بسم اللہ

جامعہ

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی و پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد [illegible] | جنوری سنہ ۱۹۳۶ء | نمبر ۱

فہرست مضامین

پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا۔

پسٹالوزی کا نظریۂ تمدن

پسٹالوزی نے اپنے زمانے کے تمدن کی تنقید اور اس کا ایک جدید نصب العین اپنی معرکۃ الآرا
کتاب "ایک خلوت گزیں کے لمحاتِ شام" میں پیش کیا ہے۔ نیوہوف کے مدرسے کی ناکامیابی
نے پسٹالوزی کو اس طرف متوجہ کیا کہ وہ اپنے خیالات وضاحت کے ساتھ پیش کرے اور یہ ثابت
کرے کہ مدرسے کا قیام ضروری تھا، گو خارجی اسباب کے باعث اس کو ناکامیابی ہوئی۔ مدرسے
کے قیام کے زمانے میں اسے اس کا موقع نہ ملا کہ وہ اپنے خیالات اچھی طرح لوگوں کے سامنے پیش
کرے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ مدرسے کی ضرورت اس کی نظر میں اس قدر بدیہی تھی کہ اس کا ثبوت
دینا غیر ضروری خیال کرتا تھا۔ پھر اس کو عملی کام کے مقابلے میں نظری مباحث سے زیادہ دلچسپی بھی
نہ تھی۔ لیکن جب مدرسہ بند ہو گیا اور چاروں طرف سے اعتراضات کی بوچھار ہونے لگی تو پسٹالوزی
نے اس کی ضرورت سمجھی کہ وہ ان مقاصد کا ذکر کر دے جنھوں نے اس کو ایک مدرسے کے قیام پر
مجبور کر دیا تھا۔ اس کی تصنیف کی سرخی ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کس درد اور غم کے عالم
میں پسٹالوزی نے یہ خیالات سپردِ قلم کئے ہیں۔ "ایک خلوت گزیں کے لمحاتِ شام" اس کتاب
کا بہت مناسب نام ہے۔ شام کے لمحات طبیعت کی افسردگی اور پستی کے لمحات ہوتے ہیں جب کہ
انسان کے قویٰ اور اس کا دماغ تھک چکا ہوتا ہے۔ تمام دن کی جدوجہد کے بعد زندگی کو شب
کی تاریکی اپنے آغوش میں چھپا لینا چاہتی ہے۔ آفتابِ عالم تاب جس کی کرنوں نے تمام دنیا کو حیاتِ
تازہ بخشی تھی، جس نے کائنات کے ذرے ذرے میں روحِ زندگی پھونک دی تھی، پردۂ شب میں نہاں
ہو جاتا ہے۔ ایک مایوس اور تھکے ہوئے ناکامیاب انسان کی زندگی کو لمحاتِ شام سے بہتر کوئی دوسرے
الفاظ ظاہر نہیں کر سکتے تھے۔ "لمحاتِ شام" کے ہر جملے میں پسٹالوزی کے تلخ تجربات کی جھلک
نظر آتی ہے۔ لمحاتِ شام سمجھنے کے لئے ضروری ہے انسان لیں ہارڈ اور گرٹروڈ کا پہلا اور دوسرا

یاد رکھنے کی بات

مشہور مصنفین اردو مثلاً مرزا غالب، خواجہ حالی، علامہ شبلی، مولانا آزاد،
مولانا شرر، علامہ اقبال، منشی پریم چند اور اردو کے جملہ مصنفین کی بلند پایہ تصانیف و تراجم اور
لاہور، لکھنؤ، الہ آباد، حیدر آباد، اورنگ آباد، علی گڈھ وغیرہ مقامات کی سب کتابیں ہر وقت
ہمارے یہاں موجود رہتی ہیں، شائقین فہرست طلب فرما کر اپنی پسندیدہ کتابیں منتخب فرمائیں

رعایت۔ مطبوعات جامعہ پر محصول ڈاک اور پیکنگ بالکل معاف ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ

(**الف**) فرمائش بمبلغ دو روپے سے کم نہ ہو۔

(**ب**) رقم بذریعہ منی آرڈر پیشگی ارسال کی جائے۔

مطبوعات جامعہ کے علاوہ دوسری کتابوں پر اس شرط کے ساتھ کہ فرمائش
مبلغ پانچ روپے سے کم نہ ہو اور رقم پیشگی بھیج جائے۔ محصول ڈاک معاف کیا جائے گا
البتہ ان کتابوں پر جو ہمیں بھی کسی خاص رعایت سے نہیں ملتیں۔ یہ ممکن نہ ہوگا۔

مکتبہ جامعہ کے مندرجہ ذیل رسائل کے نمونے مفت طلب کیجئے

رسالہ جامعہ ماہوار ☆ باتصویر "پیام تعلیم" ماہوار ☆ "کتاب نما" ماہوار

سالانہ چندہ (صہ) ☆ سالانہ چندہ (عہ) ☆ سالانہ چندہ (۸)

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

حصہ پڑھ چکا ہو۔ لمحات شام میں پستالوزی نے جماعت کا ایک نصب العین پیش کیا ہے۔ یعنی یہ کہ انسان اپنی فطرت اعلیٰ کی تکمیل سے کیا ہو سکتا ہے۔ لین ہارڈ اور گرٹرود میں جماعتی زندگی کی اصلی تصویر پیش کی گئی ہے یعنی اس میں انسان کی صرف فطرت اعلیٰ ہی نہیں دکھائی گئی ہے بلکہ اس کی فطرت ادنیٰ بھی انسان کی اعلیٰ اور ادنیٰ فطرت کا کوئی ہم آہنگ نظام موجود نہیں ہے۔ پستالوزی تقریباً پندرہ برس کوشش کرتا رہا کہ وہ کسی طرح جماعتی زندگی میں ایک توازن پیدا کر دے۔ پہلے اس نے حکومت اور قانون کے ذریعے اس کی کوشش کی جب اسے اس میں ناکامیابی ہوئی تو وہ تعلیم کی طرف متوجہ ہوا۔ پستالوزی تمام عمر اس کی تحقیق کرتا رہا کہ انسان کی فطرت خیر پر مبنی ہے یا شر پر؟ اس کتاب میں بھی پستالوزی کے پیش نظر یہی بنیادی مسئلہ ہے۔ پستالوزی کی سب سے اعلیٰ فلسفیانہ تصنیف "تحقیقات فطرت انسانی" میں بھی یہی مسئلہ زیر بحث ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ شروع سے لے کر آخر تک پستالوزی کے پیش نظر حقیقت انسان ہی کا مسئلہ رہا۔

مسئلہ فطرتِ انسانی

ظاہر ہے کہ جب تک کوئی شخص فطرت انسانی کی حقیقت کو نہ سمجھتا ہو، اس کے قوانین سے واقف نہ ہو، وہ کس طرح جماعتی زندگی میں حصہ لے سکتا ہے۔ یا اس کی رہنمائی کر سکتا ہے؟ یا وہ کس طرح انسان کی تعلیم و تربیت کر سکتا ہے؟ "لمحات شام" میں پستالوزی لکھتا ہے کہ "انسان کیا ہے، اس کو کس چیز کی ضرورت ہے، کونسی چیز اس کو اعلیٰ کرتی ہے اور کونسی ادنیٰ۔ کونسی اس کو قوی کرتی ہے اور کونسی ضعیف۔ قوموں کی رہنمائی کرنے والوں کو بھی اس کے جاننے کی ضرورت ہے اور ادنیٰ جھونپڑوں میں رہنے والے بھی اس علم کے محتاج ہیں۔

اس کتاب کی تمام عبارت ایک الہامی انداز میں لکھی گئی ہے صداقت اور جوش ہر جگہ ٹپکا پڑتا ہے۔ خاص اور اہم خیالات نہایت مختصر مگر موثر جملوں میں ادا کئے گئے ہیں، اس کتاب کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان پستالوزی کے خیالات کی داخلی بنیادوں سے واقف ہو۔ فطرت کا تصور جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، اس کتاب میں پیش پیش ہے۔ اکثر پستالوزی

طرت سے اس طرح مخاطب ہوتا ہے گویا وہ ایک مجسم انسان ہے۔ بعض اوقات یہ معلوم ہوتا ہے کہ
طرت سے مفہوم انسان کا شخصی ارادہ ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ "اے عظیم الشان فطرت تیری تربیت
بں میری خوبیاں اور میرے فرائض مضمر ہیں" بعض اوقات وہ خدا اور فطرت کے تصور کو ایک
وسرے سے ملا دیتا ہے مثلاً کہتا ہے کہ انسان کی جھونپڑی میں رحمت الٰہی باپ کی طرح موجود ہے۔
مدامیہ ہی ہستی کے انتہائی عمق میں پنہاں ہے اور یہی فطرت کی اصل قوت ہے" نہ صرف
ستالوزی کے لئے بلکہ اس عہد کی تمام ذہنی زندگی کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اصطلاح فطرت کو
واضح طور پر اپنے پیش نظر رکھیں۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں مذہب کا اثر کم ہو رہا تھا اور خدا کا تصور
تنزلزل لیکن مذہبی جذبہ چونکہ انسانی فطرت میں داخل ہے اس لئے اس کا اظہار دوسرے ذریعے
سے ہوا۔ انسان ایک مافوق الطبیعی ہستی کا عقیدہ رکھنا چاہتا ہے اپنے ایام مصیبت میں اس سے
امداد کا طالب ہونا چاہتا ہے اور ایام خوشی میں اس کا ممنون اور متشکر۔ مغرب کے عہد جدید میں ذہن
انسانی عام طور پر کلیسا سے بغاوت کر چکا تھا۔ اور کسی قسم کی قیود کا پابند نہیں رہنا چاہتا تھا۔ تاہم وہ مذہبی
جذبے سے خود کو آزاد نہیں کر سکتا تھا اس زمانہ کے انسان نے اپنے اس مذہبی
جذبے کو فطرت قرار دیا۔ اور اسی فطرت کو خدا کہہ کر پکارا۔ "فطرت" کا جو مفہوم پستالوزی کے
یہاں ہے وہی کانٹ کے یہاں "عقل" کا، فشٹے کے یہاں "نفسِ مطلق" کا، ہیگل کے یہاں "ذہن
مطلق" کا ہے۔ مذہبی جذبہ لاشعوری طور پر ان تمام فلسفیوں کی زندگیوں میں کام کر رہا تھا۔ مگر بظاہر
اس نے ایک غیر مذہبی شکل اختیار کر لی تھی
دقت یہ ہے کہ "فطرت"، "نفس مطلق"، "ذہن مطلق"، "عقل" وغیرہ مابعد الطبیعاتی اصطلاحات
بھی ہیں اور طبیعاتی بھی۔ وہ انسان سے بھی تعلق رکھتی ہیں اور خدا سے بھی۔ اصطلاح فطرت کی اس دوئی
کی وجہ سے پستالوزی کے خیالات کو سمجھنے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ فطرت کے دو پہلو ہیں۔ ایک داخلی اور ایک خارجی۔
فطرت داخلی وہ ہے جو تمام صوفیہ کی توجہ کا موضوع رہی ہے یعنی انفرادی نفس جس کے ذریعے
حقیقت کا بلاواسطہ ادراک کیا جا سکے۔ پستالوزی کہتا ہے کہ حقیقت کا ادراک میری داخلی فطرت کر سکتی

ہے۔"

فطرت خارجی وہ ہے جس کا اظہار تمام نوع انسان کی زندگی میں ہوتا ہے اپنے نفس کے ادراک کے لئے تمام انسانی زندگی کا مطالعہ ضروری ہے۔ پیسٹالوزی کہتا ہے کہ "انسان خود کو جب پہچان سکتا ہے جب وہ تمام زندگی کو بحیثیت کلی اپنے پیش نظر رکھے۔ اسی بنا پر پیسٹالوزی نے اپنے اصول تعلیم یہ مقرر کیا تھا کہ " زندگی کو انسان کا معلم ہونا چاہیے۔"

صوفی کی نظر فطرتِ داخلی پر اور عام آدمی کی نظر فطرت خارجی پر رہتی ہے حقیقت یہ ہے کہ نفس انسان کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ فطرت کے دونوں پہلو ایک دوسرے کی مدد کریں۔ انسان اسی وقت کامل ہو سکتا ہے جب وہ اپنی داخلی زندگی کی تربیت کرے لیکن اس طرح کہ خارجی دنیا سے اس کا تعلق برقرار ہے۔ خارجی دنیا کی کثرت کو اپنے نفس کی وحدت کی آنکھ سے دیکھنا سیکھے۔ خدا سے اپنا تعلق قائم رکھتے ہوئے اس دنیا کے کاموں میں پورا پورا حصہ لے۔

۲۔ مسئلہ "نامی تعلیم"

پیسٹالوزی نے دوسرا اہم تصور "لی ت شام" میں نامی تعلیم کا پیش کیا ہے۔ انسان چونکہ زندہ اور نامی ہے اس لئے اس کی تعلیم بھی نامی ہونی چاہیے فطرت ایک زندہ چیز ہے۔ اس کا اظہار ہر جگہ ہوتا ہے۔ روسو اور پیسٹالوزی کے قبل تعلیم کا یہ تصور تھا کہ ذہن انسان ایک صندوق کے مانند ہے جس میں باہر سے اشیا داخل کی جا سکتی ہیں۔ یہ تصور مشہور انگریز فلسفی اور ماہر تعلیم لاک کا بھی تھا۔ بچے کے جذبات اور احساسات کو سمجھنے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی تھی اور نہ اس کا خیال تھا کہ اس کی نشوونما اور تربیت کے کوئی علیحدہ قوانین ہیں بچے کی زندگی کی مستقل حیثیت نہیں سمجھی جاتی تھی جس کی بالذات کوئی اہمیت ہو اور جس کا ایک علیحدہ مقصد ہو۔ بچہ ایک چھوٹا سا آدمی تصور کیا جاتا تھا، اور اس کی تعلیم بالغوں کی طرح کی جاتی تھی۔ روسو اور پیسٹالوزی نے اس خیال کی جس کو میکانیکی کہا جا سکتا ہے سخت مخالفت کی، اور اس کے بجائے ایک نامی نقطۂ نظر پیش کیا۔ ان کے نزدیک بچے کی نشوونما ایک درخت کے مانند ہوتی ہے جو اپنی نشوونما کے مخصوص قوانین رکھتا ہے۔ انسان

کیاں قوانین کا مطالعہ کرنا چاہیے اور اُن کی پیروی کرنی چاہیے۔ اُسے بچوں کی تعلیم میں اس مقررہ
راہ عمل سے علیحدہ نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ وہ ان کی تمام زندگی برباد کر دے گا اور ہر انسان کو خود
بھی اپنی زندگی میں اس فطری اصول کی پیروی کرنی چاہیے۔ ورنہ اس زندگی کا تمام امن و سکون
برباد ہو جائے گا۔

انسان کی اصلی تعلیم اس وقت سے شروع ہو جاتی ہے جب اُسے فطرت سے سابقہ
پڑتا ہے فطرت انسان کی تعلیم جسمانی حواس سے شروع کرتی ہے اور تدریجاً ذہنی اور روحانی تعلیم
تک پہنچتی ہے بچہ شروع ہی میں اپنی ماں کا دودھ پیتا ہے۔ اس طرح اس کی ایک جسمانی ضرورت
پوری ہوتی ہے اور اُسے ماں کی محبت کا احساس پیدا ہو جاتا ہے پستالوزی کہتا ہے کہ اس
جسمانی محبت کے حس کو ہمیں رفتہ رفتہ ترقی دینی چاہیے تاکہ بعد میں بچہ انسانیت اور خدا سے محبت
کرے جس طرح ماں بچے کی چند ضروریات پوری کرتی ہے اسی طرح خدا اس کی تمام جسمانی ذہنی
روحانی ضروریات پوری کرتا ہے۔ اس لئے بچے کے دل میں خدا کی محبت تدریجاً پیدا کرنی چاہیے
فطرت غیر شعوری طور پر انسان کی نصف تعلیم کرتی ہے، لیکن چونکہ اس کی نصف تعلیم باقی رہ جاتی ہے
اس لیے انسان کو شعوری طور پر اس فرض کو ادا کرنا چاہیے

پستالوزی تعلیم کی دو قسمیں کرتا ہے، ایک سطحی اور ایک عمیق سطحی تعلیم وہ ہے جسے ہم ذہنی
تعلیم کہتے ہیں۔ اس کے ذریعے صرف اشیاء سے واقفیت پیدا ہو جاتی ہے ان کی ماہیت
کا علم نہیں ہوتا، عمیق تعلیم وہ ہے جو اشیاء کی ماہیت بتاتی ہے اور اس کے ذریعے انسان حقیقت
اعلیٰ سے یعنی خدا سے تعلق پیدا کرتا ہے جو نفس انسانی اور کائنات کا مرکز و مقصد ہے سطحی تعلیم
صرف اشیاء کے سائے سے واقفیت پیدا کرتی ہے، اصلی اشیاء سے نہیں سطحی تعلیم انسان
کو مغرور، غیر مستقل مزاج اور غیر مطمئن بنا دیتی ہے، پستالوزی اپنے زمانے کی تعلیم کو سطحی کہتا ہے
اور اس کے خیال میں وہ تمام متذکرہ بالا عیوب کا سرچشمہ ہے بخلاف اس کے عمیق تعلیم اشیاء
کی ماہیت سے واقف کرتی ہے اس سے انسان کو اپنی صحیح قدر کا اندازہ ہوتا ہے، اور پر اس

میں غرور کی بجائے انکسار، متانت، محبت اور شفقت پیدا ہو جاتی ہے۔ عمیق تعلیم سے جہاں داخلی قوی کی نشوونما ہوتی ہے، اور وہ ایک رشتے میں مربوط ہو جاتے ہیں۔ وہاں خارجی دنیا کی اشیاء کو بھی ایک نظام کے تحت میں دیکھنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ اس تعلیم کی بدولت انسان اشیاء کو جدا جدا دیکھنے پر اکتفا نہیں کرتا۔ بلکہ ان پر کسی ایک اعلیٰ مقصد کے تحت میں غور بھی کرتا ہے

پستالوزی کے نزدیک تعلیم کا سب سے بڑا مقصد داخلی سکون ہے، جو قوی داخلی کی ہم آہنگی سے پیدا ہوتا ہے یہی داخلی سکون تصوف و مذہب کی جان ہے۔ داخلی سکون کے لئے پستالوزی داخلی جذبے کا لفظ بھی استعمال کرتا ہے۔ اور اس لفظ کو اس نے "لمحاتِ شام" کے چند اوراق میں کوئی دس مرتبہ دھرایا ہے۔ اسی داخلی جذبے سے بعد میں پستالوزی کا تصور "ادراک" پیدا ہوا۔ "ادراک" داخلی جذبے ہی کا نام ہے، البتہ اس میں چند ذہنی اور عقلی عناصر بھی شامل ہو گئے ہیں۔ پستالوزی کے طریقۂ تعلیم کا سوائے اس کے اور کوئی مقصد نہیں ہے کہ وہ اس "داخلی جذبے"، "داخلی کیف"، "داخلی سکون" یا "ادراک" کو مختلف مضامین کی تعلیم کے ذریعے حاصل کرے۔ انسان کی یہ فطری اور اصلی کیفیت ہے اس لئے لازمًا وہ سادہ ہوگی اور اخلاقی اصطلاح میں اسی کو معصومیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ پستالوزی کہتا ہے کہ فطرت ہی خدا ہے اور وہی نفس انسانی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے نزدیک خدا کا انسان میں ظہور ہوتا ہے نفس انسانی کی قوتیں اصل میں خدائی قوتیں ہیں انسان کو اپنے نفس کی قوتوں کی نشوونما کرنی چاہئے۔ اور جن قوانین کے مطابق نفس انسانی نشوونما پاتا ہے ان کی پابندی کرنا چاہئے۔ ان قوانین سے علیحدگی اختیار کرنا گویا خدا سے علیحدگی اختیار کرنا ہے۔

انسان نہ صرف مخصوص قوتوں کے ساتھ اس دنیا میں بھیجا گیا ہے، بلکہ وہ ایک مخصوص ماحول میں پیدا کیا گیا ہے۔ اس ماحول سے اس کو علیحدگی اختیار کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہئے ورنہ وہ پرامن زندگی نہیں گذار سکتا اور نہ اپنے مقصد زندگی کو حاصل کر سکتا ہے۔ اسی بناء پر پستالوزی کہا کرتا تھا کہ غریبوں کو غربت ہی کی تعلیم دینی چاہئے، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ غریبوں

کی مادی ضرو یات کو پورا نہیں کرنا چاہتا تھا، اس کے لئے تو اس نے عمر بھر جدوجہد کی۔ البتہ وہاں کا مقصد یہ تھا کہ غریبوں کے لئے جو پیشے موجود ہیں انھیں کے ذریعے اُن کو اپنی مادی ضروریات پوری کرنی چاہئے اس طرح غریبوں کی معاشی ضروریات اطمینان سے پوری ہو جائیں گی اور وہ پرامن زندگی کی برکت سے اپنی ذہنی، اخلاقی اور روحانی ترقی کی طرف متوجہ ہوسکیں گے۔ انسان کو اپنے ماحول سے دفعتاً علٰحدہ کر دینے سے نفس انسانی اور جماعتی زندگی کا توازن بگڑ جاتا ہے اور انسان کے اخلاق اور جماعتی تعلقات میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہندوؤں کا ذات پات کا نظام بھی اسی اصول پر مبنی ہے۔ منو نے ہندوؤں کو چار طبقوں میں اس لئے تقسیم کر دیا تھا کہ وہ اپنے اپنے فرائض حسن و خوبی انجام دیں۔ ممکن ہے کہ یہ نظام انسانی زندگی کے آغاز میں جبکہ تمدنی زندگی سادہ ہوتی ہے، مفید ثابت ہو، لیکن جب ذات پات کا تشدد ایک مذہبی صورت اختیار کرے تو اس کا جو نتیجہ ہوتا ہے، وہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ہزاروں برس سے ہندوستان کی چھ کروڑ مخلوق غلامی کی بدترین زنجیروں میں جکڑ دی گئی ہے جس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے، پھر اور طبقوں کے درمیان جو دیواریں قائم کر دی گئی ہیں، اُن کی وجہ سے اجتماعی جمہوری زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے، اور ایک صحیح قومیت کی نشوونما ناممکن ہو جاتی ہے۔

پستالوزی نے منو کی طرح اپنے خیالات کو اس قدر مذہبی رنگ نہیں دیا۔ لیکن اس کی نظر انسان کے نفسی اختلافات پر ضرور تھی جس طرح مختلف پودے مختلف ماحول ہی میں نشوونما پا سکتے ہیں اسی طرح وہ مختلف خاندانوں کے لئے مختلف پیشوں کا اختیار کرنا اور ان کا اسی ماحول میں زندگی گذارنا ضروری خیال کرتا تھا اسی بنا پر وہ خاندانی تعلیم کا بہت حامی تھا، اور اس کو سب سے زیادہ اعلیٰ تعلیم قرار دیتا تھا، چوں کہ یہ انسان کو اس کی بنیادوں سے قریب تر رکھتی ہے۔ بقول خود وہ "گھوڑے اور گدھے" "گلاب اور سوسن" کے فرق کو مٹانا نہیں چاہتا تھا، وہ کہا کرتا تھا کہ منشائے فطرت یہی ہے کہ ہر چیز اپنی اصل کے مطابق نشوونما پائے، اس کی وجہ سے انسانیت کے نصب العین سے دست کشی لازم نہیں آتی، انسان کا اپنے نفس قوی کے مطابق اپنے اجتماعی

ماحول میں ترقی کرنا ہی انسانیت کی تکمیل ہے۔

فرانسیسی اور جرمن مساوات اور آزادی کے تخیل میں بہت بڑا فرق ہے، فرانسیسی تصور کے زیر اثر انگریزی اور امریکی تصور بھی مرتب ہوا ہے۔ اس میں حقوق انسانی اور انسان کے تمام معاملات میں مساوات پر زور دیا جاتا ہے۔ یہ تصور تمام انسانوں کو ہموار کرکے ایک سطح پر لاکر کھڑا کردینا چاہتا ہے۔ اسی تصور پر انقلاب فرانس کا نعرۂ جنگ "آزادی، مساوات اور اخوت" مبنی ہے۔ بخلاف اس کے جرمن تصور میں نفسیاتی اختلافات سے چشم پوشی نہیں کی جاتی۔ بلکہ انسان اور اقوام کا اپنے نفسی خواص کے مطابق ترقی کرنا ہی انسانیت کے اعلیٰ ترین مطمح نظر تصور کیا جاتا ہے۔

پستالوزی جب غریب کسان یا مزدوروں کے بچوں کی خدمت کرتا تھا تو اس کے پیش نظر مارکس وغیرہ کی طرح ایک علیحدہ مزدور جماعت کا قیام نہیں تھا، وہ اشتراکیوں کی طرح جماعت کو سرمایہ داروں اور مزدوروں کے دو علیحدہ طبقوں میں تقسیم نہیں کرنا چاہتا تھا، اور نہ اس کا یہ خیال تھا کہ ان میں ازل سے یہ جنگ چلی آرہی ہے، وہ جماعت میں فرقہ وارانہ احساس کا سخت مخالف تھا، پستالوزی غریب بچوں کی تعلیم صرف اس لئے کرنا چاہتا تھا کہ اس کے خیال میں وہ جماعت کے خراب اثرات سے سب سے کم متاثر ہوتے ہیں اور جلد سے جلد صحیح انسان بنائے جاسکتے ہیں، غریبوں میں تعلیم نہ ہونے کے باعث پستالوزی امیروں اور غریبوں میں بہت بڑا فرق دیکھتا تھا۔ اس خلیج کے وسیع ہونے میں وہ تمدن کے استحکام کے لئے خطرہ محسوس کرتا تھا، چنانچہ وہ اس کو تعلیم کے ذریعے کم کرنا چاہتا تھا۔ پستالوزی فطرتاً مطلق انقلاب پسند نہ تھا۔ لیکن اگر کسی چیز نے اس کو انقلاب پسند بنا دیا تو وہ غریبوں کی تباہی اور خستہ حالی تھی۔

۷۔ گوئٹے اور پستالوزی

لمحاتِ شام کے آخر میں پستالوزی نے گوئٹے پر تنقید کی ہے، اس کے نزدیک گوئٹے علم کی ان بلندیوں پر رہتا ہے جہاں ہر شخص نہیں پہنچ سکتا۔ وہ ایک رئیس ہے جو اپنی ذہنی عیاشیاں

میں جمہوری ضروریات اور ان کے جذبات سے ناواقف ہے۔ گوئٹے کی غیر معمولی عظمت ہمیشہ لوگوں سے پیشِ نظر رہتی تھی۔ اور پسٹالوزی کے کاموں میں رکاوٹ پیدا کرتی تھی پسٹالوزی تو عام لوگوں کو چھوٹے چھوٹے پیشوں کے ذریعے اس قابل بنانا چاہتا تھا کہ وہ معاشی بےفکری کے ساتھ ذہنی اور روحانی ترقی کریں لیکن لوگ ہمیشہ گوئٹے کی مثال پیشِ نظر رکھتے ہیں، وہ ان بلندیوں تک تو پہنچ نہیں سکتے اور اپنے پیشے سے غافل ہوجاتے ہیں، جہاں ان کو اپنے فرائض کی ادائیگی کا بہترین موقع حاصل ہو

گوئٹے سے اس کا اختلاف ذاتیات پر مبنی نہ تھا پسٹالوزی بہت ارفع اور اعلیٰ انسان تھا، وہ دراصل اشراقیت کے اس نصب العین کا مخالف تھا جس کا سب سے بڑا علم بردار گوئٹے تھا گوئٹے میں یونان کی روح کام کر رہی تھی، جہاں غیر معمولی قوت والے لوگوں کی پرستش کی جاتی تھی پسٹالوزی عیسائیت کی روح کا علم بردار تھا جو غریبوں اور مفلسوں کی خدمت کرنا چاہتی ہے گوئٹے کے تمدنی نصب العین میں علم و جمال کو بھی کافی اہمیت حاصل تھی۔ بخلاف اس کے پسٹالوزی سوائے محبت کے دوسری تمام چیزوں سے قطع نظر کرنا چاہتا تھا۔

جدید ہندوستان میں گوئٹے اور پسٹالوزی کے اس اختلاف کی مثال ٹیگور اور گاندھی کے اختلاف میں نظر آتی ہے۔ ٹیگور علم اور شاعری کی بلند فضاؤں میں پرواز کرتا ہے، جہاں اُسے حقیقت کے جلوے دکھائی دیتے ہیں، گاندھی اسی حقیقت کو مظلوم ہریجنوں کے جھونپڑوں میں تلاش کرتا ہے ٹیگور کے پیشِ نظر مشرق و مغرب کے علوم و فنون کی تحصیل ہے، تو گاندھی اخلاقی تعلیم کے سامنے تمام ذہنی تعلیم کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتا۔

۸۔ نفسیاتِ جماعت

لین ہارڈ اور گرٹروڈ پسٹالوزی کا وہ مشہور ترین قصہ ہے جس کے باعث وہ بحیثیت مصنف بہت مشہور ہوگیا۔ اس قصے میں پسٹالوزی نے جماعت اور تعلیم کے متعلق اپنے خیالات کا

اظہار کیا ہے۔ اور جماعت کے نفسی عوامل سے بحث کی ہے۔

لین ہارڈ اور گرٹروڈ کے سمجھنے کے لئے انسانیت کا تصور پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ پستالوزی کے عہد میں عام طور پر یہ فیشن تھا کہ انسانیت کے متعلق گفتگو کی جائے۔ مصنفین کے لئے یہ موضوع بہت اہم تھا۔ "لمحاتِ شام" میں پستالوزی نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اس عہد کی ذہنی میراث تھی، لیکن اس قصے میں پستالوزی نے اپنے زمانے کے خیالات سے آزاد ہو کر مسائل کے متعلق خود اپنے ذاتی خیالات پیش کئے ہیں۔

انگریزوں کی زندگی کی تاریخی اور تمدنی بنیادیں

(۱)

جغرافیہ کی قدیم ترین کتابوں میں بھی ایک جزیرے کا ذکر ہے جو کرۂ ارض کے شمالی مغربی کونے میں واقع ہے اور برطانیہ کہلاتا ہے۔ پرانے زمانے کے فنیقی کارنوال کی کانوں سے رانگا لایا کرتے تھے۔ مارسیلز کا جغرافیہ داں پائی تھیاس اپنی سیاحت کے سلسلے میں برطانیہ پہنچا تھا جولیس سیزر کچھ دن تک انگلستان کے جنوبی ساحل پر قابض رہا تھا روما کے سپہ سالار اگریکولا نے قیصر کلاڈیس کے حکم سے پورے جزیرے کو اسکاٹی کوہستان تک فتح کر کے رومی نو آبادی بنالیا تھا۔

یہاں کے اصلی باشندوں کے متعلق ہماری معلومات بہت محدود ہے۔ بعض محققوں کی رائے ہے کہ گول سر اور سیاہ بالوں والے لوگ جو زیادہ تر ویلس اور آئرستان میں پائے جاتے ہیں ان قدیم باشندوں کی نسل سے ہیں اور ان کا سلسلۂ نسب بحر روم کے سواحل کے اصلی باشندوں سے ملتا ہے بعض کے نزدیک عجیب و غریب پکٹ قوم جو رومیوں کے زمانے میں شمالی مشرقی اسکاٹستان میں رہتی تھی اور جس میں جسم پر نقش نگار بنانے اور کھودنے اور مادری وراثت کا رواج تھا یہاں کے اصلی باشندوں کی یادگار تھی تاریخی عہد کے آغاز میں یہاں کیلٹ قوم رہنے لگی تھی ویلس میں اور جنوبی مغربی انگلستان میں کیمریوں کی آبادی تھی اور بقیہ برطانیہ اور آئرستان میں گیل قبائل رہتے تھے۔ یہ لوگ ذہین، نفاست پسند اور زود آموز تھے مگر ان کی سیاسی زندگی وحدت قبائل سے آگے نہیں بڑھی تھی اور اقتصادی زندگی بھی گاؤں اور قبیلے کی نیم اشتراکی عصبیت تک محدود تھی رومیوں نے انھیں نہایت آسانی سے مغلوب کرلیا۔ فاتح قوم نے تمام ملک کو ایک فوجی چھاؤنی بنا دیا جس میں اعلیٰ درجے کی سڑکوں کا جال بچھا تھا ان میں سے بعض آج تک شاہراہوں اور ریل کی لائنوں

کی شکل میں موجود ہیں۔) جابجا فوجی پڑاؤ تھے اور بعض شہروں میں حکومت خود اختیاری قائم تھی۔ چنانچہ چیسٹر، لنکاسٹر، لنکن وغیرہ کے ناموں میں رومی الفاظ کاسٹرا (CASTRA) اور کولونیا (COLONIA) اب تک موجود ہیں، ان شہروں میں ایک قلیل التعداد اعلیٰ طبقہ لاطینی زبان بولتا تھا، رومی طرز کی عمارتیں بناتا تھا۔ اوسط درجے کی رومی عیش وعشرت کا لطف اٹھاتا تھا اور ان دیوتاؤں کو پوجتا تھا جو بحر روم کے آس پاس پوجے جاتے تھے مگر عام ملک پر رومیت کا ویسا گہرا اثر نہ تھا جیسا فرانس اور اسپین میں، چنانچہ برطانیہ میں کوئی ایسی زبان نہیں بولی جاتی جو لاطینی سے نکلی ہو۔

جب رومی فوجوں کو اپنے ملک واپس جانے کی ضرورت پڑی تو برطانیہ پر جرمن قبائل کی یورش ہوئی۔ پہلے تو دریائے ایلب اور دریائے ویسر کے دہانے سے (غالباً نارمنڈی کے نو مفتوحہ علاقوں سے) سیکس قوم بڑھی اور آبنائے انگلستان کو عبور کر کے آہستہ آہستہ دریائے ٹیمس کے کنارے تک کل ملک پر قابض ہوگئی (کم وبیش سنہ ۵۰۰ء میں)، دو قرن کے بعد اینگل قوم تلیوگ ہولسٹائن اور دریائے ایلب کے نشیبی حصوں سے چل کر کیلٹ اقوام سے لڑتی بھڑتی دریائے ٹیمس اور فرتھ آف فورتھ کے درمیان مشرقی جانب دو ثلث حصے کی مالک ہوگئی۔ اس نے بہت سی حکومتیں قائم کیں جن کے حدود اور نام آج تک بعض قسمتوں اور کلیسائی اضلاع میں بدستور باقی ہیں مثلاً ویکس، بسکس، ایکس۔ اس کے علاوہ کینٹ اور ہیمپشائر میں جوٹ قوم نے ایک سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اینگل قوم کا مشرقی راج (نارفاک اور سفاک) میں تھا۔ ان لوگوں نے کیلٹ، مرس اور نارد مبر اقوام کو مغلوب کر کے دریائے ہمبر کے دہانے سے فرتھ آف فورتھ تک اپنی سلطنت مستحکم کرلی اور اسکاٹستان کے کل نشیبی حصے کو بھی اس میں شامل کرلیا شارل اعظم کے زمانے میں برطانیہ کے کل جرمن مقبوضات متحد ہو کر ویکس کے بادشاہ اگبرٹ کے زیر فرمان تھے۔

تمام مورخ ابتدا ہی سے جرمن فاتحوں کے وحشیانہ ظلم کی شکایت کرتے آئے ہیں پھر

بھی یہ بعید از قیاس ہے کہ لوگوں نے کیلٹ قوم کو بالکل نیست و نابود کر دیا ہو۔ شمال مغرب (کمبرلینڈ) اور جنوب مغرب (کارنوال) میں کچھ دن پہلے تک کیلٹی زبان بولی جاتی تھی۔ بہت سے شہروں (مین رمیں، بیتھ، کارلیل، لندن، ڈینار) اور دریاؤں (ایون، سیورن، ٹمس، ٹرینٹ ڈی) کے نام یقیناً کیلٹی زبان کے الفاظ سے مشتق ہیں۔ موجودہ زمانے میں انگلستان میں کیلٹی شکل و شمائل کے لوگ اس کثرت سے نظر آتے ہیں کہ یہ توجیہہ کہ وہ سب قریب کے ملکوں سے آگئے ہیں کام نہیں دیتی۔ پھر جو شخص تاریخ ادبیات کا مطالعہ کرتا ہے اُسے انگریزی ادب میں تخیل کا قوی عنصر بھی جرمن انداز طبیعت کے خلاف نظر آتا ہے جس کی مثال میں شکسپیئر، سپنسر شیلے اور کیٹس کا نام لینا کافی ہے۔ اسی طرح انگلستان کے ادنیٰ طبقوں کی اشتعال پذیری سے بھی غیر جرمن عنصر کا پتہ چلتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ جب تک یہ لوگ خوش حال ہوں ان میں کسی قسم کی حرکت پیدا کرنا مشکل ہے لیکن جہاں کسی خطرہ کا شور اٹھا (مثلاً سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں یورپ کا اندیشہ انیسویں صدی میں فرانس کے اور بیسویں صدی میں جرمنی کے حملہ کا خوف) تو یہ خود بخود بھڑک اٹھتے ہیں۔ اگرچہ اس طرح کی غیر معین علامات کی بنا پر قوموں میں نسلی امتیاز کرنے میں غلطی کا احتمال ہے لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ انگریز قوم کی رگوں میں جرمن خون کے ساتھ کیلٹی خون بھی ملا ہوا ہے۔ کیلٹی زبان ویلس، اسکاٹستان اور آئرستان میں اب تک بولی جاتی ہے۔ ویلس میں تو یہ ایک ملکی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ سنہ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری کی رو سے ویلس اور اس سے ملی ہوئی انگلستان کی قسمت مان متھ میں ۲۵ فیصدی باشندے کیلٹی زبان بولتے ہیں اور دو قسمتوں میں تو نصف سے زیادہ لوگ سوائے اس کے کوئی زبان نہیں جانتے۔ اسکاٹستان کی شمالی قسمتوں (آرگائل، انورنیس، روس کرومارٹی اور سدرلینڈ) میں ۴ فیصدی باشندے محض گیلی زبان اور ۲۲ سے ۵۰ فیصدی تک گیلی اور انگریزی دونوں بولتے ہیں۔ آئرستان میں انگریزوں کے جبر و تشدد سے محض آئری زبان بولنے والوں کی تعداد گھٹ کر ½ فیصدی رہ گئی ہے یعنی سوائے دو صوبوں ڈونگل (۲٫۸) اور گیلوے (۲٫۴) کے اور

کہیں یہ لوگ کسی شمار میں نہیں۔ البتہ پچھلے قرن کی زوردار قومی تحریک کے سلسلے میں سارے ملک میں آئرش زبان پھیلانے کی کوشش کی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۹۲۲ء میں (۹ر۱۲) فیصدی باشندے انگریزی کے ساتھ آئرش زبان بھی بولتے تھے۔

انگلستان میں عیسوی مذہب بہت جلد پہنچ گیا۔ پہلی بار آئرستان کی راہ سے آیا جہاں اُسے مقدس پیٹرک کے عہد سے اب تک زوال نہ ہوا تھا۔ یہ مذہب کیلٹی اثرات قبول کر کے بہت کچھ بدل گیا تھا۔ قوم پرستی، پوپ کے اثر سے آزادی، رہبانیت، خانقاہ کی زندگی اس کی خصوصیات تھیں۔ اس کا مرکز جزائر ہیبرائڈیز کا ایک دور دراز جزیرہ آیونا تھا۔ اس کے کچھ دن بعد (سنہ ۵۹۵ء میں) روما کے مبلغ جنوبی برطانیہ میں پوپ کی عیسائیت لے کر پہنچے۔ شدید نزاعوں کے بعد یہی رومی عیسائیت غالب آئی یعنی عالمگیر کلیسا کی تحریک کو تنگ نظرانہ قوم پرستی پر (اگرچہ انگلستان کی عیسائیت میں ہمیشہ قومیت کا ایک قومی عنصر موجود رہا ہے) اور عملی اثبات زندگی کے تمدن کو خانقاہ کی باطنیت اور رہبانیت پر فتح حاصل ہوئی۔

نوجوان جرمن عیسائی تمدن کے لئے ناروے اور سویڈن کی ملحد قوموں (جنھیں انگلوسکسن لوگ ڈین کہتے تھے) کے حملے بہت خطرناک تھے۔ انھوں نے عرصے تک اسکاٹستان کے قریب کے جزائر پر اور جزیرہ مین پر حکومت کی اور آئرستان میں کئی سلطنتوں کی بنیاد ڈالی چنانچہ آئرستان کے مشہور شہر ڈبلن (سنہ ۸۴۰ء) اور کارک (سنہ ۸۶۰ء) عیسوی انھیں لوگوں کے بسائے ہوئے ہیں۔ انگلستان میں یہ لوگ سالہا سال قتل و غارت کرتے رہے شاہ الفریڈ (سنہ ۸۷۱ء تا سنہ ۹۰۱ء) نے اپنے ملک کو اس شدید خطرے سے نجات دی "ڈین" لوگوں نے مذہب عیسوی اور انگلوسکسن بادشاہ کی اطاعت قبول کر لی لیکن الفریڈ کو ان کے لئے اپنے ملک کا پورا مشرقی حصہ خالی کرنا پڑا جس میں انھوں نے اپنی بستیاں بسائیں۔ بعض شہروں مثلاً ڈربی، وہٹبی وغیرہ کے ناموں میں ڈینی زبان کا لفظ "بی" جو شہر کے معنی رکھتا ہے۔ اور یوں بھی انگریزی زبان کے موجودہ ذخیرۂ الفاظ کا ایک معقول حصہ اسکینڈی نیوین زبان سے ماخوذ ہے۔ یہاں تک کہ روزمرہ کی گفتگو

میں بھی ان زبانوں کی ضمیریں THEY , THEIR وغیرہ داخل ہوگئی ہیں الفریڈ کی موت کے بعد جنگ نئے سرے سے چھڑ گئی کینوٹ اعظم (سال وفات ۱۰۳۵ء) جو اسکینڈے نیویا کا باشندہ تھا انگلستان پر بھی حکومت کرتا تھا۔ اُس کے بعد ایڈورڈ کنفیسر کے تخت نشین ہونے سے حکومت ایک ہم قوم خاندان میں واپس آگئی لیکن اسی زمانے سے زوال کے آثار ظاہر ہونے لگے خود بادشاہ پر نارمن قوم کے خیالات کا بہت اثر تھا اور اُس کے ہم قوموں یعنی انگلوسیکسن لوگوں کی مخالفت کی وجہ سے یہ اندیشہ تھا کہ اس کی سلطنت دوبارہ ان حکومتوں میں بٹ جائے گی جنہیں ایگبرٹ اور الفریڈ اعظم نے متحد کیا تھا۔ ۱۰۶۶ء میں ہیرلڈ کے عہد حکومت میں ولیم فاتح نے انگلوسیکسن سلطنت کو مسخر کر لیا۔

(۲)

نئے خاندان شاہی کے ہاتھ میں زمام حکومت کا آنا تھا کہ فرانسیسی تمدن کی ایک زوردار لہر تمام ملک میں دوڑ گئی جس سے ابتدا میں یہ اندیشہ تھا کہ انگلوسیکسن تہذیب بالکل فنا ہو جائے گی۔ یہ خطرہ اس سبب سے اور بڑھ گیا کہ قدیم الایام سے برطانیہ اور فرانس میں بہت گہرے تعلقات چلے آتے تھے (چنانچہ جولیس سیزر نے بھی اس کا ذکر کیا ہے) اور انگلوسیکسن عہد میں برابر فرانسیسی تمدنی عناصر انگلستان میں داخل ہوتے رہے تھے، فرانس ہی کے توسط سے انگلستان نے ہمیشہ براعظم کے تمدن سے تعلق قائم رکھا ہے۔ کینٹ کی ایک ملکہ نے جو فرانکی نسل سے تھی (۵۹۷ء) انگلوسیکسن قوم میں عیسائی مذہب کی اشاعت میں بہت مدد دی تھی، شاہ ایگبرٹ جس نے انگلوسیکسن لوگوں کو متحد کیا عرصے تک فرانس میں رہا تھا، قدیم انگلستان کے سب سے اولوالعزم بادشاہ الفریڈ اعظم کی سوتیلی ماں فرانس کے بادشاہ شارل اصلع[لہ] کی ماں تھی۔ فن تعمیر اور نقاشی میں انگلوسیکسن تمدن پر فرانسیسی اثر اور ایک حد تک فرانسیسی تمدن پر انگلوسیکسن اثر صاف نظر آتا ہے جو انگلوسیکسن

لہ CHARLES THE BALD

عہد کے آخر میں منصبداری نظام اور فوج کی بہت سی اصطلاحات انگریزی میں داخل ہو چکی تھیں، اڈورڈ کنفیسر، نے جو اصل میں انگلوسیکسن نسل کا آخری بادشاہ تھا، اپنا دربار بالکل نارمن طرز پر قائم کیا تھا۔ اب نئے فرانسیسی خاندان کی حکومت سے یہ اندیشہ پیدا ہو گیا کہ جرمن طرز معاشرت بالکل فنا ہو جائے گا۔

نئے خاندان نے جفاکش انگلوسیکس قوم کی مقاومت کو ایک سخت گیرانہ نظام منصبداری کے ذریعے سے جو ایک مرکزی قوت کے ماتحت تھا جس میں جرمن طرز کی خود مختار حکومتوں کی مطلق گنجائش نہ تھی اور نارمن امرا، نارمن اسقفون اور فرانسیسی تہذیب کی مدد سے دبا لیا۔ رچارڈ شیر دل جو سب سے بڑا تو نہیں مگر سب سے مشہور بادشاہ تھا بالکل ایک رنگیلا فرانسیسی تھا، کہیں چودھویں صدی میں جاکر بادشاہ پر انگریزی رنگ چڑھا اور عدالتوں اور پارلیمنٹ میں انگریزی زبان جاری ہوئی۔ (مگر قدیم سرکاری فرانسیسی زبان کا اتنا اثر باقی رہا کہ بادشاہ نئے قوانین کو اس جملے سے منظور کرتا ہے (LEROILE VUELT) اور کسی جلیل القدر حاکم یا جج کی آمد کا اعلان (OYEZ) کے لفظ سے کیا جاتا ہے) فرانس میں نارمس راج کے مقبوضات پر اپنی حکومت قائم رکھنے کے لئے پلانٹیجنٹ خاندان کے بادشاہ اڈورڈ سوم (۱۳۲۷ء تا ۱۳۷۷ء) اور ہنری پنجم نہایت ثابت قدمی سے لڑتے رہے بلکہ انھوں نے سارے فرانس کو فتح کرنے کی کوشش کی، مگر اُن کی ساری سعی لاحاصل ثابت ہوئی یہاں تک کہ ۱۴۵۳ء میں انھیں کیلے سے بھی دست بردار ہونا پڑا۔ انگلستان کی سلطنت براعظم سے بالکل الگ ہوئی۔ ۱۵۵۸ء میں ڈنکرک انگریزوں کے قبضے میں آیا مگر چار ہی سال بعد پھر نکل گیا جس سے دوبارہ رشتۂ تعلق قائم ہونے کے امید بالکل جاتی رہی۔

انگلوسیکس لوگوں نے نہایت عزم و استقلال سے اپنے تمدن کو غیر ملکی عنصر کے حملے سے بچایا یہاں تک کہ آخر خود فاتح قوم کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ یہ سچ ہے کہ اُن کی زبان میں فرانسیسی الفاظ کی بھرمار ہو گئی مگر سب سے اہم چیز یعنی صرفی اور نحوی ترکیب خالص جرمن ہی رہی۔ طرز حکومت اور ملکی نظم و نسق پہلے بالکل نارمن طرز کا تھا لیکن آگے چل کر انگلوسیکسن عنصر غالب آگیا طرز

تعمیر بھی ابتدا میں فرانسیسی تھا لیکن قرون وسطیٰ کے آخر میں انگلستان میں ایک جزائری طرز عمارت کی ستونہ ہوئی جس کی مثال بر اعظم میں کہیں نہیں ملتی۔ نارمن امرا کی نسل بھی رفتہ رفتہ منقطع ہوگئی اگرچہ زمانوں میں اسے چھپانے کی کوشش کی گئی ہے اور ان کی جگہ قرون وسطیٰ کے آخر میں نوخیز انگلوسیکسن خاندانوں نے لے لی۔ قرون وسطیٰ کی تمدنی تحریکوں سے شمالی جرمن اور انگلوسیکس الگ تھلگ رہے۔ اس عہد کی عاشقانہ شاعری کا اثر انگلستان میں بہت خفیف تھا اور صلیبی جنگوں کا اس سے بھی کم۔ قیصری نظام حکومت تمام عیسائی ممالک میں پھیل چکا تھا مگر انگلستان والے نہ اس کے اخلاقی پہلو کو سمجھتے تھے اور نہ اس سے دلچسپی رکھتے تھے بادشاہ اور پوپ کی جنگ میں اکثر انگلستان کے بادشاہوں نے بھی حصہ لیا ہے خصوصاً ہنری دوم کے عہد میں جو قیصر باربروسا کا ہمعصر تھا اس نزاع نے اسا طول کھینچا کہ اسقف اعظم ٹامس بکیٹ کلیسا پر قرباں ہوگیا لیکن قوم کو اس سے کوئی واسطہ نہ تھا پوپ انوسینٹ سوم نے شاہ جان (۱۱۹۹ء تا ۱۲۱۶ء) کے عہد کی ابتر سیاسی حالت سے فائدہ اٹھا کر انگلستان کو اپنا باجگذار بنا لیا تھا لیکن ایک ہی صدی کے اندر بادشاہ کی قوت پھر بڑھ گئی، اور جب اس عہد کے پوپ نے پرانے مطالبات نئے سرے سے پیش کرنا چاہے تو انگلستان نے وکلف کی قیادت میں رومانی حکومت کے خلاف گہرے قومی جوش کا اظہار کیا۔ اس زمانے میں انگلوسیکس، نارمن، اور بچے کھچے کیلٹ لوگ مل جل کر ایک متحدہ قوم بن چکے تھے۔ غالب عنصر شمالی جرمن کسانوں کی نسلی خصوصیات کا ہے مادیت پرستی آداب و رسوم سے بے پروا ہونا کھرا پن آزادی کا غرور مضبوطی حماستی جرمن باطنیت مگر اسی کے ساتھ پرواز تخیل، اور ہنگامی اشتعال پذیری جس میں کیلٹی سیرت کی جھلک نظر آتی ہے، اندر تو یہ کیفیت ہے اور باہر سے ظاہری تہذیب کی ایک موٹی تہ جم گئی ہے جو زیادہ تر نارمن قوم کی وراثت ہے۔ نارمن آبا و اجداد ہی سے انگریزوں کو حکمت عملی اور لوگوں سے کام نکالنے کا مادہ ملا ہے جو صرف اعلیٰ طبقے میں پایا جاتا ہے اور معمولی لوگوں میں مفقود ہے، نارمنوں ہی سے انھیں حسن صورت کا ذوق حاصل ہوا ہے جو اُن کے مذہب (دیکھئے آکسفورڈ کی مذہبی تحریک اور "ہائی چرچ" کا نظام) اور ان کی شاعری کر ملاحظہ ہو چاسر وہم کے زمانے کے شعرا اور پوپ اور ڈرائیڈن

کا کلام، میں جرمنوں کی اجڈ طبیعت اور خشک ناملنیت سے دست و گریبان نظر آتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے آخر میں ان مختلف عناصر کے ملنے سے ایک ہم رنگ، مغرور، بدیسی تہذیب کو حقیر سمجھنے والی قوم بن گئی تھی۔ اس زمانے میں جو غیر ملک کے لوگ انگلستان آئے تھے انھوں نے انگریزوں کے غرور اور خود پسندی کا ذکر کیا ہے۔

بادشاہی سلطنت ابتدا میں خالص مستبدانہ اور منصبداری کے نظام پر مبنی تھی۔ وہ اتنی قوی تھی کہ اس نے چھوٹی حکومتوں کو ابھرنے نہ دیا ورنہ جرمنی کی طرح یہاں بھی بادشاہ شاہِ شطرنج بن کر رہ جاتا۔ یہاں تمام ملک میں شاہی عدالتیں قائم تھیں اور بادشاہ کی طرف سے محصول وصول کیا جاتا تھا۔ نظام منصبداری میں زمین کا اصلی مالک بادشاہ تھا، گو اس کے ماتحت امرا اور کلیسا کے مقابلے میں بھی بادشاہ ہی تمام سلطنت کی نمائندگی کرتا تھا۔ امرا کو آپس میں جنگ کرنے کا حق نہ تھا۔ صرف سرحدی علاقوں میں یعنی ویلس اور اسکاٹستان کی سرحد پر بعض ارل اور کاؤنٹ (مارد میرلینڈ لنکاسٹر، چیسٹر، سترلوسبری، ہرفرڈ اور ڈرہم کا اسقف) کبھی کبھی بادشاہ کے مقابلے میں خود مختاری کا دعویٰ کرتے تھے مگر وہ بھی اسے نباہ نہیں سکتے تھے۔ اس زمانے کی اتنی یادگار اب تک باقی ہے کہ صوبہ لنکاسٹر کے چانسلر کے نام سے ایک عہدے دار ہوتا ہے جو مجلس وزرا میں شریک کیا جاتا ہے اگرچہ اس کے ماتحت کوئی خاص صیغہ نہیں ہوتا۔ البتہ ویلس میں جسے اڈورڈ اول نے سنہ ۱۲۸۲ء میں فتح کیا تھا ہنری ہشتم کے زمانے تک واقعی خود مختاری حکومت تھی۔ اس انتہائی مرکزیت کے نتائج ظاہر ہیں۔ اس کی بدولت انگلستان بیرونی ممالک کے مقابلے میں ہمیشہ قوی اور مستعد پیکار رہا ہے اور خود اس کے اندر کبھی قبائلی امتیازات کا ایسا خیال پیدا نہیں ہونے پایا جو قابلِ ذکر ہو۔ مگر دوسری طرف اس نظام نے ساری قوم میں ایسی یک رنگی پیدا کر دی جو جرمن قبائل کی زندگی کی گوناگونی کے مقابلے میں ایک طرح کا نقص معلوم ہوتی ہے۔ تعلیم یافتہ انگریزوں کی زبان میں روزمرے اور محاورے کا وہ لطف نہیں جو اسکاٹوں اور امریکیوں بلکہ اکثر تعلیم یافتہ جرمنوں کی گفتگو میں پایا جاتا ہے۔ قومی سیرت کی مقامی خصوصیات، مقامی رسم و رواج، اپنے

اپنے دیں سے تعلق خاطر، یہ باتیں انگریزوں میں بھی ہیں لیکن جرمنوں سے بہت کم جرمنی میں قبائلی خصوصیات کے سبب سے جو رنگا رنگی پیدا ہوگئی ہے اس کے خلاف انگریزوں کے طرز معاشرت میں یہاں اسکاٹستان والوں کا ذکر نہیں) ایسی یکسانی نظر آتی ہے جس کے سبب ان کے یہاں بڑے شہروں میں ایک بے رنگ اور آفاقی آبادی کے اکٹھا ہو جانے میں خطرناک حد تک مدد ملی ہے۔ مگر باوجود شاہی استبداد کے نارمنوں کے زمانے میں بھی اینگلوسیکسن قوم کا حکومت خود اختیاری کا رجحان برقرار رہا اور بادشاہ، منصبدار امرا اور کلیسا کی باہمی نزاعوں کے سبب سے چھوٹے چھوٹے رئیسوں اور قصبوں کو بہت جلد خاصی اہمیت حاصل ہوگئی۔ ۱۲۱۵ء میں جو منشور آزادی شاہ جان سے حاصل کیا گیا تھا اس کی اہمیت میں مورخین ایک حد تک مبالغہ کرتے ہیں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس کی بدولت چھوٹے رئیس اور قصبے ایک حد تک بادشاہ کے استبداد سے محفوظ ہوگئے۔ اس کے پچاس ہی برس بعد (۱۲۶۵ء میں) چھوٹے رئیسوں نے کوشش کی کہ قصبوں کے نمائندوں سے مل کر حکومت کے خلاف ایک مضبوط پارٹی بنائیں جو چودھویں صدی کے آغاز میں موجودہ پارلیمنٹ یعنی ملک کے تینوں طبقوں منصبدار امرا، پادریوں اور عوام الناس (اصل میں زمینداروں اور قصبوں کے نمائندوں) کی آئینی جماعت کی بنیاد پڑی۔ ملک کے نمائندوں کی اس جماعت کو رفتہ رفتہ یہ حق حاصل ہوگیا کہ ہر قسم کا محصول لگانے کی منظوری دے اور بادشاہ کے جو مشیر ملک میں ہر دلعزیز نہ ہوں ان کی بدعملیوں کو روکے اور ان کے برطرف کرنے کا مطالبہ کرے۔ وہ بتدریج سلطنت کی سب سے اونچی قوت بن گئی یہاں تک کہ اس نے دو بار بادشاہ وقت (۱۳۲۷ء میں ایڈورڈ دوم اور ۱۳۹۹ء میں رچارڈ دوم) کو معزول کر دیا۔ ٹیوڈر بادشاہوں کے عہد سے (ہنری ہفتم کے زمانے سے جس نے ۱۴۸۵ء سے ۱۵۰۹ء تک حکومت کی۔ پارلیمنٹ کا اقتدار کم ہوگیا مگر چارلس اول کے زمانے میں اس نے کرامویل کی قیادت میں بادشاہ کو شکست دے کر کھوئی ہوئی قوت پھر حاصل کرلی اور ایک نئے انقلاب یعنی ۱۶۸۸ء میں جیمس دوم کے اخراج) کے بعد تو اس نے بادشاہ کے اثر کو اتنا کم کر دیا

کہ وہ ساہ سطرنج بن کر رہ گیا -

(۴)

تجدید مذہب کی تحریک میں انگلستان نے بہت کافی عملی حصہ لیا-اس تجدید کا سیاسی پہلو یعنی مغرد اقوام کا یورپ کے سیاسی مطالبات کی مخالفت کرنا اور اس کا مذہبی پہلو یعنی استحالہ عشائے ربانی[1] کے مسئلے اور مذہبی پیشوائی اور کلیسائی اقتدار کے معاملے میں شبہات پیدا ہونا دونوں پہلے پہل انگلستان میں جان وکلف (سال وفات ۱۳۸۴ء) کی بدولت منظر عام پر آئے -لیکن نئی تحریک کے آغاز ہی میں ہمیں انگریزوں کی مذہبیت کا مخصوص رنگ صاف نظر آتا ہے ، اُن کی ایک معقول اقلیت ، یعنی پندرھویں صدی میں لولارڈ فرقے اور سولھویں اور سترھویں میں پیورٹین فرقے کے لئے یہ مسائل روحانی اور باطنی اہمیت رکھتے تھے لیکن عام قوم کو محض اس کے ایک پہلو یعنی تحریک آزادی سے دلچسپی تھی بلکہ لولارڈ اور پیورٹین فرقے بھی زیادہ زور اسی چیز پر دیتا تھا- وکلف کے زمانے میں انگلستان پر پوپ کا اثر بہت کم ہوگیا اور ہنری ہشتم کے زمانے میں تو روما سے رشتۂ تعلق بالکل منقطع ہوگیا - پروٹسٹنٹ مذہب کی انتہا پسند جماعتیں متعدد غیر مقلد فرقے (پریسبٹرین ، انڈیپنڈنٹ وغیرہ) قائم کر کے کلیسا کے اقتدار کو کمزور بلکہ معدوم کرنا چاہتی تھیں -جہاں تک فرد کو مذہبی تقلید سے آزاد کرنے کا سوال تھا یہ لوگ نہایت شدت ، استقلال اور انتہائی ایثار کے ساتھ لڑتے تھے - مگر مذہب کے نظری مسائل اور عقائد کی بحث سے سوائے معدودے چند افراد کے کسی کو بحث نہ تھی - انگلستان کے سب سے بڑے مستبد بادشاہ ہنری ہشتم (۱۵۰۹ء تا ۱۵۴۷ء) نے نئی مذہبی تحریکوں سے فائدہ اٹھا کر اپنی مطلق العنانی اور تعدد ازدواج کی خواہشات پر کلیسا کے دامن تقدس کا پردہ ڈالا-جب پوپ نے اسے پہلی بیوی کو طلاق دینے کی اجازت نہیں دی تو اُس نے رومی کلیسا سے قطع تعلق کر لیا اور رعایا کو

---

(۱) یہ مسئلہ کہ عشائے ربانی میں روٹی اور شراب قلب ماہیت سے حضرت مسیح کا گوشت اور خون بن جاتی ہے-

اس پر مجبور کیا کہ وہ ایک نیا مساز مذہب اختیار کرے جس میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک عناصر ملے جلے تھے۔ اس کے جانشین ایڈورڈ ششم نے (۱۵۴۷ء تا ۱۵۵۳ء) خالص کیلوینی مذہب کو رائج کیا اور ملکہ میری کے زمانے (۱۵۵۳ء تا ۱۵۵۸ء) کے مختصر کیتھولک دور کے بعد ایلزبتھ نے ایک ایسے مذہب کی بنیاد ڈالی جس میں عقائد تو پروٹسٹنٹ فرقے کے تھے لیکن کلیسائی مراتب اور عبادت کے طریقے کیتھولک فرقے کے۔ جمہور کی اکثریت ان سب باتوں کو چپ چاپ قبول کرتی رہی اور پیوریٹن اقلیت نے مخالفت بھی کی تو روما کے عشائے ربانی اور دوسرے بالائی مسائل کی نہیں بلکہ صرف کلیسائی مراتب کی۔

آئندہ زمانے کے لئے سب سے اہم بات یہ ہے کہ انگلستان میں تجدید مذہب کی تحریک کا اثر سب طبقوں پر یکساں نہیں ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ کم سے کم اصل انگلستان اور اسکاٹ لینڈ سے کیتھولک مذہب قریب قریب بالکل معدوم ہو گیا لیکن یا انگلیکن قومی کلیسا محض سیاسی اور سماجی اقتدار رکھنے والے اونچے طبقوں کے لئے محدود تھا۔ نیچے طبقوں کے لوگوں کو اس سے تعلق رکھا، وہ عموماً ڈسینٹر یا نان کنفرمسٹ (غیر مقلد) اور سترھویں صدی میں پیوریٹن کے بھی بے شمار چھوٹے چھوٹے فرقوں میں بٹے ہوئے تھے جو جمہوری نظام کے پابند اور انگلیکن کلیسا سے کہیں زیادہ کیتھولک مذہب کے دشمن تھے۔ انگلیکن ڈسینٹر لوگوں میں اتنا فرق نہیں ہے جتنا دوسرے ملکوں میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں میں ہے۔ اُن کا اختلاف اصل میں عقائد پر نہیں بلکہ سماجی مراتب پر مبنی ہے۔ ان میں باہم وہی تضاد ہے جو اونچے اور نیچے، حقوق رکھنے والے اور کس مپرسی میں بسر کرنے والے طبقوں میں ہوتا ہے اور اس کے پوری طرح ظاہر نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ جو ڈسینٹر سماجی حیثیت سے ترقی کرتے ہیں وہ سرکاری کلیسا میں شامل ہو جاتے ہیں۔ عرصے تک دونوں کے تمدن اور طرز معاشرت میں بھی تضاد رہا بلکہ آج بھی موجود ہے۔ انگلیکن فرقے میں کشادہ دلی اور رواداری ہے جو سرکاری کلیسائی مذہب میں عموماً پائی جاتی ہے اس میں ہر قسم کے کلیسائی عقائد کے لئے گنجائش ہے۔ اس جوش اور باطنیت سے بے کر جو کراتا

اور کرسچیانا رسیٹی میں بھی اس دنیاداری اور بیجان رسوم کی پابندی تک جس کا نمائندہ اٹھارھویں صدی
میں لارڈ بالنگ بروک تھا۔ چنانچہ انگلستان میں علمی اور ادبی ذوق کے حامل جن کے پیش نظر علاوہ
مذہب کے دوسرے نصب العین بھی ہیں، صرف انگلیکن مذہب والوں میں پائے جاتے ہیں
برخلاف اس کے نان کنفرمسٹ لوگ مذہبی رنگ میں ڈوبے ہوتے ہیں ان کی مذہبیت کے
مختلف مدارج ہوتے ہیں بعض اس ظاہری شریعت پرستی کے پابند ہوتے ہیں جس کا توریت میں
حکم ہے اور بعض میں مشاہدے اور وجدان کی لطیف ترین باطنیت پائی جاتی ہے مگر سب کی نظر
سختی کے ساتھ مذہب تک محدود ہوتی ہے۔ سب دیانت دار، بیدار مغز، رنگینی اور تخیل سے خالی
فنون لطیفہ کے دشمن، کم ظرف اور بدمذاق ہوتے ہیں۔ سنہ ۱۶۴۰ء میں پہلے پہل یہ تضاد پوری
طرح ظاہر ہوا۔ اس عہد میں تمدن کے اصلی حامل (CAVALIERS) تھے جو ظاہری اعتبار
سے سرکاری کلیسا سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ لوگ فنون لطیفہ کے عاشق، خوش باش، لاابالی
مزاج کے تھے اور انہیں یہ دعویٰ تھا کہ آبائی ریاست اور نشاۃ ثانیہ کی تہذیب کی بدولت ہم
دوسرے انسانوں سے افضل ہیں اس زعم میں اپنے مرتبے کو قائم رکھنے کے لئے یہ ہر طرح
کے ظلم اور بددیانتی کے مرتکب ہوتے تھے ان کا مکمل نمونہ چارلس اول تھا۔ دوسری طرف
پیورٹین لوگ تھے جو سب کے سب سوائے اپنے جلیل القدر شاعر ملٹن کے دیانت دار پرہیزگار
فنون لطیفہ کے دشمن اور تنگ نظر تھے ان کے مختصر عہد حکومت سے (سنہ ۱۶۴۰ء یا سنہ ۱۶۴۹ء سے
سنہ ۱۶۶۰ء تک)، انگریزی تھیٹر اور انگریزی موسیقی کا خاتمہ کر دیا۔ بخلاف شاعری اور ناول نویسی
کے جو بادشاہ وقت کی سرپرستی میں گوشۂ تنہائی میں بھی نشوونما پا سکتی ہیں، موسیقی اور تھیٹر دونوں
قبول عام کے محتاج ہیں، اس لئے انہیں جو صدمہ پیورٹین حکومت کے زمانے میں پہنچا تھا اس
سے وہ آج تک نہیں سنبھلے ہیں۔ انگلیکن کلیسا کی فتح (سنہ ۱۶۶۰ء) کے بعد ڈراما کی قدغن کا پہلا
دور تو ختم ہو گیا لیکن دوسرا دور جو آج تک چلا جاتا ہے اس وقت شروع ہوا جب اٹھارھویں
صدی میں انگلیکن لوگوں میں نیچے طبقوں کی روح سرایت کر گئی۔ یہ نیچے طبقے والے جب

اس کے بعد جب یہ ٹھیکے میں نا کام ہو گئے تو انھوں نے یورپین عقائد کی سختی اور کلیسا کی سیاسی مخالفت کو ترک کر دیا مگر تمدنی نصب العین کو مذہب کے تنگ دائرے میں محدود رکھنے پر اب تک بہت سے آدمی قائم ہیں۔

انگلستان کے بادشاہوں کی استبداد پسندی جس کے سبب سے وہ قرون وسطیٰ کے آخر سے برابر انفرادی قوت اور انفرادی آزادی کو دبانے کی کوشش کرتے رہے آخری اسٹوارٹ بادشاہ جیمس دوم کی معزولی رسٹ ۱۶۸۸ء کے بعد ختم ہو گئی۔ اب بجائے استبدادیت کے امرا کی مدنی حکومت قائم ہو گئی۔ بادشاہ کی قوت کو لوگ روز بروز گھٹاتے رہے خصوصاً ۱۷۱۴ء سے جب ہنوور کا خاندان باہر سے آکر انگلستان کے تخت سلطنت پر حکومت کرنے لگا۔ جارج سوم ۱۷۶۰ء تا ۱۸۲۰ء کی آخری کوشش کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے ملک کو عددیت سے آزاد کرے بالکل ناکام رہی امرا کی دو پارٹیاں ٹوری اور وہگ ۱۸۳۲ء تک باری باری سے حکومت کرتی رہیں۔ یہ امرا اور شرفا کی حکومت عہد جدید میں انگلستان کی زندگی کا سب سے اہم پہلو ہے اور اس کا اثر صرف نظام سلطنت پر نہیں پڑا ہے بلکہ انگریزوں کی سیرت اور ان کی ذہنی زندگی پر آج تک یہ رنگ چھایا ہوا ہے۔

امرا سیاسی زندگی کے ہر شعبے میں سیاہ و سپید کے مالک تھے۔ مسلسل قوانین کے ذریعہ سے جو بظاہر بے ضرر نظر آتے تھے مگر اپنے اثرات کے لحاظ سے بہت دور رس تھے، عوام عملاً سیاسی قوت میں حصہ لینے سے بالکل محروم کر دئے گئے۔ ضلعوں کا مقامی انتظام مجسٹریٹوں کے ہاتھ میں تھا جو سب کے سب بڑے زمینداروں کے خاندان سے ہوتے تھے۔ شہروں میں بھی وہ سخت قیود جو اسٹوارٹ بادشاہوں نے حق انتخاب پر عائد کی تھیں بدستور باقی رہنے دی گئیں۔

شہروں کی اقتصادی زندگی بھی اس زمانے میں جب بڑے کارخانے نہیں قائم ہوئے تھے آس پاس کے بڑے زمیندار خاندانوں کی پابند تھی۔ خود پارلیمنٹ کے انتخابات پر یہ لوگ آسانی سے اثر ڈال سکتے تھے کیونکہ حلقہ ہائے انتخاب بہت محدود اور رائے دہندے

والے بہت کم ہوتے تھے ۔ وہ تمام شہر جو صنعت و حرفت میں ترقی کر رہے تھے اور جن سے یہ اندیشہ تھا کہ ایسی مستقل قوت قائم کرلیں گے اور ارباب حکومت کے لئے خطرناک ثابت ہوں گے مثلاً لیڈس، بریڈ فورڈ، مانچسٹر، برمنگھم، شیفلڈ، پارلیمنٹ میں اپنے جداگانہ نمائندے بھیجنے کے حق سے محروم تھے درانحالیکہ زراعتی خطوں کے چھوٹے چھوٹے حلقہ ہائے انتخاب جن میں سے بعض محض غیر آباد باغوں پر مشتمل تھے بدستور قائم رکھے گئے کیونکہ وہ بڑے زمینداروں کے لئے جائے پناہ تھے ملکی رسم و نسق کی تمام مجلسوں میں خواہ وہ عدالتی اجتماع ہو یا پارلیمنٹ کا اجلاس حصہ لینے والوں کو معاوضہ تو ایک طرف سفر خرچ تک نہ ملتا تھا جس کی غرض بظاہر یہ تھی کہ ان کی شان قائم رہے لیکن اصل میں یہ تھی کہ متوسط آمدنی کے لوگوں کو اپنے حقوق کی نمائندگی آپ کرنے کا موقع نہ ملے ۔ اس لئے مجسٹریٹ یا ممبر پارلیمنٹ وہی شخص ہو سکتا تھا جو معقول آمدنی رکھتا ہو یعنی ہر طرح کی سیاست پر ارباب دولت ملا شرکت غیرے قابض تھے ۔

اس کا بھی امکان نہ تھا کہ اہل علم کے طبقے میں سے کوئی مخالف حکومت جماعت کھڑی ہو سکے کیونکہ تمام علمی بیتے دولتمند طبقے والوں نے اپنے اور اپنے دوستوں کے لئے مخصوص کر رکھے تھے ۔ یونیورسٹیاں سب کی سب اور اسکول نوے فیصدی سرکاری کلیسا کے ہاتھ میں تھے جو سوائے اپنے اطاعت مندوں کے اور کسی کو تعلیم پانے کی اجازت نہ دیتا تھا اور اس بات کی پوری کوشش کرتا تھا کہ سب پادری، طبیب، قانون داں، انگلیکن فرقے کے یعنی بالفاظ دیگر بڑے بڑے حکمران خاندانوں کے ہوں ۔ سرکاری کلیسا کی قوت اس قدر وسیع تھی کہ خود وہ لوگ بھی جو کھلم کھلا اس کے مخالف تھے، اس کے اثر سے خالی نہ تھے ۔ کوئی اصطباغ یا نکاح کی رسم جو کسی انگلیکن پادری کے ہاتھ سے ادا نہ ہوئی ہو جائز نہیں قرار دی جاتی تھی کسی مردے کو بجز مقامی پادری یا اس کے نمائندے کے کوئی اور شخص دفن نہیں کر سکتا تھا ۔ آزاد مصنف بھی اب تک جدید حکومت کے لئے خطرناک سمجھے جاتے تھے ۔ اٹھارھویں صدی کے بہترین ارباب فکر میں سے اکثر مثلاً اسٹیل، بالنگ بروک، شیفٹسبری، چیسٹر فیلڈ، فیلڈنگ، سنسٹن، ہوریس

دلیوں حکمراں طبقے کے تھے اور بقیہ مثلاً ایڈیسن، پوپ، سوافٹ، ینگ وغیرہ اس طبقے کے زیر سایہ تصنیف و تالیف سے اب تک کسی کی روزی نہیں چلتی تھی اور ارباب جاہ کے دریوزہ گری کے بغیر کامیابی محال تھی ایسی بڑی شخصیت کے لوگ جیسے پوپ اور سوافٹ اور ان سے پہلے سولھویں صدی میں اسپینسر احکام اور امرا کی دربارداری کرتے تھے ڈیفو کچھ دن تک مخالف حکومت رہا لیکن آخر میں حکام کا آلۂ کار بن گیا صرف سموئل جانسن کو یہ بات نصیب ہوئی کہ غیر سرکاری امداد کے ملک کا ذہنی رہنما بن جائے لیکن وہ بھی سیاست میں حکومت کے آگے سر تسلیم خم کرتا تھا۔ جب کبھی سختی سے حکومت کی مخالفت کیجاتی تھی جس طرح جونیس کے خطوط میں (۱۷۶۹ء تا ۱۷۷۲ء) کی گئی تو لوگوں کو اس قدر حیرت ہوتی تھی جس کا ہم آج کل اندازہ بھی نہیں کر سکتے اور مخالفت کرنے والے اپنا نام پوشیدہ رکھنے پر مجبور رہتے تھے جب ۱۷۶۲ء اور ۱۷۶۴ء کے درمیاں ایک ٹیلے مضمون نگار جان ولکس نے حکومت کے مخالف پارٹی قائم کرنے کی کوشش کی تو لوگوں نے اُسے اذیت پہنچانے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔

سیدھے سادے ذرائع سے جو باہر سے دیکھنے والے کو نظر بھی نہ آتے تھے طبقہ امرا نے یہی دانشمندانہ اور جابرانہ حکومت قائم کر رکھی تھی جس کی دنیا میں کہیں نظیر نہیں ملتی، انتہائی تشدد کے ساتھ ملک کی سیاست ایسے سانچے میں ڈھالی جاتی تھی کہ اس سے زمینداروں کی اغراض کو مدد پہنچے غلہ کی قیمت کو اونچا رکھنا معاشیاتی سیاست کا سب سے کارگر حربہ تھا رفاہ عام کے لئے جو محصول لگائے جاتے تھے، مثلاً امداد غربا کا ٹیکس جو صنعتی دور کے آغاز کے بعد سے برابر بڑھ رہا تھا، اس سے حکمراں زمیندار صاحبان حتی الامکان بچ نکلتے تھے شکار کے جابرانہ قوانین محض شکار کھیلنے والے امرا کی اغراض کو مدنظر رکھ کر بنائے گئے تھے ڈسینٹر (غیر مقلد) لوگ جن کے صفوں میں زیادہ تر نیچے طبقے والے تھے نہایت سختی کے ساتھ دبائے جاتے تھے کہیں ۱۸۲۸ء میں جاکر انھیں میونسپلٹیوں وغیرہ میں منتخب ہونے کا حق دیا گیا ۱۸۳۱ء میں اُن بندشوں میں سے جو اسٹوارٹ بادشاہوں کے زمانے سے ان کی عبادت پر عائد تھیں آخری بندش ہٹائی گئی ۱۸۳۲ء

میں وہ محصول جو سرکاری کی طرف سے اُن پر عائد کیا جاتا تھا معاف کیا گیا۔ نکاح کی رسم ۱۸۳۶ء تک، اور تدفین کی ۱۸۶۸ء تک سرکاری کلیسا کے مخصوص اختیارات میں شامل رہی۔ غرض انیسویں صدی کے وسط تک ڈسینٹر لوگوں کی، جن میں ملک کی نصف بلکہ نصف سے زیادہ آبادی شامل تھی، یہ حیثیت رہی کہ طوعاً و کرہاً اُن کا وجود برداشت کیا جاتا تھا۔ مگر انگلستان کی یہ ملک پر کتنی ہی بار کیوں نہ ہو اس کا ظاہری رنگ نرم ہے اور باوجود اس کے کہ وہ اپنا قبضہ بلاشرکت غیرے قائم رکھنے کے لئے سخت سے سخت قوانین بناتی ہے اس کے عملدرآمد میں وہ بڑی حد تک انسانیت سے کام لیتی ہے، اُس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ از راہ دانشمندی نیچے طبقے کے چیدہ لوگوں کو اپنے طبقے میں شامل کرتی رہی ہے۔ یہ وسعت نظر ان لوگوں کا خاصہ ہے جو محض حکومت کے بھوکے نہیں بلکہ حکومت کے اہل ہیں اور جو اپنی قوت کے حدود کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ یہ جیز انگریزوں کی سرشت میں معلوم ہوتی ہے۔ انگلستان کے چھوٹے امرا نے جنہیں (GENTRY) کہتے ہیں قرون وسطیٰ میں اس بات کی کبھی کوشش نہیں کی کہ وہ خواہ مخواہ گھس پیٹھ کر کے بڑے امرا میں شامل ہوں اور جب دارالعوام اور دارالامرا الگ الگ ہوگئے تو یہ لوگ دارالعوام میں شہروں کے ساتھ مل گئے۔ یہاں صدیوں تک شہر والوں کو غلبہ حاصل رہا لیکن آہستہ آہستہ امرا نے اس مجلس کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔ یہاں بخلاف براعظم کے یہ رسم ہے کہ ہر امیر کا خطاب اور جائداد کا قبضہ بلاشرکت غیرے اُس کے بڑے بیٹے کو ملتا ہے۔ اس کے سبب سے یہاں مفلس، بیجا غرور کرنے والے، بیکار امرا پیدا نہیں ہونے پائے اور امرا در شہر کے شرفا آسانی سے مل جل گئے۔ امرا کے بعض خاندان مثلاً لا پول چودھویں صدی میں مرفہ الحال تاجر تھے مگر بڑھتے بڑھتے امرا میں شامل ہو گئے۔ مشہور شاعر چاسر جو اپنے نسب اور انداز طبیعت کے لحاظ سے متوسط طبقے کا تھا چودھویں صدی کے آخر میں، رفیق خاص، سفیر، ملک الشعرا کے عہدوں پر فائز تھا جو امرا کے لئے مخصوص تھے۔

اٹھارھویں صدی میں بھی نئے امرا نے جو برسر حکومت تھے دانشمندی اور سلیقے کے

ساتھ اپنے طبقے کو وسیع کیا جس کے سبب سے ایک صدی تک لوگوں کو عدیدیت کا وجود محسوس رہا۔ دیگروں کے لڑکے جو صلاحیت رکھتے تھے ہائی اسکول کی تعلیم سے نہیں روکے جاتے تھے بلکہ اکثر یونیورسٹی کی تعلیم پاکر ملک کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے تھے۔ بس اتنی شرط تھی کہ وہ انگلیکن مذہب قبول کرلیں اور چونکہ اصولاً سوائے سرکاری کلیسا کے کسی اور مذہب کا وجود ہی تسلیم نہیں کیا جاتا تھا اس لئے اس تبدیل مذہب کے لئے نہ کسی خاص رسم کی ضرورت تھی اور نہ پرانے عقائد سے باضابطہ توبہ کرنے کی۔ نوجوان طالب علم کو یونیورسٹی میں داخل ہوتے وقت بس اتنا کہنا پڑتا تھا کہ وہ انگلستان کے کلیسا کے ۳۹ عقائد کو مانتا ہے اس کے بعد حکومت کے انتہائی مراتب پر پہنچنے کے لئے اسے کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی کسی قسم کے محتسبانہ سوالوں کا جواب نہیں دینا پڑتا تھا۔ کلیسا کی ظاہری رسوم وعبادات کی کوئی پابندی نہ تھی۔ اور جو دولتمند تاجر، یا صنعتی کارخانوں کا مالک حکمراں طبقے کی نظروں میں عزت حاصل کرنا چاہتا اُسے بس سرکاری کلیسا کا رکن ہوجانا کافی تھا جس میں کسی باضابطہ داخلے کی ضرورت نہ تھی اور جس کے اصول اپنی وسعت کی وجہ سے تمام فرقوں کے عقائد پر حاوی تھے۔ اگر وہ کافی دولتمند ہوتا اس کا بہت امکان تھا کہ اُس کی لڑکی کی شادی کسی امیر سے ہوجائے یا وہ خود آخر عمر میں طبقۂ امرا میں شامل کرلیا جائے اور اس طرح اُس کی ذات اور اس کی دولت حکمراں طبقے کے لئے مزید تقویت کا ذریعہ بن جائے۔ خصوصاً جو بے اندازہ دولت اٹھارہویں صدی میں ہندوستان سے انگلستان پہنچی وہ سب کی سب رفتہ رفتہ امرا نے اس کے مالکوں کے یہاں شادی کرکے یا انھیں مرتبۂ امارت عطا کرکے اپنے طبقے میں کھینچ لی۔ یہ جذب کرنے کا عمل اب تک جاری ہے اور پچھلے قرنوں میں اس کی رفتار اس قدر تیز ہوگئی ہے کہ قدیم امرا کا وجود معرض خطر میں آگیا ہے۔ انگلستان میں جو شخص کسی اقتصادی کاروبار میں غیر معمولی کامیابی حاصل کرے اسے یہ توقع رہتی ہے کہ وہ اپنی کاروباری زندگی کو ختم کرنے کے بعد نائٹ یا بیرونٹ کا خطاب پاکر GANTRY "(امرا کے طبقۂ ادنیٰ) میں شامل ہوجائے گا یا لارڈ کا خطاب پاکر ARISTOCRACY (امرا کے طبقۂ اعلیٰ) میں جگہ پائے گا اور دارالامرا کا رکن ہوجائے گا۔ (ترجمہ)

فنستان(۱) میں مسلمانوں کی ایک جماعت

۲۴ اپریل ۱۹۲۵ء کو فنستانی حکومت کی مجلس علی نے فنستان میں بسنے والے مسلمانوں کے متعلق ایک فیصلہ کیا جس کی بدولت اسلام کو سرکاری ضابطے کے طور پر ان مذہبوں میں شمار کیا جانے لگا۔ جو ملک میں رائج ہیں فنستان کے یہ مسلمان علاقے ایدل اور ال کے ترک تاتار ہیں روس میں جب ولستو یک انقلاب ہوا تو یہ ہجرت کرکے شمال کی طرف چلے گئے اور فنستان میں آباد ہو گئے۔ ان میں سے بعض فنستان سے بخوبی واقف تھے، کیونکہ وہ انقلاب کے پہلے بھی تجارتی مال اور خصوصاً کپڑا وہاں لے جا کر بیچتے تھے۔ ان کی تعداد اس وقت ۴۰۰ ہے، یعنی سو سے کچھ اوپر خاندان وہ سترہ مختلف شہروں میں بسے ہیں، مگر زیادہ تر ہلسنگ فورز، اور تورکو میں آباد ہیں۔ قریب قریب سب سمور اور کپڑے کی تجارت کرتے ہیں۔ ان میں سے بہتیرے خوش حال ہیں اور سب کے سب صلح پسند اور کارگزار ہونے کی شہرت رکھتے ہیں

روس کے بجائے اب ان کا بیشتر حصہ فنستان کی رعایا بن گیا ہے۔ فنستان میں مذہبی آزادی کے قانون کی سختی کے ساتھ پابندی کی جاتی ہے۔ اس لئے یہ مسلمان بلا کم و کاست فنستانی شہریوں کے تمام حقوق کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں مثلاً سرکاری ملازمتوں کا دروازہ ان پر بند نہیں ہے مگر دوسری طرف شہریت کے نقطہ نظر سے بعض قاعدے ہیں جن پر عمل کرنا مسلمانوں کے لئے لازمی نہیں رکھا گیا ہے۔ ان کے یہاں نکاح امام پڑھاتا ہے، جو ولادتیں ہوتی ہیں وہ بھی اسی کے یہاں رجسٹر میں درج ہوتی ہیں اور وہ ہر سال کے آخر میں اعداد و شمار کے طور پر سرکار میں پیش کر دیا جاتا ہے۔

---

(۱) فنستان، یورپ کا سب سے شمالی ملک، روس کے شمال و مغرب، اسوئیڈن کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ یہ مضمون (REVUE DES ETUDES ISLAMIQUES) سے ماخوذ ہے۔

ان مسلمانوں کی آزادی خاص طور پر ان کی معاشرت میں ظاہر ہوتی ہے۔ وہ آپس ہی میں شادی بیاہ کرتے ہیں اور ان کے یہاں مہر کا رواج ہے۔ مسلمانوں اور عیسائیوں میں ازدواجی تعلقات قائم ہونے کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ ایسی حالت میں عیسائی عام طور سے مسلمان ہوجاتے ہیں۔ اگر وہ نہیں ہوتے تو کچھ فساد پیدا ہوجاتا ہے، کیونکہ بچوں کا مذہب طے نہیں ہوتا۔ لیکن بہرحال پیدائش کے دن ان کے نام امام ہی کے رجسٹر میں درج ہوتے ہیں۔

فنستانی مسلمان اس کی خاص فکر رکھتے ہیں کہ ان کے بچوں کو دین اور قومیت کی تعلیم دی جائے۔ اس ارادے سے انھوں نے ایسے اسکول کھولے ہیں جہاں بچے ہفتے میں دو تین دفعہ جاتے ہیں جہاں دینیات، تاریخ اسلام اور ترکوں کی تاریخ پڑھائی جاتی ہے، قرآن شریف کی تلاوت کرنا سکھایا جاتا ہے اور چند سورتیں حفظ کرا دی جاتی ہیں کہ وہ نماز پڑھ سکیں۔ ذریعۂ تعلیم ترکی زبان ہے۔ حروف تہجی اور تجوید کے علاوہ عربی زبان اور زیادہ نہیں سکھائی جاتی۔ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ترکی لاطینی حروف ہی کی زیادہ قدر کی جاتی ہے۔

اسکولوں کی تعداد بہت نہیں ہے۔ دو، جن میں سے ایک ہلسنگ فورز اور ایک تمپیر میں ہے، سال میں مہینے کھلے رہتے ہیں۔ باقی ایسے مقامات پر ہیں جہاں مسلمان بس مٹھی بھر ہیں، وہ صرف سال میں تین مہینے کام کرتے ہیں اور ان کے معلم ایک سے دوسرے میں جاتے رہتے ہیں۔ اسکولوں کے علاوہ کانفرنسیں بھی ہوا کرتی ہیں جن کا موضوع بحث بدلتا رہتا ہے۔ کبھی تو مذہب ہوتا ہے، کبھی قومیت (یعنی ترکی قوم) کا مسئلہ، کبھی ترک مسلم تاریخ۔ کانفرنس کے کرانے والے یا تو اسکولوں کے معلم ہوتے ہیں یا آتے جاتے باہر کے مسلمان، خاص طور پر ترک۔ پچھلے سال ابراہیم عارف اللہ، فنستانی مسلمانوں کے اتحاد کے ناظم نے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی جس کا مقصد قومیت کی تبلیغ کرنا تھا۔

فنستانی مسلمانوں کا کسی خاص دینی مرکز سے تعلق نہیں۔ پہلے ان کا روس کی ریاست کازان سے کچھ واسطہ رہتا تھا، مگر انقلاب کے بعد وہ علیحدہ ہوگئے۔ قومی نقطۂ نظر سے اب انھوں نے جنوبی روس کو چھوڑ کر انگورا سے لگاؤ پیدا کیا ہے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ انھوں نے ترک لاطینی

حروف اختیار کرلئے ہیں۔ اس سے اور آگے بڑھ کر کوشش کرتے رہتے ہیں کہ ترکوں کی قومی تحریک سے واقف رہیں اور دارالحکومت انگورا کے جو رسالے اور کتابیں شائع ہوتی ہیں انہیں پڑھتے رہتے ہیں ہر سال وہ ترکی کی آزادی کی اہتمام سے رسی (۲۹ راکتوبر) مناتے ہیں اور اسی طرح ترکوں کا قومی دن (۲۳ راپریل) بھی ان کے لئے ایک تہوار ہوتا ہے۔ ہر مسلمان کے گھر میں مصطفےٰ کمال کی تصویر ہوتی ہے

فنستان میں کوئی جامع مسجد نہیں لیکن تین چھوٹی مسجدیں ہیں، ایک ہلسنگ فورز، ایک تیسرا اور ایک ٹرکو میں جہاں کوئی مسجد نہیں ہے وہاں مومن مرد اور عورتیں سب کسی کے مکان پر جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے اکٹھا ہوجاتے ہیں۔ سوائے عید قرباں اور رمضان کے عورتیں مسجد وں میں نہیں جاتی ہیں۔ امام صرف ایک ہے جس کی ضروریات ملت پوری کرتی ہے اس کا مکان ہلسنگ فورز میں ہے۔ مگر وہ دوسرے شہروں کا ایک خاص معمول کے مطابق چکر لگاتا رہتا ہے جب امام موجود نہیں ہوتا تو مسلمانوں کی جماعت میں سے کوئی مناسب شخص امامت کرتا ہے بارہ وفات کے دن مومن سب جمع ہوکر قرآن شریف کی تلاوت کرتے ہیں، اور امام سب موقع کسی موضوع پر تقریر کرتا ہے۔ دولت مند لوگ اس دن دعوتیں بھی کرتے ہیں۔

سخت سردی کے باوجود فنستانی مسلمان عام طور سے شراب نہیں پیتے، مذہبی تہواروں اور قومی تقریبوں کے سلسلے میں جو ضیافتیں ہوتی ہیں ان میں بھی کوئی نشہ کی چیز پیش نہیں کی جاتی کہا جاتا ہے کہ بیس برس کے عرصے میں کوئی مسلمان بدمستی کے الزام میں نہیں پکڑا گیا ہے۔ روزے سے معاملے میں فنستانی مسلمان زیادہ سخت نہیں ہیں جون اور جولائی کے مہینوں میں جب دن بہت ہی زیادہ لمبا ہوتا ہے، روزہ رکھنا فرض نہیں سمجھا جاتا جو چاہے وہ اس کے بدلے کسی دوسرے مہینے میں اپنا دینی فرض ادا کرسکتا ہے۔ حج کے لئے اب تک صرف ایک فنستانی مسلمان گیا ہے۔ وہاں لوگ کہتے ہیں کہ حج کے لئے زمانہ ٹھیک نہیں ہے، اور ترکستانی مسلمانوں کا قول ہے کہ ہمارے حاجیوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جاتا ہے کہ گویا وہ جانوروں سے بہتر نہیں۔

مسلمان عورتوں کو وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو فنستانی عورتوں کے ہوتے ہیں۔ان کی آزادی ایک حد تک ہو مصنف سے کسی نے بیان کیا کہ وہ فنستانی مردوں کے ساتھ ناچتی نہیں ہیں مگر ... نے عکلین لہجے میں کہا کہ یہ بھی چند دنوں کے لئے ہے، فنستانی قانون کے مطابق عورت کی ... کی عمر سے پہلے شادی نہیں کی جاسکتی مسلمانوں کا قاعدہ بھی یہی ہے۔منگنیاں بالکل یورپی طرز پر ہوتی ہیں پھر بھی یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ مسلمان عورتیں بھی اتنی ہی ترقی کر چکی ہیں جتنی کہ فنستانی

... میں اس قانون کا ایک اقتباس دیا جاتا ہے جس کی رو سے فنستانی مسلمانوں کو ایک مذہبی جماعت کے حقوق دیئے گئے ہیں اور جس کے ذریعے سے مسلمانوں نے اپنے اجتماعی نظام کو ایک قانونی حیثیت دیدی ہے)

مسلمانوں نے ایک مذہبی جماعت قائم کی ہے جس کا نام "فنستان کے مسلمانوں کی جماعت" ہے۔ انھوں نے متفقہ طور پر اپنے مذہب کے بنیادی اصولوں کا ایک خاکہ تیار اور منظور کر لیا ہے اور اپنی جماعت کا ایک دستور بھی بنایا ہے۔ یہ حسب ذیل ہیں:-

(الف مذہب کے بنیادی اصول)

۱- دین اسلام پر اعتقاد رکھنا۔

- حکم شرع کے مطابق دن میں پانچ مرتبہ نماز ادا کرنا اور جمعہ کو مسجد میں نماز باجماعت پڑھنا

۳- سال میں ایک مہینے کے روزے رکھنا۔

۴- خوشحال لوگوں کا محتاجوں کی مدد کرنا۔

۵- خوشحال لوگوں کا حج کو جانا

- تمام احکامات دینی کا احترام کرنا اور ان کی پابندی لازمی سمجھنا۔

- ضمیر کو پاک صاف رکھنا اور تندرست ہونا۔

۸- ایمانداری

۹۔ ہر انسان کا لحاظ کرنا اور کسی کو نقصان نہ پہنچانا۔

۱۰۔ دوسرے کے لئے وہی چاہنا جو انسان اپنے لئے چاہتا ہو، اور دوسرے کے لئے کوئی ایسی بات نہ چاہنا جو انسان اپنے لئے نہ چاہتا ہو۔

(ب) فنستان کے مسلمانوں کی جماعت کا دستور

۱۔ فنستان کے لوگ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوں اور ان تمام قواعد کی پیروی کرتے ہوں جو اوپر بیان کئے جا چکے ہیں ایک جماعت سمجھے جائیں گے۔

۲۔ اس جماعت میں کارکن اراکین ہوں گے اور ایسے بھی جو سن بلوغ کو نہیں پہنچے ہیں

۳۔ کارکن رکن ہونے کے لئے دیندار ہونا لازمی ہے ہر رکن پر لازم ہے کہ جماعت کو اپنے مقاصد حاصل کرنے میں مدد دے۔ اراکین کا انتخاب جماعت کی مجلس منتظمہ کی تجویز پر ہوگا

۴۔ نوجوان اٹھارہ برس کے سن کو پہنچ کر بالغ سمجھے جائیں گے اور اسی کے بعد وہ کارکن اراکین بن سکتے ہیں۔ انتخاب سے پہلے امام دینیات میں ان کا امتحان لے گا۔

۵۔ صرف کارکن اراکین کو جو جماعت کے کاروبار میں حصہ لینے کا حق ہوگا۔

۶۔ جماعت کو اس کا اختیار ہوگا کہ کسی رکن کو جس کا عمل قابل اعتراض ہو خارج کر دے۔ اس کارروائی کو انجام دینے کے لئے کارکن اراکین میں سے جتنے موجود ہوں ان کی دو تہائی کی اکثریت درکار ہوگی، اور اخراج کے فیصلے کی تحریری اطلاع اس شخص کو دی جائے گی جو رکن اس طرح سے خارج کیا گیا ہو وہ تحریری اطلاع ملنے کے تیس دن کے اندر مجلس منتظمہ کے سامنے اپیل کر سکتا ہے مجلس کا فیصلہ آخری اور قطعی ہوگا

۷۔ مجلس منتظمہ اور دوسری انتظامی مجلسوں میں صرف معتبر کارکن اراکین منتخب ہو سکتے ہیں واعظ اور معلم کے فرائض وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جنھیں مجلس منتظمہ نامزد کرے۔

۸۔ جماعت جمعہ کی نماز ادا کرے گی۔ دینی اور قومی تقریبوں کے دن مجلس منتظمہ مقرر کرے گی

۹۔ عام کاروبار مجلس عامہ کی رائے کے مطابق انجام پائے گا۔ مجلس منتظمہ کے جلسے حسب

... ت یا پانچ اراکین کی درخواست پر منعقد ہوں گے۔

۱۱۔ مجلس عامہ کا اجلاس سال میں ایک مرتبہ فروری کے مہینے میں ہوگا ہر رکن کو رائے دینے کا حق ہوگا اور فیصلہ کثرت رائے سے ہوگا۔ اگر موافق اور مخالف تعداد میں برابر ہوں تو صدر کی رائے کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ مذہبی معاملات میں فیصلہ دو تہائی کی کثرت رائے سے ہو سکے گا اگر کسی مذہبی معاملے کو ایجنڈا میں شامل کرنا مقصود ہو تو مجلس عامہ کے اجلاس کی تاریخ سے ایک مہینہ پہلے تحریر مجلس منتظمہ میں پیش کر دینا چاہیئے۔

۱۲۔ جماعت کو توڑنے کا فیصلہ ⅔ کی کثرت رائے سے کیا جاسکتا ہے اگر جماعت ٹوٹ جائے تو اس کا تمام روپیہ کار خیر میں صرف کر دیا جائے گا۔

۱۳ مجلس منتظمہ امام اور چار اراکین پر مشتمل ہوگی جن کا انتخاب مجلس عامہ کے دوران اجلاس میں ہوگا ہر مجلس تین سال کام کرے گی اور اپنے اراکین میں سے ایک صدر اور ایک ناظم سال کے لیئے منتخب کرے گی۔

۱۴ مجلس منتظمہ کے اختیار میں تمام اجتماعی معاملات ہوں گے اور وہ اپنے فرائض انجام دینے میں مفاد عامہ کا ہر طرح سے لحاظ رکھے گی جماعت کا روپیہ بھی اسی کی تحویل میں رہے گا مجلس عامہ جو فیصلے کرے اس کی تعمیل کرانا بھی اسی کے ذمہ ہوگا۔

۱۵۔ مجلس منتظمہ کا صدر یا اس کی عدم موجودگی میں امام جماعت کا وکیل ہوگا۔ جماعت کی طرف سے کاغذات وغیرہ پر دستخط کرنے کا اختیار صرف مجلس منتظمہ کے صدر یا امام کو ہوگا۔

۱۶۔ اگر مجلس کے کسی رکن کے خلاف عدالت فوجداری کی طرف سے کوئی کارروائی کی جائے تو وہ فوراً مجلس کی تحریک پر رکنیت سے خارج کر دیا جائے گا خارج شدہ رکن مجلس عامہ میں اپیل کر سکتا ہے جس کا انعقاد بغیر کسی بیجا توقف کے ہوگا۔ مجلس عامہ کثرت رائے سے مجلس منتظمہ کے فیصلے کو رد کر سکتی ہے۔

اگر مجلس منتظمہ کا کوئی رکن اپنے فرائض سے غافل ہو جائے یا اس کا چال چلن بگڑ جائے تو

مجلس تین چوتھائی کی کثرت رائے سے اس کو برطرف کر سکتی ہے۔

۱۷۔ جماعت کے غیر معمولی اخراجات چندے کے ذریعے سے پورے کئے جائیں گے اگر ضرورت ہو تو ہر فرد کی حیثیت کے مطابق اس سے مزید چندہ لیا جا سکتا ہے۔

۱۸۔ ہر پندرہ سال کے بعد ایک کمیٹی مقرر کی جائے گی جو اس مدت کے تمام حسابات کو جانچے گی

۱۹۔ بچوں کی تعلیم کا انتظام جماعت کے سپرد ہوگا اور والدین کے لئے لازمی ہوگا کہ جماعت کے تجویز کئے ہوئے قواعد کی پابندی کریں۔ تعلیم کے اخراجات انہیں حسب استعداد ادا کرنا چاہئیں۔

۲۰۔ جماعت کی سرکاری زبان افغانی زبان ہوگی، لیکن جلسوں میں قومی زبان یعنی ترکی زبان بولی جائے گی

۲۱۔ اگر جماعت کے کسی دو ارکین میں قانونی تنازع ہو تو ہر فریق اپنا ایک وکیل مقرر کرے گا۔ یہ وکیل مقدمے کا فیصلہ کرنے کے لیے پنچ بن جائیں گے اور ایک تیسرے آدمی کو سرپنچ منتخب کریں گے دونوں فریق کو چاہئے کہ پنچوں کا فیصلہ تسلیم کریں۔ اگر ایسے افراد جن کے درمیان نزاع ہو تین دن کے اندر وکیل مقرر نہ کریں، یا یہ وکیل سرپنچ کے انتخاب پر متفق نہ ہو سکیں تو مجلس منتظمہ خود وکیل اور سرپنچ نامزد کر دے گی۔

اُردو زبان کی تعلیم کے مقاصد

ہر کام کا ایک مقصد ہوتا ہے اور کام شروع کرنے سے پہلے مقصد کی تعیین ضروری ہوتی ہے تاکہ تمام تر توجہ کو اس کی تحصیل پر مرکوز کیا جا سکے۔ کام کرنے والے کے ذہن میں مقصد کا تصور جس قدر صاف اور مبہم ہوتا ہے کامیابی اسی قدر زیادہ یقینی ہوتی ہے چنانچہ ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم تعلیم اردو کے مقاصد پر پہلے ہی میں غور کر لیں اور اپنے نصب العین کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں جو نتائج اور اثرات ہم اپنی کوششوں سے پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ بالکل سلجھے ہوئے انداز میں ہمارے پیش نظر ہو جائیں۔

اردو کی تعلیم و تدریس کا سب سے پہلا اور سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ طلبہ اپنی مادری زبان سے محبت کرنے لگیں۔ ان کے دلوں میں یہ احساس جاگزیں ہو جائے کہ اردو زبان ان کی اپنی چیز ہے، ان کے آباؤ اجداد کی یادگار ہے، ان کی قوم و ملک کے بہترین دماغوں کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ ہے، ایک ایسا قیمتی سرمایہ ہے جس پر وہ بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ معلم کا فرض ہے کہ وہ تعلیم و تدریس کے دوران میں اس قسم کے جذبات طلبہ کے قلوب میں پیدا کرنے کی کوشش کرے، اور کبھی اس خدمت سے غافل نہ ہو۔ وہ ان کو بتائے کہ اردو زبان کی تاریخ ابتدا سے لے کر موجودہ زمانے تک کتنی شاندار، کتنی دلچسپ اور کتنی سبق آموز ہے۔ یہ زبان کیونکر ہندوؤں اور مسلمانوں کے تصادم سے وجود میں آئی کیونکہ مختلف اقوام کے میل جول کا لازمی اور خوشگوار نتیجہ ہے اور کس طرح وجود میں آنے کے بعد اس نے دن دونی اور رات چوگنی ترقی کی ہے، یہاں تک کہ آج اس کی وسعت اور ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ نقشۂ عالم کے دور دراز ملکوں میں اس کے بولنے اور لکھنے والے موجود ہیں اور کیوں نہ ہو یہی تو وہ زبان ہے جس میں ہندی کا لوچ، فارسی کی شیرینی اور عربی کی فصاحت سبھی کچھ آ کر جمع ہو گیا ہے جس کی تعمیر میں دنیا کی بہت سی زبانوں نے حصہ لیا ہے اور جس کے رواج میں متعدد قوموں نے ایک دوسرے

کا ہاتھ بٹایا ہے۔ پھر یہی نہیں، اُردو زبان ایک عظیم القدر لٹریچر کی مایہ دار ہے اور وہ لٹریچر ایسا ہے کہ دنیا کے کسی قوم و ملک کے لٹریچر سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ ادبیات کا یہ بے بہا خزانہ ہماری تہذیب، ہمارے تمدن، ہمارے ذہنی ارتقا اور ہماری قومی زندگی کا آئینہ دار ہے علم اور آرٹ کی یہ وسیع اور عالیشان عمارت اُن گرامی قدر شعرا اور مصنفین کے ہمت و استقلال کی جیتی جاگتی یادگار ہے جنھوں نے اُردو کی خاطر کسی ایثار اور کسی قربانی سے دریغ نہیں کیا جنھوں نے شدید ترین مصائب کے باوجود اُردو کی سرپرستی سے ہاتھ نہیں اٹھایا۔

اس سلسلے میں سب سے آخری اور سب سے زیادہ ضروری بات طلبہ کے ذہن نشین کرنے کی یہ ہے کہ اُردو زبان کی ملکیت کا بار اٹھانا کوئی آسان کام نہیں ہے، اس کے ساتھ بہت سی ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں اُردو کا مستقبل تمھارے ہاتھ میں ہے اور تم سے وابستہ ہے تمھارا فرض ہے کہ تم اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرو تاکہ جب وقت آئے تو یہ امانت تمھارے سپرد کر دی جائے تم کو اس امانت کی حفاظت کرنی ہوگی۔ اور پھر اس کو آئندہ نسلوں کے سپرد کر دینا ہوگا تم کو ہر لحظہ اس امر کا خیال رکھنا ہوگا کہ اس کی پاکیزگی میں فرق نہ آنے پائے اور اس لئے ضروری ہے کہ تم ابھی سے اس پر اپنی بہترین توجہ صرف کرو۔

جب تک اس قسم کے جذبات اور اس نوع کی عصبیت ہم اپنے نونہالوں میں پیدا نہیں کریں گے ہماری تدریس کامیاب کہلانے کی مستحق نہیں ہوسکتی

اسکول کے مختلف طلبہ سوسائٹی کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں، کوئی غریب گھرانے سے آتا ہے کوئی امیر خاندان سے، کسی کے والدین تعلیم یافتہ ہوتے ہیں کسی کے جاہل، کسی کے ہاں تجارت ذریعۂ معاش ہوتی ہے اور کسی کے ہاں صنعت و حرفت غرض یہ کہ ہر بچہ ایک مختلف اور جداگانہ ماحول میں پرورش پاتا ہے۔ سب کی تربیت جداگانہ ہوتی ہے اگر ایک بچے کے ماں باپ صاحب ثروت ہونے کے علاوہ تعلیم یافتہ بھی ہیں تو یقیناً وہ اُس بچے سے زیادہ خوش قسمت ہے

جن کے والدین پڑھے لکھے بھی ہیں اور غیر مرفہ الحال بھی اس لیے نہیں کہ وہ زیادہ آرام سے رہتا ہے، اچھا کھانا کھاتا ہے، اچھے کپڑے پہنتا ہے بلکہ اس لیے کہ اس کا ماحول اپنے غریب بھائی کے ماحول سے زیادہ وسیع، زیادہ دلچسپ، زیادہ سبق آموز ہے اس کا گرد و پیش اس کے ذہنی ارتقا میں زیادہ مدد ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کی دنیائے خیال زیادہ فراخ ہے، اس کا ذخیرۂ الفاظ زیادہ وسیع ہے، اس کی قوتِ گویائی زیادہ ترقی یافتہ ہے خیالات کے اظہار کے لئے وہ زیادہ اسالیب بیان سے واقف ہے انتہا یہ ہے کہ اس کی آواز اور لہجے میں ایک خاص امتیازی شان پیدا ہو جاتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو سوسائٹی میں تفرقِ باہمی اور جماعتی عصبیت کو زندہ رکھتی ہے۔ کیونکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو حقیقتاً صاحب ثروت والدین کے بچے غریبوں کے بچوں سے مختلف زبان بولتے ہیں اور وہ لوگ جو مختلف زبانیں بولتے ہیں کبھی ایک دوسرے کے ساتھ سچی ہمدردی نہیں کر سکتے اُن میں رشتۂ محبت قائم نہیں ہو سکتا زبان کا اختلاف غیریت کی ایک دیوار ان کے درمیان حائل کر دیتا ہے۔

اسکول کا فرض یہ ہے کہ ان امتیازات اور اختلافات کو مٹائے سوسائٹی کے ہر فرد کو ذہنی و جسمانی نشو و نما کے یکساں مواقع دے "گھر" کی کمیوں کی تلافی کرے۔ اور اسکول میں خاص طور پر اردو کی تدریس کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ طلبہ میں زبان کے اختلافات باقی نہ رہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ غریبوں کے بچے (جن میں دیہاتی طلبہ بھی شامل ہیں) "ماں کی زبان" کی بجائے دوسری زبان بولنے لگیں۔ سب طلبہ کی زبان ایک ہو جائے یعنی صاف، سادہ، پاکیزہ اور آزاد اُردو۔

اُردو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے اور ملک کے ہر گوشے میں بولی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر جگہ مقامی رنگ کی جھلک اس میں پیدا ہو گئی ہے اگر آپ لاہور سے روانہ ہوں اور دہلی، بریلی، لکھنؤ، بنارس، پٹنہ ہوتے ہوئے کلکتہ جائیں تو ان اختلافات کا کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں پنجاب، بہار اور دوسرے صوبوں سے قطع نظر کر کے وہاں بعض اوقات اُردو، اُردو نہیں معلوم ہوتی

خود یوپی میں زبان کے یہ اختلافات کچھ کم نمایاں نہیں ہیں۔ درآنحالیکہ یہ وہ خطّہ زمین ہے جو اُردو کا اصل وطن ہے۔ غالباً یہ کہنا کچھ غلط نہ ہوگا کہ یوپی کے دو ہمسایہ ضلعوں کی زبان میں بھی فرق پایا جاتا ہے یعنی ہر ضلع کی زبان مقامی خصوصیات کی حامل ہوتی ہے۔ لیکن ان تمام اختلافات سے قطع نظر مستند اردو وہ ہے جو دہلی اور لکھنؤ کی زبان ہے اور جس کو ہندوستان کے تمام گذشتہ اور موجودہ اہلِ قلم نے اختیار کیا ہے۔ اور یہی وہ اردو ہے جو ہمارے اسکولوں میں مادری زبان کے طور پر پڑھائی جانی چاہئے۔ اور جس کو صحت اور سلاست کے ساتھ طلبہ میں رواج دینا ہماری تدریس کا ایک اہم مقصد ہونا چاہئے۔

صحتِ زبان کے سلسلے میں مجھے کچھ کہنا ہے وہ یہ کہ دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں جو اختلافات ہیں وہ تاریخی ہیں اور اپنی اپنی جگہ پر صحیح و جائز ہیں۔ مثال کے طور پر "سانس" دہلی میں مذکر ہے اور لکھنؤ میں مؤنث "لفظ" دہلی میں مذکر ہے لیکن لکھنؤ میں مؤنث بھی ہے دہلی میں "آپ کے ہاں" اور لکھنؤ میں "آپ کے وہاں" مستعمل ہے۔ دہلی میں "ہم جیسے" کہتے ہیں تو لکھنؤ میں "ہم ایسے" بولتے ہیں "تیتری" کو لکھنؤ والے "تتلی" بولتے ہیں اور "کونسا" کی بجائے صرف "کون" استعمال کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ دونوں صورتیں جائز اور فصیح ہیں۔ اور ماہر والوں کو ان دونوں میں سے کسی ایک کی مطابقت لازمی ہے۔ اس اعتبار سے یوپی دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حصہ وہ جو اہلِ دہلی کا پیرو ہے اور دوسرا وہ جو لکھنؤ والوں کی تتبع کرتا ہے۔ مثلاً مراد آباد والے دہلی کی زبان بولتے اور لکھتے ہیں اور بریلی والوں کی زبان کا انداز لکھنوی ہے لیکن بعض مقامات پر اردو تعلیم یافتہ طبقے میں بھی غلط بولی جاتی ہے یعنی الفاظ کا استعمال دہلی اور لکھنؤ کے خلاف کیا جاتا ہے۔ مثلاً "آواز" کو روہیلکھنڈ میں بعض پڑھے لکھے لوگ بھی مذکر بولتے ہیں یعنی "میری آواز" کی بجائے "میرا آواز" کہتے ہیں "پھنسی" کو "پھوڑیا" "چھپنا" کو "چپنا" اور "گرہ" کو "گانٹھ" کہتے ہیں۔ یا پھر اردو میں بعض مذکر الفاظ مثلاً "آرام" اور "چین" کو مونث بولتے ہیں جو بالکل غلط ہے۔ اہلِ پنجاب کی زبان میں اس نوع کی غلطیاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ اُن کے ہاں صرف تعلیم یافتہ اشخاص ہی نہیں بلکہ اکثر ادیب بھی "اُس سے کہو" کی بجائے "اُس کو کہو" "میں کار خریدنے والا ہوں" کی بجائے "میں کار خریدنے لگا ہوں" "میں نے مدت

سے اُس کو خط نہیں لکھا" کی بجائے" میں نے بڑی دیر سے اُس کو خط نہیں لکھا"، "بچ چکے ہو جاؤ" کی بجائے "بیٹھ جاؤ" اور "ٹال جاؤ" کی بجائے "ٹلا جاؤ" بولتے اور لکھتے ہیں۔ اسی طرح پٹنہ اور حیدرآباد کی مقامی غلطیاں ہیں۔ پھر کچھ ایسی بھی ہیں جو بغیر کسی مقامی تخصیص کے ہر جگہ پائی جاتی ہیں۔ اردو کے مدرسین کا فرض ہے کہ اپنے طلبہ کو ان غلطیوں کے ارتکاب سے آزاد کریں۔ یہ اصلاحِ زبان اسکول کی چار دیواری سے شروع ہوگی اور طلبہ کے ذریعے عوام تک پہنچے گی۔ اور اس کا سہرہ اردو کے اساتذہ کے سر ہوگا۔

لیکن میری اس تمام تحریر سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں صرف دہلی اور لکھنؤ ہی کو اردو کا مرکز سمجھتا ہوں ہرگز نہیں۔ میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ جب تک مقامی امتیازات نہ مٹائے جائیں گے اردو کو حقیقی فروغ حاصل نہ ہوگا۔ اور اب تو یوں بھی اردو دہلی اور لکھنؤ کی پابندیوں سے آزادی حاصل کر چکی ہے۔ میری تحریر کا مدعا صرف اس قدر ہے کہ اردو کے مدرسین جب تدریس کا ایک مقصد یہ بھی سمجھتے ہیں کہ طلبہ زبان کو صحت اور سلاست کے ساتھ بولیں اور لکھیں تو اُن کے سامنے زبان کا ایک معیار بھی ہونا چاہئے۔ یہ معیار جیسا کہ میں اوپر لکھ چکا ہوں ہندوستان کے مستند ادبا کی زبان ہے اور ہندوستان کے مستند ادبا وہ زبان بولتے اور لکھتے ہیں جو دہلی اور لکھنؤ میں رائج ہے۔

اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے اساتذہ کو قسم قسم کی مشکلات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ مثلاً جہاں اکثر طلبہ ایسے ہوتے ہیں جن کی اردو بہت کمزور ہوتی ہے اور جو اظہارِ خیال کی کوئی قدرت نہیں رکھتے وہاں بعض طلبہ ایسے بھی ملتے ہیں جو عالمانہ اور فاضلانہ زبان کے استعمال پر مصر ہوتے ہیں۔ اُن کے نزدیک بہترین زبان وہ ہے جو فارسی الفاظ اور عربی تراکیب سے لبریز ہو جس میں جملے طویل اور الجھے ہوئے ہوں جن میں "فصاحت" اور "بلاغت" پائی جائے۔ وہ گفتگو بھی کریں گے تو بعض اوقات معلوم ہوگا کہ کوئی پلیٹ فارم پر تقریر کر رہا ہے۔ استاد کا فرض یہ ہے کہ وہ قدم قدم پر طلبہ کو بتاتا رہے اور مثالیں پیش کر کے بھی سمجھاتا رہے کہ تحریر ہو یا تقریر، زبان کا بہترین زیور سلاست ہے، ثقیل الفاظ اور

نامانوس ترکیبیں عامیانہ زبان سے بھی زیادہ قابلِ اعتراض ہیں۔ اور تقریر کا مقصد یہ ہے کہ تحریر کو شستہ اور شگفتہ بنائے۔ یہ کہ تحریر، تقریر کو بھدا اور کرخت کر دے۔

اپنی مادری زبان کو سلاست، روانی اور صفائی کے ساتھ بولنا اور لکھنا ایک ایسا ہنر ہے جس کی اہمیت ناقابلِ انکار ہے زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے بہت سی باتوں کی ضرورت ہے اور اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان کو اپنی زبان پر پوری دسترس حاصل ہو تحریر ہو یا تقریر وہ اپنے خیالات کو وضاحت اور برجستگی کے ساتھ موثر پیرائے میں ادا کر سکے۔ اکثر لوگ بات کرتے وقت مناسب اور صحیح الفاظ نہیں پاتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ادھورے، نامکمل اور پھسپھسے فقرے بولتے ہیں اُن کی گفتگو میں ڈھیلا ڈھالا پن پایا جاتا ہے چستی نہیں ہوتی دماغ میں خیالات کی لرزش ہوتی ہے، ہونٹ کانپتے ہیں لیکن اُن کو ادا نہیں کر سکتے الفاظ کی یہ کمی جذبات اور شخصیت کی سچی ترجمانی میں خلل ہوتی ہے۔ ایسے لوگ اپنے سامعین کو متاثر کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوتے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اگر اُن میں یہ لسانی ضعف نہ پایا جاتا تو منازلِ ترقی قطع کرنے میں اُن کو کتنی آسانی ہوئی ہوتی اور آج دنیا میں اُن کا کیا مرتبہ ہوتا زبان کا جادو مشہور ہے اور کسے جرأت ہے جو اس سحرِ حلال سے انکار کرے پھر اگر یہ سچ ہے کہ جادو بیانی اور جادو نگاری خداداد صلاحیتیں ہیں تو اس میں بھی کلام نہیں کہ ہر شخص، کم از کم جہاں تک مادری زبان کا تعلق ہے اپنی تحریر و تقریر میں صحت، برجستگی اور قوت پیدا کر سکتا ہے۔ اُردو کی تعلیم کے سلسلے میں یہ مقصد ہر وقت پیشِ نظر رہنا چاہئے۔

علوم و فنون کے میدان میں ذہنِ انسانی نے جس قدر تگ و تاز کی ہے وہ سب کتابوں میں محفوظ ہے۔ اگر ہم اپنے آبا و اجداد کی علمی و ذہنی جدوجہد سے واقف، اور اُس جدوجہد کے نتائج سے مستفید ہونا چاہتے ہیں۔ اگر ہم صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ کہلانا چاہتے ہیں —— تو ان کتابوں کا تھوڑا بہت مطالعہ ہمارا فرض ہے پھر مطالعہ اس کو نہیں کہتے کہ کسی کتاب کو شروع سے آخر

تک ایک دفعہ پڑھ لیا جائے بلکہ مطالعہ نام ہے کسی علمی تحریر کو اس طرح پڑھنے کا کہ اس کی تمام معنویت ہمارے ذہن و دماغ کا ایک مستقل جزو بن جائے۔ چنانچہ اگر ایک طرف اس کی ضرورت ہے کہ طلبہ میں مطالعے کا ذوق و شوق پیدا کیا جائے تو دوسری طرف یہ بھی کچھ کم اہم نہیں کہ ان کو صحیح خطوط پر مطالعہ کرنے کے طریقے بتائے جائیں۔ یہ صحیح ہے کہ کامیاب مطالعہ کے اصولوں سے طلبہ کو آگاہ کرنا صرف اردو کے معلم کا فرض نہیں بلکہ دوسرے مضامین کے اساتذہ کو بھی اس طرف توجہ کرنا لازمی ہے، لیکن زبان کی تدریس میں یہ کام جس قدر اہم ہے اسی قدر اچھے نتائج کے ساتھ انجام دیا جا سکتا ہے۔

لہٰذا اردو کی تعلیم کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی تدریس کے ذریعے طلبہ میں مطالعہ کی عادت پیدا کریں تاکہ وہ جب تک اسکول میں ہیں اپنی درسی کتابوں کے علاوہ بھی کچھ کتابیں پڑھیں اور جب اسکول سے باہر جائیں تو کتب بینی کو روزانہ مشاغل میں شامل کر کے اپنے علم اور تجربے کو وسیع کرتے رہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم ان کو مطالعے کے صحیح طریقوں سے واقف کرنے کی ہر ممکن کوشش عمل میں لائیں تاکہ ان کا مطالعہ کامیاب ہو اور جو کچھ پڑھیں اس سے صحیح معنوں میں مستفید ہوں۔

ادب حیاتِ انسانی کی تفسیر ہے اور مطالعۂ ادب کا مقصد یہ ہے کہ حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں اور مظاہر کے ساتھ ایک قلبی و روحانی تعلق قائم کیا جائے۔ مطالعہ ادب کا اثر ہماری زندگی پر نہایت خوشگوار ہوتا ہے۔ ہمارے خیالات میں بلندی اور پاکیزگی، جذبات میں متانت اور سنجیدگی اور اخلاق میں تہذیب پیدا ہوتی ہے۔ جب ہم کسی ادیب یا شاعر کا کلام پڑھتے ہیں تو ہم کو ایک ذہنی مسرت اور ایک قلبی راحت حاصل ہوتی ہے۔ اور کم از کم تھوڑی دیر کے لیے ہم اس مادی دنیا اور اس کے علائق سے آزاد ہو جاتے ہیں، ہم ایک روحانی شگفتگی محسوس کرتے ہیں۔ عملی حیثیت سے اس مطالعہ کا اثر ہماری روزانہ زندگی پر نہایت مفید ہوتا ہے اور یہ اثر اپنا

ہے کہ کسی اور ذریعے سے پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ جو شخص مطالعۂ ادب سے محروم ہے وہ زندگی کی ایک پاکیزہ ترین مسرت سے ناآشنا ہے اور صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ کہلائے جانے کا مستحق نہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جو ادبیات کے مطالعے سے دلچسپی رکھتے ہیں، جو اس مطالعے کو اپنی زندگی کا ایک محبوب مشغلہ سمجھتے ہیں۔ میرے خیال میں ایسے لوگ بہت کم، بہت ہی کم ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص نے اسکول میں کم سے کم پانچ چھ برس اُردو زبان پڑھی ہے اور ہم اپنے اکثر بہترین شعرا اور اُدبا کے ناموں سے واقف ہیں حتیٰ کہ اُن کے کلام و تصانیف کا بھی مطالعہ کیا ہے لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہی محدود ہے جنھوں نے اسکول سے نکلنے کے بعد ان شعرا واُدبا کا زیادہ وسیع مطالعہ کرنے اور ادبیات کے ساتھ اپنا تعلق قائم رکھنے کی کوشش کی ہے اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو ادب کا مطالعہ تو درکنار، ادبی کتابوں کے وجود سے بھی بے خبر ہیں وہ اپنی زندگی میں کبھی کوئی ادبی کتاب نہیں خریدتے کبھی کوئی حقیر سے حقیر رقم ایک ادبی رسالے کی سرپرستی میں خرچ کرنے کے روادار نہیں ہوتے شاید یہ بھی نہیں جانتے کہ اُردو زبان کا موجودہ دور اخبارات و رسائل کا دور ہے، صحافت کا دور ہے اور یہ ادبی صحیفے زبان کی وسعت اور ترقی کے آئینہ دار ہیں، ان کا مطالعہ لازمی ہے۔ کتب فروش فریاد کرتے ہیں کہ کوئی اُن کی کتابیں نہیں خریدتا، رسالوں کے ایڈیٹر چیختے چیختے تنگ آ گئے، اُن کے گلے بیٹھ گئے لیکن اس طرح ہندوستان میں جہاں کروڑوں اُردو بولنے اور لکھنے والے موجود ہیں کسی کا مقصد خدمت زبان کی بجائے روپیہ سمیٹنا ہوتا ہے لیکن کچھ رسالے ایسے ضرور ہیں جن کا مطالعہ ہر تعلیم یافتہ اور باذوق انسان کے لئے مفید اور دلچسپ ہو سکتا ہے۔ اُردو زبان و ادب کی سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ ملک میں خوش ذوق لوگوں کا مکمل فقدان ہے۔

اُردو کے استاد کے لئے زریں موقعہ ہے کہ ملک کو بدمذاقی کی لعنت سے رہا کرے اور دنیا کو اپنا ممنونِ کرم بنائے انسانی ذہن میں دلچسپیاں پیدا کرنے کا بہترین وقت بچپن کا زمانہ ہوتا ہے۔ ادبی ذوق بھی اسی زمانے میں پیدا کیا جا سکتا ہے [اُردو کی تدریس اس انداز سے

ہونی چاہئے کہ طلبہ نظم و نثر کے بہترین کارناموں سے حظ اندوز ہونے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کریں اُن کے مذاق کی تربیت ہو، اُن کا وجدان بیدار ہو اور وہ اپنی زبان سے محبت کرنے کے علاوہ اُس کے لٹریچر میں زیادہ دلچسپی لینے لگیں۔ اُن میں مطالعے کا شوق پیدا ہو اور پھر یہ مطالعہ اُن کی زندگی کا ایک مشغلہ اور ایک نہایت محبوب شغل بن جائے۔

تو گویا ہماری تدریس کا ایک نہایت اہم مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے طلبہ کو نظم و نثر کے مطالعے سے لطف اٹھانے کی تعلیم دیں، زبان و ادب کا ایسا ذوق و شوق پیدا کریں کہ مطالعۂ ادب اُن کی اس مصروف حیات و مشاغل کا ایک اہم جزو بن جائے، کہ ملک سے بدمذاقی کو دور کرنے اور ادبیات کو فروغ دینے کا یہی ایک ذریعہ ہے۔

علم النفس کے نقطۂ نظر سے ہر بچہ اپنے اندر نہ صرف تحسین کا مادہ رکھتا ہے بلکہ تخلیقی قوت کا بھی مادہ رکھتا ہے۔ ایک حسین چیز جب ایک بچے کے سامنے لائی جاتی ہے تو وہ اُس کو دیکھ کر خوشی محسوس کرتا ہے یہی احساس وہ بنیاد ہے جس پر موزوں تربیت کے ذریعے جمالیاتی ذوق کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر بچہ جذبات اور محسوسات کی دنیا میں رہتا ہے۔ وہ اس قدر سوچتا نہیں جس قدر کہ محسوس کرتا ہے۔ اور پھر ان جذبات و محسوسات کے اظہار کا بھی خواہاں ہوتا ہے۔ یہی اُس کی تخلیقی قوت ہے۔

اُردو کی تدریس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ طلبہ کی وجدانی قوتیں بیدار کرکے ان کو تخلیق پر آمادہ کیا جائے۔ مضمون نگاری، انشاپردازی، شعرگوئی اور دیگر اصناف ادب میں طلبہ کی ہمت افزائی کرنی چاہئے۔ بچوں میں نقل کی صلاحیت پائی جاتی ہے اور جو کچھ وہ سیکھتے ہیں اسی نقالی صلاحیت کے ذریعے سیکھتے ہیں چنانچہ اُن کو آرٹ اور لٹریچر کے بہترین تخلیقی کارناموں کی نقل پر آمادہ کرنا چاہئے۔ وہ اس کام کو بڑی مستعدی اور دلچسپی سے کریں گے اور اس میں ایک حقیقی مسرت محسوس کریں گے۔

۳ طلبہ کو تخلیق ادب پر آمادہ کرنے کا مقصد یہ نہیں ہو کہ غیر فانی شعرا اور ادبا پیدا کئے جائیں۔ اسکول اس خدمت کے لئے نہیں ہے بلکہ اس کا مدعا صرف اتنا ہے کہ جن طلبہ میں ادبی صلاحیتیں ہیں اور جن کے متعلق توقع کیجاتی ہے کہ قوم و ملک کے آئندہ ممتاز اہل قلم ہوں گے اُن کی ہمت افزائی ہو، اور تخلیقی قوتیں فنا نہ ہو جائیں۔

---

۴ اُردو کی تدریس کا ایک اور مقصد یہ ہے کہ طلبہ اُن تمام مسائل میں جو اُردو زبان کی موجودہ اور گزشتہ حالت سے متعلق ہیں ایک گہری دلچسپی لینے لگیں وہ ذوق و شوق کے ساتھ زبان کی تاریخ کا مطالعہ کریں۔ اور پھر زبان کی موجودہ شکل کے حسن و قبح پر غور کریں اسکول چھوڑنے سے پہلے اُن میں کم از کم آزادانہ اور بے لاگ تنقید کا مادہ پیدا ہو جائے وہ اس لائق ہو جائیں کہ مختلف ادبی مسائل پر اظہار خیال کر سکیں اردو سے متعلق سیکڑوں مسائل ایسے ہیں جو متنازعہ فیہ ہیں جن کے متعلق بہت اختلاف رائے ہے ہماری تدریس کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ طلبہ ان تمام مسائل اور اُن کی اہمیت سے آگاہ ہو جائیں اور اُن کے متعلق اپنی رائے قائم کر سکیں۔

---

۵ ہمارے مقاصد کی فہرست نامکمل رہے گی اگر ہم ایک مقصد کو نظر انداز کر دیں اُردو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے، لیکن بدقسمتی سے اکثر لوگ اسے ایسا نہیں سمجھتے۔ اسکولوں میں اساتذہ کا فرض ہے کہ وہ یہ امر اپنے طلبہ کے ذہن نشین کرا دیں تاکہ مسلمان طلبہ یہ خیال کرنا چھوڑ دیں کہ اُردو زبان ہماری اور صرف ہماری ہے اور ہندو طلبہ یہ نہ سمجھیں کہ ہم کو اُردو زبان سے کوئی واسطہ نہیں، وہ تو ایک اسلامی چیز ہے۔ اس کی بجائے ہر طالب علم خواہ وہ کسی مذہب و ملت کا فرد ہو اُردو کو ہندوستان کی مشترکہ زبان سمجھے اور کم سے کم ادبیات کے دائرے میں تو مذہبی تعصب نہ رہے۔ اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کی متفقہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ہندوؤں نے اس کی تعمیر میں بہت کافی حصہ لیا ہے۔ زبان کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے جس

طلبہ کو تاریخی مواد سے واقفیت ہو جائے گی تو ان کو اس حقیقت میں کوئی تنگ نظری کی گنجائش نہ ہوگی اور ہماری تدریس کا ایک ایسا مقصد حاصل ہو جائے گا جس کا اثر اُردو زبان کی ترقی پر نہایت خوشگوار ہوگا۔

تو گویا اسکولوں میں زبان اُردو کی تعلیم کے مقاصد حسب ذیل ہیں

(۱) طلبہ کے قلوب میں اُردو زبان کی محبت پیدا کرنا۔

(۲) طلبہ کی تحریری اور تقریری زبان میں سلاست صحت اور صفائی پیدا کرنا۔

(۳) طلبہ میں مطالعے کی عادت ڈالنا اور ان کو مطالعے کے طریقوں سے واقف کرنا۔

(۴) طلبہ میں ادبیات سے شغف پیدا کرنا۔

(۵) طلبہ کو تخلیق ادب پر آمادہ کرنا

(۶) طلبہ کو اُردو کے تاریخی و لسانی مسائل سے آگاہ کرنا۔

(۷) طلبہ میں یہ احساس پیدا کرنا کہ اردو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے

اساتذہ کو چاہیے کہ اپنی تدریس کے دوران میں ان مقاصد کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں اگر ان کے سامنے اس قسم کا کوئی نصب العین نہیں ہے اور محض کتاب کا پڑھا دینا ہی وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں تو ان کی تدریس ایک بے معنی اور فضول چیز ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان مقاصد کے حاصل کرنے کے لیے بہت ہمت و استقلال کی ضرورت ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کام کے لئے اساتذہ کو کم از کم پانچ چھ برس کا زمانہ ملتا ہے اور یہ مدت بہت کافی ہوتی ہے اگر وہ محنت اور توجہ سے کام کریں اور اپنے کام میں دلچسپی لیں تو یقیناً کامیاب ہو سکتے ہیں

آئندہ ابواب میں جو کچھ لکھا جائے گا وہ حقیقت میں ان مقاصد کے حصول کے ذرائع ہوں گے کوشش کی جائے گی کہ ان تمام تدابیر کو تفصیلی ذکر کیا جائے جو اس سلسلے میں اختیار کی جا سکتی ہیں لیکن یہ امر بہرحال واضح رہنا چاہیے کہ مختلف طلبہ کی مختلف ضروریات ہوتی ہیں

اور اسی باعث تعلیم کے مختلف طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں تمام ہندوستان کے طلبہ کے لئے ایک ہی طریقہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ اساتذہ تدریس کے صحیح اصولوں کو سنگِ بنیاد بناکر اپنے طریقوں کو مقامی اور وقتی ضروریات کے مطابق تعمیر کریں۔

میرا ہیرو

اپنے ہمعصروں کی طرح میں بھی اپنے وقت کا اکثر حصہ کھیل
میری عمر چودہ برس کی تھی
کود میں صرف کرتا تھا۔ زندگی اور زندہ دلی مجھ میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ میرا دن بھر کا کام کیا
تھا، خوب شرارتیں کرنا چھوٹوں کو تنگ کرنا۔ بڑوں کا منہ چڑانا اور استادوں کو دق کرنا۔ لیکن ساتھ
ہی میرے کچھ خیالات بھی تھے خاص خیالات۔

صرف ونحو اور ڈرائنگ کو
سائنس اور ریاضی جیسے خشک مضامین سے مجھے نفرت تھی
میں حقارت کی نظروں سے دیکھتا تھا میں کہا کرتا تھا کہ آخر ان مضامین سے انسانوں کو کیا فائدہ پہنچ سکتا
ہے بس مجھے تاریخ سے دلچسپی تھی اور خاص کر اپنے ملک کی تاریخ سے میں بہادر اور شیر دل ترکوں
پٹھان شاہسواروں اور عرب تیغ زنوں کو عزت و احترام کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ یہ لوگ بہادر تھے
اور شجاع میں ان لوگوں کی پرستش کرتا تھا۔ یہی میری توجہ جذب کر سکتے تھے۔

اکثر اوقات میری یہ خواہش ہوتی تھی کہ بجائے ہلکی پھلکی چپاتیوں اور نفیس سالن کے میرے لئے
موٹی موٹی روٹی اور خراب سا سالن ہوا کرتا۔ بعض دفعہ میں اپنے کپڑوں کو حقارت کی نظروں سے
دیکھتا تھا کیونکہ یہ فوجی لباس سے بالکل مختلف ہوتے تھے مجھے سوداگروں ڈاکٹروں، انجینیروں
اور پروفیسروں وغیرہ سے سخت نفرت تھی۔ میری ایک آرزو تھی صرف ایک اور وہ یہ کہ میں بھی
ہیرو بن جاؤں۔

ہیرو کا مطلب کیا ہے یہ میں خود بھی اچھی طرح نہیں جانتا تھا۔ لیکن اتنا میں ضرور سمجھتا تھا کہ
ہیرو وہ ہوتا ہے جو مایوس کن حالات میں فتح حاصل کرلے جو اپنے ملکی علم کو بچانے کے لئے خود
اپنے جسم کو بارود سے اڑا دے جو تلواروں کے زخم اور بندوق کی گولیاں کھا کر اپنی جان دیدے
مگر یہ سب زخم اس کے سینہ پر ہوں پشت پر نہ ہوں مختصر یہ کہ ہیرو کا مطلب کچھ پیچیدہ سا تھا۔

میری خواہش یہ تھی کہ میں خود ہیرو بنوں لیکن چونکہ میں ابھی چھوٹا تھا اس لئے یہ ممتاز درجہ حاصل نہیں کر سکتا تھا اس لئے میں چاہتا تھا کہ کم از کم کسی ہیرو کو دیکھ لوں اور اُسے اچھی طرح سے جان لوں۔ میں نے اس کی تلاش شروع کر دی اور آخر کار اُسے پا لیا میرا ہیرو ایک اجنبی تھا جو کسی زمانے میں فوج میں سپاہی رہ چکا تھا اور اس کے چہرہ پر ایک زخم بھی تھا۔

اس ایک بیرونی اور ظاہری نشان سے میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ ضرور بہادر اور شجاع ہے۔ نہ جانے اس کے جسم پر اور کتنے زخم ہوں گے

بہر حال اس بات کا بھی یقین ہو گیا کہ ہیرو ہوتے ضرور ہیں میرے ہیرو میں ایک کمی یہ تھی کہ اس کے دونوں بازو صحیح و سالم تھے اور اس کی کوئی ٹانگ لکڑی کی نہیں تھی میں چاہتا تھا کہ ان میں سے کوئی بات ہوتی۔ لیکن میں نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ ضرور اس کا سارا جسم زخموں کی وجہ سے چھلنی ہو گا

میں اپنے ہیرو سے یہ پوچھنے کا کوئی موقعہ تلاش کر رہا تھا کہ وہ کیسے اور کہاں زخمی ہوا تھا کہ ہماری باورچن نے ایک عجیب سی بات کہہ دی جسے سنکر میں حیران رہ گیا۔

ایک دن ہماری باورچن نے اس سے پوچھا "کیوں میاں غفور خاں تمہارے چہرے پر جو زخم ہے وہ کس لڑائی میں لگا تھا۔

اس نے جواب دیا "لڑائی میں؟ اب لڑائیاں کہاں؟ جب میں فوج کی ملازمت سے الگ ہونے والا تھا تو ایک دن اپنے ساتھی سے لڑ پڑا وہ نشہ میں تھا اس نے میرے چہرے پر بندوق کا دستہ مارا جس کی وجہ سے میں زخمی ہو گیا۔

جب میں نے یہ بات سنی تو میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے میں نے سمجھ لیا کہ دنیا میں زندہ ہیرو کوئی نہیں ہے

اب اس کے سوا اور چارہ کیا تھا میں خود ہیرو بنوں اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ میں زمانہ قدیم کے کسی ہیرو کے نقش قدم پر چلوں اس کو اپنا ہیرو اپنا استاد بنا لوں اگرچہ ایسے ہیرو

بچپن سے تھے مگر میں ایک خاص ہیرو چاہتا تھا میں نے سوچا ایسا ہیرو کہاں سے تلاش کروں۔
ہمارے قبیلے کا سردار خان بھی ہیرو تھا۔ اس نے اپنی لاٹھی سے کئی ڈاکوؤں کے سر
توڑ دیئے تھے اور انھیں مار بھگایا تھا لیکن میں نے یہ کہیں نہیں پڑھا تھا اور سنا تھا کہ اس کے
جسم پر زخم بھی تھے۔ میرے نزدیک زخموں کا ہونا ضروری تھا
ارلسنڈ بھی ہیرو تھا لیکن اس کے متعلق میں بہت کم جانتا تھا اور اس کے علاوہ وہ ہندوستانی
بھی نہیں تھا۔
سلطان صلاح الدین، انور پاشا، محمود غزنوی، نپولین۔ لیکن زخموں کے متعلق کیا معلوم
علاوہ ازیں ہر ایک کو معلوم ہے کہ یہ ہیرو ہیں ہر شخص انھیں جانتا ہے۔ میں اپنے لئے ایک
خاص ہیرو چاہتا تھا جس کی پرستش تنہا میں کرسکوں۔

میری جستجو ناکام نہیں رہی اور میں نے اپنا ہیرو عجیب و غریب طریقے سے پایا۔
ہمارے قصبے سے ذرا باہر ایک قدیم مقبرہ ہے اس کے پاس کسی ضرورت کے لئے کھدائی
کا کام شروع ہوا۔ کھودتے میں پرانی پرانی ہڈیاں اور بعض اوقات سروں کے ڈھانچے نکلتے تھے
ہمارے مدرسے کے بہت سے لڑکے وہاں جاتے اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ بھی زمین کھودنا شروع
کر دیتے تھے اس خیال سے کہ شاید زمانۂ قدیم کا کوئی سکہ یا اسی قسم کی کوئی چیز انھیں مل جائے ہمیں
اس کام سے اس قدر دلچسپی پیدا ہوگئی تھی کہ چھٹی ہوتے ہی ہم وہاں پہنچ جاتے اور کافی دیر تک
ٹھہرے رہتے تھے مگر جب کئی دن تک کوئی چیز نہیں ملی تو لڑکوں نے وہاں جانا ترک کر دیا۔
لیکن میں برابر ڈٹا رہا میرا ایمان تھا کہ مجھے ضرور کوئی نہ کوئی چیز مل جائے گی۔ میری قسمت میرے
ساتھ تھی۔

ایک جگہ میں نے مٹی کا رنگ کچھ بدلا ہوا دیکھا ہر جگہ مٹی کا رنگ سیاہ تھا لیکن یہاں اس
پاس میں کچھ زردی نظر آتی تھی۔ میں نے زمین کھودنا شروع کی اور تھوڑی دیر کے بعد ایک چیز
پاکر میں خوشی سے اچھل پڑا۔ یہ چیز کیا تھی ایک کارتوس تھا۔ میں نے تھوڑی سی مٹی اور ہٹائی

مجھے چھ کارتوس اور ملے ایک تانبے کی لوح بھی جس پر گرد وغبار جما ہوا تھا۔

کارتوس؟ ــــــ مجھے میرا ہیرو مل گیا تھا۔

بڑے احترام سے میں نے ادھر اُدھر جو ہڈیاں پڑی تھیں انہیں اٹھایا اور سب چیزوں کو اپنے بستہ میں ڈال لیا۔

آخر میں نے اپنے ہیرو کو پا ہی لیا۔ اصلی ہیرو۔

جب میں گھر پہنچا تو اس خزانے کو اپنے چھوٹے سے ڈبہ میں بند کرکے قفل لگا دیا اور کنجی اپنی جیب میں ڈال لی۔

کھانے کے وقت میں نے فاتحانہ انداز میں ادھر اُدھر نظر ڈالی۔ اپنے بھائیوں اور بہنوں کو حقیر سمجھنے لگا۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ میرے پاس ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ انھیں کیا خبر تھی کہ میرے پاس ایک ہیرو کی نشانیاں ہیں، بالکل اصلی نشانیاں خوشی کے مارے میں کھانا بہت کم کھا رہا تھا یہ دیکھ اماں جان نے مجھ سے پوچھا "جمیل کیا بات ہے تم کھانا بہت کم کھا رہے ہو"

میں نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کچھ جواب دیا اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ میں خوب کھا رہا ہوں ایک سالم آلو منہ میں رکھ لیا۔

جونہی کھانا ختم ہوا میں کمرے میں پہنچا۔ ڈبہ میں ہڈیاں، کارتوس، لوح سب چیزیں موجود تھیں میں نے انھیں اپنی آنکھوں سے لگایا۔

اس شام کو میری طبیعت بالکل بدل گئی۔ میں اپنی چھوٹی بہن سے خوب کھیلا اور اُسے بالکل تنگ نہیں کیا۔ اماں جان اور ابا جان نے جو کام کرنے کو کہا اُسے اچھی طرح سے کیا۔

رات کو میں پھر کمرے میں پہنچا اور ان چیزوں کو نکال کر دیکھنا شروع کیا۔ ہڈیوں کا رنگ بھورا تھا۔ کارتوس نیلے تھے اور تانبے کی لوح پر خوب گرد وغبار تھا۔ معلوم ہوتا تھا اس پر کوئی نام لکھا ہے۔ میری خواہش تھی کہ میں اپنے ہیرو کا نام معلوم کروں جس نے یکے بعد دیگرے چھ گولیاں کھائی تھیں مگر یہ پڑھا نہیں جاتا تھا۔ آخر کار ان سب چیزوں کو ڈبہ میں رکھ کر مقفل کر دیا مجھے رات بھر

غرض اسی طرح کے خیالات میرے دل میں آتے رہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے اس راز کو کسی پر ظاہر نہیں کروں گا۔ کسی راز کو سینہ میں پوشیدہ رکھنا بڑی مسرت کی بات ہے اور پھر ایسا راز۔
میں دن بھر سوچتا رہتا تھا کہ میرا ہیرو کون ہے؟ کس جنگ میں وہ شامل ہوا اور کس جگہ پر لڑتے لڑتے اس نے جان دیدی۔ یہ بات بالکل صاف تھی کہ اس نے سات گولیاں تو ضرور کھائی ہیں لیکن کیا فقط سات گولیوں نے اس کا خاتمہ کر دیا؟ یقیناً وہ اور زخموں سے شہید ہوا ہوگا۔ تلوار کے زخموں سے، نیزوں سے، بھالوں سے، --- اس کے بعد میں نے اس کی ایک خیالی سوانح حیات تیار کر لی اور اس سے میں مطمئن بھی ہو گیا۔

اس کی زندگی کے مختصر حالات یہ تھے کہ میرا ہیرو ٹیپو سلطان کی فوج کا ایک سپاہی تھا۔ اپنی بہادری اور شجاعت سے وہ ایک اعلیٰ عہدے پر پہنچ گیا تھا۔ تمام لڑائیوں میں وہ اتنی دلیری سے لڑا کہ اس کی شہرت دور دور پھیل گئی۔ ایک مرتبہ محض اس کی فوجی قابلیت سے دشمنوں کو شکست ہوئی۔ میسور کی آخری جنگ میں وہ اتنی بہادری اتنی جرأت سے لڑا کہ دشمنوں کے دانت کھٹے کر دیے۔ وہ مخالف فوج میں گھس گیا اور کئی دشمنوں کو مار ڈالا۔ اس کی شمشیر کی دھوم تمام دشمنوں میں پھیل گئی۔ لڑتے لڑتے جب تک لڑتا وہ زخموں سے چور ہو گیا تھا لیکن اس پر بھی دشمنوں کے بیچ سے صاف نکل آیا۔ جب اسے جینے کی کچھ امید نہ رہی تو اس نے درخواست کی کہ اسے اس کے گھر بھیج دیا جائے۔ اس کی یہ درخواست منظور کر لی گئی لیکن اپنے گھر پہنچ کر وہ اللہ میاں کو پیارا ہو گیا۔ اس کا جنازہ بڑی دھوم اور شان و شوکت سے اٹھایا گیا۔ ہزارہا لوگوں نے شرکت کی۔ اور اسے ایک جگہ دوسروں سے بالکل الگ دفن کر دیا گیا۔

لیکن میں نے اپنے دل میں سوال کیا کہ آخر اس کی قبر پر کوئی مقبرہ تعمیر کیوں نہیں کیا گیا۔ ہمارے قصبے میں کئی چھوٹے چھوٹے مقبرے تھے۔ کیا ان کے نیچے سونے والے میرے ہیرو سے زیادہ شجاع اور بہادر تھے۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ میرے ہیرو نے مرتے وقت وصیت کر دی تھی کہ اس کی قبر پر کوئی مقبرہ تعمیر نہ کیا جائے۔ تغیر زمانے سے بیچارے کی قبر کا نشان بھی

مت گیا، دنیا نے اُسے فراموش کر دیا تھا۔

اس بات نے مجھے بیحد رنجیدہ کیا مجھے کسی کا یہ قول یاد آگیا کہ "احسان فراموشی ہی اس دنیا کا انعام ہے" میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس کے نام اور یاد کو تازہ کر دوں گا میں کتابوں میں اس کے حالات کو دیکھوں گا قلمی نسخوں میں اس کے نام کو معلوم کروں گا۔ اور آخر کار دنیا کو بتا دوں گا کہ میرا ہیرو کس قدر زبردست شخصیت کا مالک تھا لوگ اس انکشاف سے دنگ رہ جائیں گے۔

تصور ہی میں میں نے اس کے کردار کے متعلق طرح طرح کی رائیں قائم کر لیں۔ بہادری اور شجاعت میں لاثانی بیکس خواتین کا حامی بوڑھوں اور یتیموں کا غم خوار۔ پناہ گزینوں کا مددگار اور سرکشوں کے لئے قہر کی تلوار۔ مجھے اپنے ہیرو پر بہت فخر و ناز تھا مجھے یقین ہو گیا کہ اور سب ہیرو بہت گھٹیا درجہ کے مالک تھے

اب میں لڑکا نہیں تھا، آدمی بھی نہیں بلکہ ایک بڑا آدمی تھا۔ میرے سامنے ایک عظیم الشان کام تھا اپنے ہیرو کا نام روشن کرنا میں نے تمام کھیل چھوڑ دیے کنکوے بازی سے مجھے نفرت ہو گئی۔ گولیاں کھیلنا میں نے ترک کر دیا آوارہ گردی ختم ہو گئی۔ دوسرے لڑکوں کو میں حقارت سے دیکھنے لگا۔

یہ حالت چند دنوں تک قائم رہی۔ آخر میں نے محسوس کیا کہ اس راز کو صرف اپنے تک محدود رکھ کر کچھ زیادہ مسرت نہیں ہوتی۔ خوش قسمتی سے میرے دو نہایت پیارے اور گہرے دوست تھے۔ توقیر اور علیم۔

میں نے سوچا، اس راز میں ان کو بھی شامل کر لوں۔ سب سے پہلے میں نے ان سے قسم لی کہ وہ اس راز کو کسی اور پر ظاہر نہیں کریں گے۔ پھر میں نے اپنے ہیرو کی زندگی کے حالات انھیں سنائے۔ وہ بہت غور اور دلچسپی سے سنتے رہے جب میں ختم کر چکا تو علیم نے مجھ سے پوچھا "جمیل لیکن ہیرو کا نام کیا ہے"

میں خاموش ہو گیا کیونکہ میں نے اس مسئلہ پر کبھی غور نہیں کیا تھا۔ اس خیال سے کہ وہ میرا

تو آخر میں میں نے ان سے کہہ دیا "سکندر پاشا"
انھوں نے فوراً یقین کر لیا۔
اس کے بعد تو سکندر پاشا کے ذکر کے سوا اور کچھ ہوتا ہی نہیں تھا۔ ہم جب آہستہ آہستہ اس سے متعلق باتیں کرتے تو لڑکوں کو تعجب ہوتا کہ یہ تینوں کیا کر رہے ہیں۔ تاریخ کے گھنٹے میں جب ہمارا استاد مختلف سپہ سالاروں اور بہادروں کا ذکر کرتا تو ہم مسکراتے اور ایک دوسرے کے کان میں کہتے "بچارے کو سکندر پاشا کا پتہ نہیں اس کا مقابلہ کون کر سکتا ہے اگر وہ چند سال اور زندہ رہتا تو ہندوستان کی تاریخ کا نقشہ بدل جاتا"، ہم بہت احتیاط کرتے کہ ہمارا راز کوئی دوسرا نہ معلوم کر لے۔

اگرچہ میں "ہمارا راز" کہتا ہوں مگر دراصل یہ "میرا" راز تھا کیونکہ میں نے توقیر اور حلیم سے یوں بھی تو سونے اور تانبے کی لوح کا تذکرہ نہیں کیا تھا وہ صرف نصف راز جانتے تھے۔

گھر پر میری حالت بالکل بدل گئی تھی۔ میں اکثر اپنے کمرے میں گھنٹوں بند رہتا۔ میرا بہت وقت غور و فکر میں گزر جاتا۔ لیکن اس بات کا خدشہ بھی ہمیشہ رہتا تھا کہ میرا راز کوئی معلوم نہ کر لے۔

ایک دن میں ابا جان کے ساتھ سیر کرنے گیا۔ راستے میں مختلف قسم کی باتیں ہوتی رہیں، یکایک ابا جان نے مجھ سے پوچھا "کیا وہ کھدائی ختم ہو گئی ہے میں وہاں کئی دن سے نہیں گیا۔ تم تو اکثر جاتے رہتے ہو کیا تمھیں کام کی کوئی چیز بھی ملی یا نہیں؟"

کیا ابا جان کو مجھ پر کچھ شبہ تھا۔ میں نے جواب دیا "میں تو وہاں گزشتہ ہفتہ سے نہیں گیا۔"

یہ بات بالکل ٹھیک تھی۔ کیونکہ گزشتہ ہفتہ میں مجھے میرا ہیرو مل گیا تھا۔

ابا جان نے مسکرا کر کہا "میں سمجھتا تھا تم نے کوئی خزانہ پا لیا ہے کیونکہ تمھاری حالت کچھ بدل گئی ہے کیا سارا خزانہ اپنے لئے ہی وقف کر لوگے؟"

"نہیں" میں نے جواب دیا "مجھے تو کوئی خزانہ نہیں ملا۔"

والد صاحب قبلہ نے موضوع بدل دیا اور مجھ سے پوچھا کہ میں نے اپنے بڑے بھائی کی

شادی کے موقعہ پر کسی تحفہ کا انتخاب بھی کیا ہے یا نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے کبھی اس کا خیال تک بھی نہیں آیا تھا۔ میری تمام توجہ میرے ہیرو نے جذب کر رکھی تھی فوراً ہی میرے دل میں ایک خیال آیا بہت ہی اچھا خیال شادی کے موقعہ پر بھائی جان کے لئے ہیرو سے بڑھ کر اور کیا تحفہ ہو سکتا ہے۔

میں نے جواب دیا "ابا جان میں نے ایک نہایت ہی عمدہ تحفہ منتخب کیا ہے"

"بہت خوب" انھوں نے میری پیٹھ ٹھونک کر کہا۔

مجھے چونکہ اپنے ہیرو کے متعلق کچھ جاننے کا شوق تھا اس لئے میں نے پوچھا "ابا جان وہ جو قدیم مقبرہ ہے اس کے آس پاس کبھی لوگ دفن بھی ہوئے تھے"

"میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا۔ آج سے پچاس برس پہلے کسی کو یہاں دفن کرتے تھے مگر یہ قبرستان نہیں ہے۔ ممکن ہے زمانۂ قدیم میں اس کو اس مقصد کے لئے استعمال کرتے ہوں"

"لیکن آپ کو کسی آدمی کا نام معلوم ہے جو یہاں دفن ہوا ہو"

انھوں نے جواب دیا "مجھے کچھ نہیں معلوم" پھر کچھ سوچ کر کہا "ہاں ایک آدمی ب س فرضی کا میں نے نام سنا ہے جو یہاں دفن ہوا تھا لیکن اس کی صحیح قومیت کا پتہ کسی کو بھی نہیں معلوم"

کیا میرے ہیرو کا اصلی نام یہی تھا۔ کون کہہ سکتا ہے میں نے ذرا ڈرتے ڈرتے پوچھا "کیا ب۔س فرضی کوئی ہیرو تھا"

"ہیرو ہو نہیں بالکل نہیں۔ بلکہ بالکل متضاد"

"بزدل۔ ڈرپوک"

"اس سے بھی زیادہ فرضی ایک غدار تھا جس نے اپنے ملک سے غداری کی تھی"

"خدا رحم کرے"

"ہاں پہلے تو وہ دشمنوں کی حفاظت میں رہا۔ لیکن جب وہ چلے گئے تو لوگوں نے اس کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے اور مقبرہ کے پاس ہی دفن کر دیا۔

دفن کیا گیا پوری سی چیک کر مٹی ڈال دی ۔"

"غداری کا یہی انجام ہونا چاہیئے" میں نے کہا۔

میں نے یہ بھی سنا ہے" ابا جان نے کہا" کبھی کبھی یہاں ان بہادروں کو بھی دفن کیا جاتا تھا جن کے متعلق یہ ڈر ہوتا تھا کہ کہیں دشمن آکر ان کی بے حرمتی نہ کریں۔"

ہر حال ان باتوں سے بھی کچھ زیادہ پتہ نہیں چل سکا۔ صرف یہ معلوم ہوا کہ مقبرے کے پاس کون سی مٹی رہی ہے۔ میں نے اپنے ہیرو اور اس غدار کا مقابلہ شروع کیا۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ایک دنیا کی نظروں میں اعلیٰ اور دوسرا اسفل

جب میں گھر پہنچا تو فوراً اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوا تاکہ اپنے ہیرو کی نشانیوں کو پھر اپنی طرح سے دیکھوں۔ دروازے پر پہنچ کر میں نے اپنی جیب کو ٹٹولا کنجی میری جیب میں نہیں تھی مجھے یقین تھا کہ یہ مجھ سے کھوئی ہرگز نہیں شاید اسے میں اپنے ڈبے کے تالے ہی میں چھوڑ گیا ہوں کیا عجب کہ میرا راز ظاہر ہو گیا ہو۔

میں کچھ خوف زدہ سا ہو گیا جلدی جلدی کمرے میں داخل ہوا۔ میری چھوٹی بہن کھلے ڈبے کے پاس کھڑی تھی۔

"بدتمیز لڑکی" میں نے چلا کر کہا "تم میری چیزوں سے کیا کر رہی ہو چلی جاؤ"

"لیکن بھائی جان" اس نے جواب دیا "تالے کے ساتھ کنجی تھی میں نے ڈبہ کھول لیا یہ دیکھنے کے لئے کہ اس میں کیا ہے۔"

"ان عورتوں کی یہ عادت ہوتی ہے دوسروں کی چیزیں دیکھنے کا انہیں بہت شوق رہتا ہے۔

"بھائی جان خفا مت ہوجئے۔ میں نے کوئی چیز چرائی تو ہے نہیں۔ اس تانبے کی لوح پر بہت گرد و غبار جم رہا تھا۔ میں اس کو صاف کر رہی تھی۔ اب یہ بالکل صاف ہو گئی ہے دیکھئے اس پر کچھ لکھا بھی ہے۔"

یہ کہتے ہی اُس نے وہ لوح میرے ہاتھوں میں دیدی۔

معلوم ہوتا تھا کمرے کی دیواریں اور دروازے میرے سامنے گھوم رہے ہیں۔ ہر ایک چیز سیاہ معلوم ہوتی تھی۔ تانبے کی لوح پر جو نام لکھا تھا میں اُسے پڑھ رہا تھا۔

ب۔ س۔ فرعی

۱۸ــــ؁

میرے ہاتھوں سے لوح گر گئی۔ میں نے ہڈیاں اور کارتوس ڈبے سے نکالے اور انہیں کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

یہ انجام ہوا میرے ہیرو کا

دیہی صنعتیں اور دیہات کی نئی تعمیر

۱۔ ہندوستانی زندگی میں گاؤں کی اہمیت

ہندوستان کی ترقی کے جو آثار آج کل نظر آرہے ہیں اُن میں سب سے زیادہ امید افزا یہ صورت ہے کہ ہم نے اب دیہاتی زندگی کے متعلق غور و فکر کرنا شروع کر دیا ہے ۔ مغربی اثر میں آنے کے بعد ہم یہ بات بھلا دی تھی کہ ہندوستان ایک دیہی ملک ہے ۔ شہروں میں ہم نے مغربی انداز کی تعلیم حاصل کی ۔۔۔ خیال اپنے ملک کو جدید ملکوں کے دوش بدوش لانے کے لئے جو طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ مغرب کی تقلید میں شہری حالات کو تمام ملک میں پیدا کیا اور پھیلایا جائے ۔ لیکن اب خیالات میں تبدیلی ہو رہی ہے اور ہم اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ ہماری نجات من حیث القوم دیہی اصلاحات کے ذریعے ہی ممکن ہے ۔

کانگریس اور رائے عامہ کیوں اب دیہی اصلاح کی طرف متوجہ ہو رہی ہے اس کا سبب دریافت کرنا مشکل نہیں ہے یہ بات اب ہر خاص و عام کی زبان پر ہے کہ ہندوستان ایک دیہاتی ملک ہے یہاں کی نوے فیصدی آبادی دیہاتی ہے اور ۲۰ فیصدی سے زیادہ اشیا خام پیدا کرتی ہے اس لئے جس کسی جماعت کے پیش نظر ملک کی مادی اور اخلاقی فلاح و بہبود ہے اسے مجبوراً دیہات کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا اصل ہندوستان صرف گاؤں ہی میں نظر آسکتا ہے ۔ یہ بجائے خود معقول دلیل ہے ۔ پھر اس کے علاوہ ایک اور بہتر دلیل بھی موجود ہے ۔ ہماری تہذیب اور مغربی تہذیب میں بڑا فرق یہ ہے کہ ہماری تہذیب کی جڑ دیہاتی زندگی میں پیوست ہے اور مغربی تہذیب نے شہروں کی گود میں ہوش سنبھالا ہے اور وہیں پل کر جوان ہوئی ہے قدیم یونان کے جمہوری دور میں شہروں کا ہی راگ گایا جاتا تھا ۔ یورپ کے عہد متوسط میں طرز زندگی

کا تعین ایسے شاہی درباروں میں ہوتا تھا جو شہر میں واقع تھے۔ درباری زندگی کی خصوصیات آہستہ آہستہ جاگیرداروں تک پہنچی تھیں جاگیرداروں سے زمینداروں تک اور زمینداروں سے کاشتکاروں تک۔ اسی طرح آج بھی یہ بات محتاج وضاحت نہیں ہے کہ مغربی تہذیب فی الحقیقت شہری تہذیب ہے۔ جس کی وجہ سے لوگ کثیر تعداد میں صنعتی مرکزوں میں جمع ہو جاتے ہیں۔ ان شہروں میں بڑے پیمانے پر دولت پیدا کی جاتی ہے اور لوگ ایک یکساں سانچے میں ڈھال دیئے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں ایسا کبھی نہیں ہوا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے یہاں ایسے شہنشاہ تھے جو شہروں میں شان و شوکت سے رہتے تھے لیکن پھر بھی دیہات کی آزادی کبھی ختم نہیں ہوئی شہنشاہ صرف حملہ کے وقت لوگوں کی مدافعت کرتا تھا اور صنعت و حرفت اور تمدن و تہذیب کا مربی اور سرپرست ہوتا تھا۔ دیہی زندگی کے نصب العین اور زندگی کی سادگی کی عزت ہر شخص کے دل میں موجود تھی اور کھیتی کو مقدس سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے تمدن کو اسی وقت بہترین طریقے پر سمجھا جا سکتا ہے جب اس زرعی ماحول کو سمجھ لیا جائے۔ جس میں کہ وہ پیدا ہوا ہے۔ بنا بریں مغرب کی (جس کی ترقی کے اسباب ہم سے بنیادی طور پر مختلف ہیں) محض تقلید کرنا ہمارے قومی ترک کے لئے ہرگز موزوں اور مناسب نہیں ہے۔

پس اگر گاؤں کو ہمارے خیالات میں ایک مرکزی حیثیت حاصل کرنی ہی ہے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان اصولوں کو دریافت کیا جائے جن پر ہماری دیہاتی زندگی کی فی الواقعی بنیاد قائم کی گئی تھی کیونکہ نئی عمارت کے دوبارہ بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم موجودہ بنیادوں پر اپنی تعمیر شروع کریں۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ ان بنیادوں کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے زمانے کی ہزاروں تباہ کاریوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا ہے۔ اس لئے ہمارے لئے یہ لازمی ہے کہ ابتدائی معماروں کے نقشوں کا مطالعہ کریں کیونکہ اگر ہم ان کی تصریحات کی پوری پیروی نہ کریں گے تو ہماری عمارت بیٹھ جائے گی۔ یا استعارہ بدل کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر نئے اعضا کو پرانے جسم پر محض تھوپنا منظور نہیں ہے، تو یہ ضروری ہے کہ ان میں اور پرانے جسم میں عضوی اتحاد پیدا

کیا جائے ۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ پرانے اعضا کو ہی دوبارہ جسم سے جوڑ دیا جائے کیونکہ کوئی
زندہ جسم ... زندگی کے مختلف مدارج میں بالکل یکساں نہیں رہ سکتا ۔ یہ بدلتا رہتا ہے جب حالات
مختلف ہو جاتے ہیں تو اس سے مطابقت کی کوشش کرتا ہے اور یونہی اس کی نشوونما ہوتی
ہے ... کو ترقی دینے کی کوشش میں ہم اپنی کاہلی اور سہل انگاری سے ماضی کی طرف ایس
نہیں جا سکتے اور نہ اس کی غلامانہ تقلید کر سکتے ہیں ۔ ہماری جڑیں بے شک ماضی میں پیوست
ہوں گی اور ... ہمارے خیالوں اور کاموں کا اصل اصول وہی ہوگا جو ماضی کی دیہاتی تنظیم میں
... جاتا تھا لیکن اس کا اظہار ان مختلف حالات کی بنا پر جو اس وقت پائے جاتے ہیں مختلف
... کیونکہ زندگی ورثہ اور ماحول دونوں سے مل کر بنتی ہے ۔

... اپنی قومی زندگی کو از سر نو بنانے کی کوشش کرتے وقت یہ لازم ہو جاتا ہے
... ان بنیادی خیالوں کا صحیح اندازہ کریں جن پر ہماری دیہاتی زندگی اور تنظیم قائم ہے یہ خیالات
جہاں تک سمجھ میں آتے ہیں حسب ذیل ہیں ۔

- جماعت کے ہر رکن کے لئے کم سے کم ناگزیر اسباب حیات یقینی طور پر فراہم کرنا ۔
... مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کام کرنے والوں کو معاوضہ جنس کی شکل میں دیا جاتا تھا ۔
... اس طرح ان کی ضرورت کی تمام اشیا انھیں غذا کی شکل میں مل جاتی تھی ۔ یہ بات ظاہر ہے
... ایسے نظام میں کوئی شخص بھوکا نہیں رہ سکتا ۔ مشترکہ خاندان ایک دوسرا طریقہ تھا جو اسی مقصد کے
حاصل کرنے کے لئے اختیار کیا گیا تھا ۔ اور اس سے دولت کی تقسیم میں بھی بہت زیادہ عدم
مساوات پیدا نہ ہو سکتی تھی ۔

- مقابلہ اور جلب منفعت کی مطلق العنان خواہش کو قابو میں رکھنا اور اس کی جگہ امداد
باہمی کو ترقی دینا

ذات پات کے نظام کے ذریعے سے جماعت کا کام اس کے مختلف ارکان میں تقسیم ہوتا
تھا اور انھیں اپنا اپنا کام کرنا ہوتا تھا اس سے اس بات کی حفاظت ہو جاتی تھی کہ اگر کسی خاص

تجارت میں نفع زیادہ ہوتا تھا تو ہر شخص دوسروں سے مقابلہ کرنے کے لئے اُسی طرف نہیں لپکتا تھا اور اس کوشش میں جماعتی توازن کو آج کل کی طرح نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ مثلاً جب قانون کے پیشے میں آمدنی زیادہ ہوتی ہے تو ہر شخص وکیل بننے کی کوشش کرتا ہے اور اس بات کا خیال ترک کر دیتا ہے کہ جماعت کو کتنے وکیلوں کی ضرورت ہے۔ ذات کے نظام سے جماعتی وفاداری اور امداد باہمی بھی پیدا ہوتی تھی جس کی کمی اُن لوگوں میں جنھوں نے شہر میں تربیت پائی ہے بہت نمایاں ہے۔

۳۔ گاؤں کی زندگی کو اپنی جگہ مکمل بنانا تاکہ ہر گاؤں اپنی ضروریات کے مطابق کافی مقدار میں اشیاء پیدا کر سکے اور اپنی ابتدائی ضروریات کے لئے باہر کا محتاج نہ رہے۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مختلف تجارتوں اور پیشوں کے کاموں میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی تھی اور لوگ خارجی حکومتوں کے ناجائز انتفاع اور ان پر انحصار کرنے سے محفوظ ہو جاتے تھے۔ طرز حکومت کے اعتبار سے بھی گاؤں اپنی جگہ پر مکمل ہوتا تھا۔ اس کے معاملات کا فیصلہ پنچایت کرتی تھی۔ اسی طرح ہر گاؤں ایک جمہوریت ہوتی تھی جس کی صدارت کا کام پنچایت کے سپرد ہوتا تھا۔ جو اس بات کا خیال رکھتی تھی کہ دیہاتی زندگی کے تمام شعبے مناسب طور پر کام کریں۔

۴۔ روحانی باتوں کا مرتبہ ارفع و بلند تھا۔

یہ اسی بات سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کی اعلیٰ ترین ذات راجہ یا تاجر کی نہیں ہے بلکہ پروہت اور پنڈت کی ہے۔ راجہ چاہے کتنا ہی امیر اور طاقتور کیوں نہ ہو وہ ایک آوارہ گرد مفلس مہاتما کی عزت کرتا تھا۔ اسی سلسلہ میں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ محض دولت کمانے کی بہت زیادہ قدر نہیں تھی۔ بلکہ اس کے برعکس ترک دنیا کو انسانی ترقی کی بلند ترین منزل سمجھا جاتا تھا۔

ان نصب العینوں کے مقابلے میں مغربی تہذیب کی بنیاد جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے دنیاوی زندگی تھی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ زندگی کی سادگی کی جگہ مقبوضات کی کثرت کی تعریف و توصیف کی جاتی ہے۔ جس آدمی کے پاس دولت ہے اُس کی عزت کی جاتی ہے اور اُسے بادشاہ کی طرف سے طبقہ امراء میں جگہ مل جاتی ہے۔ علاوہ ازیں مغرب میں معاشی تنظیم کی بنیاد سخت اور بے درد مقابلے

پر کمی کی خرابی کی وجہ سے کمزور پست و ذلیل ہوجاتے ہیں اور طاقتور کمزوروں سے ناجائز فائدہ اٹھاکر اور زیادہ طاقتور بن جاتے ہیں پھر معاشی ترقی کی کوئی پہلے سے سوچی ہوئی اسکیم یا منصوبہ نہیں ہے جس کی وجہ سے پیداوار میں اضافہ طلب کا لحاظ کئے بغیر ہوتا رہتا ہے۔ تقسیم کو رسد سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی اور تمام معاشی نظام میں ایک بے ترتیبی نظر آتی ہے حرص و طمع کی علمداری ہے۔ منڈیوں اور اشیاء خام حاصل کرنے کے لئے دوسرے کا گلا گھونٹ کر اپنے لئے راستہ صاف کیا جاتا ہے اور تمام اخلاقی اور انسانی خیالات کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ مغربی اقوام جن مصیبت سے اس وقت دوچار ہیں اُس سے ہمیں عبرت حاصل کرنی چاہیے، اور اُن کی اندھا دھند تقلید نہ کرنی چاہیے لیکن ہمارے معاشی مسائل کے حل کرنے میں مغرب جو حصہ لے سکتا ہے اس کو لائق اعتنا نہ سمجھے اور اپنی دینی تعلیم کے بنیادی خیالات کے مطابق تعمیر جدید کے کام کی ابتدا کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم مختصر طور پر اُن معاشی نظاموں کی تحقیقات کریں جو اس وقت دنیا میں برسر اقتدار نظر آتے ہیں تاکہ ہم بذات خود اس بات کا فیصلہ کرسکیں کہ اپنے ملک کی حالت درست کرنے کے واسطے ہمارے لئے کونسا طریقہ اختیار کرنا سب سے زیادہ موزوں ہوگا

۲۔ دُنیا کے آج کل کے معاشی نظام

اس وقت معاشی زندگی کی دو اہم ترین شکلیں پائی جاتی ہیں۔ وہ سرمایہ داری اور اشتراکیت ہیں۔ سرمایہ داری نظام یورپ میں جاگیردارانہ نظام کے جانشین کی حیثیت سے نمودار ہوا۔ جاگیرداری نظام میں اقتدار جاگیرداروں کو حاصل تھا وہ مضبوط قلعوں میں رہتے تھے اور اپنی دولت اور قوت میں اضافہ کرنے کے لئے وقتاً فوقتاً قرب وجوار کے چھوٹے چھوٹے گاؤں پر حملہ کرتے رہتے تھے کم حیثیت کاشتکار اور مزدور انھیں خراج ادا کرتے تھے اور اس کے بدلے میں اُن کے حملے سے محفوظ رہتے تھے۔ جاگیرداروں کی ذہنیت سوائے خود غرضانہ نفع طلبی کے اور کچھ نہ تھی جب مشین کے استعمال کی وجہ سے یورپ میں صنعتی انقلاب ہوا اور اس

وقت ہندوستان سے بڑے بڑے خزانے کھینچ کر یورپ چلے گئے اُن جاگیرداروں کی جگہ بڑے
بڑے ساہوکار پیدا ہو گئے۔ جنھوں نے اپنے طور پر ایک ایسا نظام قائم کر لیا جو جاگیرداروں کے
نظام سے بہت سی باتوں میں مشابہ تھا۔ اور یوں یہ ساہوکار بھی اسی طرح منافع کمانے لگے جیسے
جاگیردار خراج کے ذریعے سے کماتے تھے۔ یہاں بھی ذہنیت خود غرضانہ نفع طلبی کی تھی اور طریقہ
یہ تھا کہ مشین کے ذریعے سے جتنا ہو سکے نفع حاصل کیا جائے اور اخلاقی پابندیوں کی کوئی پروا
نہ کی جائے۔ ایک واحد آدمی مشین کے ذریعے سے ہزاروں مزدوروں کی محنت کا نفع حاصل
کرنے لگا۔ وہ اپنی جیبیں بھرتا رہا اور چونکہ مشین کا مالک وہی ہوتا تھا اُس کے مزدور بے بس
ہوتے تھے۔ اور انھیں اُس کی حرص و آز کو بلا احتجاج کئے برداشت کرنا پڑتا تھا۔ سرمایہ داری
نظام کی ایک سب سے بڑی خرابی ہے کہ یہ نہ صرف نفع طلبی کی ذہنیت اور اُس کی معرفت بدترین
حرص اور خود غرضی کو ترقی دیتا ہے بلکہ مزدور سے دولت پیدا کرنے کے اوزار چھین کر اُس کی
آزادی بھی چھین لیتا ہے۔ جب یہ ہو جاتا ہے تو سرمایہ کی فتح اور مزدور کی غلامی مکمل ہو جاتی
ہے۔ اپنے قرب و جوار کے آدمیوں سے جو ناجائز فائدہ حاصل ہوتا ہے سرمایہ دار اسی پر
قناعت نہیں کرتا بلکہ سرمایہ دار اپنی حریص نگاہوں کو دنیا کے بعید ترین گوشوں تک لے جاتا
ہے کیونکہ اُسے اپنی مصنوعات کے لئے منڈیوں اور اپنے کارخانوں کے لئے خام اشیاء
کی ضرورت ہوتی ہے، چنانچہ بڑی بڑی رقموں کے ساہوکارے سے وہ ان جگہوں پر قبضہ
کرتا ہے اور اس بات کا پورا انتظام کرتا ہے کہ یہاں کے رہنے والوں کی حیثیت لکڑہاروں اور
پنہاروں جیسی ہو جائے۔ وہ اُنھیں اپنے ملک میں صنعتی اشیاء پیدا کرنے سے باز رکھتا ہے
کیونکہ ایسی حالت میں اُس کی منڈی اُس کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے غرض کہ اس طرح نظام سرمایہ
داری سے نظام شہنشاہیت پیدا ہوتا ہے۔ اور کمزور قوموں کو غلام کر کے اُن سے ناجائز فائدہ
حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کاروبار میں یہ ظاہر ہے کہ اخلاقی پابندیوں کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا کیونکہ
تجارت بہرحال تجارت ہے اور اُس میں جو چیز قابل لحاظ ہوتی ہے وہ صرف نفع ہوتا ہے تاریخ

کوئی چیز ساہوکار کو اپنے گندے کام کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ اگر کچھ روک ٹوک کی جاتی ہے۔ تو جنگ شروع ہو جاتی ہے اور ناقابل بیان کشت و خون اور تباہی پھیل جاتی ہے سرمایہ دار کو اپنا سرمایہ بچانا ہے۔ چاہے اس کی وجہ سے خون کی کتنی ہی ندیاں کیوں نہ بہہ جائیں غریب مزدوروں کو جس نے مشین کا ایک حقیر پرزا بننے کے لئے پہلے اپنی آزادی کو قربان کیا تھا۔ اب اعلیٰ مقصد کے لئے لڑنے کا نشہ دیا جاتا ہے اور اسے قومی عزت کا محافظ اور وحشیوں کو مہذب بنانے والا کہہ کر ابھارا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خوشی خوشی توپ کی غذا بن کر سرمایہ داروں کے حرص و آز کا شکار ہو جاتا ہے سرمایہ داری کی جو تصویر اوپر کھینچی گئی ہے وہ بہت بھیانک نظر آتی ہے لیکن اگر سرمایہ داری سے اس کا اوپری خول اتار دیا جائے اور اس کی بدنما عریانی کا تماشہ کیا جائے تو اس کے علاوہ اور نظر ہی کیا آ سکتا ہے؟ سرمایہ داری کی جلو میں خود غرضی، ناجائز انتفاع، جنگ، تباہی اور خون ریزی کا آنا ناگزیر ہے۔

اشتراکیت ان برائیوں کے خلاف ایک کھلے ہوئے احتجاج کی شکل میں رونما ہوئی اس لئے قدرتی طور پر اس سے یہ توقع وابستہ کی جاتی ہے کہ یہ ہمارے سامنے نظام سرمایہ داری کا ایک ایسا نعم البدل پیش کرے گی جو ہماری قوم کے لئے نہایت ہی موزوں ہوگا۔ اشتراکیت نے اس بات کو سمجھ لیا کہ بیان کرنے کا چاہے جو طریقہ اختیار کیا جائے سرمایہ داری کی جڑ دراصل نفع طلبی اور خود غرضی ہے اور اس نے اس سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ یہ بتایا کہ پیدائش دولت کو ایک اجتماعی شکل دے دی جائے جو چیز بھی پیدا کی جائے اگر اس کی ملکیت جماعت کو حاصل ہو تو خود غرضی اور حرص کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے۔ اشتراکیت نے نفع طلبی کی ذہنیت کو جڑ سے اکھاڑا اور یہ سمجھا کہ اس نے تمام ان برائیوں پر فتح پالی ہے جو سرمایہ داری میں پائی جاتی ہیں لیکن اس کا نتیجہ درحقیقت یہ ہوا کہ اگر سرمایہ داری ایک انتہا پر تھی تو اشتراکیت دوسری انتہا پر پہنچ گئی سرمایہ داری میں ہر فرد کو آزادی تھی استطاعت ہونے کی حالت میں ہر شخص کے لئے یہ ممکن تھا کہ ہر موقع سے پوری طرح فائدہ اٹھا سکے۔ خواہ اس سے دوسروں کو کتنا ہی نقصان

کیوں نہ ہوتا ہو لیکن دوسروں کے نقصان کا انسداد کرنے کی کوشش میں اشتراکیت دوسری انتہا تک پہنچ گئی اور اُس نے سرے سے افراد کی ذاتی جدوجہد اور مساعی ہی کو یک قلم ختم کر دیا۔ جماعت سب کچھ ہو گئی اور فرد کو اس قدر دبایا گیا کہ وہ نظام سرمایہ داری کی طرح دوبارہ ایک بڑے پہیئے کا حقیر پرزہ بن گیا۔ چند اشخاص تمام قوم کے لئے منصوبے بناتے ہیں اور بقیہ تمام لوگوں کے لئے اُن کے احکام بجا لانے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ اشتراکیت پسند لوگ اس میں شک نہیں اس کی نہایت پر زور تردید کریں گے کیونکہ اُس کا دعویٰ یہ ہے کہ نظام اشتراکیت میں صرف چند آدمی جماعت کے کاموں کو نہیں چلاتے بلکہ مزدوروں کی جماعت کے لکھو کھا آدمی جلسہ مشاورت میں شریک ہوتے ہیں اور جو بات اُنھیں مطلوب ہوتی ہے اُس کی بات فیصلہ کرتے ہیں لیکن اس کی تردید میں یہ کہا جا سکتا ہے اول تو لکھو کھا آدمی جب کوئی فیصلہ کرتے ہیں اُس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں ہوتی کہ چند با اقتدار آدمی جو چاہتے ہیں اُس کی موافقت میں محض رسمی طور پر رضامندی کا اظہار کر دیا جاتا ہے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ جہاں تک پیدائش دولت کا تعلق ہے اشتراکیت میں ذاتی جدوجہد، قوت تخلیق اور شخصیت کے اظہار کا موقع بالکل باقی نہیں رہا ہے۔ اور اُن چیزوں کی عدم موجودگی میں اشیاء کی تعداد میں اشتراکیت کی وجہ سے جو اضافہ ہوتا ہے اُس کی پوری قدر و منزلت باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ انسان جس چیز کو سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ درحقیقت اُس کی انفرادیت ہے۔ یعنی اس بات کی آزادی کہ جس طرح چاہے سوچے اور عمل کرے اور تخلیقی کام انجام دے لیکن اگر ایک آدمی کو ایک مقررہ نمونے کے مطابق کام کرنا پڑے تو وہ انسانیت کے عظیم ترین ترکہ یعنی اپنی انفرادیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور اس سے زیادہ سخت الزام کسی معاشری نظام کے خلاف کوئی دوسرا عائد نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جماعت بہرحال افراد کا مجموعہ ہوتی ہے اور جب جماعتی نظام انفرادیت دبا ڈالے تو وہ اپنے مقصد کو پورا کرنے سے قاصر رہتا ہے۔

پھر اشتراکیت پسندوں کے پاس اس کا کوئی علاج بھی نہیں ہے کیونکہ نفع طلبی کی بے وک

لوگ سلطنت ری کے خلاف احتجاج کرنے میں تو وہ بالکل حق بجانب تھے لیکن سرمایہ داری کے مرکزیت پسند قدیم اداروں کو اپنی حالت پر برقرار رکھنے میں وہ ٹھیک نہیں تھے کیونکہ سرمایہ داری کے مرکزیت پسند قدیم اداروں کا مفہوم اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ جو اشیاء پیدا کی جانے والی ہیں اُن کے متعلق سوچنے اور منصوبہ بنانے کا کام مرکز کے چند با اقتدار آدمیوں کو سونپ دیا جائے اور باقی آدمی مشین کے پرزے بننے کے ایک حقیر جز بنا دئے جائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کام کرنے والے اشتراکیت کے نظام میں بھی اسی خرابی کا شکار ہو گئے جس کے وہ نظام سرمایہ داری میں شکار تھے یعنی یہ کہ ان کا کام صحیح معنوں میں کام کرنا نہ رہا، بلکہ غیر مشروط اطاعت اور فرماں برداری ہو گیا۔ مرکز پر جو لوگ ہیں اُن کے حکم کے مطابق ایسی قسم کی اشیاء کثیر پیمانے پر پیدا کی جانے لگیں اور اکثر ایسا ہونے لگا کہ ایک آدمی کا کام صرف یہ رہ گیا کہ جب ڈبے تیزی سے یکے بعد دیگرے اس کے سامنے سے گزریں تو وہ ان پر لیبل لگاتا رہے۔ اس کام کی یکسانیت روح کو مردہ کرنے والی ہے اور جس مشین کو انسان نے بنایا تھا اُس نے آخر کار خود انسان کو ہی مشین سا کر چھوڑا۔ کیونکہ اُس مشین کی طرح جسے وہ چلاتا ہے وہ بھی صرف ایک حرکت کرتا جاتا ہے۔ اور صرف اس وقت کام کرتا ہے جب مرکز کی رضا میں شامل پایا جاتا ہے۔ اُپج، جدت، اظہار نفس سب مفقود ہو گئے ہیں اور اگر کہیں باقی ہیں تو وہ اس نظام میں پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے۔ لیکن کیا اظہار نفس کی خواہش ایک انسان کا سب سے قوی محرک عمل نہیں ہے؟ ایک بچہ کو غور سے دیکھو وہ اُسی وقت سب سے زیادہ خوش نظر آتا ہے جب اُسے سب سے زیادہ موقع اظہار نفس کا ملا ہوا ہوتا ہے اور افسردہ ہوتا ہے جب اُس پر کسی طرح کی پابندی عائد کی جاتی ہے اور اگر اُسے روکا جائے تو بہت خفا ہوتا ہے۔ آپ اس کی ننھی سی اینٹوں سے اسے ایک خوبصورت سا مینارہ بنا دیں وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوگا لیکن فوراً ہی اسے گرا دے گا تاکہ دوبارہ وہ خود بنائے۔ چاہے اس کا بنایا ہوا مینارہ کتنا ہی کمزور ہو اور آسانی سے گر جائے لیکن وہ اپنے اس ذاتی کارنامے کو دیکھ کر خوشی کے مارے پھولا نہیں سمائے گا یہی حال سیاسیات میں ہے۔ آخر لوگ حکومت

خود اختیاری کا کیوں مطالبہ کرتے ہیں بعض صورتوں میں ممکن ہے کہ بدیسی حکومت نہایت معقول ہو لیکن انسان محض معقولیت ہی کا تو متمنی نہیں ہوتا۔ درحقیقت وہ تو اظہار نفس کا خواہشمند ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا دعوی ہے کہ اچھی حکومت بھی حکومت خود اختیاری کی نعم البدل نہیں ہوسکتی چاہے مزدوروں اور کسانوں کی عام حالت سرمایہ داری کے مقابلے میں اشتراکیت کے ماتحت کہیں بہتر ہو کیونکہ سرمایہ داری کی طرح اشتراکیت میں پیداوار انفرادی مفاد کے لئے نہیں ہوتی لیکن جب تک اشتراکیت میں پیداوار کی مرکزیت موجود ہے اس وقت تک تنوع کی گنجائش نہیں ہوسکتی اور نہ عوام کو اظہار نفس کا موقع مل سکتا ہے۔

۳۔ ہندوستانی مشکلات کا حل

عدم مرکزیت اور سودیشی

اگر دنیا کا موجودہ اقتصادی نظام مسئلہ تعمیر قوم کا کوئی حل پیش نہیں کرتا جس کی آج ہمیں ضرورت ہے تو ہمیں کوئی ایسی معقول تدبیر تلاش کرنا ہے جس کے ذریعہ سے ہم اپنی قومی عمارت کی تعمیر کر سکیں۔ سرمایہ داری میں یہ مشکل ہے کہ وہ ذاتی نفع حاصل کرنے کی پوری آزادی دیتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود غرضی۔ حرص تشدد اور ناجائز فائدہ اٹھانے کے جذبات کو فروغ ہوتا ہے۔ اشتراکیت نے اس کے تدارک کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں وہ دوسری انتہا کو پہنچ گئی۔ یعنی اس نے ہر طرح کے ذاتی منافع کا انسداد کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انفرادی اظہار رائے کا باب قطعی مسدود ہوگیا۔

اس لئے ہمیں غور کرنا چاہئے کہ آخر ہماری نجات کس چیز میں ہے؟ ہم یہ نہیں طے کر سکتے کہ آیا ہمیں ذاتی نفع کا اصول ترک کر دینا چاہئے یا باقی رکھنا چاہئے۔ اس لئے ہم عجیب گومگو میں ہے لیکن جیسا کہ منطق جاننے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ گومگو کی یہ حالت محض خیالی ہوتی ہے اور ہمیشہ ایک درمیانی راستہ نکالا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس معاملے میں بھی ہماری نجات اسی درمیانی راستہ میں ہے اگر ہیگل، کا یہ قول صحیح ہے

احتی۔ تو دعوے میں ہوتا ہے۔ اس کی تردید میں بلکہ ان دونوں کی امتزاجی ترکیب میں ہوتا ہے جس میں دونوں کے صحیح اجزا شامل ہوتے ہیں تو پھر ہم بھی اپنی مشکل کا حل معلوم کر سکتے ہیں خوش قسمتی سے انفرادی طور پر یا غیر ارادی طور پر ہمارے آباؤ اجداد بھی اسی پر عمل کرتے آئے ہیں۔ ہماری مشکلات کا حل یہ ہے کہ نہ تو انفرادی نفع کا اصول اپنی جگہ پر غلط ہے اور نہ اجتماعی قبضہ و اختیار میں کوئی برائی ہے۔ البتہ اگر انفرادی نفع کا اصول اپنے حدود سے تجاوز کر جائے اور اس سے دوسروں کو نقصان پہنچنے لگے تو وہ برا ہے اسی طرح اگر اجتماعی قبضہ و اختیار کا اصول اپنے حدود سے گذر جائے اور افراد کی آزادی عمل سلب کرے تو وہ بھی برا ہے۔ ایسی حالت میں ہمیں کوئی ایسی تدبیر نکالنی چاہئے جس میں انفرادی نفع اور اجتماعی قبضہ و اختیار دونوں کی گنجائش ہو۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ صورت صرف اس طرح ممکن ہو سکتی ہے کہ پیداوار کی مرکزیت کو ختم کر دیا جائے اور سودیشی کے اصول کو رواج دیا جائے۔ عدم مرکزیت کا منشا یہ ہے کہ مرکز سے یہ ہدایت نہ دی جائے کہ کس قسم کی اشیا پیدا کی جائیں اور کتنی بلکہ پیدا کرنے والے کے ذوق اور استعداد پر اس معاملے کو چھوڑ دیا جائے صرف اسی صورت میں عوام کو ذاتی اظہار رائے اور ذاتی عروج کا موقع مل سکتا ہے۔ اس کے خلاف یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ہر شخص کو اپنا من مانا کرنے کی اجازت دیدی جائے تو اس کا نتیجہ وہی سرمایہ داری ہوگی، کیونکہ ایک شخص کو اپنی حرص کی وجہ سے پیداوار پر قابض ہونے کا موقع ملے گا، یہ صحیح ہے لیکن بہرحال اس کا انسداد کرنا ہوگا اور یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ بڑی مشینوں سے کام نہ لیا جائے اور زیادہ مقدار میں پیداوار نہ ہو۔ یعنی صرف وہی مشینیں استعمال کی جائیں جن میں صرف ایک شخص کام کر سکے مثلاً سینے کی مشین۔

علاوہ اریں ہمیں عوام میں سودیشی کی تبلیغ کرنا ہوگی تاکہ وہ اپنے قریب ترین لوگوں کی بنائی ہوئی چیزیں دور والوں کی تیار کردہ چیزوں کے مقابلے میں استعمال کرنا اپنا فرض سمجھیں علاوہ دیگر ہمیں ہر گاؤں کو کافی بالذات بنانے کے قدیم نظریئے کو ازسر نو جاری کرنا ہوگا۔ تاکہ

لوگوں کی خاص خاص ضرورتیں خود اس کے گاؤں میں پوری ہوسکیں اور بڑی حد تک باہر کے محتاج نہ رہیں اگر ہر گاؤں اس طرح باہر سے مستغنی ہوجائے اور اپنی خاص خاص ضروریات خود پوری کرنے لگے تو ہر کاریگر صرف اتنی مقدار میں چیزیں تیار کرے گا جتنی اس کے گاؤں کو ضرورت ہو یعنی پیداوار گاؤں کی مانگ کے مطابق محدود ہوجائے گی۔ اور جب یہ صورت ہوگی تو نہ زائد از ضرورت پیداوار کا سوال پیدا ہوگا اور نہ نئے سے بازار تلاش کرنے کی مشکل درپیش آئے گی۔ پھر کوئی تمام پیداوار پر قبضہ کرنے کی بھی کوشش نہ کرے گا کیونکہ جب سودیشی کے استعمال کی وجہ سے ہر گاؤں کو اپنے گاؤں کے باہر کی چیزوں کی ضرورت نہ رہیگی تو وہ اسے سعی لاحاصل سمجھے گا۔

یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سودیشی کا صحیح مفہوم واضح کردیا جائے اور تمام امکانی غلط فہمیاں رفع کردی جائیں کیونکہ سودیشی اور تنگ خیال جماعت بندی میں واقعی غلط فہمیاں پیدا ہونے کا امکان ہے۔ تنگ نظر جماعت بندی میں تو ایک شخص اپنی ہی جماعت۔ فرقہ یا طبقہ کی چیزیں استعمال کرنے کی قسم کھا لیتا ہے اور دوسرے کی اس کے یہاں گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ اسے کسی اصول سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا اور اگر اس پر عمل کیا جائے تو قومی اور بین الاقوامی اتحاد کے لئے منافی ثابت ہوتا ہے فی زمانہ ریڈیو۔ ہوائی جہاز اور تار برقی وغیرہ نے لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب تر کردیا ہے۔ گویا فاصلے کے لحاظ سے دنیا سمٹ گئی ہے۔ ایسی حالت میں یہ انتہائی حماقت ہوگی کہ دنیا کو چھوٹے چھوٹے محدود حلقوں میں تقسیم کردیا جائے جہاں ایک حلقہ کا دوسرے سے کوئی تعلق ہی باقی نہ رہے۔ حامیان سودیشی کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے۔ ان کا منشا تو محض یہ ہے کہ "خیرات پہلے گھر ہی سے شروع ہونا چاہئے" ہم پر سب سے پہلے ہمارے قریب ترین پڑوسی کا حق ہے اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ حلقہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ تمام بنی نوع انسان کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک خاندان کو لیجئے ہر شخص اپنے اہل وعیال اور اپنے افراد خاندان سے زیادہ متعلق اور منسلک ہوتا ہے اس لئے

دوسروں کے مقابلے میں اس کا یہ فرض ہے کہ وہ ان کے خورد و نوش کا انتظام کرے اور انھیں ننگا
ہونے سے بچائے۔ اپنے خاندان کے فرائض سے عہدہ برا ہونے میں گویا وہ سماج اور تمام
بنی نوع انسان کے فرائض سے سبکدوش ہوتا ہے۔ یہ تمام دائرے ایک دوسرے سے جدا
نہیں ہیں۔ ان سب کا مرکز ایک ہی ہے یعنی ایک کے اندر ایک واقع ہیں چھوٹے اور بڑے
دائرے میں کوئی مخالفت یا تضاد نہیں ہے اس لئے اگر ہم چھوٹے دائرے کی خدمت کریں تو
گویا وہ بڑے دائرے کی بھی خدمت ہوگی لہذا سودیشی کا یہ مفہوم ہوا کہ قریب ترین لوگوں کا پہلے
حق ادا کیا جائے کیونکہ دوسروں کے مقابلے میں ان کا ہم پر زیادہ حق ہے۔ لیکن اس کا یہ منشار
نہیں ہے کہ ہم ایک خاص طبقہ تک اپنے آپ کو محدود کرلیں اور باہر کے افراد کے حقوق بالکل
نظر انداز کردیں۔ اس سلسلے میں یہ کہاوت کہ "خیرات گھر سے شروع ہونا چاہیئے" بالکل صادق
آتی ہے کیونکہ اس میں خیرات کے گھر سے شروع ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ یہ نہیں کہا ہے کہ
خیرات گھر ہی میں ختم بھی ہوجانا چاہیے اسی طرح سودیشی تحریک کا بھی یہی منشا ہے کہ پہلے ہر شخص
اپنے گھر والوں کے حقوق سے عہدہ برا ہو پھر رفتہ رفتہ اپنے دائرۂ عمل کو تمام نوع انسانی تک
پھیلا دے۔ یہ مسئلہ اتنا اہم ہے اور اس میں اتنی غلط فہمیاں پیدا ہونے کا امکان ہے کہ سودیشی تحریک
سے گاندھی جی کے الفاظ بجنسہ نقل کردینا زیادہ مناسب ہوگا وہ فرماتے ہیں کہ "سودیشی ہی ایک ایسا
اصول ہے جو انسانیت اور محبت کے عین مطابق ہے۔ اگر میں اپنے خاندان ہی کا پوری طرح
حق ادا نہیں کرسکتا تو سارے ہندوستان کی خدمت کا خیال عبث ہے۔ اس لئے یہ مناسب
ہے کہ میں اپنی تمام سرگرمیوں کو اپنے خاندان کے لئے وقف کردوں اور یہ یقین رکھوں کہ اس طرح
ساری قوم بلکہ ساری دنیا کی خدمت کررہا ہوں۔ اسی کا نام محبت ہے اور یہی انسانیت ہے۔
ہر فعل کی نوعیت نیت پر منحصر ہوتی ہے۔ مثلاً اگر میں دوسروں کی تکلیف کا لحاظ کئے بغیر
اپنے خاندان کی غلط خدمت انجام دوں جیسے فرض کیجیے کہ میں کوئی ایسی ملازمت یا کاروبار
کرلوں جس میں دوسروں سے زبردستی روپیہ حاصل کیا جائے تو میں اپنے خاندان کو مالا مال

کر دوں گا اور اُس کی تمام ناجائز ضروریات بھی پوری کر دوں گا لیکن حقیقت میں نہ تو یہ خاندان کی صحیح خدمت ہوئی اور نہ ملک و قوم کی۔ بخلاف اس کے اگر میں یہ کہوں کہ خدا نے مجھے ہاتھ پیر اس لئے دیئے ہیں کہ میں صرف اپنی اور اپنے متعلقین کی پرورش کروں تو گویا میں اپنی زندگی کو سادہ اور آسان تر بناتا ہوں۔ اس طرح مجھ سے کسی کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ اور صرف اپنے قریب ترین لوگوں کی خدمت انجام دوں گا۔ تصور کیجئے کہ اگر ہر شخص یہی طرز عمل اختیار کرلے تو ملک کی حالت کتنی بہتر اور قابل رشک ہو جائے گی۔ یہ صحیح ہے کہ سب کے سب بیک وقت اس پر عمل نہیں کر سکتے لیکن جو کریں گے وہ بہر حال منزل مقصود کو قریب تر کرنے میں مدد ثابت ہوں گے اگر میں تمام دوسرے ممالک کو نظر انداز کر کے صرف ہندوستان کی خدمت کرنا چاہوں تو میرے اس طرز عمل سے کسی ملک کو نقصان نہیں پہنچے گا۔ کیونکہ میری خدمت مقابلے کی نوعیت کی نہ ہوگی" اپنی چیز کو اس طرح استعمال کرو کہ اُس سے دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے" یہ صرف ایک اعلیٰ قانونی نظریہ ہے بلکہ ایک زرین اصول ہے اہنسا اور محبت پر عمل کرنے کا ایک معقول ذریعہ ہے۔ ہم اس عقیدے کے علمبردار ہیں اس لئے ہمیں اپنے عمل سے یہ ثابت کرنا چاہئے کہ وہ وطن پرستی جس کی بنیاد محبت پر قائم ہو حیات بخش ہوتی ہے لیکن جس کی بنیاد نفرت پر ہو وہ روح کو فنا کر دیتی ہے[1]"

گویا سودیشی کی تحریک اپنے مفہوم میں پوری وسعت رکھتی ہے جب ہمیں یہ تسلیم ہے کہ ساری دنیا ایک "کل" ہے اور اس کے تمام اجزا ایک دوسرے سے بہت زیادہ منسلک ہیں تو سودیشی کا مفہوم یہ ہوا کہ ایک محدود حلقے کی خدمت ساری دنیا کی خدمت کے مترادف ہی بشرطیکہ اس کا بھی لحاظ رکھا جائے کہ دوسروں کو بھی اسی طرح اپنے محدود حلقے کی خدمت کا حق حاصل ہے۔

اسی اصول کے مطابق پھر یہ سوال ہی پیدا نہ ہوگا کہ چند بہتر اور زیادہ اہل پیدا کرنیوالے دوسروں سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گے یا انھیں اپنا غلام بنائے رکھیں گے کیونکہ جیسا کہ ہم

(۱) خیالات مہاتما گاندھی ای سی ایف اینڈریوز ص ۱۲۶-۱۲۷

پہلے بھی عرض کر چکے ہیں اس حالت میں پیداوار تو صرف مقامی ضروریات تک محدود ہو گی ۔ اور موجودہ سرمایہ داری کی سی حرص اور خود غرضی کا کوئی موقع ہی نہ ہوگا ۔ علاوہ ازیں مانگ کے مطابق پیداوار مساوی طور پر تقسیم ہو گی جب پیداوار مساوی ہو گی تو منافع بھی مساوی ہوگا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ دولت صرف چند افراد کے پاس جمع نہ ہو سکے گی آمدنی کی افراط اور تفریط جاتی رہے گی ، جس کی وجہ سے افلاس اور فاقہ کشی کی مصیبت دور ہو جائے گی اور سب کو کافی خوراک ملنے لگے گی ۔

البتہ ایک گاؤں دوسرے گاؤں سے مختلف چیزوں کا تبادلہ کرے گا کیونکہ ہر گاؤں دنیا کی ساری چیزیں نہیں تیار کر سکتا اور اگر اس کی کوشش بھی کرے تو ناممکن ہوگا کیونکہ ہر جگہ کے مقامی حالات اور خام پیداوار مختلف ہوتی ہے ۔ لیکن یہ تجارت یک طرفہ نہ ہو گی بلکہ ایسی ہو گی تاکہ کوئی گاؤں پیداوار کا ایسا مرکز نہ بن جائے جس سے دوسرے گاؤں کو نقصان پہنچے ۔ اور ان کا روزگار جاتا رہے ۔ یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ یہ چیز کیسے حاصل ہو گی ۔ اس کا جواب صاف ہے ۔ اگر سودیشی کی اہمیت عوام کے ذہن نشین کر دی جائے اور رائے عامہ کو اس کے لئے تیار کر لیا جائے تو یہ مسئلہ بہت آسان ہو جائے گا ۔ کیونکہ لوگ خود بخود قریب کی تیار شدہ چیزوں کو دور کی آئی ہوئی چیزوں کے مقابلے میں ترجیح دیں گے لیکن اس دوران میں دیہاتی پنچایتوں کو از روئے قانون یا بذریعہ محصول اس کا انتظام کرنا ہوگا کہ باہر کی چیزیں بلا ضرورت نہ آنے پائیں اس سے نہ صرف گاؤں کا اقتصادی توازن قائم رہے گا بلکہ لامحدود ذاتی منافع حاصل کرنے کی کوششوں کا بھی قلع قمع ہو جائے گا ۔ پیداوار کی عدم مرکزیت کی بدولت جب ہر گاؤں اپنی ضروریات کے لائق خود پیدا کرے گا تو بازاروں کے لئے مقابلہ مفقود ہو جائے گا اور جب بازاروں کا مقابلہ نہ ہوگا تو جنگ یا جبر و تشدد کی بھی ضرورت نہ پڑے گی ۔ اس طرح ملک میں خصوصاً اور ساری دنیا میں عموماً اس خوش حالی کا دور دورہ ہوگا ۔ علاوہ ازیں چونکہ عدم مرکزیت کے مطابق ہر مزدور کو یہ آزادی حاصل ہو گی کہ وہ جو چاہے اور جس طرح چاہے تیار کرے ۔ اس نئے اختراعی کوشش

اور انفرادی ترقی کے لئے بھی کافی میدان ملے گا۔ ورنہ کسی سماجی نظام سے اس سے زیادہ اور کیا توقع ہو سکتی ہے۔

لہٰذا انہی اصولوں پر ہمیں اپنی قومی زندگی کی داغ بیل ڈالنا چاہئے کیونکہ یہ نہ صرف سرمایہ داری اور اشتراکیت کے معائب کا انسداد کرتے ہیں بلکہ ہمارے آبا و اجداد کی یادگار بھی ہیں۔ ہم پہلے بھی اس جانب اشارہ کر چکے ہیں کہ ہمارا قدیم دیہی نظام لامحدود ذاتی منافع کا سخت مخالف تھا۔ اور اس کا حامی تھا کہ آمدنی میں افراط تفریط نہ ہو تاکہ سب کو کھانے پینے کے لئے کافی ملجائے اور ہر گاؤں اپنے طور پر مستغنی بالذات ہو جائے۔ ہمارے نزدیک یہ تمام باتیں پیداوار کی مرکزیت کو مٹانے سے اور مذکورۂ بالا طریقہ پر سودیشی پر عمل کرنے سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ (باقی)

تنقید و تبصرہ

البدور البازغہ ۔ مصنفہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ضخم ۱۴ جزو تقطیع ۲۰×۳۰ کتابت طباعت اور کاغذ عمدہ قیمت فی نسخہ ۱۲ ملنے کا پتہ ناظم صاحب مجلس علمی ڈابھیل ملک (سورت)

البدور البازغہ جو تدبیر نفس اور تدبیر منزل سے لے کر تدبیر مدن اور مباحث الٰہیہ تک حاوی ہے شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کی وہ نادر تصنیف ہے جو اب تک شائع نہیں ہوئی تھی ڈابھیل کی مجلس علمی جملہ علم دوست حضرات کے شکریہ کی مستحق ہے جس نے شاہ صاحب موصوف کی "خیر کثیر" کو شائع کرنے کے بعد اب یہ ان کی دوسری کثیر المنافع کتاب شائع کی۔ اس میں حضرت شاہ صاحب نے انسان کی انفرادی اور اجتماعی اور جسمانی اور روحانی زندگی کے جملہ اسباب و وسائل اور عادات و کیفیات و درجات و خصائل وغیرہ کو نہایت صاف اور واضح طور پر بیان کیا ہے اور حقائق شرعیہ و مسائل الٰہیہ کو ان تد ریلیس اور سہل عبارت میں لکھا ہے کہ ہر استعداد کا شخص بہرہ اندوز ہو سکتا ہے بشرطیکہ عربی جانتا ہو کیونکہ یہ کتاب عربی میں لکھی گئی ہے۔

ہم کو یہ سن کر اور بھی خوشی ہوئی ہے کہ اس کتاب کے بعد مجلس علمی شاہ صاحب کی مشہور تصنیف "تفہیمات الٰہیہ" کے چھاپنے کا قصد رکھتی ہے تفہیمات کی اشاعت میں دو امور کی طرف ہم مجلس علمی کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں ایک یہ کہ عربی اور فارسی تفہیمات کے حصے الگ الگ کر دیے جائیں اور دونوں کی اشاعت بھی الگ ہو۔ مخلوط زبانوں میں کسی کتاب کا شائع کرنا پسندیدہ نہیں دوسرے یہ کہ ہر حصہ کی فہرست بنا کر کتاب کے شروع میں ضرور لگا دی جائے۔ کیونکہ ہر ایک تفہیم ایک مستقل اور جداگانہ نکتہ ہے ایک دوسرے سے کم تعلق ہے اگر فہرست نہ ہوگی تو کتاب زیادہ نفع رساں نہ ہو سکے گی۔

ج، ا، ۰

تفسیر سورۃ الفیل - مصنفہ مولانا عبدالحمید بی ۓ فراہی بزبان عربی - لکھائی چھپائی اور کاغذ نہایت
عمدہ - حجم ۴۴ صفحات قیمت فی نسخہ ۸ر ملنے کا پتہ - ناظم صاحب مدرسۃ الاصلاح -
سرائے میر - ضلع اعظم گڈھ -

مولانا عبدالحمید مرحوم اس آخری دور میں صرف قرآن کے ایک اچھے مفسر تھے بلکہ قرآن فہمی کی امامت ان پر منتہی تھی - انھوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ اسی کتاب کریم کی خدمت میں صرف کیا وہ ربط آیات کا خصوصیت کے ساتھ لحاظ رکھتے ہیں اور قرآن کی تفسیر قرآن ہی سے کرتے ہیں مگر جو کچھ انھوں نے لکھا وہ زیادہ تر عربی میں لکھا جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے انھوں نے قرآن کے ایک معتدبہ حصہ کی تفسیر چھوڑی ہے - بعض بعض اجزا ان کی تفسیر کے ان کی زندگی ہی میں شائع ہوئے تھے جو ہندوستان سے مصر اور عرب تک پہنچے - مگر ان کے انتقال کے بعد سے پھر کوئی حرف شائع نہیں ہوا تھا خوشی کی بات ہے کہ اب ان کے بھائی حاجی رشید الدین صاحب نے تفسیر سورۃ الفیل شائع کی - انھوں نے یہ بھی امید دلائی ہے کہ آئندہ وہ دوسرے اجزا بھی شائع کریں گے ہم کو معلوم ہوا ہے کہ ہمارے دوست ڈاکٹر حافظ حفیظ اللہ صاحب سول سرجن نارہ پکی نیز جناب حفیظ احمد صاحب منصف لنگسگور ضلع رائچور (دکن) کے عطایا سے یہ حصہ چھپا ہے - اس لئے اس تفسیر کی اشاعت پر رشید الدین صاحب کے ساتھ ان حضرات کے بھی ممنون ہیں -

(ا - ح)

کلام ٹیگور حصہ اول - مترجمہ از پروفیسر ایم ضیاء الدین صاحب شانتی نکیتن تقطیع متوسط الہ آبادی
ٹائپ، طباعت روشن کاغذ نہایت نفیس قیمت عہ - ملنے کا پتہ وشوا بھارتی بک شاپ
۲۱۰ کارنواس اسٹریٹ کلکتہ -

پروفیسر ضیاء الدین صاحب نے ٹیگور کی بہت سی اچھی اچھی نظموں اور گیتوں کا ترجمہ کر کے انھیں کتابی صورت میں مرتب کر دیا ہے ان میں سے بہت سے گیت ایسے ہیں جو شانتی نکیتن میں عام طور پر گائے جاتے ہیں نظمیں مختلف بنگالی تصانیف میں سے لی گئی ہیں شروع میں ایک دیباچہ

ہے جو پروفیسر صاحب نے بہت غور اور توجہ سے لکھا ہے

اب سے کچھ ہی دنوں پہلے ٹیگور کی شاعری کا ہمارے نوجوان ادیبوں پر بہت اثر تھا اور اردو ادبی رسائل میں ادبِ لطیف، ادبِ جمیل کے عنوان سے نظم نما نثریں شائع ہوتی رہیں لیکن بجز چند، مضامین اور گیتان جلی، باغبان اور چترا کے ترجموں کے اب تک کوئی سنجیدہ کوشش ٹیگور کے کلام کو اُردو میں منتقل کرنے کی نہیں کی گئی۔ پروفیسر صاحب کا یہ کام اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ انھوں نے ٹیگور کو اور اُن کی شاعری کو بہت قریب سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اور ہمارا خیال ہے اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔

اپنے فاضلانہ مقدمے میں انھوں نے یہ بتایا ہے کہ ٹیگور نے کس ماحول میں نشوونما پائی کس طرح انھوں نے اپنی شاعری کو سنسکرتی عروض کی زنگ خوردہ زنجیروں سے علحدہ اور بنگالی ادب کو آزاد کیا اس بغاوت پر قدیم ڈگر پر چلنے والے شاعروں نے کیا کیا طوفان نہ اٹھائے لیکن شاعر نے اس کی ذرا پروا نہ کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج بنگالی شاعر اور ادیب اُسی کے راستے پر گامزن ہیں ٹیگور کی شاعری کی خصوصیات پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ "ٹیگور کی شاعری کی مابہ الامتیاز خصوصیت اس کا بے ساختہ پن ہے۔ کسی مسئلہ کو سمجھانے کے لئے یا کسی حکیمانہ معنی کو سلجھانے کے لئے وہ شعر نہیں کہتے دل میں جو کچھ گذرتا ہے وہ شعر ہو کر ادا ہو جاتا ہے۔ یہ شعر کسی بنیادی حقیقت اور کائنات کے سربستہ راز کو فاش کر دینے کی غرض سے زبان پر نہیں آتا۔ نہ اس کا مطلب کوئی علمی حقیقت یا مفید مطلب اخلاقی نصیحت بیان کرنا ہوتا ہے۔ ایک بے تاب آنسو یا بے اختیار مسکراہٹ کی طرح شعر دل کی کیفیت کی تصویر ہوتا ہے۔ اگر فلسفہ یا مذہب ان اشعار میں اپنے مفید مقصد کسی حکمت یا معرفت کو موجود پائے تو تعجب کی بات نہیں۔ مگر شعر کی اپنی زندگی کا مقصد الگ ہے۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں

"ٹیگور کی وہ خصوصیت جو مجموعی طور پر ہم اس کے کلام میں موجود پاتے ہیں اس کی ہمہ گیر

شخصیت سے شاعر کے مذہبی مقالات میں و سیاسی اور معاشرتی تحریروں میں، ادبی مضامین میں، ڈراموں و ناولوں میں ان کے اشعار میں ہم ان ہی کی بے نظیر شخصیت کو نغمہ سرا پاتے ہیں یہ شخصیت حیرت انگیز طور پر شاعرانہ، حکیمانہ اور روشن واقع ہوئی ہے:

سلسلۂ کلام میں انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ:

”ٹیگور کی عظمت کا سنگ بنیاد، ان کی لافانی شخصیت کا دارومدار وہ نغمہ ہے جو انھوں نے اس حسین دنیا کے تن بدن میں حسن و سرور کی روح پھونکنے والے شاعر کائنات محض حسن محض سرور کی مدح و ثنا میں گایا ہے اور ٹیگور کے وہ گیت ہیں جو معنی فطرت اپنے قدرتی مظاہر میں ہمیشہ سے گاتے جا رہا ہے۔ ٹیگور کا دل و دماغ ان ہی قدرتی گیتوں کے لاجواب سُروں سے گونج رہا ہے اور وہ خود مجسم سرور اور نغمہ ہو کر گاتا ہے ٹیگور کا معبود اور معشوق وہ شاعر اور مصور ہے جو اس کی زندگی میں لطف و سرور اور غم و اندوہ کی سریں پھونک رہا ہے اس کی زندگی میں عجیب و غریب کے رنگ بھر رہا ہے شاعر اس کے عشق میں اور اسی کے حسن کو قدرت میں دیکھ کر اس کی تعریف میں نغمہ سرا ہے اور اس کے گیتوں کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ نہ صرف اس زمانے میں بے مثل ہیں بلکہ ہر زمانے میں اپنے حسن کے لحاظ سے کم یاب رہیں گے“

”ایشیا کا مخصوص عرفان۔ اپنشدوں کا گیان، جو رشیوں کی خصوصیت تھا وہ عصر حاضر کی آزادی اور جدید علمی تحقیقات اور فلسفیانہ حقائق کی روشنی سے مل کر ایک حیرت انگیز عرفانی موزونیت کی صورت میں ہم ٹیگور میں موجود پاتے ہیں جبکہ ٹیگور موجودہ زمانے کے مہذب ترین اور روشن ترین دل و دماغ کا مالک ہے وہ اس دولت کا بھی پورا پورا وارث ہے جو قدیم زمانوں سے ہر مذہب و ملت کا سرمایۂ عرفان رہی ہے۔“

انھوں نے شاعری کی اصلاح کے سلسلے میں خود ٹیگور کے خیالات بھی نقل کئے ہیں طوالت کا خوف مانع ہے ورنہ وہ بھی اس قابل تھے کہ یہاں نقل کئے جاتے۔ اپنے مقدمے کے آخر میں انھوں نے ایک بہت معقول بات کہی ہے جو ٹیگور کے طرز کے مقلدین کے لئے لائق توجہ ہے۔

"اردو ادیبوں پر جس چیز کا سب سے زیادہ اثر ہوا ہے وہ ٹیگور کی انگریزی کتاب گیتانجلی ہے۔ اس اثر کے نتائج زیادہ تر وہ نثری نظمیں ہیں جو رسائل اور اخبارات میں ادب لطیف اور ادب جمیل کے عنوانوں کے ماتحت شائع ہوتی ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ٹیگور کے رنگ میں شعر کہنے کے لئے جس زبان اور جس عروض کی ضرورت ہے وہ ہمارے یہاں ابھی تک تیار نہیں ہوئی یہی وجہ ہے کہ یہ کوشش ناکام ثابت ہوتی ہے۔ علاوہ ان مشکلات کے ٹیگور کا رنگ ذاتی ہے اور بے حد شخصی اس لئے اس طرز کی تقلید کسی سے بن نہ آئے گی جس چیز کی تقلید ہمارے ادب کے لئے واقعی مفید ہو سکتی ہے وہ ٹیگور کی اس روش اور اس سلوک کی تقلید ہے جو انھوں نے بنگالی ادب کے ساتھ کیا ہے۔ ہمیں ٹیگور کے اخلاقی پہلو کی تقلید کرنا چاہئے طرز میں تقلید ادیب کی خودکشی کے مرادف ہے۔ ٹیگور کا رنگ اُن کے ذاتی عرفان کا عکس ہے ہر ادیب کی بات اس کی شخصیت کی آئینہ دار ہونی چاہئے۔"

پروفیسر صاحب نے اپنے ترجمے کے متعلق بہت انکسار سے کام لیا ہے افسوس ہے کہ ہم اصل بنگالی زبان سے نابلد ہیں اس لئے ترجمے کے بارے میں ہم کوئی صحیح رائے ظاہر کرنے سے معذور ہیں لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ عبارت نہایت صاف سلیس اور رواں ہے اور ترجمہ نہایت محنت و کاوش سے کیا گیا ہے اس سے یہ بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ٹیگور کا کلام جب دوسرے قالب میں آ کر اتنا حسین ہے تو اپنے اصلی خدو خال میں کیسا حسین و جمیل ہوگا طوالت کا خوف ہے ورنہ ہم یہاں دو ایک اقتباسات اس کے ضرور دیتے شروع میں ٹیگور کی ایک بہترین تصویر بھی ہے۔

م۔ ح۔ ح

فلسفۂ جمال۔ از جناب یاحز ؟ن صاحب ایم اے تقطیع جامعہ کی حجم چھیاسی صفحات۔ ٹائپ خوشنما، طباعت اعلیٰ، کاغذ نفیس۔ قیمت عمر ملنے کا پتہ کتابستان ۱۷ سٹی روڈ الہ آباد۔

یہ مقالہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی جانب سے شائع ہوا ہے اور اس میں مختلف عنوانات فلسفہ جمال حسن اور آرٹ، ہم آہنگی وحدت حسین اور بدصورت کا تعلق فن کی بزرگی و عظمت آرٹ اور اخلاق کے ماتحت فلسفہ جمال کی تشریح و توضیح کی گئی ہے حسن و جمال کا فلسفیانہ تجزیہ بجائے خود نہایت دلچسپ ہے اور جناب مصنف نے یہ کام بڑی کامیابی سے انجام دیا ہے طرز بیان خوشگوار دل نشین اور شگفتہ ہے۔ شروع سے آخر تک تحریر میں کہیں بھی یبوست اور خشکی نہیں آنے پائی ہے جہاں کہیں سمجھانے کے لئے مثالوں کی ضرورت پیش آئی ہے تو اردو اور فارسی کے اشعار سے کام لیا گیا ہے جس سے کتاب کی دلچسپی میں اضافہ ہو گیا ہے ہندوستانی اکیڈمی اس قسم کے مختصر مقالے شائع کر کے اردو زبان کی مفید خدمت انجام دے رہی ہے اس قسم کی کوششوں سے نہ صرف یہ کہ زبان میں وسعت پیدا ہوتی ہے بلکہ لوگوں کے ذہنی و دماغی اور علمی معیار میں بھی آہستہ آہستہ رفعت اور بلندی پیدا ہوتی ہے۔ م ۔ ح ۔ ح

تذکرۂ محسن ۔ از جناب مولوی محمد امین صاحب زبیری سابق مہتمم تاریخ بھوپال۔ تقطیع متوسط حجم ۲۴۴ صفحات کتابت وطباعت اعلیٰ کاغذ متوسط۔ قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ یا انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

یہ محسن الملک مرحوم کے سوانح حیات ہیں جنھیں محمد امین زبیری صاحب نے بڑی کاوش و تحقیق سے مرتب کیا ہے۔ شروع میں دیباچہ و انتساب کے بعد محسن الملک کے ابتدائی حالات ہیں جو صرف دو صفحوں میں ختم ہو گئے ہیں پھر اُن کی خدمات حیدرآباد کا ذکر ہے حیدرآباد کے دور آخر کے عنوان سے وہاں کی سازشوں اور امراء ریاست کی معاصرانہ رقابتوں کی تفصیل ہے اور بتایا ہے کہ اس پیچیدہ اور نازک زمانے میں محسن الملک نے کس قدر دیانت خوش اسلوبی اور تدبر سے کام کیا۔ تا آنکہ ان کو اپنے منصب سے الگ ہونا پڑا اس کے بعد نواب صاحب کی تعلیمی، سیاسی، اور مذہبی خدمات کا تذکرہ ہے پھر اُن مشکلات کی تفصیل ہے جو علی گڑھ کی

سیاست کے سلسلے میں نواب صاحب کو پیش آئیں پھر اُن کی زندگی کے آخری زمانے کے حالات ہیں اُن کے علالت اور انتقال تعزیت کے جلسوں اور پیغامات درج کئے گئے ہیں، اُن کے اخلاق و عادات بیان کئے گئے ہیں اور اُن کے فضائل خصوصیات پر اُن کے معاصرین کا تبصرہ ہے پھر محسن الملک کے عنوان سے جناب مولانا عبدالحق صاحب کا ایک بہت اچھا مضمون ہے آخر میں تحریری میں چند انگریز افسروں کے خطوط اُن کی آرا کے اقتباسات اور فارسی میں امیر حبیب اللہ خاں کی وہ رائے درج ہے جو انھوں نے علی گڑھ کالج کے بارے میں اپنی تشریف آوری کے موقع پر ظاہر کی تھی۔

نواب محسن الملک مرحوم کا شمار اُن چند مخلص افراد میں ہے جو اپنے لئے نہیں دوسروں کے لئے جیتے ہیں اُن کی زندگی کا بہترین حصہ قوم و ملک خصوصاً مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی کوششوں میں گذرا۔ اُن کی موت بھی ایسے وقت میں ہوئی جبکہ وہ قومی کاموں کے سلسلے میں شملے تشریف لے گئے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں ملک کے محسن تھے ان کے طریقۂ کار اور مصلحت اندیشی سے لوگوں کو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان کے خلوص میں شبہ کی مطلق گنجائش نہیں۔ بلا شائبہ ریب قوم کی خدمت گزاری میں سرسید کے بعد اُن ہی کا مرتبہ ہے اور یہ مسلمانوں کی احسان ناشناسی ہے کہ ایسے بزرگ قوم کی اب تک کوئی سوانح عمری نہیں لکھی گئی تھی زیر نظر کتاب سے اس الزام کو بڑی حد تک دور کر دیا ہے زبیری صاحب نے یہ کتاب بڑے سلیقے سے مرتب کی ہے۔ انھوں نے اس سے پیشتر بھی کئی کتابیں اسی موضوع پر لکھی ہیں اور یہ غالباً اُن کی تیسری کامیاب کوشش ہے البتہ ہمیں اُن سے یہ شکایت ہے کہ انھوں نے اس زمانے کی ترقی پذیر جماعت کے خلاف کا تو کہیں کہیں دبی زبان اور کچھ مخالفانہ انداز میں ذکر کر دیا ہے لیکن اس جماعت کے نقطۂ نظر اور وجوہ اختلاف کی تفصیل نہیں لکھی جس سے کتاب یک رُخی ہو گئی ہے۔ کتاب میں نواب صاحب نواب وقار الملک سر راس مسعود اور خود جناب مؤلف کی عکسی تصویریں بھی ہیں نواب صاحب کا عکس تحریر بھی ہے۔

(م ـ ح ـ ح)

غالب شکن نوشتہ مرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی سب رجسٹرار حیدرآباد دکن، تقطیع خرد ضخامت ۵۶ صفحات۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ قیمت درج نہیں مصنف سے مل سکتی ہے۔

یہ ایک خط ہے جو مرزا یگانہ صاحب آیات وجدانی نے سید مسعود حسن صاحب رضوی ایم اے پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی کو لکھا اس میں انھوں نے مرزا غالب کے متعلق ایسے خیالات ظاہر کئے ہیں جو اس افراط کا ردعمل ہیں جو غالب مرحوم کے متعلق جدید تعلیم یافتہ جماعت نے کیا ہے مرزا یگانہ نے نہ صرف غالب کے کلام ہی کی تنقیص کی ہے بلکہ اُن کے کمال کے ساتھ اُن کے خلوص اور اخلاق پر بھی حملے کئے ہیں چونکہ وہ ایک نکتہ سنج اور شگفتہ نگار صاحب قلم ہیں اس وجہ سے جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ عجیب ہے اگرچہ حقیقت سے وہ بھی اسی قدر بعید ہے جس قدر جدید تعلیم یافتہ جماعت کا خیال۔ ایک طرف اگر افراط ہے تو دوسری طرف تفریط ہے۔ اور صحیح راستہ کچھ بین بین ہی ہے آخر میں انھوں نے مرزا غالب کے متعلق کچھ رباعیاں لکھی ہیں جن میں سے چند اس لئے درج کرتا ہوں کہ ان کے خیالات کی نوعیت سے ناظرین آشنا ہو جائیں۔

غالب کے سوا کوئی شاعر ہی کہ نہیں   اوروں کے بھی حصے میں ہنر ہے کہ نہیں
مردہ ہیٹروں کو پوجتا ہے ناداں   زندہ شیروں کی بھی کچھ خبر ہے کہ نہیں

اک شاعر کہنہ سال کہہ سکتے ہو   پیشے کا شریک حال کہہ سکتے ہو
جو چاہو کہو یار۔ مگر یہ تو کہو   غالب کو نمک حلال کہہ سکتے ہو

کیا جانئیں ادھورا ہے کہ پورا شاعر   جب منہ میں زباں نہیں تو کیسا شاعر
سچ کہتے ہیں مرزا یگانہ صاحب   غالب نہ ہوگا کوئی گونگا شاعر

وہ جاتے ہیں مرزا یگانہ وہ دیکھ   میدان سخن کے مرد یکتا۔ وہ دیکھ

غالب کے پٹیت دشمن جان ادب   وہ کاں لے جاتا ہے کوا - وہ دیکھ

شہرت کاذوبہ۔ المعروف بہ خرافات عزیز یہ رسالہ بھی چھوٹی تقطیع پر ۲ جزو کا ہے مرزا یگانہ کی تصنیف ہے جس میں شروع میں مولوی غازی الدین بنی بی اے کے قلم سے وہ معرکے جو لکھنؤ میں وہاں کے ... کے ساتھ مرزا صاحب کو پیش آئے لکھے گئے ہیں پھر مرزا صاحب کے قلم سے عزیز کی شاعری پر جو گذشتہ ماہ میں آتعال کر گئے شاعرانہ تنقید ہے یہ تنقید ادبی نقطہ نظر سے لطف سے خالی نہیں کہیں کہیں اس کی محققانہ روش مفید بھی ہے۔ میرے خیال میں اہل ادب کو اس کا مطالعہ ... ہے۔ معلوم نہیں کہ عزیز مرحوم کی طرف سے اس کا جواب بھی لکھا گیا یا نہیں اس کی قیمت ... ہے اور یہ بھی مصنف سے مذکورہ بالا پتہ سے مل سکتی ہو۔

ا ا ح

آہنگِ رزم - از جناب وقار انبالوی تقطیع جیبی ضخامت ۲ ۹ صفحات ، کتابت وطباعت اچھی کاغذ اوسط درجے کا۔ قیمت ۸ر ملنے کا پتہ وقار انبالوی مزنگ لاہور

اردو زبان میں اب تک زیادہ تر رزمیہ نظموں کا ترجمہ جاتا تھا رزمیہ نظمیں لکھنے کی طرف ہمارے ... کی توجہ بالکل نہ تھی یا بہت کم تھی اور یہ اثر تھا اُس پستی اور اضمحلال کا جو صد ہا برس سے ہندوستان پر طاری تھی مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں کچھ کچھ زندگی کے آثار پیدا ہو رہے ہیں اور ... میں دو ایک شاعر ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو رزمیہ نظمیں لکھنے کی طرف خاص توجہ کرتے ہیں چنانچہ بنگال میں قاضی نذرالاسلام نے رزمیہ نظمیں لکھنے میں خاص کامیابی حاصل کی ہے اور اُن کی شہرت بنگال کی حدود سے گزر کر تمام ہندوستان میں پھیل رہی ہے اُردو میں جناب وقار انبالوی نے اس طرف توجہ کی زیر نظر مجموعہ اُن کی اسی قسم کی نظموں کا ہے۔ رزمیہ نظمیں لکھنا آسان کام نہیں ہے اس کے لئے مردانہ جذبات وخیالات کے ساتھ الفاظ بھی پر شکوہ ہونے چاہئیں اور مصرعوں کی در و بست اور ترتیب بھی ایسی کہ سننے والے یا پڑھنے والے پر مردانگی وشجاعت کے وہی

جذبات پیدا ہو جائیں جو شعر کہتے وقت شاعر کے دل و دماغ میں موجزن تھے وقار صاحب کی یہ ابتدائی کوشش ہے تاہم انھیں اپنے مقصد میں خاصی کامیابی ہوئی ہے اگر انھوں نے مشق جاری رکھی تو کیا عجب ہے کہ ہندوستان کی ترقی کی کوششوں میں اُن کی نظمیں تیز رفتاری اور ہندوستانیوں کے دلوں میں شجاعت و شہامت کا وہ جذبہ پیدا کردیں جس کی انھیں سخت ضرورت ہے

اس مجموعے میں کل تیرہ نظمیں ہیں۔ جنگ۔ سپاہی کا معبد، سپاہی اپنے بچپن میں۔ سپاہی کا خواب۔ میدان جنگ میں صبح وغیرہ شروع میں جناب برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی کا پرمغز دیباچہ ہے جس میں انھوں نے ان نظموں کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ کتاب مجلد ہے۔ جلد پر سنہرے حروں میں کتاب اور مصنف کا نام چھپا ہے۔

مصطفےٰ کمال پاشا۔ ازجناب سید اشفاق حسین صاحب ایم اے۔ تقطیع چھوٹی۔ ضخامت ۱۳۲ صفحات۔ کتابت وطباعت اور کاغذ بہتر قیمت عہ ملنے کا پتہ شیران اسلام بک ڈپو منگلور ضلع سہارنپور۔

جناب سید اشفاق حسین صاحب بچوں کے لئے شیران اسلام کے عنوان سے نامور مجاہدین و شاہان اسلام کی سوانح عمریاں مرتب کر رہے ہیں یہ کتاب اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے اس میں انھوں نے اتاترک غازی مصطفےٰ کمال پاشا کے حالات شرح و بسط سے بیان کئے ہیں اسی سلسلے میں ترکی کے موجودہ انقلاب کی تاریخ بھی آگئی ہے۔ کتاب کا انداز بیان بچوں کے لئے بہت مناسب ہے۔ زبان آسان اور دلچسپ ہے البتہ کہیں کہیں خطات زیادہ پیدا ہوگئی ہے۔ کتاب مجلد ہے اور جلد پر سنہرے حروں میں کتاب اور مصنف کا نام ہے۔

رسائل

طلوع اسلام۔ ایڈیٹر سید نذیر نیازی تقطیع رسالہ جامعہ کی۔ ضخامت ۱۱۲ صفحے کاغذ اچھا کتابت

وطباعت اوسط درجے کی۔ قیمت سالانہ ۵ر فی پرچہ ۸ر مقام اشاعت قرولباغ دہلی۔

جناب سید نذیر نیازی صاحب بی اے جامعہ (سابق استاد جامعہ) کے ادارت و اہتمام میں گذشتہ اکتوبر سے نکل رہا ہے۔ یہ ایک خالص اسلامی مجلہ ہے اور اس کے تمام عنوانات اسلامی مباحث پر مشتمل ہیں۔ فاضل مرتب نے پورے رسالے کو چند ابواب میں تقسیم کر دیا ہے شروع میں رسالہ کا تہدیہ ڈاکٹر اقبال کے نام کیا ہے۔ اس کے بعد شذرات میں ان میں نیازی صاحب نے خاص انداز میں رواں واقعات پر بحث کی ہے اس کے بعد حضرت علامہ اقبال مدظلہ کی تازہ ترین نظم مدنیت اسلام ہے۔ اس کے بعد مقالات کے ماتحت چار مضامین ہیں۔ ملت اسلامیہ ہند۔ ختم نبوت۔ سیاست معاشی اور اردو ادب کی اسلامی تحریک۔ اس کے بعد مسائل حاضرہ کے ضمن میں شہید گنج کا قصیہ ہے آثار ملیہ کے ذیل میں مسجد شاہ جہاں کا ذکر ہے پھر تاریخ و سیاسیات عالم کا باب ہے اور اس کے متعدد ذیلی عنوانات ہیں بین الاقوامی دنیا کے تحت حبشی و اطالوی نزاع اور جاپان پر دو مختصر مضمون ہیں۔ بلاد اسلامیہ کے ماتحت ترکی سیاسیات چینی ترکستان اور مصر و حبش پر بحث کی گئی ہے۔ سیاسیات ہند میں اسمبلی کے پچھلے اجلاس کا کانگریس کی ذمہ داریوں اور پنجاب کی موجودہ سیاسیات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ رجال و مشاہیر میں مولانا محمد علی اور امیر سعود کا تذکرہ ہے۔ آثار و مقامات میں نورجہاں بیگم پر ایک مختصر مضمون ہے پھر جہاں گزران کے عنوان سے احمد بے کے ایک ترکی افسانے کا ترجمہ ہے اور "انگریز کیا ہیں" کے عنوان سے ہیرلڈ نکلسن کا ایک مضمون ہے۔ اسی کے ضمن میں دو دلچسپ کارٹون ہیں پھر ہمارے معاصرین کے تحت مختلف اخبارات کے اقتباسات ہیں تنقید کتب کے باب میں شاہنامۂ اسلام اور خطبات خالدہ ادیب خانم پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ مراسلات میں لاٹ کے عجز فہم پر راجہ اختر حسن صاحب نے ایک مضمون لکھا ہے آخر میں نرم طلوع اسلام کے تحت علامہ اقبال و ختم نبوت کے عنوان سے نیازی صاحب کا ایک مختصر مضمون ہے اور سر شاہ سلیمان کے نظریۂ اضافیت پر ایک مضمون کا خلاصہ درج کیا گیا ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ پرچہ نہایت محنت

اور سلیقے کے ساتھ ایک خاص اسکیم کو پیش نظر رکھ کر مرتب کیا گیا ہے اور ہر طرح حوصلہ افزائی کا مستحق ہے اگر نیازی صاحب کی توجہ اور کوشش اسی طرح جاری رہی تو یقین ہے کہ رسالہ سنجیدہ طبقے میں بہت جلد مقبولیت حاصل کر لے گا۔

ندیم - بہار نمبر - مرتبہ جناب انجم گیاوی سالنامہ ۱۹۴۰ء حجم ساڑھے تین سو صفحات۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ بہتر۔ قیمت بہار نمبر عمر۔ سالانہ للعہ، نمونے کا پرچہ ۶ر مقام اشاعت دفتر ندیم بیچاپتی اکھاڑہ۔ گیا۔

اس رسالے نے حسب معمول اب کے بھی اپنا سالانہ نمبر بہار نمبر کے نام سے نکالا ہے اس اشاعت خاص میں امتیازی چیز یہ ہوتی ہے کہ تمام مضامین صرف فرزندان بہار کے فراہم کیے جاتے ہیں۔ اس پرچے میں بھی یہ خصوصیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ مضمون نگاروں میں علامہ سید سلیمان ندوی۔ ڈاکٹر عظیم الدین صاحب۔ سید ریاست علی صاحب ندوی جناب فکر ایم۔ اے پروفیسر محمد طاہر رضوی سید نجیب اشرف صاحب ندوی پروفیسر عبد المنان صاحب ایم۔ اے پروفیسر محمد مسلم صاحب مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی۔ حاجی معین الدین صاحب ندوی۔ مولانا ابوظفر صاحب ندوی جناب مان پوری۔ شعراء میں مولانا آزاد عظیم آبادی۔ تنقق رضوی عمادپوری جناب ولی۔ جناب عرش گیاوی جناب اصغر مجیبی جناب جمیل مظہری جناب نجم ندوی وغیرہم قابل ذکر ہیں مضامین میں مولانا سید سلیمان ندوی کا مضمون اہل بہار کے نام ایک پیام کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ سید غلام حسین مصنف سیر المتاخرین۔ اردو نثر کی ارتقا میں اہل بہار کا حصہ بہار میں مسلمانوں کی آمد۔ ظہور اسلام سے قبل عربی و ایرانی تعلقات ایک مغل شہزادہ بہار میں۔ ہماری قدیم قومی و وطنی تہذیب۔ بہار کی صحافت۔ خان بہادر خدابخش خاں۔ بہار کے معدنی وسائل اعلیٰ درجے کے تاریخی و علمی مضامین ہیں نظموں اور افسانوں کا معیار بھی اچھا خاصا ہے تین مزاحیہ مضامین بھی ہیں سرورق کے علاوہ جو سہ رنگا ہے پانچ آرٹ کی تصویریں بھی ہیں یہ بھی دو بہاری

... کے ہونے قلم کا نتیجہ ہیں اور نہایت کامیاب تین جی نے خواجہ حافظ کے ایک شعر کو مصور کیا ہے اور فن کا کمال دکھایا ہے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ تین جی پورے دیوان حافظ کو مصور کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بائیس تصویریں رسالے کے مضمون نگاروں کی ہیں سرورق بھی نہایت خوشنما ہے۔ غرض یہ نمبر ہر حیثیت سے کامیاب ہے اور ہم اس کامیابی پر جناب انجم اور ادارہ ندیم کو مبارکباد دیتے ہیں۔ البتہ اگر جناب وصی بلگرامی کا مضمون شائع نہ ہوتا تو اچھا تھا گڑے مردے اکھاڑنے سے کوئی فائدہ نہیں خصوصاً جبکہ اس سے دوسروں کی دل آزاری کا بھی خطرہ ہو۔

ادب ایڈیٹر جناب ناصر لکھنوی سار جامعہ کا ضخامت ۷۲ صفحات لکھائی چھپائی اور کاغذ بہتر۔ قیمت سالانہ للعہ ری پرچہ ۵ر۔ مقام اشاعت لکھنؤ۔

کئی سال ہوئے اسی نام کا ایک ادبی ماہنامہ لکھنؤ سے بہت اہتمام سے نکلا تھا لیکن لکھنؤ کی آب و ہوا اسے زیادہ دنوں تک راس نہیں آئی تھی اور کچھ عرصے کے بعد بند ہو گیا تھا اب مجلس انتظامیہ کا رکنوں نے اسے دوبارہ جاری کیا ہے اور یہ اطمینان دلایا ہے کہ اب اس کے بند ہونے کا امکان نہیں ہے اس رسالے کا مقصد پہلے بھی خالص ادبی تھا اور اب بھی انہی مقاصد کے ماتحت جاری ہوا ہے چنانچہ زیر نظر نمبر میں گیارہ نظمیں اور غزلیں ہیں۔ نثر کے مضمون کل سات ہیں ان میں سے بھی بیشتر کا موضوع شعر و شاعری ہے۔ ایڈیٹر صاحب نے نظموں اور مضامین کی فراہمی۔ انتخاب اور ترتیب میں نہایت خوش ذوقی اور سلیقے سے کام لیا ہے اگر کارکنان ادب اسی محنت و سلیقے سے اسے ترتیب دیتے رہے تو یہ شعر و ادب کی مفید خدمات انجام دے گا۔

کوثر۔ ایڈیٹر جناب محمود صاحب مارسٹن۔ سائز ۲۲×۱۸ ضخامت ۴۸ صفحات۔ کتابت و طباعت اور کاغذ اچھا قیمت مقامی ۱۲ر اور بیرون بنگلور ۲ر فی پرچہ ۱ر

بنگلور میں اردو جاننے والوں کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہے لیکن یہ کس قدر افسوس کی بات تھی کہ سوائے الکلام روزانہ و ہفتہ وار کے کوئی ادبی رسالہ وہاں سے شائع نہیں ہوتا تھا محمود صاحب نے یہ بڑا کام کیا ہے کہ لوگوں میں ادبی ذوق پیدا کرنے کے لئے ایسا عمدہ اور ایسا ارزاں پرچہ نکالا۔ رسالے کا معیار بھی کافی بلند ہے مضمون نگاروں میں مولانا سید سلیمان ندوی مولانا تمکین کاظمی۔ مولانا محوی صدیقی لکھنوی۔ سید احمد اللہ صاحب قادری ایڈیٹر تاریخ کے نام بھی نظر آتے ہیں رسالے کی ترتیب اور کتابت وطباعت میں بھی خاص سلیقے اور نفاست سے کام لیا گیا ہے باوجود ان خوبیوں کے قیمت برائے نام ہے اسی لئے ہمیں امید ہے کہ رسالہ بہت جلد مقبولیت حاصل کرلے گا۔

کلیم ۔ مدیر مسئول جناب نسیم خاں صاحب شاہ پوری سائز ۲۰×۳۰ حجم ۴۸ صفحات کتابت وطباعت بہتر۔ کاغذ معمولی قیمت سالانہ مع محصول ۔۔۔ فی پرچہ ۴ر مقام اشاعت الہ آباد۔

یہ رسالہ بھی علمی وادبی مقاصد کے تحت " الہ آباد کی رم وشاداب زمین میں نصب کیا گیا ہے" مضامین اچھے خاصے ہیں مضمون نگاروں میں مولانا نیاز فتحپوری، ڈاکٹر تاراچند مولانا کیفی چریاکوٹی خاص طور پر قابل ذکر ہیں ایک خاص جدت یہ کی گئی ہے اور یہ اس لئے کہ " خریدار کے پاس دو چار کتابیں فراہم ہو جائیں۔ کوئی خاص عنوان اسی وقت تبدیل ہوگا جبکہ اس کی تکمیل بصورت کتاب ہو جائے تکمیل کے بعد کتاب سے متعلق سرورق بھی شائع ہوا کرے گا۔

ساربان ۔ ایڈیٹر غلام محمد خاں بی اے سائز ۲۰×۳۰ کاغذ اور کتابت وطباعت بہتر۔ چندہ سالانہ ۔۔۔ فی پرچہ ۴ر مقام اشاعت آسٹریلیا بلڈنگ لاہور

اس رسالے کا مقصد جناب مرتب کے الفاظ میں یہ ہے کہ " واقعات عالم اور مختلف سیاسی معاشرتی اور اقتصادی تحریکات کو اس رنگ میں پیش کیا جائے کہ پبلک میں ان کو سمجھنے اور ان پر غور کرنے کی عادت پیدا ہو۔

اردو زبان میں رسالوں کی بہتات ہو اور ہے رسائل مختلف مقاصد کے ماتحت ہر روز نکل رہے ہیں لیکن اب تک سوائے مرحوم "صبح امید" کے کوئی ایسا رسالہ نہیں نکلا تھا جو تمام تر سیاسی معاشرتی اور اقتصادی مباحث پر مشتمل ہو صبح امید بھی اعتدال پسند سیاستدانوں کا ترجمان تھا اس کے مضامین بھی عام دلچسپی کے نہیں ہوتے تھے۔ رسالہ سار بان اس اہم ضرورت کو پورا کر سکتا ہو اگر وہ اپنے مقصد پر سختی سے قائم رہے اور عام رو میں نہ بہہ جائے۔ اس وقت اس امر کی شدید احتیاج ہے کہ ہندوستان کے عام لوگوں کو اہم سیاسی مسائل کی تعلیم دی جائے اور ماہرین سیاست سے سادہ زبان اور سہل انداز بیان میں مضامین لکھوائے جائیں۔ سار بان کے زیر نظر نمبر میں جو حلد کا سلا سرہے اکثر مضامین سیاسی مباحث پر مشتمل ہیں۔ مثلاً ہندوستانی باشندوں سے خطاب حقوق مطالبات پر سرسری نظر۔ کانگرس اور وزارتیں ہندوستان کا پروپگنڈا دوسرے ملکوں میں علیائن کی تحریک آزادی قضیہ انٹی وائی سینا وغیرہ ان کے علاوہ جو مضامین ہیں وہ بھی عمرانی، اقتصادی اور اصلاحی ہیں۔ تنقید و تبصرے کے ماتحت رواں واقعات پر تبصرہ کیا جاتا ہے غرض بحیثیت مجموعی رسالہ نہایت مفید اور ہر طرح حوصلہ افزائی کا مستحق ہے

انیس - ایڈیٹر جناب شرار بی اے۔ سائز جامعہ کا لکھائی چھپائی اوسط درجے کی کاغذ معمولی۔ حجم ۲۴ صفحے قیمت سالانہ ۱۲؎ طالب علموں سے صرف دو روپئے مقام اشاعت ایلچ پور سٹی۔ برار

یہ رسالہ ایلچ پور برار سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ ہمارے سامنے اس کا آٹھواں نمبر ہے۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایڈیٹر صاحب رسالے کی ترتیب اور مضامین کی فراہمی میں بہت محنت اور توجہ سے کام لیتے ہیں۔ اس نمبر میں علاوہ مقامی مضمون نگاروں کے جناب رشید صدیقی صاحب علیگڑھ جناب اسرائیل احمد خاں صاحب وحضرت جوش ملیح آبادی کے نام بھی ہیں۔ اس نواح میں اب تک کوئی معقول رسالہ نہ تھا شرار صاحب نے اس کو نکال کر اردو رسالوں کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔

دُنیا کی رفتار

چین، جاپان اور دول مغرب | شخصیت انفرادی کی طرح شخصیت قومی بھی اپنے بقا و نمو کے لئے قوت کی محتاج ہوتی ہے۔ اور جب یہ قوت نہیں رہتی تو اس کے اجزائے ترکیبی میں اختلاط اور انتشار پیدا ہو جاتا ہے اور وہ ان چیزوں کی طرح جن کے عمل میں کسی مرکزی ارادے کی کارفرمائی نہیں ہوتی اوروں کا آلۂ کار بن کر رہ جاتی ہیں، تلاطم مقاصد میں ایک بے مقصد بے شعور تنکا!

یہی وجہ تو ہے کہ آج چین کا مسئلہ حبش کی طرح دراصل ان شکاریوں میں باہمی سمجھوتہ یا تکرار کا مسئلہ ہے جو اسے اپنے کام میں لانا چاہتے ہیں۔ یعنی چین کا مسئلہ روس اور جاپان کا مسئلہ ہے، انگلستان اور جاپان کا مسئلہ ہے، اگر نہیں ہے تو چین کا مسئلہ نہیں ہے!

قدیم تاریخ کے دہرانے سے کچھ حاصل نہیں۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ ۱۹۲۲ء سے دول مغرب اور امریکہ نے "چین کے مسئلے" کو یوں طے کر رکھا تھا کہ چین کی خود مختاری کی ضمانت ہونی چاہئے، اور بحرالکاہل میں قوتوں کا ایک ایسا توازن قائم کرنا چاہئے کہ کسی کا پلہ بھاری نہ ہو اور بحری قوت میں ایک مقررہ تناسب کو تسلیم کر لیں، خصوصاً جاپان، امریکہ اور برطانیہ کے بیڑوں کی قوت میں ایک خاص تناسب مقرر کر دیا جائے۔ ۱۹۳۱ء تک مسئلہ کا یہ حل کارگر ثابت ہوا لیکن ۱۹۳۱ء کے نصف آخر میں جاپان نے اس سیاست کا آغاز کیا جس سے اس حل کی ساری کائنات دیکھتے دیکھتے ختم ہو گئی۔ چین کی خود مختاری کا خاتمہ ہو گیا اور اسی کے ساتھ بحرالکاہل میں توازن قوی کا۔ اب دول مغرب اگر اس مسئلہ کا کوئی حل سوچنا چاہیں تو انہیں جاپان سے معاملہ چکانا ہوگا کہ اب چین کا مسئلہ دراصل جاپان کا مسئلہ ہے۔

چین کا علاقہ چھین کر جاپان نے اپنی قیادت میں منچوکو کی ریاست قائم کر دی جس کا پہلا اثر تو یہ ہوا کہ مشرق بعید میں روسی اثر کو ایک ضرب کاری لگی۔ روس کی مشرقی توسیع کے مقابلے

یک بنی جاپان کی ابھری ہوئی قوت نے ترقی کی تھی اور آج یہ ترقی اس درجے کو پہنچ گئی ہے کہ اس نے روس کی توسیع کو تقریباً بند کر دیا ہے اور تیس برس سے جس ریل کا معاملہ روس اور جاپان کے تعلقات کو کشیدہ بنائے ہوئے تھا یعنی مشرقی چینی ریلوے اسے اب روس نے جاپان کے ہاتھ بیچ ڈالا ہے اس میں شک نہیں کہ اب بھی بہت سے مسائل ہیں جن پر روس اور جاپان میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اس ریل کا معاملہ طے ہو جانے کے بعد ان دونوں میں جنگ کے امکانات بہت کم ہو گئے ہیں۔ اس لئے کہ جاپان کو اس علاقے میں غیر معمولی تقویت حاصل ہو گئی ہے چین میں تسلط قائم کر کے اس نے روس کو اپنے مقابلے میں کمزور کر دیا ہے اور روس سے کشیدگی کو کم کر کے اپنے مقابلے میں روسی چین کا سہارا بھی بہت کچھ چھین لیا ہے۔

منچوکو کے قیام سے ایک بات یہ اور پیدا ہو گئی کہ چین کے مقابلے میں جاپان کو ایک بڑی محاذ بھی حاصل ہو گیا ہے۔ اب چین کے شمال میں بھی جاپانی قوت موجود ہو گی اور اگر جاپانی تسلط یہ علاوہ منگولیا تک پھیل گیا تو روس چین سے بالکل جدا ہو جائے گا۔ غرض جاپان نے اپنی سیاست اور اپنی فوجی اور بحری قوت سے چین میں اپنے قدم ایسے جمائے ہیں کہ مغربی قوتوں کو اگر چین میں تجارت کرنی ہو یا اپنا سرمایہ لگانا ہو تو جاپان کی رضامندی کا حاصل کرنا لازمی ہے۔ جاپان کے ظلم پر چین میں یقینی غصہ ہے لیکن پھر بھی یہ دونوں قومیں ایشیائی ہیں، بے شمار تمدنی رشتے انھیں باہم ملائے ہوئے ہیں اور جاپان کا یہ حوصلہ کہ وہ اس سارے علاقے کا قائد ہو جائے ایسا ہے جس کے پورا ہونے میں اب دول مغرب زیادہ عرصہ تک حائل نہیں ہو سکتیں خود چینی بھی شاید مغربی تسلط پر جاپانی تسلط ہی کو ترجیح دیں گے۔

چنانچہ جاپان نے اب صاف صاف اس بات کا اعلان بھی کرنا شروع کر دیا ہے کہ کوئی مغربی قوت چین میں معاشی یا سیاسی اثر جمانے کی فکر ہماری مرضی بغیر نہ کرے ۱۹۳۴ء میں جب جمعیۃ اقوام کے ماہرین مغربی اور وسطی چین میں بہت سی معاشی تجاویز زیر غور کر رہے تھے تو جاپان نے اس پر سخت ناخوشی کا اظہار کیا۔ اور اس کے اخباروں نے صاف صاف لکھا کہ جاپان چین میں برطانیہ

اور امریکہ سے ہمسایانہ حیثیت سے تعاون پر تیار نہیں۔ انھیں پہلے جاپان کی قیادت کو تسلیم کرنا ہوگا

اور جاپانیوں کا یہ دعویٰ محض تسکین ہی نہیں بلکہ وہ اس کی تدبیر بھی کر رہے ہیں اور کامیابی سے کر رہے ہیں، انھوں نے چین کی طوائف الملوکی سے فائدہ اٹھایا ہے اور تمام صوبوں میں ایسی صورت قائم کرنے کی تدبیریں کی ہیں جو جاپان کو ہر طرح کی معاشی اور سیاسی مراعات دینے پر مجبور ہوں اور اتنی مضبوط نہ ہوں کہ جاپان کی قوت کا مقابلہ کر سکیں وہ چین میں مرکزی حکومت کو کمزور کر کے صوبوں کی حکومتوں کو اپنے اثر میں لینا چاہتا ہے یہی اس نے شمالی جاپان میں کیا ہے فی الحال تو وہ شمالی اور وسطی چین میں اسی قسم کا بالواسطہ تسلط چاہتا ہے "فی الحال" ہم نے دانستہ لکھا ہے ممکن ہے کہ اگر اس تدبیر سے جاپانی اغراض پوری طرح حاصل نہ ہوسکیں تو بلاواسطہ تسلط کا مسئلہ بھی سامنے آئے۔

چین کے شمالی صوبوں میں جاپان کی یہ تدبیر بڑی حد تک کامیاب ہوئی ہے۔ جنوبی چین میں جاپان کا اثر کم ہے لیکن پھر بھی فارموسا کے بالمقابل فوکیں میں اس کے قدم جمے ہوئے ہیں۔ کینٹن اور کوانگسی کے جنوبی صوبوں میں بھی اس کے کارندے مصروف ہیں اور ضرورت پڑے تو چانگ کائی شک کی قوت کو بہت کچھ نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان سب باتوں سے چین میں اس قدر غصہ اور ناراضی ہوگی کہ یہ تدبیریں زیادہ عرصے تک کامیاب نہ ہوسکیں گی وہ غالباً حقائق سے پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ چین میں تعلیم یافتہ طبقے کا بہت بڑا حصہ جاپانی اثر میں ہے ان لوگوں نے جاپانی مدارس میں پڑھا ہے، جاپانی بے تکلفی سے بولتے ہیں اور جیسے جاپان کے اثر بڑھنے سے شخصی فوائد کی توقع ہے۔ ان لوگوں سے جاپان کو بڑی مدد ملی ہے اور امریکہ اور مغربی ممالک میں پڑھے ہوئے لوگوں کا اثر انھوں نے بہت کچھ کم کر دیا ہے۔ اور آج بھی باوجود جاپان کی ظالمانہ سیاست کے پہلے سے بہت زیادہ تعداد چینی نوجوانوں کی جاپانی مدارس میں جا رہی ہے اور جاپان ان کے لئے ہر طرح کی آسانیاں بہم پہنچا رہا ہے اور اس

بات کے قرائن نہایت قوی ہیں کہ جاپان اکثر چینی صوبوں میں اپنے موافق حکومتیں قائم کرا سکے گا۔
۱۰۔ اندرونی سیاست پر اس اثر کے باعث جان کائی شک پر ایسا دباؤ ڈال سکے گا کہ وہ کسی طرح ہاتھ سے نہ نکل سکے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ خود جان کائی شک کی تعلیم بھی جاپانی ہی ہے۔

چنانچہ اس دباؤ نے ۱۹۳۶ء میں چین کے نظام محاصل کو بدلوا کر جاپان کے موافق کرلیا۔ اس سے یہ بھی ہو سکتا ہے آئندہ چینی محاصل کی نگرانی پر ایک برطانوی افسر کی جگہ کوئی جاپانی مامور ہو۔ اس سے یہ کام لیا جاسکتا ہے اور غالباً لیا جائے گا کہ برطانیہ اور امریکہ اور دوسری مغربی قوموں کو چین معاشی مراعات دینے سے انکار کرے۔

اس صورت حال کو انگریزوں نے سب سے پہلے سمجھا ہے اور وہ اگر ایک طرف جاپان کے مقابلے کے لئے اپنی قوت کے بڑھانے کی تدبیریں سوچ رہے ہیں تو دوسری طرف چین میں اپنے موجودہ سرمایہ کی حفاظت اور اپنی موجودہ تجارت کے قیام کے لئے جاپان سے سمجھوتے کی فکر میں بھی ہیں۔ انگلستان کا نہایت با اثر سیاسی پرچہ راونڈ ٹیبل اپنی ستمبر کی اشاعت میں لکھتا ہے "جاپان کے مقابلے میں اس وقت جو بھی بحری اور بری انتظامات کرنے ہوں اس میں شک نہیں کہ مسئلہ چین کا کوئی مستقل حل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہماری عام سیاست سے یہ نتیجہ نکل پائے کہ بحر الکاہل کے علاقے میں ہم جاپان سے ان مشکلات کے باب میں جو ہمارے اور جاپان کے تعلقات کو برابر کشیدہ کرتی رہتی ہیں کوئی مفاہمت کرلیں۔"

دنیا کی یہ سب سے قوی سلطنت جاپان سے کیوں مفاہمت چاہتی ہے؟ اس لئے کہ جیسا ہم نے اوپر بتلایا جاپان نے اپنی سیاست سے چین کو بالکل اپنا دست نگر سا لیا ہے اور برطانیہ نے اس ملک میں مدتوں کی کوشش سے اپنی تجارت قائم کی ہے اور سرمایہ لگایا ہے۔ چین میں اس وقت سالانہ کوئی ۲۰ کروڑ روپیہ کا انگریزی مال جاتا ہے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ کوئی ڈھائی ارب روپیہ سے بھی زیادہ انگریزی سرمایہ چین میں لگا ہوا ہے۔ چین کی موجودہ معاشی

حالت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں اشیاء صرف کی کھپت ایک عرصے تک نہ بڑھ سکے گی۔ لیکن اشیاء دولت آفریں کی مانگ زیادہ ہوگی۔ یعنی سرمایہ لگانے کے امکانات اور بڑھیں گے لیکن ایسا کرنے میں جاپان سے تصادم ہوگا۔ جاپان کسی دوسرے ملک سے چین میں سرمایہ کی درآمد کو اس شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے کہ غالباً یہ معاشی اثر اس کے خلاف کام میں لایا جائیگا۔ چنانچہ جاپان کوشش کر رہا ہے کہ چین کو سب سرمایہ خود ہی فراہم کرے اور یہاں تک اس میں ساعی ہے کہ خود دوسرے ملکوں سے سرمایہ حاصل کرکے اسے چین میں لگا رہا ہے، لیکن دوسروں کو براہ راست وہاں سرمایہ نہیں لگانے دیتا جاپان کے پاس خود بھی تو غیر محدود سرمایہ نہیں ہے۔

اس حقیقت پر انگریز تاطران سیاست جاپان سے سمجھوتے کی بنا رکھنا چاہتے ہیں چنانچہ راونڈ ٹیبل جو ان معاملات میں سب سے بہتر معلومات رکھنے والا جریدہ ہے، لکھتا ہے:-

" جاپان کو خود جلد یا دیر میں پردیسی سرمایہ درکار ہوگا۔ اپنی بڑھتی ہوئی تجارت خارجہ کو مالی مدد پہنچانے کے لئے اسے سرمایہ کی ضرورت ہوگی منچوریا کے لئے سرمایہ چاہئیے اور جوں جوں چین کے وسائل پر اس کا انحصار بڑھے گا تو ان کو ترقی دینے کے لئے بھی سرمایہ مطلوب ہوگا۔

پھر جب دنیا کی دوسری منڈیوں میں اس کے مال کی کھپت آخری منزل تک ترقی کر چکے گی تو یہ چین ہی میں اپنی صنعتی پیداوار کے لئے منڈی تلاش کرے گا اور اس کے لئے چینی معیشت کو ترقی دینے کی ضرورت ہوگی اور یہ اسی طرح ممکن ہو کہ چین میں سرمایہ لگایا جائے۔ لہذا آخر کار چین میں ہمارے اور جاپان کے مقاصد میں اختلاف کی جگہ یکجہتی سی پائی جائے گی۔

اسلئے ۱۹۳۵ء کے لئے چین میں ہمارا مقصد صاف صاف یہ ہونا چاہئیے کہ ایسے حالات پیدا ہوجائیں کہ چینی تعاون اور ہمارے تحفظ کے ساتھ ساتھ مغربی سرمایہ بھی جاپان کی مدد اور رضامندی سے چین کے وسائل کو ترقی دینے میں کام آئے۔ جاپان کی چین میں دوہری حیثیت ہے۔ ایشیا کے قائد کی اور کاروبار میں شریک کی۔ ہمارا فائدہ اس میں ہے کہ اس کی دوسری حیثیت کو تقویت پہنچائیں، جہاں تک حفاظت سے ایسا ممکن ہو اپنے تجارتی اغراض کو جاپان کے تجارتی اغراض سے

مطابق کریں اور اسے یقین دلائیں کہ خود اس کے لئے سب سے بہتر سیاست یہی ہے کہ وہ شنگھائی کے عظیم الشان تجارتی عمارت میں مغرب کو اپنا ساتھی بنائے اور چینیوں کی اپنے ملک کو ترقی دینے میں مدد کرے۔"

قوموں اور ملکوں کی تقسیم پر کس سکون اور اطمینان قلب کے ساتھ اظہار خیال ممکن ہے!؟

ایک چینی اخبار سے اقتباس | اس سلسلے میں ٹین سین کے ایک مشہور چینی اخبار آئی شی پاؤ سے ذیل کا اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہوگا:

"کئی سال سے جاپان اور برطانیہ کے تعلقات کچھ مذبذب سے ہیں اور بظاہر تو یہ ہو رہا ہے کہ مخالفت کے اسباب موافقت کے امکانات سے زیادہ ہیں۔ لیکن یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ طرفین اس صورت حال سے مطمئن نہیں ہیں۔ چنانچہ جاپان کے وزیر خارجہ نے اس اہم مسئلہ پر خاص توجہ شروع کر دی ہے۔ لندن کے جاپانی سفیر مسٹر تسوویرا کو جاپان بلایا گیا ہے تاکہ ان کی مدد سے تعلقات میں کوئی خوشگوار تبدیلی پیدا کرنے کی مستقل تدبیر نکالی جائے۔ لندن میں جو جاپانی مشیر تجارتی رہا ہے وہ بھی ٹوکیو بلایا گیا ہے اور خیال ہے کہ ان کوششوں میں اچھی کامیابی ہوگی۔

سر لیتھ راس جو چین تشریف لائے ہیں کہ یہاں کے معاشی حالات کا مطالعہ فرمائیں، ان کی تشریف آوری بھی دراصل اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ براہ راست چین تشریف لائے، راہ میں امریکہ میں قیام فرمایا، گئے تو دو ہفتے کے لئے جاپان گئے تاکہ وہاں عہدیداروں اور ماہر کاروں سے ان خیالات پر مبادلہ خیال کر سکیں جن میں انگلستان اور جاپان کے اغراض مشترک ہیں۔

برطانیہ کی اس کوشش کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ مشرق بعید میں اپنی تجارت اور اپنی نوآبادیوں کی حفاظت چاہتا ہے اور خصوصاً شمالی چین میں اپنے معاشی اور تجارتی مفاد کو محفوظ کرنے کی فکر میں ہے۔ اور اس کے لئے جاپان ہی سے صلاح و مشورہ ضروری ہے۔ اصلی سوال

یہ ہے کہ جاپان برطانیہ سے کیا مانگتا ہے اور آیا برطانیہ اس مطالبے کو پورا کرسکتا ہے یا نہیں ؟"

ٹوکیو کے مراسلات اور اخباروں کے مضامین سے اقتباسات شائع کرکے یہ جریدہ اپنا خیال ظاہر کرتا ہے کہ جاپان برطانیہ سے یہ مطالبہ کرے گا کہ وہ مشرقی ایشیا میں جاپان کی مخصوص حیثیت کو باضابطہ تسلیم کرے اور وہاں اپنے مفاد کی جانچ بس اس حد تک کرے جہاں تک کہ جاپانی تعاون کے ساتھ ممکن ہو مزید براں مشرقی ایشیا کی منڈیوں کو دوسری قوموں کے لئے کھلا رکھنے کے معاوضے میں جاپان برطانیہ سے یہ چاہے گا کہ جاپانیوں کو برطانوی نوآبادیوں میں ہجرت کرکے جانے کا اور اس کے تجارتی مال کو ان کی منڈیوں میں مقابلے کا حق حاصل ہو

اس جریدہ کے خیال میں انگلستان پہلے مطالبے کو مان لے گا۔ اس لئے کہ انگلستان کی سیاست کی بنا حقائق پر ہے اور واقعات کا تقاضا یہی ہے کہ اسے مانا جائے کوئی اور چارہ ہی نہیں جاپان کو جو حیثیت حاصل ہے وہ تو حاصل ہے ہی، کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے لیکن دوسرے مطالبے کی نوعیت اور ہے۔ اس باب میں برطانیہ کی نوآبادیاں اس کو رد کریں گی اور خود اس کے معاشی اغراض اسے تسلیم کرنے سے باز رکھیں گے جاپانی۔برطانی تعلقات کو استوار کرنے میں بھی دشواری ہے اور اسی وجہ سے اس باب میں زیادہ امیدیں نہیں باندھی جاسکتیں لیکن اگر فرض کیجئے کہ یہ سمجھوتہ ہوگیا تو بھی اس کے معنی چینی نقطۂ نظر سے یہ ہوں گے کہ شمالی چین پر معاشی تسلط میں جاپان کے ساتھ اور بھی شریک ہوجائیں گے اور اس کا اقتدار بلا شرکت غیرے نہ ہوگا۔ مگر اس سے چین کو فائدہ ؟"

اپنے نوشتۂ تقدیر کو بھی آدمی کس سکون و رضا سے پڑھ سکتا ہے ؟!

حبش اور جمعیۃ اقوام | جمعیۃ اقوام نے اپنے قیام کے بعد پہلی مرتبہ سیاست کی حقیقی گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی تھی، اور ہر چند کہ اٹلی کے مقابلے میں برطانیہ کی انصاف پسندی کے محرکات باطنی دنیا کی نظروں سے بالکل چھپے ہوئے نہ تھے مگر پھر بھی تعجب تھا کہ انگلستان کی قیادت میں

یہ جمعیۃ (جس کے متعلق کہنے والے نے سچ کہا تھا کہ بہر تقسیم فورا نجسے ساختہ اند) محض حبش کی حمایت کے لئے نہیں بلکہ حق و انصاف کی تائید میں اپنے ایک بااثر رکن اٹلی کی ناخوشی مول لینے کو تیار ہوگئی پہلی مرتبہ غاصب کو غاصب بتایا گیا اور اس کے غصب کو روکنے کی تدابیر بھی ہوئیں۔ مگر افسوس کہ انصاف دوستی اور حق پسندی کا یہ تجربہ زیادہ دن نہ چل سکا۔ اور یہ توقع کہ دنیا کی قومیں اس جمعیۃ کے ذریعہ آئندہ قومی ظلم کا انسداد کر سکیں گی۔ بظاہر عرصے کے لئے ختم ہوگئی۔ اور جب کہ ہم نے ان صفحات میں پہلے چند بار لکھا تھا فرانس نے اٹلی کی نئی دوستی کا حق ادا کیا اور انگلستان کو بھی اس پر آمادہ کر لیا کہ ایسے شرائط صلح پیش کئے جائیں جو اٹلی کے لئے قابل قبول ہوں۔ ان سطور کو لکھتے وقت ان برطانوی فرانسیسی تجاویز کے متعلق جمعیۃ نے کوئی فیصلہ کیا ہے نہ اٹلی نے۔ مگر فیصلہ کچھ ہو یہ بات اپنی جگہ پر ہے کہ انگلستان جس نے حبش کی حمایت میں دنیا کی اخلاقی رہنمائی کا کام اپنے سر لیا تھا اس بارگراں کی زیادہ تاب نہ لاسکا اور آخر کو فرانس کے مشورے سے جو تجاویز اس نے پیش کیں وہ ایسی ہیں کہ ان سے پھر لاٹھی والے کی بھینس کے اصول کی تصدیق ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اطالوی اخبارات کا یہ طعن کارگر ہوا کہ ہزار چوہے کھا کر بلی حج کو جائے کچھ بھلا نہیں معلوم ہوتا۔

اور سچ یہ ہے کہ اس وقت حبش کی کمزوری اور اٹلی کی سینہ زوری کی وجہ سے دنیا کی رائے عامہ اٹلی کے کس قدر بھی خلاف ہو لیکن جمعیۃ اقوام اس وقت تک اس رائے عامہ سے پورا کام نہیں لے سکے گی جب تک کہ ماضی کی سیاسی اور معاشی ناانصافیوں اور حق تلفیوں کو رفع کرنے کی کوئی صورت نہ نکلے۔ اور جب کہ دنیا کا قاعدہ ہے کہ پہلے ان کے تلف شدہ حق پورے ہوں گے جن میں قوت ہو کمزور کے حقوق کے احترام کی منزل تو بہت دور ہے کون جانتا ہے کہ انسان کی بے دلی اسے اس منزل تک کب پہنچنے دے گی۔ ہاں، قوت والوں کو ان کا حق ملنے کا وقت قریب ہے اور شاید انگلستان نے اپنی جدید تجاویز میں اٹلی کا بھی حق تسلیم کیا ہے!

انگلستان کے مشہور لبرل سیاسی سر ہربرٹ سیمول نے نومبر کے — NINETEENTH CENTURY

میں جمعیۃ اقوام کے مستقبل پر ایک مضمون میں باوجود اٹلی کے غاصبانہ اقدام کی مذمت کرنے کے مسئلے کے اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان کے مفکرین سیاسی کے ذہن میں پہلی گھڑی سے یہ بات کم وبیش موجود تھی کہ اخلاقی اصولوں سے جہاں تک کام نکل سکے نکالو مگر سیاسی قوتوں کی بنیادی تقسیم کو بھی نظر انداز نہ کرو۔ اٹلی کو دباؤ۔ دب جائے تو اچھا ہے نہ دبے تو خود دب جاؤ۔

سر ہربرٹ لکھتے ہیں۔ "کرۂ ارض میں خشکی کا رقبہ کوئی ۵۵ ملین میل مربع ہے اس میں سے ۱۳½ ملین سلطنت برطانیہ کے زیر نگیں ہے۔ ۸½ ملین روس کے، ۴½ ملین فرانسیسی سلطنت کے ۳¾ ملین ریاستہائے متحدہ امریکہ کے، ۴¼ ملین چین کے پاس ہے (بشمول منچوریا!) یعنی ان پانچ دول کے پاس ۵۵ میں سے ۳۴ ملین مربع میل ہیں۔ یعنی کل کا ⅝۔ بلجیم، ہالینڈ اور پرتگال کی نوآبادیوں ہیں ۲½ ملین مربع میل اور چلے جاتے ہیں اور یوں دنیا کا ⅔ ان دول کے پاس آجاتا ہے۔"

"دول اس صورت حال سے غیر مطمئن ہیں وہ کہتی ہیں کہ جو یورپی ریاستیں اٹھارویں اور انیسویں صدی میں مضبوط تھیں اور جنھوں نے اپنے مواقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا وہ نہایت آسانی سے یہ کہہ سکتی ہیں کہ بیسویں صدی کا حال مختلف ہے، جمعیۃ اقوام کے قیام سے ایک نئے نظام کا آغاز ہوتا ہے اور توسیع ملکی کا عہد ختم ہو چکا تو کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کا نقشہ اتفاق سے جو ۱۹۲۰ء میں تھا وہ ہمیشہ کے لئے ویسا ہی رہے گا۔ سو سال بعد بھی وہی اور ۵۰۰ سال بعد بھی وہی؟" "یہ دول یہ بھی کہتی ہیں کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ لوگ جن کے پاس دنیا کا دو تہائی ہے اپنی پیداوار کے مبادلے کو اپنی ہی حدود کے اندر رکھنے کی کس طرح کوشش کر رہے ہیں۔ آپ ہمارے آدمیوں کو ہجرت کرکے اپنے ملک میں بسنے بھی نہیں دیتے پھر آخر ہمارے ۹۰ ملین جاپانی، ۷۰ ملین جرمن، ۴۰ ملین اطالوی اور ۳۰ ملین پول کیسے جئیں اور پنپیں؟" اس مسئلہ کے حل کے لئے ملکوں کے رقبے کو گھٹانے بڑھانے کی تدبیر پر بحث کرکے سر ہربرٹ اسے تقریبًا بالکل

ناقابل عمل بتلاتے ہیں کہ "حبش جیسے غیر ترقی یافتہ ملک کا رقبہ چھیننے تک کے لئے بھی ایک غاصبانہ جنگ کی ضرورت ہے" نوآبادیوں کو جمیعۃ اقوام کے سپرد کرنے کا بھی امکان نہیں۔ سر ہربرٹ کے نزدیک حل یہ ہے کہ بجائے سیاسی اور ملکی حل کے معاشی حل کی صورت نکالی جائے اس لئے کہ مسئلہ دراصل "کافی غذا اور صنعت کے لئے کافی خام اجناس کا مسئلہ ہے تاکہ سب ملکوں کی آبادی یہی نہیں کہ زندہ رہ سکے بلکہ ترقی بھی کر سکے۔ دنیا اس وقت غذا اور اجناس خام سے پٹی پڑی ہے اور ان کی رسد میں اضافہ کے امکانات تو بے اندازہ ہیں مشکل بس یہ ہے کہ کوئی کسی کو غذا اور اجناس خام بھیج نہیں دیتا جب تک اس کی قیمت ادا نہ کی جائے اور ان کی قیمت زر رائج میں ادا نہیں کی جا سکتی جب تک کہ زر رائج کی مقدار اتنی نہ بڑھا دی جائے کہ اس اضافہ کی وجہ سے وہ بالکل بے قدر ہو جائے۔ صاف بات یہ ہے کہ ان کی قیمت اگر ادا ہو سکتی ہے تو دوسری اجناس سے یا خدمات سے، اور معاشی قومیت کے مسلک نے اجناس اور خدمات کے ادھر سے اُدھر جانے پر جان بوجھ کر پابندیاں عائد کر رکھی ہیں اصل معاملہ یہ ہے۔ اور نتیجہ بھی بالکل صاف ہے یعنی ہماری کوشش کا خاص مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ان پابندیوں کو ہٹایا یا یہ نہیں تو کم تو ضرور کیا جائے۔

جب تک دنیا اور جمیعۃ اقوام سر ہربرٹ کے مشورے پر عمل کرنے کے لئے آمادہ ہوں اٹلی تو "ناانصافی" کو مٹانے کے لئے ناانصافی اور ظلم ہی کے پرانے نسخے کا استعمال کر رہا ہے اور اسے اس سے روکنے والے بھی "ناانصافیوں" کے وجود کو تسلیم کر کے اس نسخے کے استعمال کی مخالفت سے رفتہ رفتہ دست کش ہی ہوتے معلوم ہوتے ہیں۔ خدا رحم کرے۔

ال-۱۹۳۷

فروری ۱۹۳۷ء

جامعہ

اردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

کا

ماہوار رسالہ

زیر ادارت

ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ایم اے۔ پی ایچ ڈی
پروفیسر محمد عاقل ایم اے

قیمت سالانہ ۵ر | مطبع جامعہ دہلی | فی پرچہ ۸ر

پیامِ تعلیم

بچوں کا سب سے اچھا ماہانہ رسالہ
باتصویر، نئی ترتیب، نئی شان

اُردو کے تمام رسائل میں طلبہ کے لئے پیامِ تعلیم سے زیادہ مفید کوئی رسالہ نہیں، رسالہ کیا ہے ایک شفیق استاد ہے، جغرافیہ، تاریخ، سائنس کے مضامین اور اخلاقی پند و نصائح، کہانیوں، نظموں، معموں کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے جماعت میں جن مضامین سے لڑکے جی چراتے ہیں، پیامِ تعلیم میں خوشی سے پڑھتے ہیں۔

پیامِ تعلیم میں وہ تمام باتیں ہوتی ہیں، جن کی اسکول کے لڑکوں کو ضرورت ہے اس رسالہ کی یہی خوبی دیکھ کر ماہرینِ تعلیم نے اس کو اسکولوں کے لئے سرکاری طور پر خرید کیا ہے۔ اُردو کے عام گندے لٹریچر سے بچانے کے لئے اسے واحد رسالہ تجویز کیا ہے۔

چندہ سالانہ دو روپے آٹھ آنے، فی پرچہ ۴؍

منیجر ”پیامِ تعلیم“ - جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

بسم اللہ

جامعہ

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی — پروفیسر محمد عاقل ایم اے

نمبر ۲	فروری سنہ ۱۹۳۶ء	جلد

فہرست مضامین

پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

مسئلہ آبادی کے متعلق جدید تحقیق

مسئلہ آبادی کا مفہوم اور اُس کی خصوصیات

دنیا کی معاشی تاریخ کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے ان سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ ہر ملک و ہر زمانے میں آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ ہمیشہ مفلسی اور محتاجی میں مبتلا رہا ہے۔ گذشتہ زمانے کا کیا ذکر موجودہ زمانے کے ان ممالک میں بھی جو متمدن و ترقی یافتہ خیال کئے جاتے ہیں بہت سے نفوس ایسے ہیں جنھیں پیٹ بھر کر غذا نہیں ملتی جنھیں اوڑھنے پہننے کو کافی کپڑا میسر نہیں، اور جن کے رہنے سہنے کے لئے کوئی معقول ٹھکانہ نہیں۔ مفلس اور محتاج آفت زدہ اور پریشان، مقروض اور گروی گانٹھوں کے جھگڑوں میں گرفتار یورپ ہی نہیں بلکہ متمدن، ترقی یافتہ، نوجواں، دولتمند اور جاندار امریکہ میں لاکھوں باشندے بے روزگاری کا شکار اور بیکاری کی مصیبت میں مبتلا ہیں، کروڑوں آدمی افلاس اور محتاجی میں زندگی بسر کر رہے ہیں لاکھوں فاقہ کشی کی مصیبت جھیل رہے ہیں اور انتہائی تنگدستی سے گذر کر رہے ہیں۔

اس عالمگیر بے روزگاری اور پریشانی کا سبب حقیقت میں وہ زائد آبادی ہے جس کی ضرورت ماحول کے بدل جانے کی وجہ سے باقی نہیں رہی ہے۔ جدید تحقیق نے اس امر کو بخوبی واضح کر دیا ہے کہ میکانکل ترقیات بالخصوص ذرائع آمدورفت کے انقلاب نے مسئلہ آبادی کی نوعیت کو یکلخت بدل دیا ہے۔ گذشتہ صدی کے اوائل تک ہر ملک کے لئے یہ ضروری تھا کہ اپنی آبادی کے لئے جس قدر خوردنی اشیا کی ضرورت ہو وہ اندرون ملک ہی پیدا کرے مگر صنعتی ترقی اور ریلوں اور دخانی جہازوں کی ایجاد نے دور دراز ممالک سے نہ صرف غلے بلکہ دودھ، دہی، مکھن، ترکاری، گوشت جیسی جلد سڑ جانے والی چیزوں کی درآمد نہ صرف ممکن بلکہ آسان اور نفع بخش کر دی ہے۔ اس طرح مسئلہ آبادی کی ملکی یا قومی نوعیت بدل کر عالمی یا بین الاقوامی ہو گئی ہے۔ علاوہ ازیں میکانیت کی محیر العقول ترقی نے پیدائش دولت کو آسان اور انسانی کے اشتراک عمل کو کم کر دیا ہے۔ یعنی یہ کہ دولت کا پیدا کرنا بہت زیادہ آسان ہو گیا ہے اور اس پیدائش

دولت کے لئے انسانوں کی ضرورت کم ہو رہی ہے۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جاتا ہے میکانی ترقیات کی وجہ سے برسرکار اشخاص بے کار ہوتے جا رہے ہیں۔ معمولی کام کاج کرنے والے افراد کی اہمیت کم ہو رہی ہے مگر باایں ہمہ نسل اور مقدار دولت میں اضافہ ہو رہا ہے جس کا نتیجہ دولت کی فراوانی اور عالمگیر بیکاری میں سود ادا ہو رہا ہے۔ چنانچہ بجز صورت جنگ کے ہر ملک و ہر زمانے میں بیکاروں کی ہمیشہ ایک عظیم تعداد رہی ہے۔ زمانہ جدید میں آپ کسی ملک میں بھی ایک بھی ایسی مثال نہیں ملتی کہ صلح و امن کے زمانے میں تمام طلبگاران محنت کو کمائی کے معقول وسائل دستیاب رہے ہوں جب وقتاً فوقتاً کساد بازاری مثل وبا کے پھیلنے لگتی ہے تو بے روزگاروں کی تعداد میں اور اضافہ ہوتا ہے اور مفلس، محتاج، فاقہ کش، پریشان افراد کی تعداد کروڑوں تک پہنچ جاتی ہے خلقت انسانی کا یہ جم غفیر کیا زائد از ضرورت مخلوقات عالم میں نہیں شامل کیا جا سکتا؟ کیا بے روزگاروں کی اس عظیم تعداد کا بار کمانے والوں پر نہیں پڑ رہا ہے؟ کیا یہ لوگ حقیقت میں زائد آبادی میں شمار کئے جانے کے مستحق نہیں ہیں؟ اور کیا ان کا وجود بقیہ آبادی کے لیے بجائے سہارے کے بوجھ کے مماثل نہیں ہے؟

میکانی ماحول کے بدل جانے اور فطرت حالات میں تغیر پیدا ہو جانے کی وجہ سے مسئلہ آبادی کی تحلیل کا دارومدار اب مقدار غذا پر نہیں رہا۔ لہٰذا عصر جدید میں تعداد آبادی کا تقابل مقدار دولت سے کرنا بے سود و بے معنی ہے۔ کیونکہ تاوقتیکہ لوگ برسر خدمت نہ ہوں اور کسی نہ کسی طرح کچھ نہ کچھ کماتے نہ ہوں ان کے لئے یہ ناممکن ہے کہ اس دولت سے مستفید ہوں۔ جو فی الوقت پیدا ہو رہی ہے یا بآسانی پیدا کی جا سکتی ہے۔ سرشت انسانی کی بدترین طینتوں میں وہ انتہائی خودغرضانہ ذہنیت ہے جس کی وجہ سے وہ نہ تو خود دولت سے مستفید ہوتا ہے اور نہ دوسروں کو متمتع ہونے کا موقع دیتا ہے نہ تو خود اس کثیر دولت کو استعمال کرتا ہے اور نہ مفلسوں، محتاجوں، غریبوں، ننگوں، بھوکوں اور فاقہ کشوں کو اس کثیر دولت سے مفت فائدہ اٹھانے کا موقع دیتا ہے۔ یہی سرشت انسانی ہے جو اپنے نفع کے لئے دوسروں کی مسرتوں کو ہی نہیں دوسروں کی زندگی کو بھی قربان کرنے کے لئے ہر وقت آمادہ رہتی ہے۔ ایسے عادات و اخلاق پر فخر کرنے والے اور مذہبیت و روحانیت پر ناز کرنے والے

ہندوستانیوں کا طرزِ عمل دیکھئے کہ انتہائی قحط اور پریشانی کے زمانے میں جبکہ لکھوکھا مخلوقِ خدا چاول کے دانے دانے اور روٹی کے ٹکڑے ٹکڑے کے لئے ترس رہی تھی وہ اپنی منڈیوں کا غلہ نفع کی خاطر بیرونی ملکوں کو برآمد کر رہے تھے۔ چنانچہ معاشیاتِ ہند کے مسلم الثبوت استاد رومیش چندر دت لکھتے ہیں:۔

"۱۸۷۷-۱۸۷۶ء میں جب ہندوستان انیسویں صدی کے سخت ترین قحط کے بالکل قریب تھا اس نے دوسرے سالوں کے مقابلے میں زیادہ غلہ برآمد کیا" [۵۱]

اسی طرح واڈیا اور جوشی نے اپنی مشترکہ تصنیف The Wealth of India میں لکھا ہے کہ:۔

"جب کہ سینکڑوں اور ہزاروں آدمی فاقہ سے ایک صوبہ میں مر رہے تھے قریب کے صوبے سے گیہوں اور غلہ دنیا کے دوسرے حصوں کو برآمد کر رہے تھے" [۵۲]

ہمیں اسی قسم کے انسانوں کی سرشت کو پیش نظر رکھتے ہوئے مسئلہ آبادی کی ماہیت اور نوعیت پر غور کرنا چاہئے۔ لہٰذا پیدائش دولت کی آسانیوں سے مسئلہ آبادی نہیں حل ہو سکتا اور صرف دولت کی فراوانی سے افلاس نہیں مٹ سکتا۔ آج اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ پیدہ شدہ دولت زیادہ سے زیادہ اشخاص کے درمیان تقسیم ہو اور تقسیم دولت کے لئے یہ لازمی ہے کہ پیدائش دولت میں زیادہ سے زیادہ اشخاص شریک رہیں تاکہ انھیں اپنی محنت کا معاوضہ ملے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ میکانی ترقی لوگوں کو پیدائش دولت میں شریک ہونے سے محروم کر رہی ہے اور موجودہ نظام معاشرت و سیاست کے تحت انھیں محنت میں دولت ملنی محال ہے لہٰذا یہ اور بھی ضروری ہے کہ تعداد آبادی اور ذرائع معاش یا تعداد خدمات میں توازن رکھا جائے۔ چنانچہ جدید تحقیق کا یہ سب سے بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے اس

R C Dutt "The Economic History of India in the Victorian age"-Kegan Paul London, 5th edition p 349 ۵۱

Wadia and Joshi · Wealth of India p. 277 ۵۲

حقیقت کا انکشاف کیا کہ مسئلہ آبادی کا مرکز ثقل ذرائع معاش ہے نہ کہ مقدار دولت لہذا مسئلہ آبادی کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے تعداد آبادی کا تقابل ذرائع معاش سے کرنا چاہئے نہ کہ اس مقدار دولت سے جو پیدا کی جارہی ہو یا پیدا کی جاسکتی ہو۔ لہذا یہ ثابت کرنا سعی لاحاصل ہے کہ موجودہ دولت میں کس قدر زیادہ اضافہ کیا جاسکتا ہے یا یہ کہ موجودہ زمانہ میں کس قدر دولت پیدا ہورہی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ پیدا شدہ دولت کیوں کر تقسیم ہورہی ہے اور تقسیم دولت میں حقدار ہونے کے لئے کتنے افراد برسرروزگار ہیں۔ یاد رہے کہ موجودہ زمانے میں مسئلہ آبادی کی نوعیت بالکل بدل گئی ہے وہ ملکی اور قومی مسئلہ نہیں رہا ہے بلکہ بین الاقوامی ہوگیا ہے۔ اس کا انحصار مقدار دولت پر نہیں رہا بلکہ اس کا دار و مدار اب ذرائع معاش پر ہوگیا ہے۔ میکانیت میں آئے دن ترقی ہوتی چلی جارہی ہے جس کی وجہ سے انسانوں کی کھپت کے مواقع کمتر ہوتے جارہے ہیں مگر آبادی ہے کہ تیز رفتاری سے بڑھتی چلی جارہی ہے جس کا لازمی نتیجہ طبقہ داری تصادم، فرقہ داری منافشات، بیکاری، بے روزگاری، تعطل، پریشانی، فاقہ کشی، مصیبت زدگی، افلاس اور محتاجی ہے!

پس ہندوستان کے مسئلہ آبادی پر غور کرتے وقت ہمیں اس امر کا خیال رکھنا چاہئے کہ آیا جس رفتار سے ہندوستان کی آبادی میں اضافہ ہورہا ہے اسی رفتار سے ذرائع معاش بھی بڑھ رہے ہیں یا نہیں؟ اگر اس سوال کا جواب ایجاب میں ہو تب بھی فخر و مسرت کی کوئی بات نہیں ہوسکتی کیوں کہ ترقی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جس معیار پر گذشتہ نسلوں نے زندگی گذاری تھی اسی معیار پر ہم بھی زندگی گذار دیں۔ ترقی کے لئے یہ لازمی ہے کہ معیار زندگی بتدریج بلند ہوتا جائے اور ہر نسل کا معیار آرام گذشتہ نسل کے معیار آرام سے بلند تر ہو[۵]۔ اسی مفہوم کو واضح کرنے کے لئے مسئلہ آبادی کے محققین نے آبادی کے متعلق ایک نہایت اہم

---

[۵] اس موضوع پر میں نے تفصیل اور وضاحت سے ایک اور مضمون میں بحث کی ہے جو "معیار زندگی۔ عمرانیاتی تشریح و توضیح" کے عنوان سے کلیۂ جامعۂ عثمانیہ کے سہ ماہی رسالے "مجلۂ عثمانیہ" (جلد چہارم شمارہ دوم و سوم بابت ۱۳۴۳ھ) میں شائع ہوا ہے۔

نظریہ پیش کیا ہے جسے انگریزی میں Optimum Theory of Population کہتے ہیں اور جس کا ترجمہ نظریہ موافق توازن آبادی کیا جاسکتا ہے۔

نظریہ موافق توازن آبادی | نظریہ موافق توازن آبادی سے مراد یہ ہے کہ ذرایع معاش اور تعداد آبادی میں موافق تناسب رہنا چاہئے ۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر زمانے اور ہر ملک میں حقیقی حالات کے تحت آبادی کی ایک خاص تعداد ہی انسانوں کے شایانِ شان معقول معیار آرام پر زندگی گذار سکتی ہے ، کیوں کہ ہر ملک وہر زمانے میں حقیقی حالات کی وجہ سے ذرایع معاش مقررہ ومعینہ ہوتے ہیں با لفاظ دیگر ہر ملک کی عمرانی ومعاشرتی قومی وسیاسی ، صنعتی وزراعتی ، تجارتی وکاروباری فنی وتعلیمی ، تمدنی ومعاشی حالت وحیثیت ، قابلیت واستطاعت کے موافق اس ملک میں ایک خاص تعداد آبادی ہی کو معقول معیار زندگی پر پالنے کی صلاحیت رہتی ہے ۔ اگر ملک کی آبادی اس حد وانتہا کو پہنچ جائے تو ملک میں فلاح وبہبودی کے آثار صاف نظر آئیں گے کیوں کہ آبادی کی تعداد سے زیادہ ذرایع معاش کی تعداد رہےگی ۔ اسی طرح اگر ذرایع معاش کے اضافے کے ساتھ ساتھ آبادی میں بھی اضافہ ہو تو آبادی اور ذرایع معاش میں موافق توازن رہے گا جس کا نتیجہ عام مرفہ الحالی وخوشحالی ہوگا ۔ برخلاف اس کے اگر ذرایع معاش سے زیادہ روزگار کے متلاشی افراد ہوں اور ان طلبگاران روزگار کی تعداد میں تیز رفتار سے اضافہ ہوتا جائے تو نتیجہ پریشان حالی سراسیمگی ، غربت وافلاس ہوگا ۔

اس تشریح سے ظاہر ہے کہ ہر ملک میں ایک خاص تعداد افراد کے پالنے کی سکت ہوتی ہے ۔ اگر حالات بدل جائیں تو یہ تعداد بھی حالات کے موافقت یا عدم موافقت کی وجہ سے زیادہ یا کم ہوجائے گی ۔ مثلاً اگر سیاسی اندھیر کے بجائے ملکی خوش انتظامی قایم ہوجائے مصلحین معاشرت کی کوششوں کی وجہ سے ملک کی عمرانی زندگی معاشی جدوجہد کے لئے فیض رساں ہوجائے ، راجا اور پرجا ، رعایا اور عہدیدار ایک دوسرے کے بہی خواہ ہوجائیں ، عام تعلیم کے علاوہ صنعتی وزراعتی تجارتی وکاروباری تعلیم کا وسیع پیمانے پر انتظام کردیا جائے ، صنعت وحرفت کی سرپرستی معاشرت وسلطنت کرنے لگیں ، ملک میں ایسے سپوت پیدا ہوں جن کی رہنمائی قوم تسلیم کرے اور ان کے ہدایات پر عمل پیرا ہو تو لازماً ملک کی

عام استطاعت بڑھ جائے گی اور وہ معقول معیار آسائش پر زیادہ تعداد میں آبادی کو پال سکے گا یعنی ملک کی متوازن آبادی (Optimum Population) بڑھ جائے گی برخلاف اس کے اگر کسی ملک میں سیاسی بدنظمی شروع ہو جائے مصلحین معاشرت کا فقدان ہو، رہبران کامل عنقا ہو جائیں، سپوتوں کے بجائے کپوت پیدا ہونے لگیں، خودغرضیاں حد اعتدال سے تجاوز کر جائیں سلطنت معاشی جد و جہد میں بیجا مداخلت کرنے لگے، صنعت و حرفت کس مپرسی کی حالت میں پڑی رہیں، صنعتی و زراعتی مدرسے بند کر دئے جائیں پیشہ اور کاروباری تعلیم کا معقول انتظام نہ رہے اور عام تعلیم بھی ناقص ہو تو اس ملک میں زوال کے آثار جا بجا نظر آئیں گے، ذرائع معاش کم ہو جائیں گے اور اس ملک کی آبادی کو معقول معیار آرام پر پالنے والی صلاحیت کم ہو جائے گی۔ اصطلاحی زبان میں اسی مفہوم کو یوں ادا کیا جاتا ہے کہ اس ملک کی متوازن آبادی Optimum Population کم ہو جائے گی۔

نظریہ سوال توازن آبادی کو بخوبی سمجھنے کے لئے موجودہ زمانے کے چار مختلف النوع ممالک کی حالت پر غور کیجئے۔ ایک طرف انگلستان اور جاپان اور دوسری طرف چین و ہندوستان۔

انگلستان اور جاپان معاشی نقطۂ نظر سے بجا طور پر ترقی یافتہ کہلاتے ہیں کیوں کہ علاوہ سیاسی حوش انتظامی و ملکی آزادی کے ان ملکوں کی عمرانی و معاشرتی کاروباری و تجارتی، زراعتی و صنعتی، تمدنی و معاشی حالت باوجود کئی خرابیوں اور برائیوں کے بحیثیت مجموعی اطمینان بخش اور نیم ترقی یافتہ ممالک کے لئے قابل رشک ہے۔ خصوصاً تعلیمی حالت بہت اچھی ہے علاوہ ابتدائی جبری تعلیم کے ہر قسم کی تعلیم کا معقول انتظام ہے اور لکھو کھا تعلیم گاہوں اور درس گاہوں میں قوم کو تجارتی، زراعتی، کاروباری، پیشہ وری، صنعتی یا فنّی تعلیم سے مستفید ہونے کا موقع حاصل ہے اور ان مواقع سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب و تحریص کی جاتی ہے۔ ساتھ ہی اقبال و خوش نصیبی سے ایسے افراد پیدا ہوتے جاتے ہیں جنھیں قومی ترقی سے سچی ہمدردی ہوتی ہے اور وہ اپنے اپنے کاموں میں مستغرق ہونے کے باوجود قوم کی تربیت کے لئے وقت اور موقع ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ اور اپنی کوشش سے لاکھوں کو فیض پہنچاتے ہیں۔ کسی کو علم و ادب کی دھن ہے، کوئی تحقیق و تفتیش میں بے خود ہے، کسی کو کاروبار میں انقلاب پیدا کرنے کی خواہش ہے۔ کوئی

اپنی چرب زبانی اور سحر بیانی سے قوم کو تیز تر رفتار سے ترقی کرنے کی ہمت دلا رہا ہے، کوئی بڑے بڑے بنک قایم کر رہا ہے کسی کو زراعت سے دلبستگی ہے اور کسی کو نو آبادیات کی ترقی کا شوق ہے، مگر باوجود ان گوناگوں کاموں اور مختلف النوع خدمتوں کے مشترکہ خصوصیت عام ہے کہ سب کے دل میں قوم کی سچی ہمدردی موجزن ہے۔ غرضکہ ہر ایک اپنی اپنی دھن میں مست ہے اور اپنی انتہائی صلاحیت سے ہر ممکن طریقہ پر علم و عمل کے ذرایع ملک کی نفع بخش خدمت کرنے میں لگا ہے۔

برخلاف ان ممالک کے چین و ہندوستان کی حالت پر غور کیجئے دونوں محکوم - ایک ظاہراً آزاد مگر باوجود ظاہراً آزادی کے حقیقی غلام۔ دونوں غافل دونوں جاہل اور دونوں کاہل! نہ حکومت رعایا کی رفیق و مددگار نہ رعایا حکومت کی ہمدرد و بہی خواہ۔ آپس میں لڑائی، حکومت سے لڑائی، بھائی بھائی سے لڑائی۔ نہ خلوص نہ استقلال نہ ہمت نہ کمال اتحاد و اتفاق باہمی ہمدردی دلچسپی اولوالعزمی اور جفاکشی بحیثیت قومی خصوصیات کے مفقود ہیں شاذ و نادر ہی ہمیں ایسے لوگ ملتے ہیں جن میں فرض شناسی کا جوہر ہو ورنہ عام طور پر لاپرواہی اور بے حسی سب پر طاری ہے ایسی صورت میں ان ممالک کی آبادی اگرچہ ۳۵ کروڑ کی حد سے تجاوز کر گئی ہے مگر حقیقت میں یہ ممالک معقول معیار آرام پر ۱۰ کروڑ کو بھی نہیں پال سکتے۔ اس کے یہ معنے ہوئے کہ اگرچہ ہندوستان کی حقیقی آبادی ۳۵ کروڑ ہے مگر اس کی متوازن آبادی فی الحال موجودہ حالات کا اعتبار کرتے ہوئے صرف ۵ کروڑ تصور کی جا سکتی ہے محض اس لئے کہ چین اور ہندوستان کی حقیقی آبادی موافق توازن آبادی کی حد سے تجاوز کر چکی ہے ان ملکوں میں بیماریوں اور وباؤں کی کثرت ہے، محتاجی اور مفلسی چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اور غربت و فاقہ کشی کی وہ شدت و وسعت ہے کہ اس کی مثال روئے زمین پر کہیں اور نہیں ملتی! شرم و غیرت سے، ندامت و خجالت سے ہمیں اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ باوجود کئی ہزار سالہ مشرقی تہذیب و تمدن کے اور باوجود صدیوں کی مغربی حکومت کے آج ہندوستان دنیا کا مفلس ترین ملک ہے اور ذرایع معاش کی ایسی قلت ہے کہ اگر سب کو معقول معیار آرام پر زندگی گذارنے کا موقع ملے تو آج ہندوستان کی "متوازن" آبادی ۵ کروڑ کے لگ بھگ نظر آئے گی حالانکہ حقیقتاً یہاں کی آبادی ۳۵ کروڑ سے زاید ہے تو کیا اس کے معنے یہ ہوئے کہ ہندوستان میں کثرتِ آبادی ہے اور یہ ملک

کثیر الآباد ہے ؟ مغربی علما اور انگریز حکام کی اکثریت اس نتیجہ پر پہنچ چکی ہے کہ ہندوستان کثیر الآباد ملک ہے مگر اس خیال کی تردید کے لئے یہ کہنا کافی ہے کہ ہندوستان میں توسیع کاشت اور ترقی صنعت کے بے شمار امکانات ہیں ساتھ ہی ہندوستان کی کثرت آبادی سے انکار کرنا بھی ممکن نہیں۔ کیونکہ بڈھوں، اپاہجوں اور معذوروں کے علاوہ ہندوستان کے کروڑہا افراد محتاجی و مفلسی میں مبتلا ہیں اور لاکھوں بے روزگار پائے جاتے ہیں پھر کیا تعجب اگر کوئی یہ نتیجہ اخذ کرے کہ ہندوستان کثیر الآباد ملک ہے اور کثرت آبادی کے سبب غربت و ناداری کا دور دورہ ہے جس کا نتیجہ بیماریوں اور وباؤں کی کثرت، اور فاقوں اور قحطوں کی وسعت و شدت میں نمودار ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ اس سوال کے جواب میں کہ آیا ہندوستان کثیر الآباد ہے اقرار و انکار دونوں ناممکن ہیں۔ اس کا خاطر خواہ جواب اسی صورت میں دیا جا سکتا ہے جبکہ جدید تحقیق کی روشنی میں کثرت آبادی کا مفہوم واضح کیا جائے۔

کثرت آبادی۔ عمرانی تجزیہ و تشریح

کثرت آبادی کے مفہوم کے متعلق جو عمرانیاتی تحقیق ہوئی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کثرت آبادی کی دو قسمیں ممکن ہیں جن کو مطلق کثرت آبادی اور اضافی کثرت آبادی کہا گیا ہے۔ اور اس تشریح کے بموجب وہی ملک مطلق معنے میں کثیر الآباد کہا جا سکتا ہے جو باوجود مکمل سیاسی حریت انتظامی اور مکمل بہترین معاشی نظام کے اتنے ذرائع معاش فراہم نہ کر سکے جو تمام آبادی کے کے لئے کافی ہوں یعنی یہ کہ تمام پیدائش دولت کے طریقے اختیار کرنے، تمام قدرتی دولت کے ذرائع سے استفادہ کرنے اور تمام معلوم شدہ دریافت کردہ طریقوں کو منطبق کرنے اور انسانوں کی انتہائی اہلیت کے مطابق بہترین تعلیم اور حکومت کا معقول ترین انتظام کرنے کے باوجود بھی اگر کسی ملک میں اتنی دولت نہ پیدا کی جا سکے جو تمام آبادی کے لئے کافی ہو تب کہیں ہم اس ملک کو مطلق معنے میں کثیر الآباد کہیں گے ان ممکن بہترین حالات کے تحت میں جب موجودہ آبادی کے لئے ذرائع معاش ناکافی ہوں اور یہ زاید آبادی کسی طرح بھی پیدا آور کام نہ کر سکے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس ملک میں مطلق کثرت آبادی ہے۔ صحرائے اعظم میں بسنے والی آبادی کی غربت کا بڑا راز یہ معاشی جغرافیائی حقیقت ہے کہ کسی طرح بھی اس صحرائے اعظم کو ایک سرسبز و شاداب ملک میں نہیں بدلا جا سکتا۔ کم از کم انسانی عقل و فراست سے یہ باہر ہے اور انسانوں کا ذخیرہ معلومات اس

قسم کا کرشمہ کرنے سے فی الحال قاصر ہے کیونکہ بنی نوع انسان کو کوئی ایسی ترکیب معلوم نہیں جس سے صحارا ڈیزرٹ تھل شمالی ہندوستان کے زرخیز ہو جائے اور اسی طرح وہاں کروڑوں کی تعداد میں انسانی مخلوق آباد ہو سکے۔ اسی طرح وہ ممالک جہاں قدرتی خزانوں کے دفینے موجود نہ ہوں، جہاں قیمتی دھاتیں معدوم اور مفید دھاتوں کی کانیں معدوم ہوں صنعتی ترقی سے قدرتی طور پر محروم کر دیئے گئے ہیں اور کبھی توقع نہیں کر سکتے کہ وہ کسی طرح بھی بہت زیادہ ذرائع معاش مہیا کر سکیں گے قدرتی مجبوریوں کے آگے عقل انسانی عاجز آجاتی ہے معاشی موانعات کے سامنے فراست بشری قاصر ہو جاتی ہے اسے اپنی مجبوری و بے بسی کا دل شکن احساس ہوتا ہے اور اسے اپنی بے بضاعتی و بے اختیاری کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ مگر یہ مجبوری و بے بسی، بے بضاعتی و بے اختیاری اسی وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ قدرتی حالات یک لخت خلاف ہوں اور بہتری کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ بہت کم حصہائے ممالک ایسے ہیں جہاں قدرتی موانعات اور معاشی جغرافیائی خصوصیات کی وجہ سے توسیع زراعت و ترقی صنعت و حرفت قطعی طور پر ناممکن ہو۔ یہ تو ہم باور کر سکتے ہیں کہ قطبین کے قرب و جوار کی وسیع زمینوں سے انسان فی الحال متمتع نہیں ہو سکتا مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ چین سے غربت، ایران سے افلاس اور ہندوستان سے محتاجی معاشی جغرافیائی اسباب کی بنا پر دور نہیں کی جا سکتی کیونکہ مثل افریقہ اور امریکہ کے یورپ اور ایشیا کے اکثر حصوں میں ترقی صنعت اور توسیع زراعت کے وسیع امکانات ہیں کم از کم معاشی جغرافیائی خصوصیات ایسی نہیں ہیں جو ترقی میں سد راہ ہوں لہٰذا ان ممالک میں یا جہاں افراد کی غلطیوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے یا جماعتوں کی غلط کاریوں اور نادانیوں کے سبب سے اقوام کی بدعقلی اور بدعملی کی بنا پر کافی ذرائع معاش مہیا نہ کئے جا سکتے ہوں اور آبادی کی ایک کثیر تعداد ہلاکت و ناداری، مفلسی و محتاجی، تہیدستی و فاقہ کشی میں مبتلا رہتی ہو۔ صرف اضافی کثرت آبادی پائی جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر یہ ممالک صرف اضافی معنے میں کثیر الآباد ہیں

کثرت آبادی کی اس تقسیم سے واقف ہونے کے بعد اب ہم بآسانی اس سوال کا جواب دے سکتے ہیں کہ ہندوستان کثیر الآباد ہے یا نہیں۔ اس سوال کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ ہندوستان مطلق معنی

میں کثیر آبادی نہیں ہے بلکہ ہندوستان میں اضافی کثرت آبادی پائی جاتی ہے کیوں کہ ہندوستان میں اب بھی توسیع زراعت کے متعدد ذرائع موجود ہیں اور ترقی صنعت کی بھی بہت گنجائش ہے ماہرین زراعت نے اندازہ کیا ہے کہ اگر ہندوستان میں توسیع کاشت کے اُن تمام ذرائع سے استفادہ کیا جائے جن کا علم بنی نوع انسان کو ہو چکا ہے تو موجودہ زرعی پیداوار کی مقدار میں دس گنا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ زرعی پیداوار کے متعلق ہم نے تخمینہ کیا تھا کہ وہ صرف ۵ کروڑ افراد کو انسانوں کے شایانِ شان معقول معیار آرام پر پالنے کے لئے کافی ہے لہٰذا اس صورت میں جب کہ ہندوستان کی زرعی پیداوار دس گنی ہو جائے گی ہندوستان کم از کم ۵۰ کروڑ انسانوں کو معقول معیار آرام پر پال سکے گا اگر توسیع زراعت کے ساتھ ساتھ ہم ترقی صنعت و حرفت کے لئے بھی کوشاں رہیں تو ہندوستان کے لئے یہ بآسانی ممکن ہے کہ وہ ایک ارب انسانوں کو اعلیٰ معیار آرام پر پال سکے۔ جو حالت ہندوستان کی ہے اس سے بہتر یا بدتر تمام ممالک مشرق و مغرب کی ہے ہر جگہ بالخصوص مشرق میں ہم کو یہی صورت حال نظر آتی ہے کہ قدرت کے لامحدود ذرائع کو نظر انداز کیا جا رہا ہے اور تجارتی دفینوں اور قدرتی ذرائع تکثیر دولت سے کما حقہ' فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا ہے جرمانیہ کے ممتاز ماہر معاشیات پروفیسر پینگ نے اندازہ کیا ہے کہ وادی میسیپی اور امیزون میں اتنے وسیع قطعات موجود ہیں جن پر تمام یورپ کی آبادی منتقل کی جا سکتی ہے۔ صرف جنوبی امریکہ میں جس کا رقبہ ہندوستان کے مجموعی رقبے سے دوگنا ہے ڈیڑھ دو ارب انسانوں کو پالنے کی صلاحیت ہے حالانکہ وہاں کی حقیقی آبادی صرف ۲۲ کروڑ ہے۔ اس کے یہ معنے ہوئے کہ صرف جنوبی امریکہ میں اب بھی ۱۰ گُنے اضافے کی گنجائش موجود ہے۔ اگرچہ توسیع زراعت و ترقی صنعت کے بے شمار ذرائع ہر جگہ نظر آتے ہیں مگر ساتھ ہی ہر جگہ دائمی بے روزگاری، شدید افلاس اور وسیع غربت پائی جاتی ہے۔ باوجود ان بے شمار قدرتی ذرائع کے انسان صدیوں سے مصیبت کی زندگی بسر کر رہا ہے، نوکریاں نہ ملنے کی ہر جگہ شکایت ہے، تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی تعداد ہر ملک میں بسرعت بڑھ رہی ہے اور تقریباً ہر پیشے میں فالتو لوگوں کا وجود مصیبت کا باعث ہو رہا ہے۔ انہی عجیب و غریب حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بظاہر متضاد نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں کہ آج دنیا کے کسی ملک میں مطلق کثرت آبادی نہیں پائی جاتی حالانکہ ہر ملک میں اضافی کثرت

آبادی پائی جاتی ہے امریکہ اور انگلستان جیسے دولتمند اور طاقتور ممالک میں اضافی کثرت آبادی کی تمام
نشانیاں موجود ہیں۔ لاکھوں تعلیم یافتہ، ہنرمند اور محنت پسند افراد نوکریوں کے متلاشی ہیں
لاکھوں انتہائی تنگدستی سے پست ترین معیار زندگی پر گذر کر رہے ہیں۔ لاکھوں بے خانماں برباد بھٹکتے
پھر رہے ہیں، نہ ان کو رہنے سہنے کے لئے ٹھکانا، نہ پہننے اوڑھنے کو کافی لباس ہے نہ کھانے پینے کے
لئے صحت بخش غذا میسر ہے پھر دیکھئے تو امریکہ ایک وسیع براعظم ہے جس کا رقبہ ہندوستان کے رقبے
سے سات گنا زیادہ ہے اور انگلستان کے قبضہ میں ایک وسیع سلسلہ مقبوضات و نوآبادیات کا ہے جس کا
مجموعی رقبہ انگلستان کے رقبہ سے ڈیڑھ سو گنا زیادہ ہے۔ باوجود اس وسعت و شہنشاہیت کے،
باوجود تعلیم اور میکانیت کے، باوجود علم و دانش کے، اور باوجود بیسویں صدی کی روشن خیالی اور جمہوری
حکومت کے انگلستان میں ۲ لاکھ سے زیادہ بے روزگار اور نصف کروڑ سے زیادہ انتہائی مفلسی و محتاجی
میں گذر کرنے والے انگریز ہیں جب انگلستان و امریکہ کی یہ حالت ہو تو ہندوستان و چین کا کیا ذکر!
جب بہار عالم کی یہ شان ہو تو خزاں کا کیا ٹھکانا!؟ جب حاکم سلطنت کی خود مختار رعایا لاکھوں کی
تعداد میں غربت سے بسر کر رہی ہے تو محکوم سلطنتوں کی آبادی کا کیا ذکر! جب "متمدن" ممالک میں بسنے
والی مہذب قومیں افلاس و ناداری میں گرفتار ہوں تو "قدیم" ممالک میں بسنے والی "دقیانوسی" "جاہل"
قوموں کا کیا ذکر! جب ہنرمند و اقبال مند قوموں کی یہ داستان ہو تو بے ہنر اور بدنصیب قوموں کا کیا ذکر!
جب دولت مند اقوام کا یہ حشر ہو تو مفلس قوموں کا کیا ذکر! وہ تمام برائیاں جو مغربی یورپ اور شمالی
امریکہ میں پائی جاتی ہیں تمام ایشیائی ممالک میں وہ چند شدت و وسعت سے نظر آتی ہیں! (باقی)

نظام الملک کے آباؤ اجداد

سلطنت بخارا میں سمرقند کے قریب ایک قصبہ می آباد ہے۔ یہیں نظام الملک کے دادا خواجہ عابد پیدا ہوئے تھے۔ لیکن اپنے وطن کو چھوڑ کر انھوں نے بخارا میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی جہاں انھیں اپنی قابلیت منوانے کا زیادہ موقع تھا۔ خواجہ صاحب عالم شیخ کے صاحبزادہ تھے جو اپنے زمانہ کے ایک مشہور صوفی اور عالم تھے شاہ بخارا نے انھیں اعظم العلماء کے لقب سے سرفراز کیا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت بھر میں وہ سب سے زیادہ عالم و فاضل تھے خواجہ عابد کی والدہ میر ہمدان کے خاندان سے تھیں جو سمرقند کے ممتاز سید تھے۔ عالم شیخ کا آبائی وطن دراصل کردستان کا ایک چھوٹا سا گاؤں سہرورد ہے اور وہ اپنا شجرہ نسب شیخ شہاب الدین سہروردی سے ملاتے ہیں جو ایک بڑے روحانی رہنما تھے اور جنھوں نے تصوف پر بہت سی کتابیں بھی لکھی ہیں اور یہ بزرگ اپنا شجرہ نسب حضرت ابوبکرؓ خلیفۂ اول تک پہنچاتے ہیں[1]

کہا جاتا ہے کہ عالم شیخ روحانی قوتوں کے مالک تھے۔ وہ اپنے بے شمار مریدوں کو ریاضت اور عبادت

---

[1] شجرہ نسب حسب ذیل ہے

(۱) شیخ شہاب الدین
(۲) ابو محمد حفظ
(۳) شیخ قطب الاقطاب زین الدین
(۴) شیخ علاؤ الدین
(۵) شیخ تاج الدین
(۶) شیخ فتح اللہ
(۷) شیخ نجیب اللہ
(۸) شیخ جاوید المعروف سرمست
(۹) شیخ فتح اللہ ثانی
(۱۰) شیخ جاوید ثانی
(۱۱) محمد درویش
(۱۲) شیخ محمد مومن
(۱۳) میر محمد عالم صدیقی
(۱۴) عزیزان عالم
(۱۵) خواجہ میر اسمٰعیل المعروف عالم شیخ
(۱۶) خواجہ عابد

کے طریقے لوگوں کو بتایا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے بیٹے خواجہ عابد کو مذہبی تعلیم دی اور یہ اپنے والد کی وفات کے بعد بخارا چلے آئے۔ حکومت کے ارباب حل وعقد نے ان کی ذہانت اور قابلیت دیکھ کر انہیں قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کیا جسے انھوں نے قبول کر لیا۔ چند دنوں کے بعد ان کو شیخ الاسلام بنا دیا گیا جو حکومت میں ایک بہت اہم عہدہ تھا۔

شاہجہانی عہد حکومت کے انتیسویں برس حج کے لئے مکہ جاتے ہوئے آپ ہندوستان تشریف لائے اور اپنے آپ کو شاہی دربار میں پیش کیا جہاں خلعت کے علاوہ آپ کو چھ ہزار روپئے کی تھیلی عنایت کی گئی۔ آپ کو شاہی ملازمت میں ایک عہدہ بھی پیش کیا گیا اور آپ نے وعدہ کیا کہ مکہ سے واپسی کے بعد اس کو قبول کر لیا جائے گا۔

۱۰۶۷ھ (۱۶۵۷ء) میں خواجہ عابد حج سے واپس آئے یہاں آکر معلوم ہوا کہ شاہجہاں سخت بیمار ہے اور اس کے لڑکے شاہی تخت حاصل کرنے کے لیے جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ یہ سن کر سیدھے اورنگ زیب کے پاس دکن چلے گئے۔ شجاع اور مراد اپنی بادشاہت کا اعلان کر چکے تھے مگر اورنگ زیب احتیاط اور حکمت عملی سے کام لے رہا تھا۔ وہ فوراً بیجاپور سے روانہ ہو کر شمالی حدود میں پہنچ گیا اور بہانہ یہ کیا کہ وہ شاہی احکام کی پیروی کر رہا ہے۔ اس اچانک روانگی کی وجہ سے اکثر ورانی مغل سپاہی بہت بددل ہو گئے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ان کو اس پھل سے محروم کیا گیا جو انھیں طویل مشقت و محنت کے بعد ملنے والا تھا۔ بہت سے مغل افسر بھی اورنگ زیب کی ملازمت سے الگ ہو گئے۔

یہ حالات تھے جب خواجہ عابد نے اس کی ملازمت میں داخل ہونے کی درخواست کی۔ اورنگ زیب نے انھیں اپنی خاص تورانی فوج میں جو شاہی افواج کا ایک اہم عنصر تھی ایک بڑا عہدہ دے دیا خواجہ عابد عالم وفاضل ہونے کے علاوہ جنگ کے قوانین سے بھی خوب واقف تھے ان کی شرکت کے سبب اورنگ زیب کو بہت فایدہ ہوا کیونکہ ان کی سعی اور کوشش سے ان کے ہم وطن اورنگ زیب کے جھنڈے کے پیچھے جمع ہو گئے۔

۱۸ فروری ۱۶۵۸ء کو اورنگ زیب برہان پور پہنچا اور اپنا وقت گذارنے کے لئے ایک ماہ تک

وہاں ٹھہرا رہا۔ اسی دوران میں داراشکوہ نے حکومت کے تقریباً تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے اور تمام وہ سڑکیں جو بنگال احمد آباد اور دکن کو جاتی تھیں، بند کر دی تھیں۔ کوئی مسافر یا پیغام بر کہیں آجا نہیں سکتا تھا۔ (خافی خان۔ جلد دوم ص ۴) اورنگ زیب مراد کو اپنی طرف کرنے میں کامیاب ہوگیا اور اس نے پختہ وعدہ کیا کہ سترک دشمن پر حملہ کرنے سے قبل وہ اجین میں اورنگ زیب سے آملے گا۔ برہان پور کے قیام میں اورنگ زیب نے خواجہ عابد کو ۴۰۰۰ ذات، ۵۰۰ اسپ اور خان کے لقب سے سرفراز کیا (ماثرالامرا۔ جلد سوم۔ ص ۱۲۱) اجین جاتے ہوئے انھیں ایک خلعت، ایک گھوڑا، ایک ہیروں سے جڑا ہوا خنجر اور ایک جواہرات سے ٹکی ہوئی پیٹی بھی مرحمت ہوئی (عالمگیر نامہ ص ۴۵)۔

جب داراشکوہ کو اورنگ زیب اور مراد کے ارادوں کی خبر ہوئی تو اس نے مارواڑ کے راجہ جسونت سنگھ اور قاسم خاں کو حکم دیا کہ وہ فوراً مالوہ کی طرف روانہ ہوں تاکہ ان دونوں کو وہیں روک دیا جائے مراد اپنی فوج سمیت اجین میں اورنگ زیب سے آملا۔ ان دونوں کی فوجوں نے راجہ جسونت سنگھ کی فوج پر حملہ کیا جو اجین کے نواح میں دریائے سپرا کے کنارہ موجود تھی۔ ایک خونی جنگ کے بعد راجہ کی فوج کو شکست ہوئی اور اس کے سپاہی مختلف سمتوں میں بھاگ گئے۔ راجہ بھی فرار ہو کر اپنے دارالخلافہ جودھ پور میں پہنچ گیا۔

اس لڑائی میں خواجہ عابد نے بہت نمایاں حصہ لیا تھا چنانچہ اس کے خاتمہ پر انھیں چار ہزاری کا عہدہ دیا گیا۔ (عالمگیر نامہ ص ۷۶، ماثرالامرا حصہ سوم ص ۱۲۱) اورنگ زیب کو ان پر اس قدر بھروسہ تھا کہ ہزر ( ) خاں اور ذوالقدر خاں کے ساتھ ان سے بھی کہا گیا کہ دارالسلطنت جاتے ہوئے اس کے ساتھ رہیں (عالمگیر نامہ۔ ص ۴۲)

سموگڈھ کی جنگ میں جو جون ۱۶۵۸ء میں ہوئی تھی خواجہ عابد اورنگ زیب کے ساتھ تھے۔ اس میں داراشکوہ کو شکست ہوئی اور اس کی قوت کا خاتمہ ہو گیا خواجہ عابد بھی ان لوگوں میں سے ہوں گے جن کو اورنگ زیب نے زر و جواہر سے مالا مال کر دیا اور جن کی تعریف و توصیف بھی کی تھی۔ وہ لوگ جو اورنگ زیب پر کافی اثر رکھتے تھے اور جنھوں نے لڑائیوں میں اپنی قوت و مردانگی کا ثبوت دیا تھا ان کے

نام یہ ہیں خواجہ عابد، مخلص خاں اور منعم خاں ۔ اورنگ زیب اپنے دشمنوں کے خلاف لڑائی کا جو خاکہ سوچتا تھا اس میں ان تینوں سے ضرور مشورہ لیا جاتا تھا۔

اورنگ زیب جب سربرآٰئے حکومت ہوا تو پہلے چار سال ملک میں امن و امان قایم کرنے پر صرف ہوئے اور اس تمام مدت میں خواجہ عابد بڑے اختیار سے کام کرتے رہے داراشکوہ، شجاع اور جسونت سنگھ کے خلاف جو مہمات بھیجی گئیں ان میں یہ بھی شامل تھے ان لڑائیوں میں بحیثیت سپاہی کے انھوں نے بہت شہرت حاصل کی (عالمگیر نامہ ص ۲۴۰ ، ۷۰۰) چوتھے سال الور کے نواح میں ان کو میوات کا فوجدار مقرر کیا گیا ۔ جہاں میووں نے سرکشی اختیار کر رکھی تھی اور بعض اوقات تو لوٹ مار کرتے ہوئے دہلی کی دیواروں تک آجاتے تھے ایک سال تک وہ اس عہدہ پر فائز رہے ، اس کے بعد شیخ میراک[1] کی جگہ انھیں صدر کل کے عہدہ پر متعین کیا گیا ۔ یہ ایک بہت اہم عہدہ تھا کیونکہ اس کا عہدہ دار شاہی وزارت کا رکن سمجھا جاتا تھا اور خیرات کے لئے معافی کی زمینوں کی تقسیم اسی کے ذمہ ہوتی تھی ۱۶۶۵ء میں خواجہ عابد کے عہدہ میں اور اضافہ ہوا اور ایک ہاتھی بھی انھیں مرحمت کیا گیا (عالمگیر نامہ ص ۸۵۵) صدر کل کے عہدہ پر تقریباً چھ سال تک یہ فائز رہے ۔

۱۶۶۸ء میں صدر کل کے عہدہ پر شیخ میراک کے لڑکے رضوی خاں کو مقرر کیا گیا اور انھیں صوبہ اجمیر

---

[1] میراں سید جلال بخاری جو شیخ میراک کے نام سے زیادہ مشہور ہیں جہانگیر کے عہد میں خراسان سے ہندوستان آئے ۔ لاہور میں ملا عبدالسلام کے حلقہ میں داخل ہوئے جو ایک مشہور عالم تھے اور فقہ و حدیث میں پچاس سال تک درس دیتے رہے ۔ شاہ جہاں نے شیخ میراک، کو اپنے شہزادوں کا اتالیق مقرر کیا عہد شاہ جہانی کے اٹھائیسویں سال انھیں پانچ سو ذات اور پچاس سوار کا منصب دیا گیا جب اورنگ زیب تخت نشین ہوا تو انھیں تین ہزاری کا منصب دیا گیا اور اگلے سال سید ہدایت اللہ قادری کی بجائے صدر کل بنا دئے گئے بڑھاپے کی وجہ سے وہ اپنے فرائض اچھی طرح ادا نہیں کر سکتے تھے اس لئے ۱۶۶۶ء میں وہ الگ ہو گئے اور دو سال کے بعد ان کا انتقال ہو گیا (مآثر الامرا جلد سوم ص ۵۱۹) ۔

وہاں ٹھہرا رہا۔ اسی دوران میں داراشکوہ نے حکومت کے تقریباً تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے اور تمام وہ سڑکیں جو بنگال احمد آباد اور دکن کو جاتی تھیں، بند کر دی تھیں۔ کوئی مسافر یا پیغام بر کہیں آ جا نہیں سکتا تھا۔ (خافی خان۔ جلد دوم ص ۴) اورنگ زیب مراد کو اپنی طرف کرنے میں کامیاب ہو گیا، اس نے پختہ وعدہ کیا کہ سلطنت کی تقسیم پر حملہ کرنے سے قبل وہ اجین میں اورنگ زیب سے آ ملے گا۔ برہان [illegible] کے قیام میں اورنگ زیب نے خواجہ عابد کو ۳ ذات، [illegible] اسپ اور خان کے لقب سے سرفراز [illegible] (ماثر الامرا۔ جلد سوم۔ ص ۱۲۱) انہیں عطا ہوئے انہیں ایک خلعت، ایک گھوڑا، ایک ہیرا جڑا ہوا خنجر اور ایک جواہرات سے جڑی ہوئی پیٹی بھی مرحمت ہوئی (عالمگیر نامہ ص۔ ۴۵)۔

جب داراشکوہ کو اورنگ زیب اور مراد کے ارادوں کی خبر ہوئی تو اس نے مارواڑ کے جسونت سنگھ اور قاسم خاں کو حکم دیا کہ وہ فوراً مالوہ کی طرف روانہ ہوں تاکہ ان دونوں کو [illegible] جائے۔ مراد اپنی فوج سمیت اجین میں اورنگ زیب سے آ ملا۔ ان دونوں کی فوجوں نے [illegible] سنگھ کی فوج پر حملہ کیا جو اجین کے نواح میں دریائے سپرا کے کنارے موجود تھی۔ ایک خونی [illegible] راجہ کی فوج کو شکست ہوئی اور اس کے سپاہی مختلف سمتوں میں بھاگ گئے۔ راجہ [illegible] دار الخلافہ جودھ پور میں پہنچ گیا۔

اس لڑائی میں خواجہ عابد نے بہت نمایاں حصہ لیا تھا چنانچہ اس کے خاتمہ پر انہیں [illegible] کا عہدہ دیا گیا (عالمگیر نامہ ص ۷۰، ماثر الامرا حصہ سوم ص ۱۲۱) اورنگ زیب کو بھروسہ تھا کہ ہزار [illegible] خاں اور دوالقدر خاں کے ساتھ ان سے بھی کہا [illegible] جانے ہوئے اس کے ساتھ رہیں (عالمگیر نامہ ص [illegible])

[illegible]

علاقہ پر چاروں سمت سے حملہ کیا جائے [illegible] بیجاپوری [illegible]

تمام نواح کے حملہ کی خبر سنی تو وہ سب مال و متاع خاندان اور ساتھیوں کو لے کر پہاڑی قلعوں [illegible] بھاگ گیا (خافی خان جلد دوم ص ۲۶۳) جودھ پور اور تقریباً تمام میدانی شہر فتح کر لئے گئے اور [illegible]

...ام یہ ہیں خواجہ عابد، مخلص خاں ... اورنگ زیب اپنے دشمنوں کے
...تھا اس میں ان تینوں سے صرور مشورہ لیا جاتا تھا۔

...نگ زیب جب ... حکومت ہوا تو پہلے چند سال ملک میں امن و امان قائم کرنے پر
... اس تمام مدت میں خواجہ عابد ... اعتماد سے کام کرتے رہے دارا شکوہ، شجاع اور
...ر ... خلاف جو مہمات بھی ... سے ان لڑائیوں میں بحیثیت سپاہی کے انھوں
... سال اور کے واقع میں ان کو ہرات کا
... کی ... عالمگیر نامہ ... تھی اور بعض اوقات تو ... کرتے ہوئے ...
... اس کے بعد ... کی جگہ
... عہدہ ... رہے، ... شاہی وزارت کا رکن
... چونکہ اس کا عہدہ دار شاہی وزارت کا رکن
... حا ... چونکہ اس کا عہدہ ... عہدہ میں لو ... اصل
... میں خواجہ عابد کے عہدہ ...
... تقریباً چھ سال تک
... کے عہدہ پر ...

شہزادہ
...س کی
...لرا اپنے نام
...ہمسر کی طرف
...بیٹے مجاہد خاں
...مالکی مناسب

...اور ... صوبہ اجمیر

...ے تعاقب میں روانہ کیا
...دمیوں سے بخوبی واقف
...حت میں شامل تھے۔ پچاس
... بات لے لئے دی گئیں (ماثر عالمگیری ص ۲۰۳)
... سے عوض ایک خاص خلعت اور ایک گھوڑا مرحمت ہوا اور قلیچ خاں کے خطاب سے

... چند مذہبی باتوں کی وجہ سے قلیچ خاں شاہ عالم کو پسند نہیں کرتا تھا کیونکہ
...ی تھا چونکہ اس کے خیالات شہزادہ سے بالکل مختلف تھے اس لئے بعد اجازت حاصل
... ہو ... شاہی جماعت میں آکر مل گیا۔ جب اورنگ زیب کو یہ خبر ملی تو اس نے اہتمام
...کوتوال کو ... کہ قلیچ خاں کو نظر بند کر لیا جائے بعد میں صلابت خاں کے سپرد ہوا لیکن اس کی تائید

میں بحیثیت صوبیدار بھیج گیا (ماثر عالمگیری ص ۶۲) تین سال کے بعد ان کو ملتان کا صوبیدار بنا دیا گیا جہاں وہ چار سال تک رہے (ماثر عالمگیری ص ۱۰۱) اس تمام مدت میں اورنگ زیب کو ان پر کامل اعتماد رہا۔ عہد حکومت کے تیرہویں سال اورنگ زیب نے ان لوگوں کو خاص خلعت دیئے جن پر اس کو پورا بھروسہ تھا ان میں اسد خاں عمدۃ الملک وزیر اعظم، مرتضیٰ خاں، حسن علی خاں اور طاہر خاں کے علاوہ خواجہ عابد بھی تھے ۱۶۷۶ء میں خواجہ عابد کو دارالسلطنت واپس بلا لیا گیا اور حاجیوں کی جماعت کے سردار مقرر ہوئے (الصنف ص ۴۴) جماعت حجاج کا سردار ہر سال شہنشاہ مقرر کیا کرتا تھا۔ سردار کا فرض یہ تھا کہ وہ شاہی تحفے مکہ اور مدینے لے جائے روانگی کے وقت انھیں شہنشاہ کی طرف سے ایک خاص خلعت دیا گیا جو بہت بڑا امتیاز تھا۔ عام طور سے جماعت حجاج کا سردار اس شخص کو بنایا جاتا تھا جس کی علم و فضیلت کی شہرت ملک بھر میں ہو (ماثر عالمگیری ص ۱۴۴) حج سے واپس آنے کے بعد خواجہ عابد ۱۶۷۹ء تک دربار شاہی میں مقیم رہے اس سال شہنشاہ امن و اماں اور اپنی حکومت قایم کرنے کے لئے راجپوتانہ روانہ ہوا۔

مرزا راجہ جے سنگھ کی سفارش پر راجہ جسونت سنگھ کو معاف کر کے سرحدی چوکیوں کا نگراں محافظ بنا دیا گیا تھا۔ جمرود میں اس کے انتقال پر راجپوتانہ میں ایک زبردست شورش شروع ہو گئی جس کا خاتمہ ایک طویل جنگ کے بعد ہوا راجہ جسونت سنگھ کا کوئی لڑکا نہیں تھا اس لئے شہنشاہ نے فیصلہ کیا کہ ریاست مارواڑ کا الحاق سلطنت میں کر لیا جائے اس نے اجیت سنگھ کو جو لاہور میں پیدا ہوا تھا اصلی وارث ماننے سے انکار کر دیا عسکران راجہ جسونت سنگھ کا وزیر تھا اس کے لڑکے درگا داس نے اجیت سنگھ کا ساتھ دیا اپنے ہاتھوں میں لیا۔ یہ فتنہ اس قدر بڑھا کہ شہنشاہ کو سلطنت سے کمک منگوانا پڑی اور اجمیر کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا اس لئے بنگال سے شہزادہ اعظم اور دکن سے شہزادہ معظم کو طلب کیا اور شہزادہ اکبر کو حکم دیا کہ راجپوت علاقہ پر چاروں سمتوں سے حملہ کیا جائے۔ رانا اودے پور بھی اس بغاوت میں شریک تھا۔ جب اس نے شاہی افواج کے حملہ کی خبر سنی تو وہ سب مال و متاع خاندان اور ساتھیوں کو لے کر پہاڑی قلعوں میں بھاگ گیا (خافی خاں جلد دوم ص ۲۶۳) جودھ پور اور تقریباً تمام میدانی شہر فتح کر لئے گئے اور تمام

سول و فوجی عہدوں پر مغلوں کو متعین کر دیا گیا۔

جب رانا اور درگا داس کے ساتھی ہر طرف سے مجبور ہو گئے تو انھوں نے سوچا کہ شاہی عہدہ داروں میں نااتفاقی پیدا کی جائے۔ وہ شہزادہ معظم کو شہنشاہ ماننے پر تیار تھے بشرطیکہ وہ ان کے ساتھ ہو جائے۔ مگر شہزادہ موصوف نے ان پھیلانے والے پیغامات کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ جب ادھر سے مایوسی ہوئی تو یہی کھیل شہزادہ محمد اکبر سے کھیلا گیا۔ درگا داس جو بڑا زبردست باتونی تھا وہ شہزادہ اکبر کے پاس گیا اور رانا اودے پور اور اپنے ساتھیوں کی طرف سے قسم کھا کر کہا کہ وہ سب اس کی شہنشاہیت قبول کر لیں گے۔ ناتجربہ کار شہزادہ اس کی باتوں میں آگیا اور تخت پر بیٹھ کر اپنے نام کے سکے مضروب کرائے۔ اور چند دنوں کے بعد اپنے باپ سے فیصلہ کن لڑائی کرنے کے لئے اجمیر کی طرف روانہ ہوا۔ تہور خاں کو سات ہزاری کا منصب اور امیر الامرا کا خطاب دیا گیا۔ خواجہ عابد کے بیٹے مجاہد خاں کو امتیازی القابات دیے گئے اگرچہ وہ کسی ایک کو بھی قبول کرنے پر تیار نہیں تھا وہ چاہتا تھا کہ کسی مناسب موقعہ پر شاہی جماعت میں چلا جائے (خافی خاں جلد دوم ص ۲۶۶)۔

۱۶۸۱ء کی ابتدا میں شاہ عالم کے ساتھ خواجہ عابد کو شہزادہ اکبر کے تعاقب میں روانہ کیا گیا۔ چونکہ خواجہ عابد اجمیر میں صوبیدار رہ چکے تھے اس لئے وہ یہاں کے حالات اور آدمیوں سے بخوبی واقف تھے بہت سے راجپوت سردار مثلاً اندر سنگھ، رام سنگھ اور سجان سنگھ بھی اس جماعت میں شامل تھے۔ پچاس ہزار اشرفیاں شاہ عالم کو اور پچاس ہزار فوج کے اخراجات کے لئے دی گئیں (مآثر عالمگیری ص ۲۰۳) خواجہ عابد کو اس کی خدمات کے عوض ایک خاص خلعت اور ایک گھوڑا مرحمت ہوا اور قلیچ خاں کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ چند مذہبی باتوں کی وجہ سے قلیچ خاں شاہ عالم کو پسند نہیں کرتا تھا کیونکہ شہزادہ شیعی تھا۔ چونکہ اس کے خیالات شہزادہ سے بالکل مختلف تھے اس لئے بغیر اجازت حاصل کئے وہ اس سے الگ ہو کر شاہی جماعت میں آکر مل گیا۔ جب اورنگ زیب کو یہ خبر ملی تو اس نے اہتمام خاں کوتوال کو حکم دیا کہ قلیچ خاں کو نظر بند کر لیا جائے بعد میں صلابت خاں کے سپرد ہوا کہ اس کی تادیب

دیکھ کر اُسے معافی دی گئی اور چند ماہ بعد رہا کر دیا گیا نظم قائم رکھنے کے لئے ایسا کرنا ضروری تھا۔ اگر اس کے اپنے بیٹے بھی اس کی مرضی کے خلاف کچھ کرتے تو اورنگ زیب ان کو بھی معاف نہیں کرتا۔

شہنشاہ کا دوبارہ اعتماد حاصل کرنے کے بعد ۱۶۷۲ء میں قلیچ خاں رضوی خاں کے بجائے صدر کل کے عہدہ پر مقرر ہوا۔ دوسرے سال اُسے شہزادہ معظم کے ساتھ دکن کی مہموں پر روانہ کیا گیا جہاں سیواجی کے بیٹے سنبھاجی کے دربار میں شہزادہ اکبر نے پناہ لی تھی۔ اس کے بجائے شاہی ؟ کی بنا پر شریف خاں اس عہدہ پر مقرر ہوا۔ (ماثرِ عالمگیری ص ۲۱۹) جب وہ شہنشاہ سے رخصت لینے گیا تو اسے ایک خلعت اور گھوڑا مرحمت کیا گیا اور نقارہ بجوانے کا حق بھی مرحمت ہوا یہ حق صرف ان لوگوں کو دیا جاتا تھا جن کا منصب دوہزاری سے بلند ہوتا تھا اور وہ بھی خاص صورتوں میں۔ نقارہ شہنشاہ کے حضور میں نہیں بج سکتا تھا اور نہ محل سے ایک خاص فاصلہ پر (ماثرِ عالمگیری ص ۲۱۳)

عہد عالمگیری کے انتیسویں سال قلیچ خاں ظفرآباد (بیدر) کا صوبیدار مقرر ہوا ایک خلعت اسلحہ جات اور ایک گھوڑا بھی مرحمت کیا گیا سید مظفر[۱] حیدرآبادی کے بیٹوں نجابت خاں و امانت خاں اور اکرام خاں ناصر خاں اور سید حسن خاں کو حکم دیا گیا کہ اس کے ماتحت کام کریں (ماثرِ عالمگیری ص ۲۶۴)

جب بیجاپور کی فتح کے لئے شہنشاہ خود اس طرف روانہ ہوا تو قلیچ خاں شولہ پور میں آکر شاہی افواج میں شامل ہوگیا اور ۱۶۸۵ء سے ۱۶۸۶ء تک برابر اس مہم میں شریک رہا وہ خندقوں کا محافظ و نگران تھا اور شہنشاہ کی طرف سے اسے تیروکماں عنایت ہوا تھا۔ بیجاپور کی فتح کے بعد ایک گھوڑا اور خنجر اسے حاصل ہوا۔

---

[۱] گولکنڈہ کے محاصرہ سے قبل نجابت خاں اور امانت خاں شہنشاہ سے الگ ہوکر تیغ نظام حیدرآبادی سے جا ملے تھے۔ قلیچ خاں نے ان پر پورا اعتماد کرکے ان کو شہزادہ عالم اور خان جہاں کی افواج کا رہنما مقرر کیا تھا۔ قطب الملک کے افسران کی ماتحت فوجوں نے جو ادھر ادھر گھومتی رہتی تھیں شاہی فوجوں کو سخت پریشان کیا اور دونوں بھائیوں کو بھی اپنی طرف ملا لیا (ماثرِ عالمگیری ص ۲۶۹)۔

۱۶۸۶ء میں قلیچ خاں نے محاصرہ گولکنڈہ میں خوب کارہائے نمایاں کیے۔ وہ حملہ کرنے والی فوج کا افسر تھا۔ ایک بار جب وہ حملہ کر رہا تھا تو دشمنوں نے گولہ باری شروع کر دی اس کے دائیں بازو پر ایک گولہ آکر لگا جس کی وجہ سے وہ سخت زخمی ہوا لطف اللہ خاں موقع پر پہونچ گیا اور اُسے خیمے میں لے آیا اس قدر شدید زخمی ہونے کے باوجود وہ خیمے تک گھوڑے پر سوار رہا اور اُترنے سے انکار کر دیا۔ جب اورنگ زیب کو یہ خبر معلوم ہوئی تو اُسے بہت افسوس ہوا۔ اس نے علاج کے لیے فوراً جراحوں کو بھیجا۔ دوسرے دن اسد خاں (عمدۃ الملک) وزیر اعظم شہنشاہ کی طرف سے خیریت مزاج پوچھنے کے لئے آیا جب وہ قلیچ خاں کے خیمہ میں پہنچا تو اس کو دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ وہ بڑے اطمینان سے بیٹھا بائیں ہاتھ سے قہوہ پی رہا ہے اور جراح اس کے دائیں کاندھے کے زخم سے لوہے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اور ہڈیاں نکالنے میں مصروف ہیں اس نے حسب عادت مسکرا کر وزیر اعظم سے کہا کہ وہ جلدی اچھا ہو جائے گا اور شہنشاہ کی خدمت میں اپنے فرائض شروع کر دے گا۔

مگر موت کے سامنے کوئی علاج کارگر نہیں ہوا تین دن کے بعد قلیچ خاں کا انتقال ہو گیا اور قلعہ گولکنڈہ کے پاس آصف نگر میں اسے دفن کیا گیا کہا جاتا ہے کہ اس کا دایاں بازو جو گولہ سے اڑ گیا تھا قصبہ عتیق پور میں مدفون ہے۔ جہاں کہ وہ پایا گیا تھا۔ قلیچ خاں کی یادگار اب تک صرفِ خاص سے منائی جاتی ہے۔

اورنگ زیب کے دل میں قلیچ خاں کی بہت عزت تھی اُس کی بیماری کے دوران میں شہنشاہ نے اُس کے بیٹے غازی الدین فیروز جنگ کو حسب ذیل خط لکھا تھا

میں خود سلطنت کے بہی خواہ اور قابل فرزند کی خیریت مزاج دریافت کرنے کے لئے آنا چاہتا تھا لیکن اپنے دل میں کہا کہ میں اُس کی تکلیف دہ حالت کو نہیں دیکھ سکوں گا۔ اسی لئے میں عمدۃ الملک کو اس کے دیکھنے کے لئے اپنی آنکھیں دے کر اور اپنے دل کا حال سنانے کے لئے بھیجتا ہوں اس وقت صرف انگور مل سکتے ہیں۔ لیکن طبیبوں نے کہا ہے کہ سلطنت کے اس ستون کے لئے یہ مفید نہیں رہیں گے۔ اس لئے فیصلہ کیا ہے کہ میں خود بھی انگور نہیں کھاؤں گا۔ اگر خدا نے چاہا تو اس کی صحت کے بعد ہم دونوں یہ پھل کھائیں گے۔

اے خدا میری خواہش بہت عمدہ ہے"

خدا کرے میں اسے پورا کر سکوں' (رقعات عالمگیری)

ایک مرتبہ اورنگ زیب نے شہزادہ اعظم کو خط لکھا تھا جس میں قلیچ خاں کی مثال دے کر اُسے سمجھایا تھا کہ اس کی تقلید اور پیروی کرنی چاہیئے اس نے لکھا تھا۔

مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ قلیچ خاں اپنے سپاہیوں کا بہت زیادہ خیال رکھتا ہے وہ ان کو قہوہ پلاتا ہے، ناشتہ کے وقت ناشتہ اور کھانے کے وقت کھانا کھلاتا ہے۔ جب سپاہی اس سے رخصت ہوتے ہیں تو وہ ان کو خوشبو لگاتا ہے اور پان دیتا ہے۔ وہ تمام قسم کے کھانے سپاہیوں کے گھروں پر بھیجتا ہے تاکہ ان کی عورتیں اور بچے یہ شکایت نہ کریں کہ مرد ہی ہر قسم کی نعمت سے لطف اٹھاتے ہیں اس کے بعد اسے کسی فقیر کا قصہ بیان کیا ہے کہ ایک آدمی نے اس سے پوچھا کہ آج کل کا زمانہ بہت خراب ہے۔ اس نے جواب دیا کہ شکر کرو اس سے زیادہ خراب نہیں ہے۔ اس سے اورنگ زیب کا مطلب یہ تھا کہ اس کا زمانہ اس قدر خراب نہیں جیسا کہ لوگ کہتے ہیں کیونکہ اس کے زمانہ میں قلیچ خاں جیسے آدمی رہتے ہیں۔ (ایضاً ص ۳)

قلیچ خاں کے پانچ بیٹے تھے سب سے بڑے کا نام شہاب الدین خاں تھا جو غازی الدین خاں فیروز جنگ کے لقب سے زیادہ مشہور ہے سلطنت مغلیہ میں جو سب سے بڑا امتیاز ہو سکتا ہے وہ غازی الدین خاں نے حاصل کیا تھا دو حقیقی بھائی تھے مجاہد خاں[۵۱] اور محامد خاں[۵۲] اور دو سوتیلے بھائی

---

[۵۱] اس کا اصلی نام محمد عارف تھا۔ کچھ دنوں خیر آباد میں فوج دار رہا عہد عالمگیری کے اٹھارویں سال اس کی جگہ عنایت خاں مقرر ہوا (ماثر عالمگیری ص ۱۴۱) چوبیسویں برس شہزادہ محمد اکبر کو چھوڑ کر اور شاہی حمایت میں آجانے پر اس کو خلعت دیا گیا اور منصب میں بھی ترقی ہو گئی (ماثر عالمگیری ص ۱۹۹)۔

[۵۲] معلوم ہوتا ہے اس نے کوئی امتیاز حاصل نہیں کیا تھا اور معمولی زندگی بسر کی تھی۔

علی خاں اور عبدالرحیم خاں ۔

سنہ ۱۱۲۱ھ میں شہاب الدین سمرقند میں پیدا ہوا تھا جب اس کا باپ ہندوستان روانہ ہوا تو اس نے

۱؎ غازی الدین فیروز جنگ کا یہ سوتیلا بھائی تھا عہد عالمگیری کے انتیسویں برس اس کو ایک لقب دیا گیا اور ایک تحفی بھی عنایت ہوئی (ماثر عالمگیری ص ۲۶۳) شہزادہ اعظم کی فوج کے لئے جو خزانہ مالوہ بھیجا گیا تھا اس کا محافظ و نگران حامد خاں تھا ۔ اڑتالیسویں برس اسے ڈیڑھ ہزاری کا منصب دیا گیا ۔ دوسرے سال یہ اپنے بھائی فیروز جنگ سے لڑ کر شاہی دربار میں چلا آیا جہاں اسے دو ہزاری کا منصب عطا ہوا ۔ (ماثر عالمگیری ص ۴۹۵) عہد فرخ سیر میں اسے پنج ہزاری کا منصب ملا دربار میں اس کا بہت رسوخ تھا دہلی اور آگرہ کے درمیان جاٹ بستے تھے جب انھوں نے بغاوت کر دی تو اس کو دور کرنے کے لیے اسے خاص طور سے مقرر کیا گیا تھا ۔ محمد شاہ کے عہد میں معز الدولہ صلابت جنگ کے لقب سے سرفراز کیا گیا ۔ نظام الملک نے اسے گجرات میں اپنا نایب مقرر کیا مگر چند دنوں بعد دکن کا صوبیدار مقرر کر دیا ۔ کرناٹک جاتے ہوئے گلبرگہ میں اس کا انتقال ہوا اور سید محمد گیسو دراز کے مقبرہ کے پاس دفن ہوا ۔

۲؎ بعد کو نصیر الدولہ صلابت جنگ کے لقب سے مشہور ہوا ۔ اورنگ زیب کے عہد میں اسے خان کا لقب عطا ہوا بہادر شاہ نے چین قلیچ خاں کا لقب دے کر جون پور کا فوجدار مقرر کر دیا جب نظام الملک نے گوشہ نشینی اختیار کر لی تو اس نے بھی اس کا ساتھ دیا دلاور علی خاں اور عالم علی خاں کے خلاف جو لڑائیاں ہوئیں ان میں اس نے حصہ لیا ۔ ـــہ میں اسے پنج ہزاری کا منصب اور نصیر الدولہ صلابت جنگ کا لقب دیا گیا ۔ نظام الملک نے رحمت خاں کی بجائے اسے برہان پور کا صوبیدار مقرر کیا بہادر خاں پر فتح پانے کے بعد اسے ہفت ہزاری کا منصب عطا ہوا اعزاز الدولہ کے انتقال کے بعد اسے اورنگ آباد کا گورنر بنایا گیا نادر شاہ کے حملہ کے بعد جب نظام الملک شہنشاہ کی اجازت سے اپنے بیٹے ناصر جنگ کی بغاوت فرو کرنے دکن کی جانب روانہ ہوا تو عبدالرحیم نے برہان پور میں اس کا استقبال کیا اور بہادر جنگ کا خطاب پایا …ھ میں اورنگ آباد میں اس کا انتقال ہوا ۔ عبدالرحیم بہت اچھا خوش نویس تھا اور فنون لطیفہ کا سرپرست ۔ بہ خیاص رقم کے لقب سے مشہور تھا اس کے بیٹے مجاہد خاں کو کوئی شہرت حاصل نہیں ہوئی (ماثر الامرا جلد دوم ص ۸۴) ۔

سبحان قلی خاں شاہ بخارا کی ملازمت اختیار کرلی۔ اس کی خواہش تھی کہ ہندوستان میں اپنے باپ کے پاس چلا جائے لیکن شاہ بخارا کو اس سے اتنی انسیت اور محبت پیدا ہوگئی تھی کہ وہ اس کے جانے پر راضی نہیں ہوتا تھا ایک دن سبحان قلی خاں کہیں باہر سیر و تفریح کے لئے گیا شہاب الدین اور دو درباری خواجہ یعقوب اور رستم بے بھی اس کے ساتھ تھے۔ شہاب الدین نے ان دونوں درباریوں کو راضی کرلیا کہ وہ بادشاہ کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ اس کو ہندوستان جانے کی اجازت دیدے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا وہ واقعی اپنے دوست کو خوش کرنا چاہتے تھے یا وہ اسے اپنی راہ سے ہٹانا چاہتے تھے کیونکہ شہاب الدین کا دستاہ پر سب کافی اثر تھا۔ بہرحال انھوں نے یہ معاملہ سبحان قلی خاں کے سامنے پیش کردیا جب وہ خوش اور مزہ میں تھا وہ لوگ جو اپنے آقا سے کچھ حاصل کرنا چاہیں کسی مناسب موقعہ کی تلاش میں رہتے ہیں یہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوگئے اس کے بعد بادشاہ نے نوجوان شہاب الدین کو اپنے حضور میں بلایا اور سورہ فاتحہ تلاوت کی یہ سورۃ اس وقت تلاوت کی جاتی ہے جب کوئی کسی سے جدا ہوتا ہے بعد ازاں بادشاہ نے کہا تم ہندوستان جارہے ہو تم یقیناً بڑا نام پاؤ گے" اور واقعی اس کے الفاظ بالکل ٹھیک نکلے۔ شہاب الدین نے اتنا بڑا عہدہ اور امتیاز حاصل کیا جس پر فرمانروایان بلخ و بخارا بھی حسد کرسکتے تھے۔ (مآثر عالمگیری ص ۹۱ مآثر الامراء ص ۷۶۲)

عہد عالمگیری کے بارہویں سال شہاب الدین ہندوستان پہنچا جبکہ اس کی عمر بمشکل بیس برس کی تھی شہنشاہ اس سے اچھی طرح پیش آیا اور اس کو تین سو کا منصب دیا گیا۔ شہنشاہ نے اس نوجوان پر اور شفقت فرمائی اور اس کی شادی نواب سعد اللہ خاں وزیر اعظم شاہ جہاں کی بیٹی صفیہ خانم سے کرائی (تاریخ فاتحہ)

تقریباً دس برس تک یہ اپنے باپ کے ساتھ مختلف قسم کے تجربات حاصل کرتا رہا جب شہنشاہ نے اپنے تمام معتمد افسران اور امرا کو راجپوتانہ بلایا تو شہاب الدین بھی شہنشاہ کے ہمراہ اجمیر چلا آیا۔ اس کی جرأت اور بہادری سب سے پہلے اس وقت معلوم ہوئی جب اس نے حامد خاں کی سرکردگی میں راٹھوروں کا ان کے پہاڑی قلعوں میں تعاقب کیا تھا اس خدمت کے بدلے اسے خلعت اور

بخشی شہنشاہ کی طرف سے عنایت ہوئی (ماثر عالمگیری ص ۱۹۴)

اس مہم سے واپس آنے کے بعد شہنشاہ نے آدھی رات کو اُسے بلا بھیجا اور کہا وہ فوراً حسن علی خاں کی خبر لائے کیونکہ ایک مدت سے اس کا کچھ پتہ نہیں تھا خبر رسانی کے تمام ذرائع بالکل ختم ہو چکے تھے اور حسن علی خاں اودے پور کی شمالی گھاٹیوں میں محصور ہو گیا تھا اس سے شہنشاہ کو بہت پریشانی تھی شہاب الدین کو اس کے حالات کا بالکل علم نہیں تھا اس علاقہ میں جنگلات تھے اور ان میں جنگلی جانور اور ڈاکو رہتے تھے مگر ان خطرات کے باوجود اس نے یہ ذمہ داری قبول کر لی۔ اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر وہ روانہ ہوا اور دوہی دن میں سب حالات معلوم کر لئے۔ اس خدمت کے عوض شہنشاہ نے اسے خان کا لقب دیا۔ یہ شہاب الدین کی جرأت اور مردانگی تھی جس کی وجہ سے حسن علی خاں اور اس کی فوج تباہی سے بچ گئی حسن علی خاں کو فوراً کمک پہنچائی گئی اور چند ہفتوں بعد اس نے رانا اودے پور کو شکست فاش دی جس سے رانا کی قوت کا خاتمہ ہو گیا اور اسے ارلولی پہاڑیوں کی طرف فرار ہونا پڑا۔

اس کے فوراً بعد ہی شہاب الدین خاں کو حکم ملا کہ وہ سروہی کی طرف روانہ ہو کر درگا داس کو روکے جو اجمیر پر حملہ کرنے کی تجویز کر رہا تھا تاکہ شہزادہ محمد اکبر کے لئے ہندوستان کا تخت حاصل کرے۔ شہاب الدین نے شہزادہ کی فوج میں نفاق ڈلوا دیا۔ سب سے پہلا کام جو اس نے کیا وہ یہ تھا کہ اپنے بھائی حامد خاں کو اپنی تجویزوں کے متعلق خفیہ اطلاع دی اگرچہ شہزادہ نے حامد خاں کو بہت بڑا عہدہ دے رکھا تھا مگر وہ چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح شاہی افواج میں شامل ہو جائے چنانچہ وہ شہزادہ محمد اکبر کے پاس گیا اور کہا کہ اگر اس کو اجازت مل جائے تو وہ جا کر اپنے بھائی شہاب الدین کو اپنی طرف ملائے جب اس کو اجازت مل گئی تو وہ بہت سا روپیہ اور دوسری چیزیں لے کر اپنے بھائی سے آملا حامد خاں کے الگ ہوتے پر بہت سے دوسرے عہدہ دار شہزادہ اکبر سے الگ ہو گئے اور بہت کم اس کے ساتھ رہ گئے۔ شہزادے نے میر اقی خاں کو بھی اس غرض سے بھیجا تھا کہ وہ شہاب الدین کو اس کی طرف آنے پر آمادہ کرے (ماثر عالمگیری ص ۱۹۹)۔

جب شہزادہ اکبر کی فوجیں اجمیر کے قریب پہنچیں اور حملہ کی تیاریاں شروع کیں تو رات کے وقت

بہت سے لوگ شہاب الدین سے جا ملے ۔ صرف چند آدمی ضیاء الدین محمد شجاعی کی سرکردگی میں اور راٹھور کی فوج باقی رہ گئی (خافی خاں جلد دوم ص ۲۷۵) شہزادہ بہت دل برداشتہ ہوا اور بھاگ کر سنبھاجی کے پاس پہنچا جس نے اس کی بہت خاطر کی' راہیری قلعہ کے پاس ایک مکان رہنے کو دیا اور گذارے کے لئے ایک رقم مقرر کردی (خافی خاں ص ۲۷۷)۔

شہاب الدین کا مقصد بغیر خون بہائے پورا ہوگیا اور وہ اجمیر واپس ہوا شہنشاہ نے اس کو استقبال (کیا) لیا۔ اورنگ زیب شہزادہ اکبر کی تیاریوں سے خائف نئی کمک کا منتظر تھا۔ اس نے پہاڑیوں پر توپخانہ اور خیموں کے اردگرد خندقیں کھدوادی تھیں۔ شہاب الدین کے پہنچنے پر شہنشاہ کو اطمینان ہوگیا اس بات پر کہ اس نے سروہی سے اجمیر تک ۱۲۰ میل کا فاصلہ طے کیا ہے اور شہزادے کے بہت سے سپاہیوں کو اپنی طرف کر لیا ہے اُسے داروغہ عرض مقرر کر دیا جو صرف ان آدمیوں کے لئے مخصوص تھا جس پر شہنشاہ کو پورا اعتماد ہوتا تھا۔ اس عہدہ دار کا کام یہ تھا کہ عرضیوں پر دوبارہ غور کرکے بادشاہ کی منظوری کے لئے پیش کرے اس کے دو سو ساتھی بھی شاہی عنایت سے سرفراز ہوئے۔ مراق خاں کو جس نے اپنا تمام مال و متاع شہزادہ اکبر کے خیمہ میں چھوڑ دیا تھا ایک خلعت اور دو ہزار روپیہ نقد دئے گئے اور دو سو سوار کا منصب عطا ہوا۔

جون ۱۶۸۱ء میں بیکانیر کے شیام سنگھ کی وساطت سے اورنگ زیب نے اودے پور کے رانا سے صلح کر لی تاکہ دکن جا کر سنبھاجی اور شہزادہ اکبر کے خطرناک اتحاد کا خاتمہ کر دے سنبھاجی یہ چاہتا تھا کہ اکبر کو اورنگ زیب کے مقابلہ میں تخت ہندوستان پر بٹھا دے اور اس کے علم کے نیچے راجپوتوں کو جمع کرے۔ (ص ۱۰۸) ابتدا ہی سے شہنشاہ کی خواہش تھی کہ میواڑ کے راج سنگھ سے صلح کر لی جائے۔ اس نے ایک پیغام بر کی زبانی راجہ سے یہ کہا کہ راٹھوڑ کے خلاف جو قدم اس نے اٹھایا تھا وہ سیاسی ضرورت کے سبب تھا اس نے اس کو یقین دلایا کہ اس کی ریاست کو کبھی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا اور یہ کہ اُسے چاہئے کہ وہ شہنشاہ کی مدد کرے تاکہ میواڑی بغاوت کی روح فنا ہو جائے۔ (آداب عالمگیری آصفیہ کتب خانہ ذاتی قلمی نسخہ) مگر درگاداس نے رانا سے کہا کہ میواڑ یہ

قبضہ ہو جانے کے بعد لووسٹ پور کی آزادی خطرہ میں پڑ جائے گی۔ اور اراولی کے دروں سے اس کے ملک پر حملہ کر دیا جائے گا۔ محمد اکبر کی فراری کے بعد مہارانا نے اپنے ہی فوائد مد نظر رکھ کر شہنشاہ سے صلح کر لی جس کو وہ عرصہ تک نہیں ٹال سکتا تھا شہنشاہ کو بھی بذات خود دکن جانے کا موقعہ مل گیا مہارانا نے وعدہ کیا کہ باغی راٹھوروں کی مالی یا اخلاقی مدد نہیں کرے گا اس نے اپنے وکیل کے ذریعہ اطاعت کا اعلان شہنشاہ کے پاس بھجوا دیا۔ جزیہ کے بدلے رانا نے منڈل، پورا اور بدنور کے علاقے شہنشاہ کے حوالہ کر دیئے (سرکار جلد سوم۔ ص ۴۲۲)۔

اس کے بعد شہنشاہ دکن کے لئے اجمیر سے روانہ ہوا اور ۱۳ نومبر ۱۶۸۱ء میں برہان پور جا پہنچا یہاں سے روانہ ہو کر ۲۲ مارچ کو اورنگ آباد پہنچ گیا یہاں اورنگ زیب نے بہت سی گھومنے والی جماعتیں بنائیں تاکہ ہر حصہ میں مرہٹوں سے جنگ ہو سکے شہزادہ معظم شاہ عالم کو کن کان فتح کرنے کے لئے بھیجا گیا اور شہزادہ اعظم کو خاندیش اور بگلانہ کی سمت روانہ کیا گیا۔ شہاب الدین اگرچہ ابھی نوجوان تھا مگر شہنشاہ کو اس پر اتنا اعتماد تھا کہ اُسے جونر (شمالی کون کان) کی طرف بھیجا تاکہ اس حصہ کے مرہٹہ حکمرانوں کی سرکوبی کرے۔ اس کی غیر حاضری میں شہنشاہ نے اسے مکرم خاں کی جگہ عصا برداروں کا مہتمم مقرر کر دیا اور سید اعلان خاں کو اس کا نائب (مآثر الامراء جلد دوم۔ ص ۴۷۸) جب کامیاب ہو کر واپس ہوا تو اُسے قلعہ رام سیج کی تسخیر کے لئے مقرر کیا گیا یہ قلعہ پہاڑ کی چوٹی پر تھا محصورین نے شہاب الدین کا خوب مقابلہ کیا اُس کی تمام کوششیں بیکار گئیں۔ قلعہ والوں نے بڑی ہمت اور جرأت کا ثبوت دیا۔ قلعہ دار ایک بڑا تجربہ کار آدمی تھا جب لوہے کے گولے ختم ہو گئے تو لکڑی کے بنوا لے گئے انھوں نے محاصرین کو پتھروں کی بارش اور جلتی ہوئی گھاس پھینک کر واپس ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ خافی خاں کے الفاظ میں لکڑی کا ایک گولہ لوہے کے دس گولوں کے برابر تھا۔ (جلد دوم۔ ص ۲۸۲) پیہم ناکامیوں کے بعد شہاب الدین کو واپس بلا کر اس کی بجائے شاہ جہاں بہادر کو کلتاش کو قلعہ کو محاصرہ کے لئے مقرر کیا گیا مگر باوجود کوشش بسیار اس سے بھی کچھ نہیں ہو سکا۔

سنہ ۱۶۸۳ء میں شہاب الدین کو ایک فوج کے ساتھ پونا اور سوپا کی جانب روانہ کیا گیا تاکہ اس

علاقہ میں فوجی چوکیاں قایم کی جاتیں ۔ روانہ ہونے سے قبل اُسے ایک تیر و کمان دس ہزار روپیہ نقد اور فوج کے اخراجات کے لئے دمن سونا دیا گیا (ماثر عالمگیری ص ۲۴۲) معلوم ہوتا ہے کہ واپس آنے کے چند ماہ بعد اسے شاہ عالم کی مدد کے لئے کوکن کان روانہ کیا گیا (اثر عالمگیری ص ۲۴۰) اس کی خدمات کے عوض شاہ نے اسے ایک خلعت، پانچ رکابیاں اور شاہی طعام بھیج کر اپنی خاص شفقت کا اظہار فرمایا ۔ غالباً اسی موقعہ پر اُسے غازی الدین خاں کا لقب بھی دیا گیا تھا (ماثر الامرا جلد دوم ص ۴۰۷)

قلعہ رائے گڑھ کے نواح میں غازی الدین خاں (شہاب الدین) کا مقابلہ ایک مرہٹہ فوج سے ہوا جو سنبھاجی کی سرکردگی میں تھی اس نے مرہٹہ فوج کو شکست فاش دی اور باقی ماندہ سپاہی بھاگ کر قلعہ میں محصور ہو گئے ۔ چونکہ اس کے پاس محاصرہ کا سامان نہیں تھا اس لئے قلعہ کے بیرونی حصوں میں آگ لگا کر وہاں سے چلا آیا اس لڑائی میں بہت سے مرہٹہ سردار مارے گئے اور بہت سے سردار گرفتار ہوئے گرفتار ہونے والوں میں سیداجی الوجی ملہار اور رائو سبحان جیسے قابل ذکر ہیں ۔ شہاب الدین نے انھیں شاہی دربار روانہ کر دیا یہاں انھوں نے اورنگ زیب کی اطاعت اور مدد کا دل سے وعدہ کر لیا اس لئے انہیں خلعت اور خلایف دئے گئے (ماثر عالمگیری ص ۲۴۵) غازی الدین خاں کو خوب مال غنیمت ہاتھ آیا ۔ جب سید اعلان اور شاہ محمد چوبدار نے مژدہ فتح سنایا تو شہنشاہ کو بہت مسرت ہوئی ۔ اول الذکر پیغامبر کو ایک اچھی رخصت کیا گیا اور دوسرے کو ایک خلعت اور دوسو روپیہ نقد عطا ہوئے ۔ شہاب الدین کو دیدر جنگ کا لقب دیا گیا اور نقارے بجوانے کی اجازت بھی عطا ہوئی ۔ ۵۰ خلعت اس کے ساتھیوں کو دئے گئے ۔ (ماثر عالمگیری ص ۲۵۷) ۔

اورنگ زیب کو خوب معلوم تھا کہ مرہٹوں سے جنگ کافی طویل رہے گی ۔ اس نے ان کو بہت سی شکستیں دینے کے بعد بیجاپور کی فتح کا بیڑا اٹھایا اس لئے نومبر ۱۶۸۳ء میں ہیڈ کوارٹر احمد نگر منتقل ہو گیا ۔ بیجاپور سے جنگ کا بہانہ تلاش کرنے میں دیر نہیں لگی ۔ شہنشاہ نے سکندر عادل شاہ شاہ بیجاپور کو لکھا تھا کہ وہ اس کی مرہٹوں کے خلاف جنگ میں مدد کرے ۔ اپنے ملک سے فوج کے لئے اجناس بھیجے اور مغل فوج کو بغیر کسی شرط کے اپنے علاقہ میں سے گذرنے کی اجازت دے ۔ سکندر نے ان مطالبات کا جواب ترش دیا۔

اس نے کہا کہ سلطنت بیجاپور میں اس کے افسران نے بغیر اجازت جو فوجی چوکیاں قایم کرلی تھیں انھیں فوراً توڑ دیا جائے اور یہ کہ وہ تمام خراج جو مغل حکومت نے اس کے آباؤ اجداد سے وصول کیا ہے واپس کر دیا جائے اس لئے کہ ان کو اس کا کوئی حق نہیں تھا۔ اورنگ زیب کو یہ خبر بھی مل گئی تھی کہ سکندر خفیہ طور سے دشمنوں کی مدد کر رہا تھا اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ بیجاپور کو سلطنت مغلیہ میں شامل کر لیا جائے۔

مارچ ۱۶۸۵ء میں ایک بہت بڑی فوج شہزادہ اعظم کی سرکردگی میں بیجاپور کا محاصرہ کرنے کو روانہ کی گئی۔ سکندر نے اپنی سلطنت کی حفاظت سید مخدوم عرف شرزہ خاں کے سپرد کی جو فن جنگ میں قابل تھا اور آدمیوں پر کافی اثر رکھتا تھا اس نے بھیم نائک کو بھی لکھا کہ وہ مغلیہ فوجوں کو تنگ کرے مغلوں نے بیجاپور کی فوج کو دریائے تنگ بھدرا کے کنارے زبردست شکست دی اور بہت نقصان پہنچایا مغل فوجوں کو بیجاپور کی فوجی جماعتیں بہت تنگ کرتی تھیں مگر اعظم بڑی احتیاط سے بڑھتا رہا اور آخرکار بیجاپور کا محاصرہ کرکے فوجی چوکیاں قایم کردیں تاکہ شولاپور میں شہنشاہ سے براہ راست تعلق قایم رکھ سکے مگر بھیم نائک اور سیدی مسعود نے یہ چوکیاں کاٹ ڈالیں شاہ گولکنڈہ ابوالحسن نے بھی اب جی پنڈت کی سرکردگی میں ایک دستہ فوج سکندر کی مدد کے لئے بھیجا حالانکہ اورنگ زیب اسے متنبہ کرچکا تھا۔ ان فوجوں نے اردگرد کے ملک پر قبضہ کرلیا اس لئے جس ذخیرہ شہزادہ اعظم کی فوج تک نہیں پہنچ پاتی تھی اس سے شہزادہ کی فوج میں قحط پڑ گیا جس سے شہنشاہ بہت پریشان ہوا غلہ بہت مہنگا ہوگیا اور سپاہی اس برداشت نہ کر سکے یہ سن کر شہنشاہ نے اپنے بیٹے کو مشورہ دیا کہ محاصرہ اٹھا دیا جائے شہزادے نے محاصرہ اٹھانا اپنی ذلت سمجھی اور تجربہ کار افسران سے مشورہ لیا اس نے خاص طور سے رحم علی خاں ماتنگیہ تاتی کی رائے پوچھی جو فن سپہ گری کا زبردست ماہر تھا حسن علی خاں نے کہا ’’ بہتری اس میں ہے کہ محاصرہ اٹھا دیا جائے ‘‘ دوسروں نے اس کی تائید کی اس پر شہزادے نے سب کو مخاطب کرکے کہا ’’ آپ لوگ اپنی رائے دے چکے۔ اب میری رائے سنئے۔ میں میرے دو بیٹے اور بیوی یہیں رہیں گے اور یہاں سے نہیں جائیں گے جب تک ہمارے دم میں دم باقی ہے آپ جو

چاہیں کرسکتے ہیں یہ سن کر سب نے فیصلہ کیا کہ وہ محاصرہ جاری رکھیں گے چاہے کتنی ہی تکالیف اور مصائب کا سامنا کرنا پڑے (ماثر عالمگیری ۲۶۴)۔

جب شولاپور میں اورنگ زیب کو یہ خبر ملی کہ شہزادہ اعظم محاصرہ جاری رکھنے کا تہیہ کرچکا ہے تو اس نے غازی الدین خاں فیروز جنگ کو بلایا کہ وہ شہزادہ کی مدد کو جائے اس کا بھائی مجاہد خاں تیر انداز خاں حجر خاں اور چند دوسرے سپاہی اس کے ساتھ چلنے کے لئے راضی ہوگئے۔ روانہ ہونے سے پیشتر اس کو ایک خلعت ماہی مراتب، چار علم اور ایک ہاتھی مرحمت کیا گیا اس کو شہنشاہ کے ہاتھ اور پیر چھونے کا شرف بھی بخشا گیا (ماثر عالمگیری ص ۲۶۵)۔

ان کے ساتھ بیس ہزار غلہ سے بھری ہوئی بیل گاڑیاں تھیں اور وہ باد برق۔ گھوڑوں پر سوار تھے "تاکہ شہزادہ کو جس قدر جلد ہو سکے غلہ پہنچایا جائے۔ اندی کے مقام پر ان کی مٹھ بھیڑ شرزا خاں اور عبدالرؤف کی فوجوں سے ہوگئی جو ان کا راستہ روکنا چاہتے تھے فیروز جنگ کے سپاہی دشمنوں کا دسواں حصہ بھی نہیں تھے مگر بیجاپوریوں کو شکست ہوئی اور وہ ادہر ادہر بھاگ گئے اس دوران میں پیم نائک واکن کھیڑہ کا زمیندار اپنی فوجوں سمیت بیجاپور والوں سے ا ملا اور ان کی تعداد چودہ ہزار تک پہنچ گئی مگر فیروز جنگ نے بغیر کسی اضطراب کے اس سے لڑائی شروع کردی اور ایسی شکست فاش دی کہ ان کا بالکل خاتمہ کردیا اس کے بعد اندی میں اس نے ہیر فوجی چوکی قایم کی کیونکہ یہ مقام شولاپور اور بیجاپور کے درمیان فوجی نقطہ نگاہ سے بہت اہم تھا۔ اعتقاد خاں کو وہاں کا تھانیدار مقرر کیا اور صف خاں کو بھی وہیں ٹھہرنے کا حکم دیا۔ (ماثر عالمگیری ص ۲۶۶)۔

فیروز جنگ کے پہنچنے پر حالات بالکل بدل گئے دل برداشتہ سپاہیوں میں ایک نئی زندگی اور روح پیدا ہوگئی۔ شہزادہ اعظم نے اسے گلے سے لگا لیا یہ خبر سن کر شہنشاہ بہت خوش ہوا اور کہا جس طرح خدا نے خاندان تیمور کی عزت و آبرو فیروز جنگ کے ذریعہ سے بچائی ہے اسی طرح خدا اس کے جانشینوں کی عزت حشر تک قایم رکھے (خافی خاں جلد دوم ص ۳۱۹)۔

چونکہ بیجاپور کے محاصرہ کو پندرہ ماہ سے زاید ہوگئے تھے اس لئے شہنشاہ خود ۱۴ جون ۱۶۸۶ء

کو شولا پور سے روانہ ہو کر بیجا پور کے قریب رسول پور میں ۲۳ر جولائی کو پہنچ گیا شہنشاہ کی موجودگی سے سپاہیوں کے دل بڑھ گئے انھوں نے خندقیں کھودنا شروع کیں اور قلعہ کی خندق کو بھرنا شروع کیا غازی الدین خاں فیروز جنگ نے قلعہ فتح کرنے کی ایک تجویز تیار کی جسے شہنشاہ نے منظور کر لیا اورنگ زیب نے اُسے سعادت خاں کے ہاتھ ہیرے کی ایک انگوٹھی بھجوائی (مآثر عالمگیری ص ۲۶۹)۔

ادھر محصورین دل شکستہ اور پست ہمت ہو گئے تھے آدمی اور گھوڑے ختم ہو رہے تھے اس کے علاوہ وہ فیروز جنگ اور دوسرے بہادروں کے حملہ کی تاب نہیں لا سکے اس لئے وہ مجبور تھے کہ قلعہ مغلوں کے حوالہ کر دیں۔ ۱۰ر دسمبر ۱۶۸۶ء کو شرزا خاں اور عبدالرؤف نے فیروز جنگ سے ملاقات کی اور سکندر کی طرف سے شرائط طے کیں دوسرے دن انھیں شہنشاہ کے حضور میں پیش کیا گیا ۱۹ر دسمبر کو اورنگ زیب بڑی شان و شوکت سے قلعہ میں داخل ہوا۔

جب شیخ ہدایت کیش واقعہ نویس کل نے اس محاصرہ اور فتح کا حال لکھ کر شہنشاہ کے حضور میں پیش کیا تو اورنگ زیب نے خود اپنے ہاتھ سے اس جملہ کا اضافہ کیا " میرے فرزند ارجمند فیروز جنگ کی کوششوں سے یہ محاصرہ کامیابی سے ختم ہوا۔ (خافی خاں جلد دوم ص ۳۲۲) دوسرے القابات کے علاوہ فیروز جنگ کو یہ بھی امتیاز حاصل ہوا کہ اُسے فرزند ارجمند کہا گیا یہی الفاظ شہنشاہ نے اُس خط میں استعمال کئے تھے جو امیر خاں صوبیدار کابل کے نام لکھا گیا تھا کسی نے اس قلعہ کے فتح کی تاریخ یہ کہی ہے:۔ سدِ سکندر گرفت (خافی خاں ص ۳۲۲)۔

(باقی آیندہ)

ہندوستانی قومیت کی تعمیر میں مسلمانوں کی اہمیت

(ذیل میں ہم الہ آباد کے مشہور لیڈر پنڈت سندر لال صاحب کا وہ خطبہ درج کرتے ہیں جو انھوں نے دکن کی ہندی پرچار سبھا کے سامنے پڑھا تھا۔ اس خطبہ سے جس وسعت قلب کا اظہار ہوتا ہے وہ عام طور پر ہندو لیڈروں اور مسلمانوں کے رہنماؤں میں نہیں پائی جاتی۔ ہندو مسلم اتحاد کی طرف سے مایوسی کے اس زمانہ میں اس قسم کی پُرامید تحریریں کارکنوں کی حوصلہ افزائی کا باعث ہو سکتی ہیں اسی لئے اس کے پورے خطبہ کو ہم یہاں درج کرتے ہیں۔ پنڈت جی نے اپنے خطبہ کے لئے جس زبان کو استعمال کیا ہے وہ عام ہندی سے مختلف ہے اس میں بھی رواداری پائی جاتی ہے انھوں نے اردو اور ہندی کو ملا کر ایک مشترک زبان لکھنے کی کوشش کی ہے۔ مترجم صاحب نے ان کے خطبہ کے بہت کم الفاظ بدلے ہیں)۔

دکن کی ہندی پرچار سبھا کے کارکنوں، ممبروں اور سبھا [illegible]

ہندوستان میں کون ایسا پڑھا لکھا ہوگا جو اسے دیش کی حالت کو سدھارنے کی کچھ بھی چاہ رکھتا ہو اور جس کی نگاہیں دکن کی ہندی پرچار سبھا اور اس کے کارناموں کی طرف نہ گئی ہوں۔ اپریل سنہ ۱۹۴۴ء میں جب آپ کے یہاں کے پرچاریوں کی جماعت الہ آباد پہنچی وہاں کے اور بہت سے لوگوں کی طرح مجھے بھی ان کے ساتھ مل کر بیٹھنے اور بات چیت کرنے کا فخر حاصل ہوا۔ ان میں سے چند کے ساتھ میرا تعارف برسوں پہلے کا تھا۔ آپ کے "پرچاریوں" کا خلوص، ان کی بے غرض خدمت جس میں غرور کا پتہ نہ چلتا تھا، ان کے دیش پریم سے بھرے ہوئے دل جن میں تنگ خیالی اور فرقہ پرستی کی گنجائش تک نظر نہ آتی تھی۔ ان کے پاکیزہ خیالات اور ان کی اعلیٰ کارگذاریاں —— ان سب نے مل کر میرے دل پر بڑا اثر ڈالا جو شمالی ہند کے ہزاروں اور باشندوں کے دلوں پر ڈالا ہوگا

ایک اور چیز بھی جس نے پہلے سے میرے دل کو اس اثر کے لئے تیار کر رکھا تھا۔ میرے گہرے دوست پنڈت بنارسی داس چترویدی نے یہاں سے جا کر مجھے جو حالات سنائے تھے۔ ان کے

یادگاریوں کے خیالوں، تمناؤں اور حوصلوں میں مجھے ان کی زندہ تصویر دیکھنے کو مل گئی۔ جماعت کے رہنماؤں کی خواہش اور اصرار پر میں نے وعدہ کر لیا کہ میں کسی موقع پر دکن آکر زیادہ نزدیک سے آپ کی ان ساری کوششوں کا مطالعہ کروں گا۔ وعدہ اور قرض ہم پر رہا۔ نومبر ۱۹۴۵ء میں پہلا زوردار لقوا حملہ ہوا۔ اس وقت سب کاموں سے بے تعلق ہو کر میں نے کچھ لکھنے پڑھنے کا کام ہاتھ میں لے رکھا تھا جو ابھی تک پورا نہیں ہوا اور ممکن ہے ابھی کئی سال اور لے۔ بغیر یکسوئی کے اس طرح کا کام کم از کم میرے جیسے کمزور یا سال کے لئے ناممکن ہے۔ میں نے جیوں تیوں کر کے اس سال ٹال دیا۔ اس سال پھر تقاضا ہوا۔ اب کی بڑھاپے کی ہمت نہ ہو سکی۔ اس لئے آپ کی جماعت کا قدردان، آپ کے رہنماؤں کی کارگزاریوں کا قائل اور آپ کے پریم میں بندھا ہوا میں آپ کے سامنے موجود ہوں

سارے ہندوستان کے لئے ایک قومی زبان کو قومی زندگی کے لئے ضروری اور اہم سمجھتے ہوئے بھی اس قسم کی تحریک سے میں زیادہ تر اپنے کو الگ رکھتا رہا ہوں۔ اس کے وجوہ ہیں۔ لیکن آپ کی جماعت کے ساتھ مہاتما گاندھی کے گہرے تعلق اور ہمارے خاص رہنماؤں کے روشن خیالات اور کام کا شکر، پروفیسر شاستری، پنڈت رام رتن بی اے اور ستی پریم چند جی جیسے بے تعصب ادیبوں کے نام دیکھ کر جنہوں نے محبت سے پہلے چار برس میں اسی ایک فرض کو ادا کیا ہے۔ غرض ان سبھوں باتوں نے مل کر آپ کی دعوت منظور کرنے کے بارے میں میرے تامل کو دور کر دیا

مجھے اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ کام کو اپنی نئی اصولوں کی کمزوریوں اور اپنے چاروں طرف کی ناگفتہ بہ حالت کی وجہ سے ہم شمال میں نہ کر سکے، باوجود بھی کوششوں کے اس کی گتھیوں کو سلجھانے کی بجائے ہم نے ایک حد تک اور زیادہ پیچیدہ کر دیا۔ جسے جاتی قومیت کو سیمنٹ بنانے کے ہم لے اور زیادہ پھوٹ اور اختلافات کا سبب بنا دیا۔ اس بڑے کام کو اس دلدل سے نکال کر اس کا اصلی سندر روپ دینا اور دکن کی نہایت موافق آب و ہوا میں اس سے سچ مچ ہندی قومیت کے پیدا کرنے کا کام لینا آپ ہی کے لئے مقسوم ہو چکا ہے۔

قومی زبان کے بنانے میں دکن کی بڑی خدمت ہماری آج کل کی ہندوستانی زبان کی پیدائش کی جگہ شمال میں تھی۔

لیکن اس زبان کی نشو و نما اور اس کی ترقی چودہویں، پندرہویں اور سولہویں صدیوں میں دکن کے بادشاہوں کی سرپرستی میں سب سے زیادہ دکن ہی میں ہوئی۔ دلی کے کمزور ہو جانے کے وقت سے کئی نسلوں تک دکن اردو شاعری اور اردو ادب کا ایک خاص مرکز رہا۔ حیدرعلی اور ٹیپو سلطان جیسے مسلم بادشاہوں نے کناڑی اور فارسی دونوں کو الگ رکھ کر ہندی کو اپنے محلوں کے اندر کی زبان قرار دیا۔ آج بھی ہندوستان بھر میں ہندوستانی زبان کا سب سے زبردست مرکز حیدرآباد کی ریاست اور وہاں کی عثمانیہ یونیورسٹی ہے دکن ہی کی دو ترقی پذیر ریاستوں میں دو بڑی یونیورسٹیاں ہیں جو نہ شمال کی ہندو اور مسلم یونیورسٹیوں کے برابر بدیسی اثر میں ہیں اور نہ اتنی زیادہ فرقہ پرست دوسری طرف سنسکرت کے علم میں بھی دکن کے پنڈت شمالی ہند کے پنڈتوں سے زیادہ پیچھے نہیں ہیں۔ سنسکرت سے مختلف نسل کی جن ہندوستانی زبانوں سے آیندہ کی قومی زبان کو اپنے ماننے پالنے کے لئے بہت سے مال لینا ہیں وہ بھی دکن ہی کی مختلف بھاشائیں ہیں۔ اس لئے بالکل قدرتی معلوم ہوتا ہے کہ دکن ہی کی غیر جانب دار اور دولتمند فضا میں ہماری مستقبل کی قومی زبان پیدا ہو اور یہیں سے اس کا سب سے زیادہ پرچار ہو۔

<u>قومی زبان کی ضرورت</u> | قومی زبان کی اہمیت پر کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ قومی زبان بڑی حد تک قومی زندگی کی جان ہے۔ جو سماج بھی مل جل کر رہنا چاہتی ہے ایک متحد زندگی بسر کرنا چاہتی ہے اور اس متحدہ حیثیت سے انسانی ترقی میں حصہ لینا چاہتی ہے اس میں بڑی حد تک ایک نصب العین، ایک ہی تمنائیں اور ایک سے خیالات کا ہونا لازمی ہے اور یہ بات بغیر ایک قومی زبان کے ناممکن ہے بغیر ایک قومی زبان کے سماج کے مختلف حصوں کا ایک دوسرے کو پوری طرح سمجھ سکنا اور ایک دوسرے سے پریم کر سکنا ناممکن ہے۔

قومی اور صوبوں کی زبانوں کے تعلق کے بارے میں بھی بہت کچھ کہا جا چکا ہے گجراتی ادب، بنگالی ادب، مرہٹی ادب، تامل ادب، تلگو ادب اور کناڑی ادب وغیرہ کے بیش قیمت جواہرات کو ہم کھونا نہیں چاہتے۔ ہم انھیں ویسے ہی قوم کا ترکہ اور ورثہ سمجھتے ہیں جیسے کبیر، تلسی داس، غالب اور ذوق کو۔ ہندوستان ایک دیس ہوتے ہوئے بھی ایک بڑا براعظم ہے جس کے ان مختلف صوبوں کا فرق جس میں

ہر ایک یورپ کے ایک ایک ملک کے برابر ہے تمام ہندوستان کی خوبصورتی کو اور زیادہ دوبالا کرتا ہے اور اس اختلاف کو ایک خاص حد تک قائم رکھتے ہوئے اس میں یکتائی پیدا کرنا ہندوستانی قومیت کا فرض ہے۔

یوں تو ہر دیس اور ہر پردیس کی زبانیں سدا بدلتی رہیں گی مگر قومی زبان کا فائدہ یہ ہے کہ جب کہ ایک گجراتی دوسرے گجراتی کے ساتھ گجراتی میں بات کرے، اور ایک بنگالی دوسرے بنگالی کے ساتھ بنگالی میں۔ ایک گجراتی ایک بنگالی کے ساتھ یا ایک پنجابی ایک مدراسی کے ساتھ جب بات چیت کرے تو قومی زبان میں کرے اور ہمالیہ سے راس کماری تک اور مشرقی بنگال سے شمال مغربی سرحد تک ہمارے تمام صوبوں کا باہمی کاروبار اسی زبان میں ہو۔ ہر ہندوستانی کو اس پر ناز ہو۔ اسے پیدا کرنے میں سب کا حصہ ہو ہر صوبہ میں زیادہ سے زیادہ لوگ اس کے جاننے والے ہوں اور تمام ہندوستان کے جسم کی نسوں میں اس کی روانی اسی طرح کی ہو جس طرح خون کی جسم میں ہوتی ہے۔ بغیر اس کے ہندوستانیت یا قومیت کی خواہش نہ ہم میں ابھر سکتی ہے اور نہ دیر تک قائم رہ سکتی ہے۔

<u>قومیت پر یقین</u> مگر اس کے لئے سب سے پہلی اور سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمیں قوم یا قومیت کی ٹھیک ٹھیک تمنا ہو۔ جس قوم کو اپنی یکتائی میں یقین نہیں وہ ایک قومی زبان کے پیدا کرنے میں معاون نہیں ہو سکتی۔ بدقسمتی سے اس زبردست سوال پر ہمارے دلوں میں ابھی تک بے حد گتھیاں پڑی ہوئی ہیں۔ اس بارے میں ہمارا تعصب اور ہماری لاعلمی دونوں انتہا کو پہنچ چکے ہیں۔ یہی ایک خاص وجہ ہے کہ قومی زبان کا قیام ہو یا قومی آزادی کا حصول کہیں بھی اپنی کوششوں میں ہمیں خاطر خواہ کامیابی نصیب نہیں ہوتی۔

ان گتھیوں میں سب سے زبردست گتھی یہ ہے کہ ہم ابھی تک ہندو اور مسلمان، برہمن اور غیر برہمن، گجراتی اور بنگالی اور دوسری جگہ اس سے بھی چھوٹی چھوٹی قسم کی تنگ خیال تمناؤں سے اوپر نہیں اٹھ سکے یہاں تک کہ قوم اور اسی طرح تہذیب یا کلچر کی جو وسیع تمنائیں ہمارے دماغوں میں پیدا ہونی چاہئے تھیں جن سے ہمیں ایک ہندوستانی قوم اور ایک ہندوستانی تہذیب کے قیام میں امداد مل سکتی ان کی بجائے

آج کل کے ادب میں ہندو قومیت اور مسلمان قومیت، بنگالی قوم اور گجراتی قوم، ہندو تہذیب اور مسلم تہذیب، برہمن کلچر اور غیر برہمن کلچر جیسی آوازیں جو ہمارے اختلاف کو بڑھانے والی ہیں اور جو ہمارے دیس کے اندر ایک قومیت یا ہندوستانیت کے قیام میں زبردست رکاوٹ ہیں اکثر سننے میں آتی رہتی ہیں۔

اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ہماری آج کل کی گری ہوئی حالت میں ان چھوٹی چھوٹی تمناؤں میں بھی کچھ حقیقت کا شائبہ ہے لیکن یہ ہمارا نصب العین، ہمارا معیار ہمارا مشن نہیں ہے۔ ان سب میں اختلاف پھوٹ اور نفرت کی دو خاص لہریں ہیں جن میں سے اس وقت دیس کے کچھ حصہ میں ایک کا اور دوسرے حصہ میں دوسرے کا زیادہ زور دکھائی دے رہا ہے۔ یہ دونوں زہریلی لہریں یہ ہیں — ایک طرف ہندو تہذیب اور مسلم تہذیب کے اختلاف میں یقین اور اس اختلاف کو قائم رکھنے کا خیال اور دوسری طرف برہمن تہذیب اور غیر برہمن تہذیب کے اختلاف میں یقین اور اسے قائم رکھنے کی فکر۔

ہندو اور مسلم تہذیبیں

ان دونوں میں میں ہندو تہذیب اور مسلم تہذیب کے اختلاف کے بارے میں آپ کا کچھ زیادہ وقت لینا چاہوں گا کیونکہ یہ اختلاف ہی ہماری بیشتر قومی مصیبتوں، ہماری اس وقت کی مشکلوں یہاں تک کہ اردو اور ہندی کے جھگڑوں کی بنیاد ہے۔ اس تباہ کن اختلاف کی جڑیں ہماری ایک دوسرے کی طرف سے اور اپنے ملک کی تاریخ کی طرف سے وہ زبردست لاعلمی اور وہ افسوسناک غلط فہمیاں ہیں جو ہمارے اندر کی تنگ خیالیوں کی وجہ سے قائم ہیں اور خاص ہمارے اسکولوں اور کالجوں کی درسی کتابیں اور فرقہ پرست ذہنیت کے لوگوں کا زہریلا پروپگنڈا زندہ رکھے ہوئے ہے۔

اس تھوڑے سے وقت میں ناممکن ہے کہ میں مذہب اسلام اور مسلم تاریخ کے مختلف پہلوؤں کو یا ہندوستانی تاریخ کے مسلم عہد کے سرسری خاکہ کو بھی آپ کے سامنے رکھ سکوں یا اسلام اور ہندو دھرم پر تبصرہ اور تنقید کر کے دونوں کی بہترین خوبیوں کو آپ کے سامنے پیش کر سکوں۔ مگر اس بارے میں ہماری لاعلمی اتنی نقصان رساں شکل اختیار کر چکی ہے اور ایک دیس کے رہنے والوں، ایک قوم کے دو فرزندوں، ایک خاندان کے دو سگے بھائیوں میں ایک دوسرے سے ناواقفیت اتنی بڑھ گئی ہے اور آپس کے پریم کے لئے ایک دوسرے کو جاننا اتنا ضروری سا ہے کہ میں بہت ہی مختصر طریقے پر ایک سرسری نگاہ مذہب اسلام

اس کے بانی' ہندوستان سے باہر کے اس کے کارنامے' اور اس کی ہندوستانی تاریخ پر ڈالنا چاہوں گا۔

اسلام اور اس کا بانی | اسلام کی پیدائش آج سے تیرہ سو سال پہلے ایشیا کے عرب دیس میں ہوئی تھی۔ اسلام اور اس کے بانی محمد صاحب کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لئے اُس وقت کے عربوں کی حالت کو جان لینا ضروری ہے۔ عرب کے لوگ اس وقت مذہبی حیثیت سے ہزاروں لچر اوہام پرستیوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ معاشرتی حیثیت سے وہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں چھوٹے چھوٹے قبیلوں میں بٹے ہوئے تھے جن میں باہمی پریم یا اتحاد کی جگہ آئے دن خانہ جنگیاں ہوتی رہتی تھیں۔ اخلاقی حیثیت سے ان کی سیرت بہت گندی اور گنہگار تھی۔ سیاسی حیثیت سے عربوں کا ملک چار حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ شمال کا حصہ روم کے شہنشاہوں کے قبضہ میں تھا۔ مشرقی حصہ پر ایران کے بادشاہوں کی حکومت تھی۔ جنوب اور مغرب کا بہت بڑا حصہ حبش کے عیسائی شہنشاہ کے ماتحت تھا۔ صرف بیچ کا تھوڑا سا حصہ نام کو ابھی تک آزاد تھا مگر اس پر قبضہ کرنے کے لئے بھی روم اور ایران دونوں کی طرف سے کوششیں جاری تھیں۔ ایک اس طرح کے دیس اور اس طرح کے لوگوں میں آج سے ۱۳۶۵ سال پہلے محمد صاحب کا جنم ہوا۔

محمد صاحب کی کوششوں اور ان کی سیرت کو بھی میں دوسرے تاریخ لکھنے والوں کے الفاظ ہی میں بیان کرنا چاہوں گا۔ محمد صاحب کی کوششوں اور ان کی کامیابیوں کو بیان کرتے ہوئے ریورینڈ ڈبلیو آر ڈبلیو سٹیفنس اپنی کتاب "عیسائیت اور اسلام' انجیل اور قرآن" میں لکھتا ہے:-

"جو برائیاں محمد صاحب کے وقت میں عرب میں سب سے زیادہ پھیلی ہوئی تھیں جن کی قرآن میں بڑے زوروں کے ساتھ برائی کی گئی ہے اور جن کی قطعی ممانعت کی گئی ہے وہ یہ ہیں:- شراب خوری' زناکاری اور ایک ساتھ کئی عورتوں سے بے روک شادی' بیٹیوں کا قتل' بے تحاشا جوا' سود خواری کے ذریعہ لوٹ' اور جادو ٹونے میں یقین۔ محمد صاحب کی تعلیم کے ذریعہ ان برائیوں میں سے کچھ بالکل مٹ گئیں اور باقی کم ہو گئیں۔ جس سے عربوں کے اخلاق میں بڑی ترقی ہوئی اور یہ بات اس اصلاح کے جوش اور اس کے اثر دونوں کا ایک حیرت انگیز اور نہایت وسیع ثبوت ہے۔ بیٹیوں کا قتل اور شراب خواری کا بالکل

بند ہو جانا محمد صاحب کی سب سے نمایاں کامیابی ہے۔

" اپنی قوم پر محمد صاحب نے بہت بڑا احسان کیا۔ یہ ایک ایسے دیس میں پیدا ہوئے تھے جہاں کسی طرح کی سیاسی تنظیم عقلی عقاید اور اخلاق تینوں میں سے کسی کا پتہ نہ تھا۔ محمد صاحب نے ان تینوں کو قایم کیا۔ اپنے زبردست جوہر استعداد کے ایک ہی وار میں انھوں نے اپنے ہموطنوں کی سیاسی حالت، ان کے مذہبی عقاید اور ان کے اخلاق تینوں کو ایک ساتھ سدھار دیا۔ بہت سے الگ الگ آزاد قبیلوں کی جگہ انھوں نے ایک قوم چھوڑی۔ بہت سے دیوی دیوتاؤں اور خداؤں میں اندھے یقین کی جگہ انھوں نے ایک قادر مطلق مگر رحمٰن و رحیم خدا میں ایک معقول یقین پیدا کر دیا۔ انھوں نے لوگوں کو یہ بتایا کہ خدا ہمیں سدا دیکھتا رہتا ہے اور ہمارے اچھے اور برے سب کاموں کا ٹھیک ٹھیک پھل دیتا ہے اس یقین کے مطابق ہی انھوں نے لوگوں کو ٹھیک ٹھیک زندگی بسر کرنا سکھایا۔"

ریورینڈ ٹلو سورتھ اسمتھ اپنی کتاب محمد اور اسلام میں لکھتا ہے:۔

" محمد صاحب کو ایک ساتھ تین چیزوں کے قائم کرنے کی خوش نصیبی حاصل ہوئی۔ ایک قوم، ایک شہنشاہیت اور ایک مذہب تاریخ میں کہیں اس طرح کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔"

بے شبہ اس زمانہ کے عربوں جیسی ایک ٹکڑے ٹکڑے اور بچھڑی ہوئی قوم کو ایک امنگ ایک حوصلہ اور ایک محبت کے رشتہ میں باندھ کر انھیں اصلی معنوں میں ایک متحد قوم بنا دیا اور اتنے تھوڑے سے وقت میں انھیں روم اور ایران جیسی سلطنتوں کے پنجے سے آزاد کر لینا دنیا کی حصول آزادی کی تاریخ میں ایک لاثانی اور حیرت انگیز واقعہ ہے۔ یہ ایک واقعہ ہی محمد صاحب کو سنسار کے بڑے سے بڑے لوگوں میں جگہ دینے کے لئے کافی ہے۔ مگر محمد صاحب کا رتبہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

میجر آرتھر گلن لیونسرڈ اپنی کتاب "اسلام اس کی اخلاقی اور روحانی قدر" میں لکھتا ہے:۔

" محمد صاحب گہرے سے گہرے معنوں میں کسی بھی یگ اور کال کی سچی سے سچی اور زیادہ سے زیادہ لگن والی آتماؤں میں سے تھے وہ صرف مہاپرش ہی نہیں تھے بلکہ بنی نوع انسان میں جو بڑے سے بڑے یعنی سچے سے سچے آدمی کبھی بھی پیدا ہوئے ہیں ان میں سے ایک تھے۔ وہ نہ صرف پیغمبر کی حیثیت سے بزرگ تھے

ملکہ ایک محب وطن اور سیاست داں کی حیثیت سے بھی افضل تھے ۔ وہ مادی اور روحانی دونوں طرح کا تعمیری کام کرنے والے تھے ۔ انھوں نے ایک بڑی قوم کو تعمیر کیا اور ان دونوں سے بڑھ کر ایک کہیں زیادہ بزرگ مذہب کو پیش کیا ۔ جب کبھی مستقبل میں انسانوں کے درمیان اس وقت کے مقابلہ میں فرقہ وارانہ طرفداری کم ہو جائے گی اور لوگ معقولیت کے ساتھ انسانیت دوست مذہب کو ماننے لگیں گے اس وقت محمد صاحب بھی آج کے مقابلہ میں کہیں زیادہ عزت کے ساتھ دیکھے جائیں گے ۔ فی الحقیقت محمد صاحب بڑے لوگوں میں بھی بہت بڑے تھے ۔"

اس طرح کے کئی اقتباسات محمد صاحب کے مختلف یورپین سیرت نگاروں کی کتابوں سے دیئے جا سکتے ہیں ۔ مگر صرف ایک اور ۔ انگلینڈ کا مشہور مصنف ٹامس کارلائل محمد صاحب کی پوری سیرت کا نقشہ کھینچتے ہوئے اپنی کتاب " ہیروز " ہیرو ورشپ اور ہیرواک ان ہسٹری " میں لکھتا ہے :۔

" وہ زندگی کا ایک جلتا ہوا انگارا تھا جسے گویا قدرت نے اپنی شاندار گود سے نکال کر پیدا کیا تھا سنسار کے خالق کے حکم سے وہ سنسار کو روشن کرنے آیا تھا ۔ ۔ وہ ایک خاموش بزرگ ہستی تھا ۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنی زندگی کے خاص مقصد کی طرف پوری لو لگائے بغیر رہ ہی نہیں سکتے جنھیں خود فطرت مخلص ہونے کے لئے مقرر کرتی ہے جب کہ دوسرے لوگ رائج الوقت نظریوں اور سنی سنائی باتوں کے پیچھے آنکھ بند کر کے چلتے رہتے ہیں اور اسی میں مطمئن رہتے ہیں وہ اپنے آپ کو ان نظریوں کے فریب میں مبتلا نہ کر سکتا تھا وہ اکیلا اپنی روح کو لے کر حقیقت کے ساتھ ٹکرا رہا تھا ۔ میں کہہ چکا ہوں کہ موجودات کا عظیم ترین راز ۔ خوفناک مگر جگمگاتا ہوا راز ۔ اس کی آنکھوں کے سامنے چمک اٹھا ۔ کوئی لچر جیسے اب اس ناقابل بیان سچائی کو اس کی آنکھ سے اوجھل نہ کر سکی تھی ۔ جو آدمی اس سچائی کے ساتھ جسے ہم سچائی ہی کہہ سکتے ہیں اپنے زندگی کے مقصد کو کھوجنے میں لگ جائے اس میں سچ مچ ایک خدائی طاقت شامل ہوتی ہے اس طرح کے آدمی کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ سیدھے مادر فطرت کے دل سے نکلے ہوئے ہوتے ہیں ۔ لوگ انھیں اس طرح سنتے ہیں جس طرح کسی دوسرے کی بات نہیں سنتے انھیں سننا پڑتا ہے ۔ اس کے مقابلہ میں اور سب کچھ ہوائی قلعے معلوم ہوتے ہیں شروع سے ہزاروں طرح کے خیال زائروں اور آوارہ گرد لوگوں کی

طرح اس شخص کے دل میں چکر لگاتے رہے۔ میں کیا ہوں؟ یہ اتھاہ چیز جس میں میں رہتا ہوں اور جسے لوگ کائنات کہتے ہیں اس سے کیا؟ زندگی کیا ہے؟ موت کیا ہے؟ میں کیا مانوں؟ میرا مقصد کیا ہے؟ غار حرا اور کوہ سانی کی اندھیری چٹانوں نے ریگستان کی سخت گیر تنہائیوں نے اس کے سوالوں کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس ابدی گردش نیلے اور خاموش آسمان نے جو سر کے اوپر پھیلا ہوا تھا اور جس پر تارے جگمگا رہے تھے کوئی جواب نہیں دیا۔ کہیں سے کوئی جواب نہ ملا۔ اخیر میں اس کی اپنی روح کو اور جو کچھ خدائی الہامی قوت اس کے اندر موجود تھی اسے جواب دینا پڑا"

محمد صاحب کی سیرت، اس کی تعلیمات ان کی کوششوں اور ان کے کارناموں کو بیان کرنے کا یہ وقت نہیں۔ شاید سنسار کے کسی دوسرے بڑے آدمی کو بدنام کرنے کی اتنی کوشش نہیں کی گئیں جتنی محمد صاحب کو۔ اس کے بھی وجوہ ہیں جن میں اس وقت پڑنا فضول ہے۔ ایک ہندی کی کتاب میں میں نے اس ساماں کی ایک لمبی فہرست پڑھی تھی جسے محمد صاحب رحلت کے وقت چھوڑ گئے تھے۔ اس میں ایک سگار کا ڈبہ بھی تھا اور ایک شاہی تخت۔ جب کہ تمبا کو اس وقت عرب بھر میں کہیں دیکھنے کو بھی نہ تھا اور محمد صاحب زندگی بھر کبھی کسی طرح کے شاہی تخت پر نہیں بیٹھے۔

محمد صاحب کی بیشتر زندگی شکلوں اور سخت تکلیفوں میں گذری۔ اپنی عمر کے آخری دس سالوں میں وہ نئی آزادی حاصل کی ہوئی آزاد عرب قوم کے بادشاہ رہے۔ ان دس برسوں کے اندر بھی ان کی زندگی بہت سادہ، محتاط اور تپسیا کی زندگی تھی۔ حکومت کے پیسے یا زکوٰۃ کے روپیہ سے ایک کوڑی اپنے یا اپنے کنبہ والوں کے لئے لینا وہ حرام سمجھتے تھے۔ متعدد بار کئی کئی دن انھیں فاقے سے گذر جاتے تھے۔ عرب کے بادشاہ ہونے کے دنوں میں بھی انھوں نے کبھی لگاتار تین دن تک پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ وہ سدا اپنے کپڑوں کو خود پیوند لگاتے تھے۔ اپنی چپلوں کو خود گانٹھتے تھے اپنے اونٹ کو خود کھریرا کرتے تھے۔ اپنی بکریوں کو خود دوہتے تھے۔ اپنے مکان میں خود اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیتے تھے۔ کھجور کی چٹائی یا ننگی زمین پر سوتے تھے۔ ایک بار سخت بیماری کے دنوں میں پیٹھ پر بوریئے کا نشان دیکھ کر کسی نے اجازت مانگی کہ گدا نیچے بچھا دیا جائے۔ محمد صاحب نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں آرام کرنے کے لئے پیدا نہیں ہوا

حضرت محمدؐ کی تمام مذہبی تلقین کا لب لباب دو لفظوں میں ہے۔

اوّل - ایک خدا پر اعتقاد

دوم - نیک کام کرو

حضرت محمدؐ کی بیس سال کی خاص خاص تلقینوں کا مجموعہ قرآن مجید ہے میں نے قرآن کو بہت مرتبہ شروع سے آخر تک بڑے غور سے پڑھا ہے" دنیا کے دوسرے مذہبوں کی جانب قرآن کی رائے اور اپنے مذہبی اصولوں کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد اپنی کتاب 'ترجمان القرآن' میں لکھتے ہیں:-

قرآن نے نہ صرف اُن سب مذہبوں کے قایم کرنے والوں کو سچا مانا ہے جن کے ماننے والے اس وقت اس کے سامنے موجود تھے بلکہ صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ مجھ سے پہلے کتنے ہی رسول اور ہادی دین ہو چکے ہیں میں سب کو سچا مانتا ہوں اور ان میں سے کسی ایک کا نہ ماننا بھی خدا کی حقیقت سے انکار کرنا سمجھتا ہوں اس نے کسی مذہب والے سے یہ نہیں چاہا کہ وہ اپنے مذہب کو چھوڑ دے بلکہ اگر کبھی چاہا تو یہی چاہا کہ سب اپنے اپنے مذہبوں کی اصلی حقیقت پر عمل کریں کیونکہ سب مذہبوں کی حقیقی تعلیم ایک ہی ہے نہ تو اس نے کوئی نیا اصول پیش کیا اور نہ کوئی نئی راہ عمل ہی بتائی۔ اس نے ہمیشہ انہی باتوں پر زور دیا جو دنیا کے سب مذہبوں میں سب سے زیادہ جانی بوجھی باتیں رہی ہیں ایک اللہ کی پرستش اور نیک عمل کی زندگی۔ اس نے جب کبھی لوگوں کو اپنی طرف بلایا ہے تو یہی کہا ہے "کہ اپنے اپنے مذہبوں کی حقیقی تعلیم کو پھر سے تازہ کر لو۔ تمہارا ایسا کر لینا ہی مجھے قبول کر لینا ہے"

قرآن کے دوسرے سورہ میں کہا گیا ہے" بلاشبہ راہ نجات کھلی ہوئی ہے یہ کسی خاص ملت کے لئے نہیں ہے جس کسی نے خدا کے آگے سر جھکایا اور جس کے اعمال نیک ہیں وہ چاہے یہودی ہو چاہے عیسائی ہو اور چاہے کوئی اور ہو وہ اپنے رب سے ثمرہ حاصل کرے گا اس کے لئے نہ کسی کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم"

اس قسم کی بیشمار آیتیں قرآن میں سے اقتباس کی جا سکتی ہیں۔

سلطنت عرب | حضرت محمدؐ کی تعلیم نے نیم مہذب بدکردار صدیوں کے غلام اور آپس کے نفاق کے مرض میں مبتلا عربوں میں ایک نئی روح پھونک دی جس کی بدولت عربوں نے دیکھتے دیکھتے نہ صرف اپنے ملک ہی میں ایک آزاد قومی حکومت قایم کرلی بلکہ باہر نکل کر اس زمانہ کی ایرانی سلطنت اور رومن سلطنت جیسی دو زبردست طاقتوں کو شکست دے کر حضرت محمدؐ کے انتقال سے ۸۰ سال کے اندر اندر یورپ میں چین کی سرحد سے لے کر پچھم میں ہسپانیہ تک وہ عظیم الشان سلطنت قایم کی جو کم و بیش ایک ہزار سال تک قایم رہی اور جو اپنے زمانہ کی سب سے بڑی سلطنت خیال کی جاتی تھی تمام مغربی ایشیا تمام شمالی افریقہ اور آدھے یوروپ پر عربوں کی حکومت تھی یہ عرب سلطنت دنیا کے لئے ایک برکت ثابت ہوئی۔ اگرچہ اس بارے میں تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں تب بھی اس سوال کی عظمت کو دیکھتے ہوئے ایک سرسری نگاہ اس پر ڈال لینا بھی ضروری ہے یہاں پر بھی پہلے ہمیں اسلام کے سامنے آنے سے پہلے مغربی دنیا کی حالت کو سمجھ لینا چاہئے۔

ظہور اسلام سے قبل یوروپ کی حالت مسٹر جے ایچ ڈینیسن Emotion as the Basis of Civilization نامی انگریزی کتاب میں لکھتے ہیں:-

"پانچویں اور چھٹی صدی میں مہذب دنیا فنا کی سرحد پر کھڑی تھی"

شہنشاہ قسطنطین رومی عیسائی مذہب کو رومن سلطنت کا مذہب بنانے کا اعلان کرچکا تھا۔ شہنشاہ تھیوڈوسیس نے یہ ہدایتیں جاری کردی تھیں کہ عظیم رومن سلطنت میں کسی دوسرے مذہب یا دین کے ماننے والے کو رہنے کی اجازت نہ دی جائے سلطنت میں ایک خاص محکمہ اس لئے قایم کیا گیا تھا کہ گھر گھر جاکر لوگوں کے مذہب کا پتہ لگایا جائے، شام عراق مصر ایشیائے کوچک اور یونان میں جو صدیوں پہلے سے اس زمانہ کی تہذیب کے سب سے بڑے مرکز تھے لاکھوں آدمیوں کو اپنے قدیم مذہبی خیالات نہ چھوڑ سکنے کے جرم میں موت کی سزا دی جانے لگی یونان جیسے ذیستان قدیم ملک کا ایک ایک پرانا مندر گرا دیا گیا ان میں بیشمار بودھ مٹھ بھی تھے۔ ان مندروں اور مٹھوں کی جاگیریں ضبط کرلی گئیں اگر کسی مکان یا مندر سے عود وغیرہ کے جلنے کی خوشبو آئی تھی اور یہ پتہ لگ جاتا تھا کہ یہ خوشبو مریم یا عیسائی دیوی

کے علاوہ کسی اور بت کے سامنے جلائی جا رہی ہے تو اس مکان میں فوراً آگ لگا دی جاتی تھی اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر کہ کوئی شخص اپنے گھر کے اندر عیسیٰ کو خدا کا بیٹا مانتا ہے یا انسان کا بیٹا عیسیٰ میں خدائیت کو مانتا ہے یا ایسٹر کا تہوار اسی روز مناتا ہے جس روز رومن سلطنت میں اجازت ہے یا کسی اور روز ہفتہ کے روز پاک دن مناتا ہے یا اتوار کے روز اس طرح کی باتوں پر قصوروار کو موت کی سزا دی جاتی تھی ۔

ان مذہبی تعصبات اور ان مظالم کے ساتھ فلسفہ کی تعلیم اور علم وفضل کا چل سکنا محال تھا ہندوستان مصر اور یونان کے نجومی سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال پہلے زمین کے گول ہونے کا پتہ لگا چکے تھے لیکن انجیل میں لکھا تھا کہ زمین چپٹی ہے رومن سلطنت بھر میں جہاں کہیں کوئی ایسی کتاب ملتی تھی جس میں لکھا ہو کہ زمین گول ہے اُسے فوراً پھونک دیا جاتا تھا اور کتاب کے ساتھ گھر کے مالک کو بھی مع بال بچوں کے آگ کے حوالے کر دیا جاتا تھا اطالیہ یونان مصر شام وغیرہ میں سینکڑوں ہی قیمتی کتب خانے جلا دئے گئے ہزاروں اشخاص نے اپنے اپنے کتب خانے اس لئے پھونک ڈالے کہ کہیں کسی کتاب میں کوئی ایسی بات نہ مل جائے جس کی وجہ سے ان کو اور ان کے بال بچوں کو آگ میں جلنا پڑے ۔ یونانی تہذیب کے عروج کے زمانہ سے یونان ایشیا کوچک شام اور مصر بھر میں متعدد کالج اور ہزاروں بڑے بڑے مدرسے تھے جن میں افلاطون اور ارسطو جیسوں کی کتب فلسفہ بقراط جیسوں کی کتب طب ہپارکلیوس اور ٹالمی جیسوں کے علم نجوم اقلیدس اور اپولونیس جیسوں کے علم ریاضی آرکیمڈیز جیسوں کے مادی سائنس وغیرہ کی تعلیم لاکھوں طالب علموں کو دی جاتی تھی وہ سب مدرسے اور دار العلوم روم کے عیسائی حکمرانوں کی ہدایت کے مطابق ایک دن بند کر دئے گئے کیونکہ ان کی تعلیم انجیل کی تعلیم کے خلاف سمجھی جاتی تھی ۔

بقراط کو آج تک یوروپ کے لوگ ابو الطب کہتے ہیں ۔ عیسائی مذہب سے پہلے بقراط کی قائم کی ہوئی یونانی علم طب کے مطابق رومن سلطنت بھر میں ہزاروں طبیب لاکھوں مریضوں کو دوائیں دے کر اچھا کرتے تھے ۔ اب پاپائے روم اور حکمرانِ روم نے مل کر حکم نافذ کر دیا کہ دواؤں کے ذریعہ کسی مریض کا علاج کرنا خلاف مذہب اور گناہ ہے ۔ بیماروں کو اچھا ہونے کے لئے عیسائی گرجا میں جا کر حضرت مریم کی

مورت (بت) کے سامنے (نذر) پیش کرنا چاہیئے اس سے دعا مانگنی چاہیئے اور عیسائی پادریوں سے گنڈے تعویذ لینے چاہیں یا عیسائی صلیب کی لکڑی یا عیسائی ولیوں کی ہڈیوں سے اپنا بدن چھلا لینا چاہیئے اس کے خلاف چلنے والے کو یا کسی بھی بیمار کو دوا دینے والے کو موت کی سزا دی جاتی تھی۔

یہ سب بیان ہے کہ مغرب کے اس زمانے تک کے تمام عالم کا صرف ایک پھیکا اور نامکمل خاکہ ہے جبکہ اسلام اور عربوں کا دنیا کے اسٹیج پر ظہور ہوا عیسائی رومن حکمراں جسٹینین ا کی تمام لڑائیوں میں (اور جسٹینین کی تمام لڑائیاں مذہبی لڑائیاں ہوتی تھیں جو عیسائی پادریوں کے فتوؤں کے ساتھ شروع ہوتی تھیں اور جن میں ہر لڑائی کے بعد جسٹینین کے عیسائی مہنت (درویش) آس پاس کے تمام علاقہ میں جاکر تلوار ہاتھ میں لئے ایک ایک آدمی سے پوچھتے تھے کہ تم روم کے عیسائی مذہب کو مانتے ہو یا نہیں اور انکار یا پس و پیش کرنے والے کو فوراً تلوار کے گھاٹ اتار دیتے تھے) صرف جسٹینین کی ان مذہبی لڑائیوں میں ماہرین تواریخ کے مطابق سب ملا کر دس کروڑ انسان اس زمین پر سے اٹھ گئے "ڈیمیس" کی اس بات میں گہری سچائی ہے کہ پانچویں اور چھٹی صدی کے درمیان مہذب زمانہ عالم کے سر پر کھڑا ہوا تھا۔ جہالت اور ظلم کی ایک زبردست گھٹا دنیا کے تمام اس حصہ کے اوپر چھائی ہوئی تھی اور یورپ کے ان تمام حصوں میں جو عرب سلطنت کے باہر رہ گئے ایک ہزار برس تک چھائی رہی۔

<u>ہندوستان کے باہر اسلام کے کارنامے</u> جسٹینین کے مرنے سے چار سال کے اندر حضرت محمدؐ پیدا ہوئے اسلام اور عربوں نے نمودار ہو کر اس حالت میں کیا کچھ کیا اس حالت کو کہاں تک درست کیا یہ بات تاریخ کے مطالعہ سے ہی تعلق رکھتی ہے مکمل مذہبی آزادی اور رواداری سب مذہبوں کی بنیادی وحدت رعایا کے مذہبی خیالات اور رسم و رواج میں حکومت کی غیر جانبداری وغیرہ کے بلند اصول اس سے سینکڑوں برس پہلے ہندوستان ایران مصر اور یوروپ میں پہونچ چکے تھے لیکن اب وہ صرف یونانی کتابوں کے اندر بند تھے رومن حکمران جولیس نے جو زرتشت کے مذہب کی مصری شاخ کا ماننے والا تھا اور جس کا شمار ہندوستان کے اشوک چندرگپت اکبر اور ایرانی شہنشاہ دارا کے ساتھ دنیا کے بڑے سے بڑے صلح جو شہنشاہوں میں کیا جاتا ہے روم اور یوروپ کو پھر سے ان اصولوں پر چلانا چاہا مگر عیسائیوں کے مذہبی اندھے پن کی

روم کے سامنے وہ ٹھہر نہ سکا ایک کور مذہب عیسائی کے ہاتھوں اسے اپنی جان دینی پڑی جولیس کے بعد کے شہنشاہ پھر عیسائی ہوتے جہالت اور ظلم کی گھٹا اور زیادہ کالی ہوتی چلی گئی۔

عربوں کی سلطنت یہی طاقت تھی جس نے کامیابی کے ساتھ عیسائی یوروپ کو مذہبی رواداری کا سبق پڑھایا اور ایک مصیبت زدہ دنیا کے اندر پھر سے پوری پوری مذہبی آزادی کے اصول کو قایم کیا عربوں کی طاقت کے اتنی تیزی کے ساتھ بڑھنے کا سب سے بڑا راز یہی تھا کہ مصیبت زدہ رعایا ہر جگہ ان کا بڑی خوشی کے ساتھ استقبال کرتی تھی جس ملک کو وہ لوگ فتح کرتے تھے اس میں سب سے پہلے ان کا کام ہوتا تھا کہ تمام رعایا کے لئے مذہب کے معاملوں میں پوری آزادی کا اعلان کر دیا جاتا تھا سب کے مندروں گرجاؤں اور دیگر عبادت گاہوں کی حفاظت کا بار یہ لوگ اپنے اوپر لیتے تھے قدرتی طور پر سائنس صنعت و حرفت کھیتی اور تجارت نے عربوں کے زمانہ حکومت میں اتنی ترقی کی جس کا پہلے خیال بھی نہ تھا عراق میں پہنچتے ہی عربوں کا پہلا کام تھا چلڈین ہندسہ کے زمانہ کی دجلہ اور فرات نامی ان خوبصورت نہروں کو پھر سے صاف اور جاری کرانا جو صدیوں سے بند پڑی تھیں۔ مصر میں عربی فاتح عمر نے لاکھوں مزدور لگا کر اس نہر سویز کو صاف کرایا اور اسے نئے سرے سے تیار کرایا جو صدیوں سے سوکھی پڑی تھی اور جس سے اس کے بعد صدیوں تک برابر یوروپ اور ایشیا کے درمیان بڑے سے بڑے جہاز آتے جاتے رہے آج کل کی نہر سویز عمر کی ہی کھدائی ہوئی ہے جسے فرانسیسیوں نے پچھلی صدی میں پھر سے صاف کرایا۔ ایک عمر تک کے تمام لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے مفت اور لازمی تعلیم جاری کرانے کا سہرا دنیا کی تاریخ میں سب سے پہلے شاید خلیفہ عمر ہی کو حاصل ہوا۔ پرانی یونیورسٹیاں پھر سے جاری کی گئیں سلطنت عرب میں ہزاروں نئے اسکول قایم کئے گئے ہزاروں کتب خانے کھولے گئے نجوم اور سائنس کے مطالعہ کے لئے جا بجا رصدگاہیں اور دارالعمل قایم کئے گئے تمام قدیم یونانی کتابوں کے عربی اور دیگر زبانوں میں ترجمے کئے گئے چین اور ہندوستان جیسے ملکوں میں علم کی تلاش کی گئی۔ تعلیم کو مذہب سے آزاد کیا گیا۔ خلیفہ کے ماتحت عیسائی، یہودی اور بودھ تک یونیورسٹیوں کے پروفیسر اور مدرسوں کے سرکاری انسپکٹر مقرر ہوتے تھے۔ اس زمانے کی اطالیہ اور شمالی فرانس کے اندر کسی انسان کے پاس زمین کے نقشہ کا گلوب مل جاتا تھا تو اس کی سزا موت تھی عربی ہسپانیہ میں جغرافیہ

کی تعلیم گلوب کے ذریعہ دی جاتی تھی جب کہ سینکڑوں برس بعد انگلستان میں ایک بھی پختہ سڑک نہ تھی اور برسات کے دنوں میں لندن کا کوئی آدمی بغیر گھٹنوں یا کم سے کم ٹخنوں تک کیچڑ میں پاؤں رکھے اپنے گھر سے باہر نہ نکل سکتا تھا اس زمانہ میں عربوں کے ماتحت ہسپانیہ میں سنگ مرمر کی عمارتیں اور شاندار محل بنے ہوئے تھے ۔

گیارھویں بارھویں اور تیرھویں صدی میں عربی زبان یوروپ کی تعلیم فلسفہ اور سائنس کی زبان تھی ۔ فرانس یا انگلستان میں کوئی انسان ایسا نہ مل سکتا تھا جسے دلدادہ علم کہلانے کا شوق ہو اور جو عربی جانتے اور عربی بول سکنے کا اعزاز نہ رکھتا ہو ملاستہ ساتویں صدی سے لے کر پندرھویں صدی تک یوروپ کے اندر صرف عربوں نے ہی فلسفہ اور سائنس کے شعلوں کو زندہ رکھا ڈریپر کے الفاظ میں " علم کا جھلملاتا ہوا چراغ اس وقت روشن رکھا گیا جبکہ وہ بجھنے ہی کو تھا عربوں ہی لے آئے ہم تک پہنچایا عرب ہی یوروپ کے اندر سائنٹیفک کیمسٹری ظہور میں لائے یونانیوں نے مختلف علوم کو جس جگہ چھوڑا تھا عربوں نے انھیں بہت زیادہ ترقی دی ۔

عربوں کے زمانہ حکومت میں لوگوں کے اخلاق میں جو حیرت انگیز اصلاح ہوئی اور سائنس نے جو بے مثل ترقی کی اسے مسلمانوں کے مذہبی خیالات کا نتیجہ بتلاتے ہوئے تاریخ نگار مسٹر جے ڈبلو ڈریپر A History of the Intellectual Development of Europe (یوروپ کی ذہنی ترقی کی تاریخ) نامی کتاب میں لکھتے ہیں ۔

" ایشیا اور یورپ کے لوگ اپنی روزمرہ کی رہنمائی کے لئے اور یورپ اور امریکہ کے لوگ سائنس کی روشنی کے لئے قرآن کے کتنے زیادہ رہین منت ہیں ۔ جب یورپ اس سے زیادہ مہذب نہیں تھا جتنا اس وقت (افریقہ کا ملک) کیفریریا ہے اس وقت عرب نہ صرف سائنس میں ترقی کر رہے تھے بلکہ نئی سائنس پیدا کر رہے تھے فلسفہ، ریاضی، نجوم، کیمیا، طب کے میدانوں میں ان کی فتوحات ان کے فوجی فتوحات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ شاندار، زیادہ دیرپا اور اسی لئے زیادہ اہم ثابت ہوئیں ۔

ڈینسن جس کا اقتباس ہم اوپر درج کر چکے ہیں اسلام سے قبل کی مغربی دنیا کی حالت عیسائی رومن سلطنت کے ذریعہ اس کی تباہی اور اسلام کے ذریعہ اس کے احیاء پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے ۔

اس زمانہ میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تہذیب جس کی تعمیر میں چار ہزار برس صرف ہوئے تھے ٹکڑے

ٹکڑے ہونے کو ہے اور اغلب تھا کہ نسل انسانی اسی حالت کو واپس ہو جائے جب حالت بربریت ہر قبیلہ اور ہر فرقہ دوسرے کے خلاف تھا اور امن و قانون کو کوئی جانتا ہی نہ تھا یہ وہ زمانہ تھا جو بدترین امکانات سے پُر تھا۔ تہذیب ایک بڑے درخت کی طرح جس کے بے شمار تپوں کا سایہ دنیا بھر پر تھا اور جس کی شاخوں میں فنون لطیفہ سائنس اور علم ادب کے طلائی ثمر لگے ہوئے تھے ڈگمگا رہی تھی کیا کوئی ایسا جذباتی تمدن تھا جو درمیان میں پڑ کر نسل انسانی کو پھر سے ملا سکے اور تہذیب کو فنا ہونے سے بچا سکے۔ اسلام نے اس حیرت انگیز اور ناقابل یقین کارنامے کی تکمیل کی۔ اس نے ایک پاش پاش ہوتے ہوئے عالم کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو جمع کیا اور انھیں جوڑ کر ایک ایسی تہذیب کی شکل میں ہموار کیا جس کا عروج ایک ہزار سال تک قایم رہا اسلام نے یہ کام جماعت بندی کی اس نئی ترکیب سے کیا جو حضرت محمدؐ کی غیر معمولی فراست سے ظہور میں آئی تھی اور جو ضروریات وقت کے عین مطابق تھی۔

بلاشبہ حضرت محمدؐ کی وفات سے لے کر ایک ہزار سال تک کی عربوں اور اسلام کی تاریخ دنیا کی تاریخ کے سب سے زیادہ عظیم الشان ابواب میں سے ہے اس کی عظمت اور دنیا کو اس کے ذریعہ جو کچھ فیض پہنچا اس کی جھلک ایک چھوٹی سی تقریر میں دے سکنا غیر ممکن ہے۔ یہ کہہ دینا کافی ہے کہ یوروپ کی تمام موجودہ سائنس اور وہاں کے تمام آزاد انجمنوں کا بانی اگر کسی کو قرار دیا جا سکتا ہے تو عربوں کو۔

اب میں پھر اپنے ملک کی طرف آتا ہوں ہندوستان سے باہر کے مسلمانوں کی تاریخ کے بارے میں ہم میں سے زیادہ تر اشخاص بالکل کورے ہی ہیں لیکن اپنے ملک کی مسلم تاریخ کے بارے میں صرف ناواقف ہی نہیں بلکہ ہم میں سے زیادہ تر کے دماغوں میں نہایت تباہ کن اور زہریلے مغالطے بھرے ہوئے ہیں اور بھرے گئے ہیں جو ہماری قومی یکجہتی اور باہمی محبت کے راستہ میں زبردست روڑے ہیں اس طویل اور نہایت پیچیدہ لیکن نہایت ضروری مضمون پر بھی میں صرف ایک سرسری نگاہ ہی ڈال سکتا ہوں۔

ہندوستان میں اسلامی حکومت | سب سے پہلا اصول اس بارے میں یہ ہے کہ کسی بھی انسانی جماعت یا انجمن پر اگر ایمانداری کے ساتھ رائے قایم کرنی ہو تو اسے اس زمانہ کی چاروں طرف کی حالت کے ساتھ ملا کر دیکھنا ہوگا ہم میں سے بیشمار کے دلوں میں یہ نہایت غلط خیال بیٹھا ہوا ہے کہ انگریزوں کے

آنے سے پہلے ہندوستان کے مسلمان حاکم ہندوستان کی رعایا کی ساتھ تعصب اور تنگ دلی سے کام لیتے تھے۔ تاریخ اس کے بالکل خلاف ہے تاریخ نگار ڈبلیو ایم مارنس (ایشیا کی سلطنت) نامی کتاب میں لکھتا ہے۔

دلی کے ابتدائی شہنشاہوں کے دور سے سترھویں صدی تک تمام مذہبوں کے ساتھ مکمل رواداری کا سلوک کیا گیا کیا وہ لوگ جنھوں نے ایسوں کے مقبرے بنائے ہیں جو اس زمانہ میں یوروپ کو مذہب کے نام پر قتل کئے جانے والوں کے لئے ایک زبردست قبرستان بنانے میں لگے ہوئے تھے اور ضمیر کی پابندی کرنے والے مفرور بن سے امریکہ کی نئی بستیاں بسا رہے تھے ہندوستان کے خلاف زبان کھولنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں کیا وہ بے شرمی کے ساتھ یہ دعویٰ کرکے کہ ان کی تہذیب اس زمانہ کی ہندوستانی تہذیب سے زیادہ سچی تھی تاریخ کا گلا گھونٹ سکتے ہیں اگر اس دعوے کے ثبوت میں انہی کی لکھی ہوئی تاریخ پر اعتبار کرکے انہی کو شہادت کے لئے بلا لیا جائے تو کیا حالت دکھائی دے گی ایک طرف ان کے مذہبی جنون سے پُر ہاتھوں سے (سترھویں صدی کے عیسائی مذہب کی پریسبیٹیرین شاخ کے) کونسیٹ لوگوں کا خون کیتھولک طبقہ کے لوگوں کا خون اور پیورٹین طبقہ کے لوگوں کا خون تیزی سے ٹپک رہا ہے اور دوسری طرف اس تمام عرصہ میں وہ نئی پھانسیاں کھڑی کرتے جا رہے تھے نئی بیڑیاں گھڑ رہے تھے اور ایکٹس آف یونیفارمٹی نام کے خوفناک قانون پاس کر رہے تھے (جن کے مطابق یوروپ کے ہر ایک ملک میں اس فرقہ کو چھوڑ کر جسے اس زمانہ کے حکمراں مانتے تھے باقی عیسائی فرقوں کے بھی لاکھوں آدمی زندہ جلا دئے گئے یا انتہائی تکلیف دے دے کر مار ڈالے گئے)۔

کوئی ہندو یا مسلمان اپنے پیدائشی عقیدوں کی وجہ سے کسی پبلک ملازمت کے ناقابل نہ سمجھا جاتا تھا مسلمان بادشاہ خوشی کے ساتھ بڑے بڑے ذمہ دارانہ عہدے پڑھے لکھے اور ہوشیار برہمنوں کے سپرد کر دیتے تھے اور مہاراجاؤں کے درباروں میں بہت سے مسلمان عزت و حشمت حاصل کر لیتے تھے۔ حیدر علی کے وہ وزیر جنھوں نے ایک عرصہ تک اس کی موت کو چھپائے رکھا نہایت اعلیٰ ذات کے ہندو تھے اور جب مرشد آباد میں افسر خزانہ کا تقرر ہونے والا تھا تو نواب ناظم نے نندکمار کو

بجائے محمد رضا خاں کے مقرر کرنا چاہا تھا ۔ شواجی کو منصب اور ٹیپو کو مذہبی مجنون کہا جاتا ہے لیکن جنوبی ہندوستان کی حکومتیں (جب ہم نے ان کے معاملات میں دخل دینا شروع کیا) مذہبی تعزیر کے قوانین کے سسٹم سے ناآشنا تھیں جو کہ اس زمانہ میں خود ہماری اور دیگر یورپین سلطنتوں کے ہاں بہت عزیز انسٹی ٹیوشن تھے ۔ آئرلینڈ میں کوئی کیتھولک زمینداری کا وارث نہ ہو سکتا تھا ۔ فوجی افسر بن سکتا تھا اور نہ جوڈیشل محکمہ کا جج ہو سکتا تھا فرانس میں ہیوگونو فرقہ کے ایک ایک جولاہے کو سمندر پار بھیج دیا جاتا تھا اور سویڈن میں سوائے لوتھرن فرقہ کے اور کوئی جیوری میں شامل نہ ہو سکتا تھا اور اسپانیہ میں سوائے حکمرانوں کے اور کسی عیسائی فرقہ کے پیرو کی تجہیز و تکفین عیسائی رسم و رواج کے مطابق نہ ہو سکتی تھی اسی زمانہ میں سنی اور شیعہ مرہٹہ اور سکھ آزادی کے ساتھ ہندوستان کے ہر شہر اور دربار میں اختیار اور فائدہ حاصل کرنے کے لئے مقابلہ کرتے تھے “

ہندوستان کے اندر مسلمانوں کی طرز حکومت کی تاریخ موٹے طریقہ پر ایک ہزار سال تک کے مختلف خاندانوں کی تاریخ ہے اتنے طویل عرصہ تک کسی بھی ملک یا مذہب کی تاریخ میں اچھے اور بُرے ہر طرح کے لوگ مل سکیں گے لیکن اگر ہم بے تعصبی سے اس تمام تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہندو یا مسلمان کسی بھی ہندوستانی کو اس پر شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے ایک اورنگ زیب کو چھوڑ کر پہلے کے اور بعد کے باقی تمام ہندوستان کے مغل شہنشاہوں کا زمانہ مذہبی رواداری کی نظر سے دنیا کی تاریخ میں ایک معیاری زمانہ تھا بابر ہمایوں اکبر جہانگیر شاہجہاں اور اس کے بعد اورنگ زیب کے تمام جانشینوں کے زمانہ میں ہندو اور مسلمانوں کے ساتھ یکساں سلوک کیا جاتا تھا دونوں مذہبوں کی یکساں قدر کی جاتی تھی اور مذہب کی بنا پر کسی کے ساتھ کسی طرح کا بھی تعصب نہ کیا جاتا تھا ۔ دہلی کے مغل دربار کے اندر ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے خاص خاص تیوہار بڑے جوش اور دھوم دھام کے ساتھ منائے جاتے تھے ۔ دسہرے کے دن شہنشاہ کا جلوس نکلتا تھا جس میں ہاتھیوں اور گھوڑوں کو خوب سجایا جاتا تھا اور ہندو اور مسلمان امراء سج سج کر ساتھ ساتھ شامل ہوتے تھے رکشا بندھن (سلونو) کے دن برہمن لوگ اور ہندو رؤسا اور سرداران شہنشاہ کی کلائی پر راکھی (ہندوؤں کے رواج کے مطابق

متبرک دھاگا) ، ہندو جاتے تھے ۔ دیوالی کی رات کو شاہی محلوں کے اندر روشنی ہوتی تھی اور جوا کھیلا جاتا تھا ۔ شوراتری اور محرم دو شاعید اور شب برات بھی اسی شان سے منائی جاتی تھی ۔ ہر شہنشاہ کی طرف سے بیشمار مندروں کو جاگیریں اور معافیاں دی گئیں اورنگ زیب متعصب تھا لیکن اورنگ زیب کے دربار میں بھی ہندو وزیر اور اس کی فوج میں ہندو سپہ سالار موجود تھے ۔ اورنگ زیب کا وزیر مالیات آخر تک ہندو رہا آج تک شمالی ہندوستان بھر میں بہت سے ہندو مندروں کے پجاریوں اور مالکوں کے پاس اورنگ زیب کے دستخطی فرمان موجود ہیں جن میں اورنگ زیب نے ان مندروں کو جاگیریں عطا کی ہیں اس طرح کے دو فرمان ابھی تک الہ آباد میں موجود ہیں جن میں سے ایک اریل میں سومیشور ناتھ کے مشہور مندر کے پجاریوں کے پاس ہے ۔ دو سو برس سے زاید تک مغل سلطنت میں گائے ذبح کرنے کی قانونی ممانعت تھی اور اس پر سختی کے ساتھ عملدرآمد ہوتا تھا ۔

تاریخ انسانوں کی تاریخ ہے اور اس میں سے ہر طرح کی انسانی کمزوریوں کی مثالیں ڈھونڈھ کر نکالی جا سکتی ہیں ۔ ہندو اور بودھ بھی ایک دوسرے کے ساتھ لڑے جیسیوں اور ہندوؤں نے ایک دوسرے پر مظالم کئے شیو اور شکتی فرقوں نے (جو دونوں ہندوؤں ہی کے فرقے ہیں) ایک دوسرے کے سر توڑے ہندو اور مسلمانوں میں بھی جب لڑنے کی امنگ اٹھی ایک دوسرے سے لڑے ۔ لیکن ہندوستانی تاریخ کی دو باتوں سے کسی بھی بے تعصب مطالعہ کرنے والے کو انکار نہیں ہو سکتا ۔ ہندوستانی تاریخ کے ماہر خصوصی میجر باس داس وسو مرحوم نے چند سال ہوئے گروکل کانگڑی کے کنووکیشن اڈریس میں کہا تھا ۔

یہ صاف ہے کہ مذہب کے نام پر اور فرقہ وارانہ اختلافات کی بنا پر جس طرح زبردست حیوانی مظالم اس زمانہ کے ہر ایک یورپین ملک میں ہو رہے تھے وسیع الخیال ہندوستان میں ان کا کہیں نام بھی نہ تھا ۔ اور جس طرح کی رواداری اور باہمی محبت کا سلوک مسلمانوں کے بیشتر دور حکومت میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں موجود تھا یورپ میں کہیں اس کا سایہ بھی نہ تھا ۔ رعایا کی بہبودی ۔ خوشحالی ۔ مالی آسودگی کی نظر سے مغل شہنشاہوں کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں بلاشبہ طلائی دور تھا ۔ دولت پیداوار

اور خوشحالی کی جو جھلک ہمیں ہندوستان میں شاہجہاں کے زمانہ میں دیکھنے میں آتی تھی وہ شاید ہی دنیا میں کسی دوسرے ملک کو نصیب ہوئی ہو۔ اس مقولہ کے ثبوت میں ہندوستانی تاریخ نگاروں کے علاوہ اس زمانہ کے بیشمار انگریز اور دیگر غیر ملکی سیاحوں کے بیانات نقل کئے جاسکتے ہیں۔ قومی زندگی کے مختلف حصوں سوسائٹی کے رسم ورواج علم سیاسیات سائنس فن و ہنر صنعت وحرفت تجارت وغیرہ میں مسلم دور سلطنت کے اندر ہندوستان نے جو بے نظیر ترقی کی مشہور تاریخ نگار سر جادو ناتھ سرکار نے اسے اپنی کتاب میں اور حال میں مختصر صورت سے "ہندوستان کو مسلم حکومت کے دس عطئے" نامی اپنی ایک تحریر میں اور دیگر بہت سے تاریخ نگاروں نے بہت خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

اسلام کیسے پھیلا | ایک اور افسوسناک غلط فہمی بہت سے لوگوں کے دلوں میں اسلام کے پھیلنے کے بارے میں ہے ڈی ڈبلو آرنلڈ نے اپنی کتاب The Preaching of Islam تبلیغ اسلام میں بتا کے ایک ایک ملک میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کو کافی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے سر جادو ناتھ سرکار نے بھی اس مضمون پر کچھ روشنی ڈالی ہے ڈاکٹر تاراچند نے اپنے عالمانہ مضمون The Influence of Islam on Indian Culture (ہندوستانی تمدن پر اسلام کا اثر) میں ہندوستان کے ایک ایک صوبہ میں اسلام کے پھیلنے کے سبب اور طریقے لکھے ہیں دیگر عالموں نے بھی اس مضمون پر کافی روشنی ڈالی ہے آرنلڈ نے دکھلایا ہے کہ وہ فرضی مبلغ اسلام جس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں قرآن شریف کی جلد ہوتی تھی تاریخ میں کہیں ڈھونڈے پتہ نہیں ملتا۔ ہندوستان کے ایک ایک صوبہ کے حالات اس بارے میں کافی وضاحت سے مل سکتے ہیں اسلام سب سے زیادہ ملکوں میں اور اس زمانہ میں پھیلا جن میں اسلام کا سیاسی اثر یا تو اس زمانہ تک پہنچا نہ تھا اور اگر پہنچا تھا تو نہایت کمزور تھا سیاسی اثر کے مضبوط ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام کا پھیلنا رکا ہے بند ہو گیا ہے بڑھا نہیں ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ جنوب سے شروع ہوئی نہ کہ شمال سے اور وہ اس زمانہ میں جبکہ یہاں اسلام کی حکومت کا پتہ بھی نہ تھا۔ آگرہ اور دہلی کے ان ضلعوں میں جو صدیوں مسلمان سلطنت کے مرکز رہے ہیں آبادی چوتھائی سے زیادہ

آبادی ہندوؤں کی رہی اور ابھی تک ہے اس مضمون کو وضاحت سے بیان کرنے کا وقت میرے پاس نہیں ہے لیکن زبردستی لوگوں کو مسلمان بنائے جانے کے جو قصے لوگوں میں کہیں کہیں رائج ہیں اگر وہ سب سچے بھی ہوں جو ان میں سے بلاشبہ ۹۰ فی صدی فرضی تھا) تو بھی جن تمام ہندوستانیوں نے مذہب اسلام قبول کیا اُن میں سے ہزارویں حصے نے بھی اس طرح کی کسی زبردستی کی وجہ سے نہیں کیا شروع کی صدیوں میں زیادہ تر ہندوؤں کی چھوٹی کہلانے والی ذاتوں کے لوگوں نے ہی بڑی بڑی تعداد میں نئے مذہب کو اختیار کیا اور ان کے ایسا کرنے کا سبب صاف تھا ایک طرف ایک اللہ ایک رسول نہ کوئی دیوی نہ دیوتا سیدھے سادے اصول بنی نوع انسان میں کل مساوات نہ کوئی اونچا نہ کوئی نیچا نہ خدا اور اس کی پرستش کرنے والے کے درمیان کسی ولی یا مرشد کی ضرورت مذہب کی نگاہ میں امیر اور غریب بادشاہ اور فقیر عالم اور جاہل سب برابر دوسری طرف بیشمار دیوی دیوتا بہت کڑے شاستر سخت مذہبی اعمال کی پابندیاں ذات پات اونچ نیچ۔ نہ بغیر برہمن یا پروہت کے پیدائش کی رسوم ہوسکیں اور نہ شادی اور موت کی رسومات ادا ہوسکیں۔ پھر اس پر ایک مذہب کے ماننے والوں میں آپس میں وہ سلوک جس پر مجھے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں اگر ہم آٹھویں صدی سے بارھویں صدی تک ہندوؤں کی مذہبی اور مجلسی حالت کا صحیح طور پر مطالعہ کریں (اور یہی وقت ہندوستان میں مذہب اسلام کے پھیلنے کا تھا بارھویں صدی کے بعد کا نہیں) اور ساتھ ساتھ اُن ہزاروں معیاری کیرکٹر رکھنے والے مسلم فقرا کی زندگیوں کا مطالعہ کریں جو اس زمانہ میں تمام ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے اور جن کی ہندو راجاؤں کے دربار میں زبردست عزت تھی تو اسلام کے پھیلنے اور فروغ پانے کے اسباب اور طریقے ہمیں آئینہ کی طرح دکھائی دے جائیں۔

اس زمانہ کی تقریباً سبھی تاریخی تحریروں کا مطالعہ کرنے کے بعد ڈی ڈبلو آرنلڈ لکھتا ہے۔

ہندوؤں کی نیچ قوموں پر اونچی کے ہم مذہبوں نے توہین اور نفرت کی جو بھرمار کی اور ان قوموں میں کے کسی شخص نے اگر اپنی حالت بہتر بنانا چاہی اس کے راستہ میں جو ناقابل عبور رکاوٹیں ڈالی گئیں یہ باتیں ایک ایسے مذہبی نظام سے زبردست اختلاف رکھتی ہیں جس میں کوئی اچھوت نہیں اور جس میں

ہر حوصلہ کی تکمیل کا پورا موقعہ ہے مثلاً بنگال میں سوتی کپڑے کے بننے والے ہندو جنھیں ان کے ہندو ہم مذہب ذلت کی نظر سے دیکھتے ہیں کثیر تعداد میں اس لئے اسلام قبول کر لیتے ہیں کہ وہ جس ذلیل حالت میں تھے اس سے بچ جائیں اسی طرح ہندوستان کے ہر حصہ سے مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں

طبقہ وارانہ تعصب کی عدم موجودگی میں ہی ہندوستان میں اسلام کی حقیقی قوت کا راز مضمر ہے جس کی وجہ سے اتنی کثیر تعداد میں ہندو مسلمان ہو جاتے ہیں

علاوہ ازیں بنگال میں جنگلی قوموں نے دوران پیچ قوموں نے مسلم مبلغوں کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا جو ہندو دھرم کے دائرے کی بعید ترین حدیں تھیں جن سے ان کے مغرور آریہ فاتح نفرت کرتے تھے اور بہ نظر توہین دیکھتے تھے ان غریب پیچ قوم کے کسانوں، رہزنوں شکاریوں ماہی گیروں وغیرہ کے لئے اسلام عالم بالا کا ایک پیغام بن کر آیا ۔ لوگوں کے دلوں پر اس نے اثر کیا زیادہ تر نو مسلم غریب طبقہ کے تھے ۔ اسلام نے خدا کے متعلق بلند تصور اور اخوت انسانی کے متعلق بہتر خیال پیدا کیا اس نے بنگال کی نیچ قوموں کے کروڑوں آدمیوں کو جو مدتوں سے ہندو فرقہ کے بیرونی حلقہ کے سرے پر بیٹھے ہوئے تھے ایک نئے مجلسی نظام میں آزادانہ داخلہ کا موقع دیا ۔

بنگال کے دو کروڑ مسلمانوں میں سے صرف ۲۵ ہزار بالائی طبقہ کے گنے جاتے ہیں اور کل ہندوستانیوں میں سے تقریباً نصف تعداد جولاہوں کی ہے تاریخ صاف ظاہر کرتی ہے کہ ہندوستان کے مشتر مسلم بادشاہوں نے ہر قسم کی تبدیل مذہب کی حوصلہ افزائی نہیں کی بلکہ الٹی اس کی حوصلہ شکنی کی

اب میں اس بحث سے ہٹ کر پھر سے قومیت تہذیب تمدن اور فرض انسانی کے اصول کی جانب آنا چاہتا ہوں ۔

<u>قوم اور قومیت</u> | یہ خیال نہایت غلط اور نقصان دہ ہے کہ ایک قوم ہونے کے لئے کسی معنی میں بھی ایک دھرم یا ایک مذہب ہونا ضروری ہے میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ ہمارے آج کل کے لٹریچر میں اکثر ہندو قوم اور مسلم قوم کے الفاظ کا استعمال ہوتا رہا ہے یہ استعمال صرف ہماری ناواقفیت یا ہماری تنگدلی کا مظہر ہے ہندوستان میں مختلف دین اور مختلف مذہبوں ہندو مسلمان پارسی بودھ عیسائی سکھ وغیرہ کے لوگ ہیں

لیکن قوم یا نیشن ایک اور صرف ایک ہے ہندوستانی قومیت یا نیشنلزم کا تعلق ملک کے ساتھ ہے مذہب کے ساتھ نہیں جس ملک کے اندر رہنے والوں کو پوری مذہبی آزادی نہیں کوئی کسی بھی مذہب کا ماننے والا ہو سب کی یکساں قدر نہیں اور سب کو قومی زندگی میں یکساں حقوق نہیں حاصل ہیں وہ ملک بنی نوع انسان کی ترقی میں معاون نہیں ہو سکتا اور جتنی جلدی دنیا سے مٹ جائے اتنا ہی اچھا ہے آج سے قریب ۲۰ سال پہلے سے ہندوستان کے مشہور فلسفی اور سیاست داں شری آربندو گھوش نے اس بارے میں ایک بڑا خوبصورت مضمون اپنے مشہور اخبار کرم یوگی میں شائع کیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ اس دنیا میں پہلے بھی بیشمار آدمیوں نے متعدد بار ماں کے درشن کرنے کی کوشش کی مگر انھیں پوری کامیابی نہ ہو سکی بجائے ماں کی مکمل صورت کے درشن کرنے کے انھیں صرف ایک ہی پہلو کی زیارت ہو سکی شواجی نے ماتا کے درشن صرف ہندو ماتا کی شکل میں کیے گرو گوبند سنگھ نے ماں کا درشن کرنا چاہا انھیں صرف پنج آب ماتا کے درشن ہوئے بنکم بابو نے ماتا کے درشن کرنے چاہے انھیں صرف بنگال ماتا کے درشن حاصل ہوئے وغیرہ لیکن بھارت ماتا (مادرِ ہند) کی مکمل زیارت صرف جدید نیشنلزم کو ہی حاصل ہو سکی۔

تاریخی نظر سے آربندو بابو کی تصور مکمل طور پر سچ نہیں ہے لیکن اس میں حقیقت کا بہت کچھ حصہ ہے مگر صرف فلسفیانہ یا نفسیاتی نظر سے ہمارے مستقبل کے نصب العین ہماری معیاری نظر سے ان کی بات سولہ آنے سچی اور نہایت اہمیت رکھتی ہے۔

ہمیں بڑی تکلیف کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ آربند بابو کے وقت سے اگرچہ ۲۱-۱۹۲۰ء کے سنہری زمانہ کی طرح کبھی کبھی ہمیں ماتا کے مکمل درشن کی جھلک دکھائی دے گئی ہے تب بھی بیشتر ہمارے اور ہماری معبود دیوی کے درمیان زیادہ سے زیادہ پردے پڑتے چلے گئے ہیں

اس کے بھی وجوہ ہیں۔ ہم بھی انسان ہیں ہم میں بھی کمزوریاں ہیں سیاست کی شطرنج کے ہم اتنے شاطر کھلاڑی نہیں ہیں دوسرے کا جادو ہمارے سر پر بھی چڑھ کر بولنے لگتا ہے ٹھیک ہماری اسی وقت کی سی حالت میں انگلستان چار سو برس تک رومن لوگوں کی جوتیاں کھاتا رہا اس وقت کے انگلستان کی تاریخ اٹھا کر پڑھ لیجئے انگلستان کو ایک ایک شہر ایک ایک گوشہ باہمی نفاق آپس کی

پھوٹ محسن کشی وطن سے غداری اور اپنے ملک اور اہل ملک کو برباد کرکے غیر ملکی حکمرانوں کو خوش رکھنے والوں سے خوب بھرا ہوا تھا۔ خدا کے فضل سے ہماری حالت اس سے بدرجہا بہتر ہے ہمیں یقین ہے کہ اپنے مرض کا علاج کرنے میں ہمیں اب صدیاں نہیں لگ سکتیں لیکن ہمیں اپنے چاروں طرف آنکھیں کھول کر دیکھنا ہوگا ہمیں اپنی کمزوریوں کو سمجھنا ہوگا اور انہیں دور کرنا ہوگا۔

جو لوگ تمام ہندوستان کے اندر ایک ہندو قوم اور ایک ہندو سلطنت کا خواب دیکھ رہے ہیں یا جو ہندوستان میں یا دنیا میں پھر سے خالص اسلامی دور قایم کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں میں ان کی نیت پر شبہ نہیں کرتا لیکن وہ دانستہ یا نادانستہ اس بدقسمت ملک کی بیڑیوں کو اور زیادہ جکڑ رہے ہیں اس کی بدقسمتی اور اس کی مصیبتوں کو دیرپا بنا رہے ہیں اس کے تنگ اصول انسانی قوم کے لئے مفید نہیں ہیں دنیا ان اصولوں کو اس تنگ نظری کے مرض کو مٹا کر رہے گی ایسا نہ ہو کہ اس کا یہ روگ قومی جسم میں اتنا پیوست ہو جائے کہ مرض کے مٹنے کے ساتھ ساتھ مریض بھی ختم ہو جائے۔

(ماہی آسو)

بڑھیا

لوگ اسے "بڑھیا" کہتے تھے۔ وہ بہت زیادہ معمر تھی۔ اس کا نیم برہنہ، جھرّیوں پڑا ہوا جسم ایک ڈھانچ کی مانند تھا۔ اس کے ہاتھوں میں رعشہ تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں مفلوج ہو چکی تھیں اور وہ اپنے ہاتھوں کے بل زمین پر گھسٹ کر راستہ طے کرتی تھی۔ اس کے بال مختصر اور اُلجھے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں اگرچہ کھلی ہوئی تھیں اور بینائی سے بالکل محروم نہ تھیں، لیکن ان میں وہ روشنی، وہ چمک نام کو نہ تھی جو انسانی آنکھوں میں مرتے دم تک پائی جاتی ہے۔ آنکھیں خیالات اور جذبات کا آئینہ ہوتی ہیں۔ وہ خفیف سے خفیف ذہنی کاوش اور ہلکے سے ہلکے قلبی تاثر کی تصویریں کر سکتی ہیں لیکن اس کی آنکھیں بے حس تھیں، بے جان تھیں، کیف سے خالی تھیں جیسے شیشے یا پتھر کی مصنوعی آنکھیں ہوتی ہیں۔ وہ جب نظریں اٹھا کر کسی کو دیکھتی تھی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بکری یا گائے اپنی کھلی ہوئی لیکن ساکت اور بے معنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔ جب کوئی بے زبان جانور ہمیں دیکھتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں نہیں دیکھ رہا۔ بلکہ اس کی نظریں ہمارے جسم میں سے گذر کر کسی ایسی چیز تک پہنچ رہی ہیں جو ہمارے پیچھے ہے۔ بالکل یہی بات بڑھیا کی آنکھوں میں پائی جاتی تھی۔ اس کی آواز بھی عام انسانوں کی سی آواز نہ تھی وہ حلق کی بجائے ناک سے نکلتی ہوئی معلوم ہوتی تھی، اور ایک طویل، خوفناک اور درد انگیز کراہ کی مانند تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جو کچھ وہ کہتی تھی بہت مشکل سے سمجھ میں آتا تھا۔ غرض یہ کہ بڑھاپے کے سبب سے اور زندگی کی سختیاں جھیلنے کے باعث اس کے تمام حواس ضعیف اور کند ہو چکے تھے۔

جب وہ سڑک کے کنارے بیٹھ کر بھیک مانگتی تھی تو اس کا وجود حیاتِ انسانی کی انتہائی بیچارگی، انتہائی پستی اور انتہائی ذلّت کی تصویر پیش کرتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ گردشِ ایام کی تمام ستم انگیزیاں اور حوادثِ روزگار کی ساری تباہ کاریاں یہیں جمع ہو گئی ہیں۔ اور اس بے انصاف، جفا پیشہ اور سفاک زمانے نے اپنے ظلم کا ایک شاہکار تیار کیا ہے بگڑی ہوئی صورت، تھکی ہوئی بے جان آنکھیں، بھدّی اور غیر فطری آواز، مجروح، لرزتا ہوا اور نیم عریاں جسم پھٹے ہوئے، میلے، غلیظ اور متعفن کپڑے ـــــ حقیقت میں یہ ایک بہت ہی دردناک اور بہت ہی نفرت انگیز منظر

تھا پھر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جب وہ اپنے ہاتھ پھیلا کر کراہتی ہوئی آواز میں پکارتی اور لوگوں کو اپنی قابلِ رحم حالت کی طرف متوجہ کرتی تو لوگ اسے دیکھ کر منہ پھیر لیتے، جس طرح ایک زخمی، نیم مردہ اور گھناؤنا منظر پیش کرنے والے کتے کو سڑک کے کنارے پڑا ہوا دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں۔

وہ اپنا سارا دن شہر کی مختلف سڑکوں پر گزارتی تھی۔ رات کو سونے کے لئے اور آرام — آرام!! — کرنے کے لئے اسے دو تین مقامات معلوم تھے انہی میں سے کسی مقام پر جا کر پڑ رہتی اور صبح کر دیتی۔ شہر کے ایک ایسے حصے میں جو رؤسا اور عمائدین کا مرکز تھا تین عالیشان مکان آس پاس واقع تھے۔ ان مکانوں کے درمیان زمین کا ایک نہایت مختصر قطعہ اس طرح پڑا تھا گویا کسی کی ملکیت نہیں۔ بڑھیا نے اس پر اپنا قبضہ جما لیا تھا اور وہ جاڑوں کی اکثر راتیں اسی کنج میں گزارتی تھی۔ ہرچند کہ وہاں چھت یا سائبان کی قسم سے کوئی چیز نہ تھی، تاہم چونکہ جگہ تنگ اور اونچی دیواروں سے گھری ہوئی تھی اس لئے سرد ہوا سے ایک حد تک محفوظ تھی اور ایک بے سر و سامان انسان کو رات کی سردی سے بچنے کے لئے اس سے بہتر مقام میسر نہ آ سکتا تھا۔

اس روز جب وہ شام کو اس کنج میں پہنچی اور حسبِ معمول اپنا کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی — وہ کمبل جو شاید اس کا ہم عمر تھا — تو اس نے یہ نہ دیکھا (وہ یہ دیکھ ہی نہ سکی) کہ آسمان پر بادل جمع ہو رہے ہیں۔ پھر جب ان بادلوں نے گرجنا شروع کیا تو غالباً ان کی دہلا دینے والی آوازیں اس کے بہرے کانوں تک نہ پہنچ سکیں اور اس کو آنے والے طوفان سے آگاہ نہ کر سکیں۔ جب بالکل رات ہو گئی، زمین سے لے کر آسمان تک اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا، تو اس نے چمکتی ہوئی بجلی کی روشنی دیکھی لیکن کندئ حواس کے باعث وہ اب بھی خطرے کو محسوس نہ کر سکی اور بے خبری کے عالم میں پڑی رہی۔ تھوڑی دیر میں ہوا بہت زیادہ ٹھنڈی ہو گئی اور تیزی کے ساتھ چلنے لگی۔ اس کا نیم عریاں جسم جس نے بہت سے موسمی شدائد برداشت کئے تھے عام انسانی جسم کی طرح حساس نہ تھا۔ تاہم وہ اس تند اور سرد ہوا سے متاثر ہوا۔ اور موسم کے ناخوشگوار اثرات اس نے محسوس کئے بڑھیا نے بوسیدہ کمبل کو ہر طرف سے سمیٹا اور ٹانگوں کو اس حد تک سکیڑا کہ وہ بالکل ایک گٹھری معلوم ہونے لگی لیکن سرد ہوا کی تندی اور تیزی میں فرق نہ آیا۔ اس کی خنکی بڑھتی ہی گئی۔ بڑھیا کو کسی طرح نیند نہ آئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی — شاید اس امید میں کہ ہوا تھم جائے، سردی کم ہو جائے تو پھر سو رہوں۔ لیکن اس کو کئی گھنٹے یوں ہی بیٹھے رہنا پڑا۔

کون کہہ سکتا ہے کہ جب وہ اس طرح بیٹھی سرد ہوا کے طمانچے برداشت کر رہی تھی تو اس کا دل کن خیالات کی آماجگاہ سا ہوا تھا۔ وہ شاید ان خوش نصیب انسانوں کے تصور سے ہم آغوش تھی جو اپنے عالیشان اور سنگین مکانوں میں مصروفِ راحت تھے، جو رات کی برفانی ہواؤں سے محفوظ تھے، جو خون کو رگوں میں منجمد کر دینے والی سردی سے بے خوف تھے جن کے پاس نرم بستر تھے، گرم لحاف تھے اور سرخ انگاروں سے بھرے ہوئے آتشدان تھے۔ یا شاید وہ اس دورِ افتادہ اور بچھڑے ہوئے زمانے کو یاد کر رہی تھی جب اس کی زندگی میں سردی اور تاریکی نام کو نہ تھی۔ دھوپ بھی اور سردی بھی، عزیزوں کی محبت تھی اور محبت کی گرمیاں تھیں گرمی، جاڑا، اور خزاں، سب موسم آتے تھے، اپنی اپنی راحتیں اپنے ساتھ لاتے تھے اور دنیا میں بکھیر کر چلے جاتے تھے۔ نہ دن کو سڑکوں کی خاک دھول تھی، نہ رات کو سرد ہوا کے طمانچے۔

رات کے ٹھیک گیارہ بجے ہلکی ہلکی پھوار پڑنی شروع ہوئی۔ بڑھیا اس ترشح کے صحیح معنی شاید ابھی سمجھی بھی نہ تھی کہ موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں یہاں تک کہ دو چار لمحوں کے اندر موسلا دھار بارش کا سماں بندھ گیا۔ وہ چیخی، چلّائی، مدد کے لئے لوگوں کو پکارا "سرکار" "حضور" "بیگم صاحب" "میں بھیگ گئی" "میں مر گئی" "مجھے بچاؤ" کے نوابے بلند کئے مگر کسی نے اس کے حال پر توجہ نہ کی، کوئی اس کی مدد کو نہ آیا۔ اس کی دردناک پکار کا جواب کسی طرف سے نہ ملا جب چیختے چیختے تھک گئی تو رونے لگی، اپنی مکروہ اور بھدّی آواز میں آہ و زاری کرنے لگی لیکن ــــ گویا یہ اس کے نالہ و فریاد کا جواب تھا ــــ بادل اور زور سے گرجنے لگا، بارش زیادہ شدید ہو گئی، ہوا کے جھونکے طوفانی موجوں کے تھپیڑے بن گئے، درختوں کی دری شاخیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر خوفناک آوازیں پیدا کرنے لگیں، نالے ندیاں بن کر بہنے لگے، رفیع الشان عمارات کی بلندیوں سے آبشار رواں ہو گئے مکانوں کی پختہ چھتوں پر اور ٹین کی چادروں پر مینہ کا شور بھوتوں اور جنوں کا رقص معلوم ہونے لگا، فضا بحرِ موّاج کا نمونہ بن گئی، عالم تیرہ و تار ہو گیا۔ دنیا متلاطم ہو گئی، اور اس تلاطم میں، اس ہولناک سیلاب میں، اس ہیبت انگیز اور قیامت خیز طوفان میں بڑھیا کی فریاد غرق ہو گئی ــــ اپنی تمام مظلومیت اور بیچارگی، تمام ناتوانیوں اور اندوہ ناکیوں کے ساتھ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔

اب جب کبھی رات کو زور کی بارش ہوتی ہے، تیز اور تند ہوائیں چلتی ہیں، بجلیاں کڑکتی ہیں، اور بادل گرجتے ہیں تو ان میں عالیشان مکانوں کے رہنے والوں کو بادوباراں کے طوفان میں خوفناک انسانی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ یہ

دیہی صنعتیں اور دیہات کی نئی تعمیر

(بسلسلۂ گذشتہ)

۴۔ آل انڈیا ویلیج انڈسٹریز ایسوسی ایشن

تاریخ اور اس کا دستور اساسی وغیرہ

ان مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے گاندھی جی نے ایک آل انڈیا ویلیج انڈسٹریز ایسوسی ایشن (تمام ہندوستان کی انجمن صنایع دیہی) کے قیام کی ضرورت محسوس کیا چنانچہ اُن کے ایماء سے انڈین نیشنل کانگرس نے اپنے اڑتالیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ بمبئی ۲۷ر اکتوبر ۳۴ء میں حسب ذیل تجویز منظور کی۔

"چونکہ اس وقت ملک کے ہر حصہ میں ایسی انجمنیں اور ادارے قایم ہو رہے ہیں جو سودیشی کو فروغ دینے کے مدعی ہیں اور اُن میں بعض کانگرس سے امداد حاصل کرتے ہیں اور بعض خود مختار ہیں۔ اور چونکہ عوام کے لئے سودیشی کی صحیح ماہیت کا سمجھنا مشکل ہو گیا ہے۔ نیز چونکہ کانگرس شروع ہی سے عوام کی ترجمانی کرتی چلی آئی ہے اور دیہات کی تنظیم اور سدھار تو کانگرس کے تعمیری پروگرام میں داخل ہی ہے اور چونکہ اس قسم کی اصلاحی کوششوں کا لازمی نتیجہ کھدر اور چرخہ کے ساتھ ساتھ دیہات کی دوسری مردہ اور قریب المرگ صنعتوں کو زندہ کرنا اور اُن کو ترقی دینا ہوگا اور ظاہر ہے کہ اس کام کو کھدر اور چرخہ کی ترویج کی طرح صرف ایسی متحدہ اور غیر معمولی جدوجہد سے کیا جا سکتا ہے جو کانگرس کی سیاسی سرگرمیوں سے آزاد اور اُن کے اثرات سے مامون ہو۔ اس بنا پر شری جے۔ سی۔ کمار اپا کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ گاندھی جی کے مشورہ سے آل انڈیا ویلیج انڈسٹریز ایسوسی ایشن کے نام سے ایک ادارہ قایم کریں جو کانگرس کی سرگرمیوں کا ایک جزو ہو۔ ایسوسی ایشن مذکور دیہاتی صنعتوں کے احیا اور ان کی ترقی اور دیہاتیوں کی اخلاقی

اور جسمانی اصلاح کی کوشش کرے گی اور اُسے اپنا دستور اساسی بنانے۔ سرمایہ فراہم کرنے اور اپنے کام کو چلانے کے لئے مناسب ذرائع اختیار کرنے کا حق ہوگا۔

اس تجویز کے مطابق ۱۴ر دسمبر ۱۹۳۴ء کو ایسوسی ایشن کی تشکیل عمل میں آئی اور اس کا نام آل انڈیا ویلیج انڈسٹریز ایسوسی ایشن یا اکھیل بھارت گرام ادیوگ سنگھ یا تمام ہندوستان کی انجمن صنایع دیہی قرار پایا۔ اس کا مقصد دیہات کی تنظیم دیہاتی صنعتوں کا احیاء اور ترقی اور دیہاتیوں کی اخلاقی اور جسمانی سدھار ہے۔ ایسوسی ایشن یہ سب کام گاندھی جی کی سرپرستی میں کرے گی۔

ایسوسی ایشن مذکوران ارکان پر مشتمل ہے۔

امناء۔ تاسیسی ارکان۔ انتظامی بورڈ۔ معمولی ارکان۔ نمائندے۔ اعزازی کارکن۔ تنخواہ دار کارکن۔ سرکار اور مجلس مشاورت اس کے علاوہ ہوگی

امناء | ده امی امناء کا بورڈ جو چھ اشخاص پر مشتمل ہے ایسوسی ایشن کے سرمایہ اور جائداد کا قانونی نگراں ہے۔ اور انتظامی بورڈ کے حسب ہدایت خرچ کرنے کا مجاز ہے۔

تاسیسی ارکان اور انتظامی بورڈ | تاسیسی ارکان کی تعداد آٹھ ہے اور پہلا انتظامی بورڈ انہی پر مشتمل ہے یہ ۱۴ر فروری ۱۹۳۵ء سے، سال تک انتظامی بورڈ کے رکن رہیں گے اور بورڈ ہی ایسوسی ایشن کے جملہ کاموں کا ذمہ دار ہے۔

معمولی ارکان | معمولی رکن کے لئے ضروری ہے کہ رکنیت کے شرائط نامہ کی تصدیق کے ساتھ انتظامی بورڈ کا ایک رکن اس کی سفارش بھی کرے اور اس کے بعد بورڈ اس کی رکنیت کو تسلیم کرلے۔ معمولی رکن کو ہر تیسرے مہینہ اپنے کام کی رُوداد سکریٹری کے پاس ارسال کرنا ہوگی۔

نمائندے | نمائندے معمولی ارکان میں سے منتخب کئے جائیں گے اور یہ انتخاب انتظامی بورڈ کرے گا نمائندے اپنے اپنے حلقہ کی نمائندگی کے فرائض ادا کریں گے۔ اور ان کا انتخاب اپنے علاقہ سے واقفیت انتظامی قابلیت اور مقامی اثر و رسوخ کی بنا پر ہوگا۔ دراصل یہی نمائندے ایسوسی ایشن کے اصل کارکن ہوں گے۔ یہ لوگ اپنے اپنے ضلعوں میں ایسوسی ایشن کی شاخیں کھولیں گے۔ انھیں اپنے کام کے لئے

سرمایہ جمع کرنے کا حق ہوگا لیکن وہ اس کو ذاتی ضرورتوں پر خرچ کرنے کے مجاز نہ ہوں گے اور نہ ہی ایسوسی ایشن کے مرکزی دفتر سے انھیں کوئی امداد ملے گی۔ ان نمائندوں کو ماہ بماہ اپنے کام کی رُوداد اور آمد و خرچ کا حساب مرکز میں بھیجنا پڑے گا

اعزازی کارکن | اعزازی کارکن نمائندوں اور معمولی ارکان کے علاوہ ہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ وہ دیہات کی سی ہوئی چیزیں خود استعمال کریں اور دوسروں میں اُن کا پرچار کریں اور دیہاتیوں کی جو خدمت اُن کے بس میں ہو کریں اُن کو ہر مہینے اپنی کارگذاریوں کی رُوداد مرکزی دفتر میں پیش کرنا ہوگی۔

تنخواہ دار کارکن | اُن کارکنوں کے علاوہ جو ضلعوں کے نمائندے خود مقرر کریں گے اور خود ہی اُن کو تنخواہ دیں گے نیز ایسوسی ایشن کے مرکزی دفتر کے ملازموں کے ماسوا بورڈ ایسے کارکن بھی ملازم رکھے گا جو دیہاتوں میں آباد ہو کر ایسوسی ایشن کے پروگرام کے مطابق سدھار کا کام کریں گے۔ یہ کارکن عام طور پر ایسے علاقوں میں مقرر کئے جائیں گے جہاں پہلے سے ایسوسی ایشن کے نمائندے نہ ہوں گے ان کارکنوں کو گذر اوقات کے لئے دس روپے ماہوار دئے جائیں گے۔

شریک کار | ہر شخص جو ایسوسی ایشن کے مقاصد سے ہمدردی رکھتا ہے اور اُسے کم از کم سو روپیہ سالانہ چندہ دیتا ہے وہ ایسوسی ایشن مذکور کا شریک متصور ہوگا۔ اور جو شخص ایک ہزار روپیہ یکمشت دے گا وہ ایسوسی ایشن کا شریک دائمی سمجھا جائے گا۔

مشیر | مشیر وہ ہیں جو اپنی ذاتی مصروفیتوں کے باوجود ایسوسی ایشن کو ضرورت کے وقت مفید مشوروں سے بلا معاوضہ ممنون کریں۔

ان شعبوں کے علاوہ ایسوسی ایشن اپنے پروگرام میں ملحقہ اداروں اور منظور شدہ اداروں سے بھی کام لے گی۔

ملحقہ ادارے | ملحقہ اداروں میں آشرموں اور اس قسم کی دوسری قومی انجمنوں کا شمار ہوگا جس کا مقصد دیہات کی اصلاح اور دیہاتیوں کی خدمت کرنا ہے اور نیز اُس کے اغراض و مقاصد میں کوئی بات ایسی نہ ہو جس سے ایسوسی ایشن سے اصولاً تضاد واقع ہوتا ہو۔

منظور شدہ ادارے | منظور شدہ اداروں سے مراد وہ دکانیں اور اشخاص ہیں جو ایسوسی ایشن کے زیر اثر دیہات کی بنی ہوئی چیزیں مہیا کریں اور اُن کو فروخت کریں، یہ لوگ ایسوسی ایشن کے تجارتی کارندے ہوں گے اس وقت تک ایسوسی ایشن کی طرف سے حسب ذیل اشیاء کی خرید و فروخت کے متعلق اجازت نامے دئے جا چکے ہیں چکی کا پسا ہوا آٹا ۔ گڑ ۔ شہد ۔ ہاتھ کا نکالا ہوا چاول ۔ کولھو کا تیل ۔ ہاتھ کا بنا ہوا کاغذ ۔ گھی ۔ دال اور خشک پھل ۔

مالیات | ایسوسی ایشن کا نصب العین لامرکزیت ہے اور وہ نہایت خلوص سے اُس پر عمل پیرا ہے ۔ چنانچہ اُس نے اپنے پروگرام میں مقامی طور پر مالی امداد کا انتظام کیا ہے ۔ اُس کے نمائندے اپنے کام کے لئے اپنے اپنے حلقوں سے چندہ فراہم کریں گے البتہ ایسوسی ایشن کا مرکزی دفتر اپنے ہمدردوں کے عطیات یا چندے قبول کرتا ہے اور نیز اُسے اپنے معمولی شرکا اور دائمی شرکا سے سالانہ چندے بھی وصول ہوتے ہیں، امید ہے آگے چل کر مرکزی دفتر کا کام ملحقہ اداروں اور منظور شدہ اداروں کی فیسوں سے چل جایا کرے گا ۔

ارکان کی تعداد | ۴ر نومبر ۳۵ء تک ایسوسی ایشن کے مختلف ارکان کی تعداد حسب ذیل تھی ۔

معمولی ارکان	۴۲۳	منظور شدہ دکانیں	۲۷
نمائندے	۶۱	ملحقہ ادارے	۵

نشر و اشاعت | ایسوسی ایشن نے جن چیزوں کے متعلق اس وقت تک قابل اعتماد معلومات فراہم کی ہیں اُن پر چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کئے ہیں ۔ نیز ایسے اغراض و مقاصد کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں اخبارات اور رسائل میں مضامین لکھے گئے ہیں اور اس وقت ہفتہ وار "ہریجن" ایسوسی ایشن کا ترجمان ہے ۔ یہ اخبار انگریزی ۔ گجراتی اور ہندی میں شائع ہوتا ہے ۔ کارکنوں کو چاہئے کہ وہ مفید مشوروں کے لئے اس کا مطالعہ کریں ۔

انجمن کا پروگرام | ظاہر ہے کہ دیہات کے تمام مسائل کو سلجھانا ایسوسی ایشن کے بس میں نہیں ۔ مزید برآں بعض مسائل تو صرف حکومت کے کرنے کے ہیں کیوں کہ اُن کے لئے تمام ہندوستان پر سیاسی اور اقتصادی اختیارات

کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان حالات میں ضروری ہے کہ ایسوسی ایشن اپنے دائرہ عمل کو صرف اُن طریقوں تک محدود رکھے جن کا انحصار شخصی انتظام اور ذاتی اختیار پر ہو۔ اور اس میں حکومت کے اداروں اور اثر و نفوذ کی ضرورت نہ پڑے۔

اس میں شک نہیں کہ ہر اُس ادارہ کو جس کا مقصد دیہات کی اصلاح ہے سب سے پہلے دیہاتیوں کی جسمانی حالت کی طرف توجہ کرنا ہوگی کیوں کہ دیہاتی ہی گاؤں کی تمام سرگرمیوں کا مرکز ہے اور جب تک اُس کی جسمانی حالت اچھی نہ ہوگی گاؤں کی اصلاح کی امید رکھنا بے کار ہے۔ اس امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسوسی ایشن نے سب سے پہلے گاؤں کی صفائی کو لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک گاؤں کی گلیاں، بازار اور میدان صاف نہ رکھے جائیں گے اور آب رسانی کا اچھا انتظام نہ ہوگا گاؤں والے آئے دن بیماریوں اور وباؤں کا نشانہ بنے رہیں گے جو اُن کی رہی سہی قوت کو بھی ختم کر دے گی، بہر حال وہ لوگ جو دیہاتیوں کا بھلا چاہتے ہیں اُن سے ایسوسی ایشن کی درخواست یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے گاؤں کی صفائی کا کام شروع کریں۔ اور وہ اس طرح کہ گاؤں میں معمولی طور پر راستے بنائیں۔ گلیوں کو گندگی کے ڈھیروں سے جو کھیتیں اور بیماریوں کے جراثیم کا گھر ہونے ہیں پاک کریں۔ پاخانوں کی غلاظت کو کام میں لانے کے لئے اصلاحی طریقے رائج کریں اور گاؤں کے تالابوں اور کنوؤں کو صاف کیا جائے۔ اور دیہاتیوں کو حفظانِ صحت کے طریقوں اور گھروں کی روشنی اور صفائی کی ضرورت۔ کپڑوں اور کھانے پکانے کے بارے میں مناسب ہدایات دی جائیں۔

اس کے علاوہ ایسوسی ایشن مذکور خوراک کی اصلاح کے متعلق غور و خوض کر رہی ہے وہ کھانے کی ایسی مناسب نوعیت معلوم کرنا چاہتی ہے جو دیہاتیوں کی گرہ کے مطابق ہو اور اُس میں غذائیت کے ضروری اجزا بھی ہوں۔

کسان کی اہلیت پیداوار اچھی خوراک نہ ملنے کی وجہ سے بھی گھٹ گئی ہے۔ لہذا یہ ضروری ہے، کہ اس کے کھانے میں زندگی بخش عناصر کو شامل کیا جائے، ورنہ جو کچھ اُسے ملتا ہے کم از کم اُس کی غذائیت تو نہ گھٹنے پائے اگر وہ چاول کو تھوڑی سی دال بھات کے ساتھ مل کر ہی گزر کرتا ہے، تو اس بات کا خیال رکھنا چاہئے، کہ وہ

چاول سے پورا فائدہ اٹھائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے، اس کو یہ بتانا چاہئے کہ کتنے چاول کے لئے کتنا پانی کافی ہے۔ کیوں کہ چاول اُبالنے کے بعد جو زائد پانی پھینک دیا جاتا ہے، اس میں بہت سی غذائیت موجود ہوتی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اُسے ہاتھ کا کوٹا ہوا چاول استعمال کرنا چاہئے۔ اس سے صرف یہ فائدہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنا روپیہ مِل کی نذر کرنے سے بچ جاتا ہے، بلکہ یہ طبی نقطۂ نظر سے بھی مفید ہے، کیونکہ مِل کی گرمی سے وٹامن (ب) ضائع ہو جاتا ہے۔ چاول کو صاف نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ ایسا کرنے میں چاول کا رنگ بگڑ جاتا ہے، اور دراصل اسی میں وٹامن (ب) موجود ہوتا ہے، جو کہ غذائیت رکھنے کے علاوہ بیری بیری سے بھی محفوظ رکھتا ہے۔ سارے طبیب، اس امر پر متفق ہیں کہ ناصاف چاول، صاف کئے ہوئے چاول سے کہیں بہتر ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں پروٹین، چربی، اور معدنیات نسبتۃً زیادہ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ناصاف چاول سے کبھی قبض نہیں ہوتا، درآنحالیکہ صاف چاول ہمیشہ قبض کرتا ہے۔ ان اسباب کے پیش نظر، ایسوسی ایشن اس امر پر زور دیتی ہے کہ ہر وہ شخص جس کو کسانوں کے دُکھ درد کا احساس ہو، وہ خود بھی ناصاف، ہاتھ کا کوٹا ہوا چاول کھائے، اور کسانوں کو بھی اس کی تلقین کرے۔ مزید برآں طب کا یہ بھی تقاضا ہے کہ ہاتھ کا پسا ہوا گیہوں اور سادہ گڑ، مشین کے آٹے اور نفیس شکر سے بہت زیادہ مفید ہیں۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ مشین کی گرمی، ان کی غذائیت کو زائل کر دیتی ہے۔ چنانچہ ایسوسی ایشن ہاتھ کے پسے ہوئے گیہوں اور گڑ کے استعمال کرنے کا پروپیگنڈا کرتی ہے۔ علاوہ ازیں، ایسوسی ایشن کے زیر نگرانی عام اناج، ساگ، پھلوں اور سبزیوں پر تحقیق کی جا رہی ہے، تاکہ کسانوں کے لئے کوئی متوازن خوراک مقرر کر دی جائے، ایسوسی ایشن امید کرتی ہے کہ وہ ان طریقوں سے کسانوں کے فاقہ زدہ جسموں میں نئی زندگی اور جان ڈال دے گی۔

ایسوسی ایشن کی کارکردگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اس کے نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا پہلا کام کسانوں کی معاشی زندگی کو سدھارنا ہے۔ آج کسان بڑی ہی بُری حالت میں ہے۔ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس کے ہاتھ میں کوئی فائدہ مند پیشہ نہیں رہا۔ جب سے بڑے پیمانہ کی مشینری آگئی ہے، اس کی سب چھوٹی چھوٹی صنعتیں جو پہلے اس کی ضروریات کی کفالت کرتی تھیں، برباد ہو گئی ہیں۔ چنانچہ اب اس کا ایک ہی

سہارا ہے' یعنی زمین لیکن یہاں بھی ایک مصیبت آپڑی ہے' آدمی زیادہ ہیں اور زمین بہت کم۔ پھر کیا کیا جائے ؟

اس نقطہ پر پہنچ کر "دیہاتی صنعتوں کی ایسوسی ایشن" کو یہ لازم آتا ہے کہ وہ گاؤں کی موجودہ صنعتوں کے واقعی حالات کا مطالعہ کرے۔ ان میں سے جو پھل پھول رہی ہیں' جو مر رہی ہیں یا مر چکی ہیں' سب کو غور سے دیکھے۔ مقامی حالات سے ہم آہنگ صنعتوں کو رائج کرے' از سر نو زندہ کرے یا ان کو ترقی دے پھر ان کی زاید پیداوار کے لئے نئی منڈیاں ایجاد یا تخلیق کرے۔ ایسا کرنے میں' دساور کی بستیوں سے بنی ہوئی صنعتوں کے ساتھ مقابلہ نہیں ہوگا' کیوں کہ باہر کی منڈیوں سے مقابلہ کرنا' ہمارے سودیشی آئیڈیل کے خلاف ہے۔ سودیشی کا یہ مقصد ہے کہ دیہاتی' اپنی ضروریات کے مطابق' اپنے ہاتھ سے چیزیں تیار کریں۔ آخر ہم اپنے ان کی روئی کو' کپڑا بننے جاپان یا لنکا شائر کیوں بھیجیں' جب کہ دیہاتی یہ کام خود سر انجام دے سکتے ہیں ؟ کیا ایک وہ غریب آدمی' جس کی آمدنی دس روپئے ماہوار سے بھی کم ہو' اپنے کپڑوں کی دھلائی صفائی یورپ میں کرائے گا ؟ کتنا لغو خیال ہے غریب آدمی کو اپنے کپڑے خود ہی دھو لینے چاہئیں اس کے بس کی بات نہیں ہے' کہ وہاں کی مہنگی مزدوری' اور کرایہ وغیرہ اور کثیر اخراجات کا متحمل ہو سکے۔ لیکن غریب دیہاتی ہمیشہ اس لغویت کا شکار رہتا ہے' وہ اپنی خام پیداوار کو یورپ بھیجتا ہے اور جو چیزیں وہاں سے بن کر آتی ہیں' ان کو استعمال کرتا ہے حالانکہ اس کی قطعی ضرورت نہیں ہے' وہ یہ سارا کام خود کر سکتا ہے۔ اس صورت حالات سے یہ المناک نتیجہ نکلتا ہے کہ دیہاتی پر دوہرا ظلم ہوتا ہے۔ اس کو تیار شدہ چیز کے لئے زاید روپیہ دینا پڑتا ہے' اور وہ کام کاج سے بھی محروم رہتا ہے۔ یہ بات کہنے میں کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے کہ جاپان اور لنکا شائر دیہاتی کو خود کپڑا تیار کرنے کی زحمت سے بچا لیتے ہیں۔ یہ دلیل صرف ان لوگوں کے لئے کچھ معنی رکھتی ہیں' جن کی آمدنی کے ذرائع دیہاتی پیشوں سے مختلف ہیں لیکن ہندوستان میں اس جماعت کی تعداد بہت ہی قلیل ہے۔ آبادی کا زیادہ تر حصہ کسانوں پر مشتمل ہے' جو ایڑی چوٹی کا پسینہ بہا کر ہی روٹی کماتے ہیں۔ ان کے لئے ایک پائی بھی بہت زیادہ قیمت رکھتی ہے اور اگر ان کو کام کرنے کا کوئی موقع نہ ملے۔ تو یہ ان کی موت کے مترادف ہے۔ اس وجہ سے ایسوسی ایشن اس امر کو اپنا اولین فرض سمجھتی ہے' کہ ہندوستان کی خام اجناس' باہر نہ جانے پائیں' دیہاتی خود اپنے ہاتھ سے کام کرے۔ اپنی ضروریات کو

پیدا کریں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ گاؤں کی دولت جو باہر کے ملکوں کی طرف بہی جاتی ہے، اس کا رخ پھر گاؤں کی طرف موڑ دیا جائے تاکہ دیہاتیوں کی حالت بہتر ہو جائے۔ قدیم زمانہ میں، ہندوستانی گاؤں خود اپنی ضروریات مہیا کر لیا کرتے تھے اور یہاں کی روئی، سلک، دری، پیتل اور ہاتھی دانت وغیرہ کی صنعتیں، دوسرے ملکوں کے لئے باعث رشک تھیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ آج ہندوستان صرف ایک زراعتی ملک ہی بن کر رہ جائے۔ اور اس سے بڑی بات یہ ہے کہ اگر گاؤں کے لوگوں کی صنعت سے محرومی برابر جاری رہی تو عوام کی حالت بالکل تباہ ہو جائے گی اس لئے یہ عالم ہے کہ وہ فاقوں میں مبتلا ہیں۔ اگر اس طریقہ کار کی روک تھام نہ کی گئی۔ اور دیہاتیوں کو زراعت کے ساتھ ساتھ اور پیشے نہ سکھائے گئے تو ان کے لئے مستقبل میں کوئی امید باقی نہیں رہتی۔

اس کے تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس تباہی سے بچنے کے لئے، قدیم دیہاتی صنعتوں کی طرف رجوع نہیں کرنا چاہئے بلکہ تمام ہندوستان میں نئی بڑے پیمانے کی مشینری کو فروغ دینا چاہئے، جو کہ دیہات کے بے کاروں کو اپنے میں جذب کر لیں گی۔ اس تجویز میں یہ نقص ہے کہ یہ ہمارے ملک کے مخصوص حالات کے مطابق نہیں ہے۔ کسان زمین کو چھوڑ کر کارخانوں میں کام نہیں کر سکتا کیونکہ زمین اس کی توجہ کی طالب ہے۔ اس کو در اصل، اس چیز کی شدید ضرورت ہے کہ جب اسے کھیتی باڑی کے کام سے فراغت ہو، تو وہ عارضی طور پر کسی صنعت کو لے بیٹھے۔ علاوہ ازیں، فیکٹریاں محض کہہ دینے سے تو بن نہیں جاتی ہیں اور ہمارے یہاں بے روزگاری اس قدر عام ہے کہ اس کو دور کرنے کے لئے بے شمار فیکٹریاں بنانا پڑیں گی، بفرض محال اگر آدمی کارخانوں میں کھپ بھی جائیں تو مصنوعات کو بیچنے کے لئے منڈی کہاں ملے گی؟ دنیا میں پہلے ہی زائد پیداوار کا طوفان آیا ہوا ہے اور منڈیاں حاصل کرنے کے لئے شدید مقابلہ جاری ہے۔ اس وجہ سے فیکٹریاں بڑھا دینے کا خیال، قطعاً ناقابل عمل ہے۔ اور فیکٹری لگانا تو اس حالت میں مفید ہوتا ہے، جب مزدور کم ہوں، اور مال کی مانگ زیادہ ہو لیکن ہم بالکل برعکس حالت سے دوچار ہیں۔ ہمارے ملک میں ایک طرف تو لاکھوں ایسے آدمی ہیں جنہیں کوئی کام نہیں ملتا، اور دوسری طرف قطع نظر اس امر سے کہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں، لیکن بہت زیادہ سستا مال باہر سے آتا رہتا ہے۔ جو مسئلہ

ہمیں درپیش ہے وہ محنت کو بچانے کا نہیں، بلکہ اس کو کہیں نہ کہیں لگانے کا ہے۔ یہ خواہش کارخانے نہ چلنے سے پوری نہیں ہوسکتی کیوں کہ اُن میں تو آبادی کا ایک قلیل حصہ جذب ہوسکتا ہے۔ اس مشکل کا ایک ہی حل ہے، یعنی دیہاتیوں کو ایسی صنعتیں سکھائی جائیں، تاکہ وہ اپنی ضروریات کو آسانی سے مہیا کرسکیں، اور انھیں دور دراز نہ بھٹکنا پڑے۔ اس طرح سے ساری پیداوار گاؤں کے بہت سے خاندانوں میں بٹ جائے گی، اور جب پیداوار اس طرح سے بٹ جائے تو جیسا کہ اب ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف دولت تھوڑے سے آدمیوں کے پاس جمع نہیں ہوسکے گی۔ آدمی اپنے لئے اور اپنے پستری پڑوسیوں کے لئے کام کریں گے اور تجارتی سرمایہ داروں اور برآمد کرنے والے تاجروں کی محنت سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکیں گے۔ گاؤں کے آدمیوں کو برآمد کرنے والے نہ ان کی اشیاء عام سے محروم کرسکیں نہ وہ غیر ملکیوں پر اپنی ضروریات رسد کے لئے انحصار کریں گے بلکہ وہ صرف اپنی ذات پر بھروسہ کریں گے اور اپنی ابتدائی احتیاجات کو اپنی محنت سے پورا کریں گے اور زاید پیداوار کو فروخت کریں گے اس نظام میں گاؤں والوں سے ناجائز نفع حاصل نہ کیا جائے گا اور وہ ان تاجروں سے جو ان سے تجارتی اغراض کے لئے مال پیدا کرانا چاہیں گے " ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے ہم اس کے پیدا کرنے پر بالکل قانع ہیں اگر تم اپنے لئے ہم سے دولت پیدا کرانی چاہتے ہو تو تمھیں جو دام ہم مانگیں وہ ہی ادا کرنا پڑیں گے"۔ چنانچہ ایسوسی ایشن کا مقصد اس طرح صنعتوں کو زندہ یا جاری کرکے دیہاتی کو مستغنی بنانا ہے تاکہ وہ سہولت کے ساتھ اپنی ضرورت کی تمام چیزیں خود پیدا کرسکے۔

اس کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ ہم کسی ایسے حصہ زمین پر نہیں رہ رہے ہیں جو دنیا سے بالکل الگ تھلگ ہو ہم چاہیں یا نہ چاہیں کارخانوں کی بنی ہوئی اشیا کثیر تعداد میں آئیں گی اور گاؤں کی اشیاء کے لئے اس سے مقابلہ ناممکن نہ ہوگا۔ لیکن جیسا کہ ابھی بیان کیا جاچکا ہے ایسوسی ایشن کا مقصد مقابلہ میں شریک ہونا نہیں ہے بلکہ صرف ذاتی اور اپنے قریبی ہمسایوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے دولت پیدا کرنا ہے۔ مثلاً میں کاتتا ہوں اور اپنے لئے کافی کپڑا بنا لیتا ہوں پھر جب میں کھدر صرف اپنے لئے تیار کرتا ہوں تو کارخانہ کے کپڑے کی قیمت سستے ہونے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کیوں کہ میں اپنے کپڑے کے لئے کوئی نقد رقم ادا ہی نہیں کرتا ہوں۔ لیکن

یہ کہا جا سکتا ہے کہ دیہاتی بذات خود تمام اُن چیزوں کو جن کی اسے ضرورت ہے پیدا نہیں کر سکتا۔ اُسے ان چیزوں کو جن کو وہ خود پیدا نہیں کر سکتا (مثلاً کاغذ) ہونا مگر کھلے بازار خریدنا پڑے گا اور ان حالات میں گاؤں کا بنا ہوا کاغذ اور جوتا کارخانے کی بنی ہوئی اشیاء سے مقابلہ کرنے لگیں گے۔ اس کا جواب ہمارے پاس یہ ہے کہ وقت گذرنے اور پیداوار کے طریقوں میں ترقی ہو جانے کے بعد گاؤں کی بنی ہوئی اشیاء کارخانوں کی بنی ہوئی اشیاء سے گھٹیا نہ رہیں گی۔ بلکہ اس کے برخلاف بجا طور پر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ان کی قدر بالکل اسی طرح بڑھ جائے گی جیسے مغرب میں ہاتھ کی بنی ہوئی اشیاء کو کارخانہ کی پیدا کی ہوئی اشیاء پر ترجیح دی جاتی ہے حتیٰ کہ قیمت کے معاملہ میں بھی یہ دریافت کیا گیا ہے کہ جب مزدور ہندوستان کی طرح کثیر اور سستے ہوتے ہیں تو ہاتھ کی بنی ہوئی اشیاء کارخانہ کی اشیاء کا بخوبی مقابلہ کر سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ جب تمام توجہ اور انسانی ذہانت اس بات کے لئے مرکوز کر دی جائے گی کہ ایسی مشینیں ایجاد کی جائیں جو بڑے پیمانہ پر پیداوار حاصل کریں اور انفرادی طور پر چلائی جا سکیں (جیسے سینے کی مشین) جس کا کہ ایسوسی ایشن ارادہ رکھتی ہے تو پیداوار کس آسانی سے بڑھائی جا سکتی ہے اور محنت اور وقت کو بچایا جا سکتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہاتھ کی بنی ہوئی اشیاء اسی ہی سستی ہو جائیں گی جیسی کہ کارخانہ کی اشیاء ہوتی ہیں۔ لہٰذا ہمارے پروگرام میں ایسی مشین کو جو مذکورۂ بالا سینے کی مشین کی طرح مزدور کی انفرادی طور پر مدد کرے گی خاص اہمیت حاصل ہے۔ لیکن ایسی بڑے پیمانہ کی مشین کی جو پیداوار کو مرکز کے ماتحت لاتی ہے اور مزدور کو غلام بناتی ہے ہمارے یہاں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ایک ملک کی تمام صنعتیں چھوٹے پیمانہ پر نہیں چلائی جا سکتیں مرکزیت پسند طریقہ پیداوار کی بھی ضرورت رہے گی مثلاً عام منفعت کی صنعتوں میں۔ لیکن یہ بجائے افراد کے ہاتھ میں نہیں رہیں گی بلکہ حکومت کے انتظام اور نگرانی میں آجائیں گی اور قطعاً عوام کے مفاد کے لئے کام کریں گی۔ بڑے پیمانہ کی صنعتیں خریداروں کے لئے امداد باہمی کی انجمنیں بھی چلا سکتی ہیں۔ مگر ایسی صنعتیں ایسوسی ایشن کے موجودہ کام میں شامل نہیں ہیں اس لئے ان کے متعلق یہاں بحث نہیں کی جا سکتی۔

سودیشی کے اصول کے مطابق جو صنعتیں دیہات میں چلائی جائیں انہیں دیہاتیوں کی ضروریات کے متعلق ہونا چاہئے نہ کہ شہریوں اور غیر ملکیوں کی ضروریات سے لیکن بعض حالات میں گاؤں والے ایسی اشیاء بھی پیدا کر سکتے ہیں جن کی انہیں

خود ضرورت نہ ہو بشرطیکہ ان کی فوری طلب موجود ہو (کیوں کہ اس صورت میں بھی پیداوار ایک معلوم طلب سے منسلک ہو جائے گی) نیز دوسری شرط یہ ہے کہ ان کی پیداوار کے لئے اشیاء خام مقامی طور پر موجود ہوں اور ان اشیاء کی پیداوار سے کئی آدمی جلد سے لگ سکیں مثلاً گاؤں والے اگر فاؤنٹین پن یا گھڑیاں بنانے لگیں تو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے کیوں کہ ان کے بنانے کے لئے جس مشین اور اشیاء خام کی ضرورت ہے وہ مقامی طور پر دستیاب نہیں ہو سکیں۔ ان کی طلب شہریوں تک محدود ہے اور اس کے لئے اس سے صرف چند خاندان روزگار سے لگ سکتے ہیں علاوہ ازیں مغرب نے ان صنعتوں کو عمل کرنے کے لئے اس قدر فکر اور سرمایہ صرف کیا ہے کہ دیہات والے کامیابی کے ساتھ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لیکن مثال کے طور پر گڑ کے پیدا کرنے میں یہ بات نہیں ہے۔ اس کی طلب کثیر ہے اور اس سے بہت سے گاؤں میں کئی کئی خاندانوں کو روزگار مل سکتا ہے۔ ایسوسی ایشن اسی قسم کی صنعتوں کو ترقی دے گی۔

رہا سوال ایسی صنعتوں کا جن میں گاؤں والے تجارتی اغراض کے ساتھ مصروف ہوں ان کے لئے ایسوسی ایشن کا مطالبہ ہے کہ کاریگر کو کمتر ین اسباب حیات کے لائق اجرت فراہم کرنے کی ضمانت لی جائے چنانچہ وہ موثر طریقے اختیار کر رہی ہے کہ جو اشیاء اس کی معرفت فروخت ہوں ان سے کاریگر کو کم از کم اس قدر اجرت مل سکے۔ ہمارے ملک میں سب سے کم اجرت والی ایک صنعت سوت کاتنے کی ہے جس سے موجودہ زمانہ میں کاتنے والوں کو ایک پیسہ فی گھنٹہ ملتا ہے اس چیز کو اب اور زیادہ برداشت نہ کیا جائے گا کاتنے والے کو اسباب حیات کے لائق اجرت دی جائے گی اور اس کا تخمینہ یہ معلوم کر کے کیا جائے گا کہ سائنس کی تحقیقات کے مطابق ایک جوان بالغ کے لئے کم از کم غذا کی کس قدر ضرورت ہے۔ یہ بے شبہ صحیح ہے کہ آج گاؤں والوں کی غذا اس کمتر ین معیار سے بہت کم ہے لیکن ایسوسی ایشن اس بات کو محسوس کرتی ہے کہ جب وہ گاؤں والوں کو اس بات کی تعلیم دینا چاہتی ہے کہ وہ اچھی اور صحت بخش غذا کھائیں تو وہ گاؤں والوں کو اس کی خریداری کے ذرائع بہم پہنچانے سے غفلت نہیں کر سکتی۔ اجرت کی بنیاد ایک کاریگر یا مزدور کی آٹھ گھنٹے کی محنت ہوگی۔ اس نظام کا لازمی نتیجہ ہوگا کہ کھدر اور گاؤں کی ایسی اشیاء کی قیمت جو مقررہ کمتر ین اجرت سے کم قیمت پر فروخت ہو رہی ہیں بڑھ جائے گی اور قدرتی طور پر ان اشیاء کی فروخت گھٹ جائے گی۔ لیکن گاندھی جی جو اس تحریک کے روح رواں ہیں اس

بات سے نہیں گھبراتے۔ وہ کہتے ہیں کہ گاؤں والے کے استحصال ناجائز اور غیر انسانی اجرت سے تو یہ بہتر ہے کہ ان اشیاء کی تجارت تباہ ہو جائے۔ پھر یہ بات بھی مدنظر رکھنا چاہیئے کہ ساری اسکیم میں گاؤں والا خود اپنی ضروریات زندگی کو پیدا کرتا ہے جس کی وجہ سے یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ گاؤں والا اپنی بنیادی احتیاج کو خود فراہم کرنے سے قاصر رہے گا۔ عملاً اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ لوگ جو اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہیں اسے اپنا فرض سمجھیں گے کہ زیادہ قیمتیں ادا کریں تاکہ وہ ایک ایسے نظام کی حمایت نہ کریں جس میں عوام کی مجبوری اور لاچاری سے ناجائز نفع حاصل کیا جاتا ہے۔ کمترین اجرت کو تسلیم کرانے کا محرک ایک اخلاقی جذبہ ہے عملی دشواریاں بےشبہ پیدا ہوں گی۔ لیکن اسے اقدام کے حق و انصاف میں اعتقاد ہی اس کی تسخیر میں ہماری اعانت کرے گا۔ اور آخر میں ہمیں اس قابل بنائے گا کہ ہم دنیا کو دکھا سکیں کہ حق و انصاف ہی بہترین معاشی اصول ہے۔

ان لوگوں کا جو ایسوسی ایشن سے متعلق ہیں ایک خاص فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ گاؤں کی ایک تفصیلی پیمائش کریں کہ یہ معلوم ہو سکے کہ کون سی صنعتیں اس وقت چلائی جا رہی ہیں ان کی حالت کیا ہے، صنعتوں کے لئے کون اشیاء خام موجود ہیں اس سے پہلے کون سی صنعتیں رائج رہ چکی ہیں ان صنعتوں کے جو طریقے تھے ان میں سے کتنے باقی ہیں اور انھیں کس طرح نفع بخش طریقہ پر دوبارہ زندہ کیا جا سکتا ہے۔ ایسوسی ایشن قدرتی طور پر اپنی خاص امداد ان صنعتوں کو دے گی جن کا رواج عام ہے جن کے لئے سرمایہ کی بہت کم ضرورت ہوتی ہے جن سے بہت سے لوگ متاثر ہوتے ہیں اور جن کا ہر گاؤں بغیر بیرونی امداد کے آسانی سے انتظام کر سکتا ہے۔ وہ صنعتیں جو ان شرائط کو پورا کرتی ہیں اور جنھیں اس وجہ سے فائدہ کے ساتھ دوبارہ زندہ یا جاری کیا جا سکتا ہے حسب ذیل ہیں:۔ سوت کی کتائی اور بنائی۔ چمڑے کی دباغت، تیل نکالنا، گڑ اور کھانڈ بنانا۔ آخر الذکر کو چھوڑ کر ان میں سے ہر ایک کے لئے اشیاء خام تقریباً ہر جگہ پائی جاتی ہیں۔ ان کے لئے بہت کم سرمایہ کی ضرورت ہے۔ جس مہارت کی ضرورت ہے وہ آسانی سے حاصل کی جا سکتی ہے اور ان کی طلب بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ انھیں ایسوسی ایشن کے پروگرام میں فی الفور داخل کر لیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر چمڑا رنگنے کو لیجئے۔ ہر گاؤں میں مردہ جانور ملتے ہیں اس وقت انھیں عموماً پھینک دیا جاتا ہے اور انھیں یا تو ہریجن کھانے کے لئے کاٹ لیتے ہیں یا انھیں کتوں، کوؤں اور گدھوں کے کھانے کے لئے ڈال دیا جاتا ہے۔ چمڑا اور ہڈیاں عموماً تمام

ضایع ہو جاتی ہیں اور جب لاش کو کھلی ہوا میں سڑنے دیا جاتا ہے تو اس سے قرب و جوار میں گندگی پھیلتی ہے۔ اس کی جگہ ایسوسی ایشن کی نگرانی میں لوگوں کو یہ سکھایا جا رہا ہے کہ لاش کے کیا مختلف استعمال ممکن ہیں۔ لاش کی کھال اتاری جاتی ہے۔ کھال کو نمک لگایا جاتا ہے اور پھر اسے دباغت کی جگہ لے جایا جاتا ہے جہاں اسے صاف کر کے چمڑا بنایا جاتا ہے۔ کھال کے صاف کرنے میں جو گوشت نکلتا ہے اس سے سریش بنایا جاتا ہے۔ اوجھڑی سے چربی علیحدہ کی جاتی ہیں اور آنتوں سے تانت نکالی جاتی ہے جو ٹینس کے بلّے اور دھُنکی کی تانت بنانے میں استعمال کی جاتی ہے۔ گوشت اور ہڈیوں کو پانی میں سات آٹھ گھنٹے ابالا جاتا ہے۔ چربی سطح پر آ جاتی ہے۔ اس طرح جو چربی علیحدہ ہو جاتی ہے اسے پہیّوں کو چکنا کرنے اور دوسرے صنعتی کاموں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ خوب ابالی ہوئی ہڈیوں اور گوشت کو دھوپ میں خشک کر لیا جاتا ہے اور پھر اس کو پیس کر اس کا سفوف بنا لیا جاتا ہے۔ یہ سفوف بہت قیمتی کھاد ہے اور آسانی سے بازار میں فروخت کیا جا سکتا ہے۔ سینگوں کے کنگھے، چاقو کے دستے اور ایسی ہی اور چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ اس کام کے لئے ہڈیوں کا بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ مردہ جانور کے تقریباً ہر حصہ سے جو مختلف کام لئے جا سکتے ہیں۔ اور ان سے جو مختلف صنعتیں پیدا ہوتی ہیں جب اس پر غور کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ عدم واقفیت کی وجہ سے ہمارے ملک کی کس قدر کثیر دولت ضایع ہو رہی ہے۔ ایسوسی ایشن سے جو لوگ متعلق ہیں یہ ان کا کام ہوگا کہ وہ ان وسائل کی تحقیقات کریں اور جو چیزیں اب بظاہر بے کار نظر آتی ہیں ان سے گاؤں والوں کے لئے دولت اور روزگار پیدا کریں۔

عوام کے سخت افلاس کا ایک سبب یہ ہے کہ گذشتہ صدی میں ذہین اور پڑھے لکھے لوگ دیہات سے کھنچ کر شہروں میں آ بسے ہیں اور انھوں نے اونچی تعلیم پا کر گورنمنٹ کے محکموں میں عہدے اور کلرکوں کی جگہیں حاصل کر لی ہیں اور گاؤں ان کے فیض سے محروم ہو گیا ہے۔ ان میں سے کچھ لوگ تاجر اور آڑھتی بھی بن گئے ہیں نتیجہ اس کا یہ ہوا ہے کہ دیہات کی صنعتیں ان قابل افراد کی رہنمائی سے محروم ہو کر زوال کی طرف مایل ہو گئی ہیں۔ کسی صنعت کے کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے تین قسم کے آدمیوں کی ضرورت ہے تاجر، ماہر صنعت اور ادنیٰ مزدور۔ تاجر اور ماہر صنعت تو اس نئے دور میں ترک سکونت کر کے شہروں میں جا بسے ہیں لیکن ادنیٰ مزدور جو کوئی کام ذہانت سے نہیں کر سکتے صرف وہ گاؤں کی صنعتوں کا کام چلانے کے لئے باقی رہ گئے ہیں۔

اس لئے ہمیں گاؤں کے طریقہ پیداوار کی موجودہ خرابیوں پر افسوس نہ کرنا چاہئے ۔ دیہاتی صنعتوں کی ایسوسی ایشن اس صورت حال کا علاج گاؤں کے کاروبار میں تجارتی طریقے اور فنی مہارت رائج کر کے کرنا چاہتی ہے اور اس طرح ان بین عناصر میں جو صنعتی ترقی کے لئے ضروری ہیں دوبارہ توازن قائم کرنا چاہتی ہے ۔ اوپر کی مثال کو اگر سامنے رکھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ گاؤں میں جو اسراف پسند طریقے مردہ جانوروں کو ختم کرنے کے لئے رائج ہیں وہ سب اس جہالت کا نتیجہ ہیں جس کی وجہ سے گاؤں والے لاش سے مختلف قسم کے فائدے اور وہ طریقے جن سے یہ فائدے حاصل ہو سکتے ہیں اختیار نہیں کر سکتے ۔ فنی علم کی ضرورت ہے جس کی گاؤں والوں میں کمی ہے صرف اس علم کے ذریعہ سے ہی گاؤں والے زیر بحث طریقوں کو اختیار کر سکتے ہیں ۔ جب فنی ماہر گاؤں والوں کو نئے طریقے بتلا دے گا اس وقت ماہر تجارت کی صنعت کو تسلیم دینے اور اس کو معقول کاروباری بنیاد پر قائم کرنے کے لئے ضرورت ہوگی ۔ دیہاتی صنعتوں کی ایسوسی ایشن کو توقع ہے کہ وہ اس قسم کے ماہروں کو شہر سے نکال کر دوبارہ دیہاتوں میں دیہاتی صنعتوں کو زندہ کرنے اور ترقی دینے کے لئے بھیج سکے گی

دوسرا اہم کام جو ایسوسی ایشن نے اپنے ذمہ لیا ہے وہ پیداوار کے بہتر طریقوں کی علمی تحقیقات کا ہے تاکہ اس ذریعہ سے گاؤں والوں کی پیداوار کی مقدار اور وسعت کو بڑھایا جا سکے ۔ اس مقصد کے لئے مختلف قسم کی (مثلاً تیل نکالنے والی، گھی دودھ کی، شہد پالنے والی، کاغذ بنانے والی، چمڑے کو رنگنے والی، سوت کاتنے اور بننے والی) صنعتوں کے متعلق مرکزی دفتر میں تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے اور رفتہ رفتہ اور دوسری صنعتیں بھی اس میں شامل کر لی جائیں گی ۔ تمام ملک کے دیہاتی کام سے باخبر رہنے کے علاوہ ایسوسی ایشن کو توقع ہے کہ وہ پیداوار دولت، حفظان صحت اور غذا کے متعلق ملک کے ایک حصہ میں جو بہتر طریقے رائج ہیں ان کی اشاعت دوسرے حصوں میں بھی کر سکے گی ۔

توقع یہ کی جاتی ہے کہ بہت جلد ایسوسی ایشن کے پاس دیہی صنعتوں کا ایک عجائب خانہ ہو جائے گا جہاں نہ صرف تمام ملک کی دیہی اشیاء کی نمائش ہوا کرے گی بلکہ ان کے بنانے کے جو مختلف طریقے رائج ہیں ان کی بھی نمائش ہوگی تاکہ جو لوگ انہیں دیکھنے آئیں انہیں علمی فائدہ حاصل ہو اور وہ اس بات کو سمجھ سکیں کہ کس حد تک ملک کے ایک حصہ میں جو طریقے رائج ہیں وہ نفع کے ساتھ دوسرے حصے میں اختیار کئے جا سکتے ہیں اور نئے

طریقوں کی ضروری تعلیم حاصل کر سکیں۔ عجائب خانہ سے متعلق ایک کتب خانہ بھی ہوگا جہاں صنعت سے متعلق جس قدر لٹریچر موجود ہے وہ دستیاب ہو سکے گا۔ رفتہ رفتہ دیہی تعلیم کا ایک مرکز بھی ترقی پا جائے گا جہاں دیہات کے کام کرنے والوں کو جس تربیت کی انہیں ضرورت ہے دی جا سکے گی۔

۶۔ اپیل

یہ ظاہر ہے کہ ایسوسی ایشن کا کام اس وقت تک قابل اطمینان طریقہ پر نہیں چل سکتا جب تک وہ لوگ جن کے پاس دیہات کی تباہ حالت کو دیکھنے کے لئے آنکھیں، سننے کے لئے کان اور سمجھنے کے لئے دل ہیں اشتراک عمل کے لئے آمادہ نہ ہوں۔ احاطہ مدراس کے ایک سرکاری افسر کی پیمائش کے مطابق سنہ ۱۹۳۳ء سے سنہ ۱۹۳۳ء تک دیہی آبادی کا قرض فی کس ۸۳ روپیہ اور فی خاندان ۱۹۴ روپیہ رہا۔ ان کی آمدنی اسی زمانہ میں پورے بارہ روپیہ سال رہی جس کی معنی یہ ہیں کہ ایک روپیہ ماہانہ کی آمدنی میں دیہاتیوں کا کھانا، کپڑا، مکان، قرض پر سود اور تمام دوسرے ضمنی اخراجات کو برداشت کرنا پڑا۔ یہ ابھی تک ایک معمہ ہے کہ ان حالات میں کسان زندگی کس طریقہ پر گذارتا ہے۔ اس کی زندگی صرف اس قدر کہی جا سکتی ہے کہ وہ روح اور جسم کے تعلق کو قائم رکھتا ہے زندگی کے ان آراموں میں سے اسے کوئی آرام بھی حاصل نہیں ہے جو زندگی کو خوشگوار بناتے ہیں۔ اگر تعلیم یافتہ اور دولت مند لوگوں کو گاؤں والوں کی جو ہماری آبادی کا بیشتر حصہ ہیں اور جس کی حالت روز بروز بدتر ہوتی جاری ہے بدنصیب زندگی کا تھوڑا سا بھی علم ہوتا تو وہ اس وقت تک چین سے نہ بیٹھ سکتے جب تک کہ وہ گاؤں والوں کی حالت درست کرنے میں کچھ نہ کچھ حصہ نہ لیتے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمارا ملک بہر حال ایک دیہی ملک ہے اس لئے جب تک ہم دیہات کی اصلاح کا کام نہ کریں گے اس وقت تک ہم اپنے ملک کی عملاً کوئی خدمت نہیں کر سکتے اس لئے تمام ان لوگوں کے لئے جو ملک کی اصلاح کا کام کرنا چاہتے ہیں یہیں سب سے زیادہ موقع ہے۔

اس کام میں صرف مرد ہی نہیں بلکہ عورتیں بھی حصہ لے سکتی ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ عورتیں دیہات کا کام مردوں سے بھی زیادہ کر سکتی ہیں کیونکہ گاؤں کے کام کا تعلق افلاس، مصیبت، حفظان صحت غذا اور تمام ایسے کاموں سے ہے جس سے عورت کو بنیادی طور پر زیادہ دلچسپی ہے۔ عورتیں ہی بہر حال گھر

تربیت ہوتی ہیں اور اس حیثیت سے ہندوستان کے مستقبل کی کنجی ان ہی کے ہاتھ میں ہے۔ مائیں بچوں کی جو تربیت کرتی ہیں ملک کا مستقبل اسی سے وابستہ ہے۔ اگر ان میں سودیشی کی روح پیدا کرا دی جائے اور اگر وہ اپنے بچوں کو اپنے پڑوسیوں کے حقوق سے واقف کرا دیں تو دیہی صنعتوں کی انجمن کا کام تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ میدان بہت وسیع ہے اور اس میں عورت مرد، ہندو اور مسلمان، کانگریسی اور غیر کانگریسی۔ ایک کی جدوجہد کی گنجائش ہے۔ لہٰذا ایسوسی ایشن سب کو بلا امتیاز و تفریق آگے بڑھنے اور مدد کرنے کی دعوت دی ہے۔

ماہِ نو

کاغذ کی کشتیاں

روز روز، ندی میں، کاغذ کی کشتیاں ڈال دیتا ہوں۔ اُن پر بڑے بڑے سیاہ حرفوں میں اپنا نام لکھ دیتا ہوں اور اپنے گاؤں کا۔

مجھے خیال ہے کہ کسی اجنبی ملک میں کوئی انھیں پائیگا اور مجھے جانے گا!

میں کشتیاں اپنے باغ کے ننھے ننھے خوشبودار پھولوں سے بھر دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ صبح کے یہ پھول رات کو کسی زمین پر اُتار لئے جائیں گے۔

کاغذ کی کشتیاں ڈال دیتا ہوں اور آسمانی بادلوں کے، ہوا سے بھرے ہوئے بادبان دیکھتا ہوں

معلوم نہیں کون انھیں میری کشتیوں سے مقابلہ کرنے کو بہاتا ہے!

جب رات آجاتی ہے تو میں اپنے بازوؤں میں سر چھپا لیتا اور خواب دیکھتا ہوں کہ میری کاغذ کی کشتیاں ستاروں کی ٹمٹماتی روشنی میں چلی جا رہی ہیں! نیند کی پریاں ان میں سوار ہیں اور انکی پھولوں کی ٹوکریوں میں خواب بھرے ہوئے ہیں!

پرستان

اگر لوگ میرے بادشاہ کے محل کو جان لیں تو یہ ہوا میں غایب ہو جائے گا!

اس کی دیواریں سفید چاندی کی ہیں اور چھت چمکیلے سونے کی!

رانی سات دالان والے محل میں رہتی ہے اور اس کے جواہر کی قیمت سات سلطنتوں کے برابر ہے!

آؤ اماں! میں تمہارے کان میں کہہ دوں کہ میرے بادشاہ کا محل کہاں ہے؟
وہ دیکھو، بالاخانہ کے اس کونہ میں جہاں 'تلسی' کا گملا ہے!
سات سمندر پار ساحل پر شاہزادی سوئی ہے۔
سوا میرے دنیا میں کوئی نہیں جو اسے پا سکے۔
اس کے ہاتھ میں کڑے ہیں اور کانوں میں موتیوں کے بندے!
اس کی زلفیں زمین پر لوٹ رہی ہیں!
جب میں جادو کی چھڑی سے چھوؤں گا تو وہ جاگ اٹھیگی اور جب مسکرائے گی تو اس کے منہ سے لعل نکلیں گے۔
لیکن آؤ اماں، میں تمہارے کان میں کہہ دوں۔ ——————
شاہزادی بالاخانہ کے اس کونہ میں ہے جہاں 'تلسی' کا گملا ہے!
جب دریا جا کر نہانے کا وقت آجائے تو بالاخانہ پر اس چبوترہ کے پاس جاؤ۔
میں کونہ میں جہاں دیوار کے سائے ملتے ہیں، بیٹھتا ہوں ——————
میرے ساتھ صرف بلی آسکتی ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ کہانی والا حجام کہاں رہتا ہے۔
لیکن آؤ اماں، میں تمہارے کان میں آہستہ سے کہہ دوں کہ کہانی والا حجام کہاں رہتا ہے؟
وہ دیکھو، بالاخانہ کے اس کونہ میں جہاں تلسی کا گملا ہے! ۔۔۔۔۔

کہاں سے؟

"میں کہاں سے آیا ہوں؟ تم نے مجھے کہاں سے پا لیا ہے؟" ننھے نے اماں سے پوچھا۔
اماں نے کچھ روتے ہوئے کچھ ہنستے ہوئے ننھے کو سینہ سے چمٹا کر کہا:-
"تم میرے دل میں آرزو بن کر چھپے تھے میری جان! تم میرے بچپن کے کھلونوں میں تھے
جب میں مٹی کے دیوتا بناتی اور توڑ دیتی تھی تو در اصل تمہیں بناتی اور توڑتی تھی میرے لال!

"تم میرے دیوتاؤں میں تھے ۔ میں جب انھیں پوجتی تو تمھیں پوجتی تھی ! میری تمام امیدوں میں، محبت میں آرزوؤں کی زندگی تم ہی تم تھے، میرے تھے ! نہ فنا ہونے والی خوشی میں، جو ہمارے گھر میں ہے، تمھاری ہی روح ہے، میرے پیارے ! .. دوشیزگی میں جب میرا دل اپنی پنکھڑیاں کھول رہا تھا، تم اس کی خوشبو تھے ! . میرے پر شباب جسم و اعضا میں تمھاری نرمی تھی، تمھارا گداز ! جیسے سورج نکلنے سے پہلے آسمان پر روشنی ! . جنت کے ننھے دُلارے ! صبح کی روشنی کے ساتھ آنے والے ! تم ہستی کے آبشار میں بہتے بہتے آخر میرے دل کے ساحل سے آلگے ہو ! ... جب تمھارے چہرہ کو دیکھتی ہوں تو ایک طلسم میں کھو جاتی ہوں ! تم جو سب کے ہو، صرف میرے ہوگئے ہو ! ..

"کھو دینے کے ڈر سے میں تمھیں سینہ سے چپٹائے رکھتی ہوں ! کون سے جادو نے میرے ان کمزور بازوؤں میں دنیا کی دولت کو گھیر رکھا ہے ؟ ! .

۱۷۔ صحرائے تپانستر

اماں آسمان کے کنارے پر اجالا ہو رہا ہے ۔ معلوم نہیں کیا بجا ہے ؟

کھیل میں اب جی نہیں لگتا اس لئے اب تمھارے پاس آیا ہوں ۔ آج سنیچر ہے، چھٹی کا دن ۔

کام بند کردو اماں آؤ کھڑکی کے پاس بیٹھو اور مجھے بتاؤ کہ پری کی کہانی والا صحرائے تپانستر کہاں ہے ؟

بارش کے سایہ نے دن کو چھپا لیا ہے ۔

خوفناک بجلی اپنے ناخنوں سے آسمان کو نوچ رہی ہے ۔

جب بادل گڑگڑاتے اور بجلی چمک جاتی ہے تو مجھے ڈر جانے میں بڑا اچھا لگتا ہے اور میں تم سے لپٹ جاتا ہوں ۔

جب بھاری بھاری قطرے گھنٹوں تک بانس کے بنوں پر ٹپا ٹپ کرتے رہتے ہیں اور کھڑکیاں ہوا کے جھونکوں سے کھٹ کھٹ کھڑاتی ہیں میرا جی چاہتا ہے، اماں کہ تنہا کمرہ میں تمھارے ساتھ بیٹھوں اور پری کی کہانی والے صحرائے تپانستر کے بارے میں تم سے سنوں ! ۔

اماں یہ صحرا کہاں ہے ؟ کس سمندر کے ساحل پر، کس پہاڑی کے دامن میں، کس بادشاہ کی سلطنت میں ؟

وہاں کھیتوں میں آریاں نہیں ہیں نہ کوئی راستہ جس سے گاؤں والے شام کو اپنے گاؤں میں جا سکیں یا سوکھی لکڑی جمع کرنے والی عورتیں اپنے بوجھ بازار میں لیجا سکیں۔ صحرائے تنہا نستر میں بالو، زرد گھاسوں کے گچھے ہیں اور صرف ایک درخت جس پر عقلمند چڑیوں کے جوڑے کا گھونسلہ ہے۔

میں خیال کر سکتا ہوں کہ آج ایسے ندی والے ایک دن، بادشاہ کا چھوٹا بیٹا ایک بھورے گھوڑے پر سوار صحرائے تنہا نستر میں تنہا، شاہزادی کی تلاش میں جا رہا ہے جو نامعلوم سمندروں کے اس پار دیو کے محل میں قید ہے۔

دور کے آسمان میں جب بارش کا دھندلکا آتا ہے اور بجلی دکھ بھری چیخ کی طرح یکایک جھلک جاتی ہے، کیا اس وقت وہ اپنی بدنصیب اماں کو یاد کر رہا ہے ؟ جسے بادشاہ نے چھوڑ دیا ہے اور جو اپنی آنکھوں کو پونچھتی ہوئی گوسالہ میں جھاڑو دے رہی ہے ؟

دیکھو اماں، دن ختم ہونے سے پہلے ہی اندھیرا ہو چلا اور وہاں سامنے گاؤں والی سڑک پر کوئی راہ گیر نہیں۔

چراگاہ سے گوالا کا لڑکا بھی سویرے ہی چلا گیا اور کسان بھی کھیت چھوڑ چھوڑ کر اولتی کے نیچے چٹائیوں پر بیٹھے ناراض بدلیوں کو دیکھ رہے ہیں۔

اماں میں نے سب کتابیں الماری میں چھوڑ دی ہیں ——— اس وقت سبق یاد کرنے کو مت کہو۔

جب میں بڑھ کر ابا کے اتنا بڑا ہو جاؤں گا تو سب کچھ جان لونگا جو جاننا چاہیئے۔

لیکن آج اماں مجھے بتا دو کہ پری کی کہانیوں والا صحرائے تنہا نستر کہاں ہے ؟

۱۸ - بارش کا دن

خاموش ندیاں جنگل کے سیاہ کناروں پر جمع ہو رہی ہیں۔

ننھے باہر مت جاؤ!

تاڑ کے درخت جھیل کے کنارے قطار میں کھڑے اور آسمان سے سر ٹکرا رہے ہیں۔
کوّے اپنے بھیگے ڈینوں کو سمیٹے املی کی شاخوں پر چپ چاپ بیٹھے ہیں اور دریا کے مشرقی کنارے پر تاریک اندھیرا چھایا جا رہا ہے۔

احاطہ سے بندھی ہوئی ہماری گائے زور زور سے ڈکرا رہی ہے
ننھے، یہاں ٹھہرو جب تک میں اسے گوسالہ میں لے آؤں۔

پانی سے جل تھل کھیتوں میں آدمی مچھلیاں پکڑنے کو جمع ہیں جو تالاب کے پانی کے ساتھ بہتی ہوئی آ رہی ہیں ایک ننھے سے بچے کی طرح جو اپنی ماں کو چڑھانے کے لیے ہنستا ہوا بھاگ گیا ہو، بارش کا پانی تنگ گلیوں کی نالیوں میں سے بہہ رہا ہے۔

سنو، گھاٹ پر کوئی ملاح کو پکار رہا ہے
ننھے، دن کی روشنی بہت مدھم ہے اور گھاٹ اب بند ہو گیا۔

آسمان، پاگلوں کی طرح رستے ہوئے پانی پر سوار معلوم ہوتا ہے، دریا کا پانی بے صبر اور پرشور ہے، عورتیں سویرے ہی گنگا سے اپنے گھڑے بھر کر لے گئیں۔

چراغ اب جلا دینا چاہیے
ننھے، باہر مت جاؤ!

بازار جانے والی سڑک بالکل ویران ہے۔ دریا کو جاتی ہوئی گلی چکنی ہو گئی ہے۔ ہوا بانس کی شاخوں کے جال میں پھنسے ہوئے وحشی جانور کی طرح چیخ اور تڑپ رہی ہے۔

۲۶۔ ثروت!

اماں، تمہاری ثروت بیوقوف ہے! وہ بالکل بچی ہے!
سڑک کی روشنیوں اور ستاروں میں اسے کچھ فرق نہیں معلوم ہوتا۔

کھیل میں جب ہم ٹھیکریوں کا کھانا بناتے ہیں تو وہ سمجھتی ہے کہ وہ سچ مچ کا کھانا ہے اور اسے منہ میں ڈالنے کی کوشش کرتی ہے۔

جب میں کتاب کھول کر اسے ا، ب، ت، پڑھنے کو کہتا ہوں تو وہ اپنے ہاتھوں سے ورق پھاڑ ڈالتی ہے اور عجیب سی چیخ پڑتی ہے اس طرح تو تمھاری بھی سبق پڑھتی ہے!

جب میں غصے میں آنکھیں نکال کر اس کو ڈانٹتا ہوں اور اسے شریر کہتا ہوں تو وہ ہنس پڑتی ہے جیسے یہ کوئی بڑا مزہ دار کھیل ہوا۔

سب جانتے ہیں کہ ابا یہاں نہیں ہیں۔ لیکن اگر کھیل میں میں زور سے "ابا" کہہ کر پکارتا ہوں تو وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگتی ہے جیسے کہ سچ مچ ابا نزدیک ہی ہیں

جب دھوبی گدھوں پر کپڑے لاد کر لاتا ہے اور میں گدھوں کا کلاس قائم کرتا ہوں اور ثروت کو کہتا ہوں کہ میں ماسٹر صاحب ہوں تو وہ بے وجہ چلاتی ہے اور مجھے "دادا" کہتی ہے۔

تمھاری بچی چاند کو پکڑنا چاہتی ہے کسی احمق ہے وہ سراج (لڑکے) کو "چھپال" کہتی ہے۔

اماں تمھاری ثروت بیوقوف ہے، وہ بالکل بچی ہے!

۴۲۔ پھول

جب طوفانی بدلیاں آسماں پر گڑگڑاتی ہیں اور جون کی جھڑیاں آتی ہیں،

نم پوروا ہوا دلدل پر سے ہوتی ہوئی بانس کی شاخوں میں بانسری بجانے کو آتی ہے۔

اس وقت پھولوں کا جھنڈ یکایک نکل آتا ہے، کوئی نہیں جانتا کہاں سے؟ اور گھاس پر مستانہ خوشی میں ناچتا ہے۔

اماں سچ مچ میرا خیال ہے کہ پھول بھی زمین کے نیچے اسکول میں جاتے ہیں

وہ دروازہ بند کر کے سبق پڑھتے ہیں اور اگر وقت سے پہلے آنا چاہیں تو ماسٹر انھیں کونوں میں کھڑا کر دیتے ہیں۔

برسات میں انھیں تعطیل ہوتی ہے!
جنگل میں شاخیں ٹکراتی ہیں اور دیوانی ہوا میں پتیاں کھڑکھڑاتی ہیں۔ بجلی والی بدلیاں سب جناتی ہاتھوں سے تالیاں بجاتی ہیں اور پھول بچے اپنے گلابی، پیلے، اور اُجلے لباسوں میں اٹھلاتے ہیں۔
تم جانتی ہو اماں، ان کا گھر آسمان میں ہے، جہاں ستارے ہیں۔
تم نے دیکھا ہے وہ وہاں جانے کے کتنے مشتاق ہیں؟ جانتی ہو وہ کیوں اتنی جلدی میں ہیں؟
البتہ میں قیاس کرسکتا ہوں کہ وہ اپنے بانہہ کس کے لئے پھیلائے ہیں۔
میری طرح ان کے بھی اماں ہیں!

شبِ بہار

گھٹائیں جھوم رہی ہیں، ہوائیں رقصاں ہیں　　فضا ہے مست، زمانہ اسیرِ غفلت ہے
اِن آنسوؤں کی مرے دوست! اِدھر کچھ بھی نہیں　　شبِ بہار میں رونے کی مجھکو عادت ہے

چاندنی راتیں

ہمیشہ جاگتے ہی جاگتے سحر کر دی　　کبھی ہنسا کبھی آہیں بھریں، کبھی رو دیا
سا کے چاند کو اپنا گواہ کہتا ہوں　　میں آج تک شبِ مہتاب میں نہیں سویا

نغمہ اور محبّت

آب دریا میں ہے جس طرح روانی پنہاں　　جیسے الفاظ میں ہوتے ہیں معانی پنہاں
نغمہ گر! یونہی ترے دردبھرے نغموں میں　　ہے مرے دردِ محبت کی کہانی پنہاں

خود فراموشی

اونچے سُروں میں ایک غزل گا رہا ہوں میں　　گو درد کی کسک سے مرا دل ہے بیقرار
یونہی ڈبو کے درد کو گیتوں کے شور میں　　ناخوشگوار کو میں بناتا ہوں خوشگوار

کیفِ برشگال

رات کا وقت ہو، گھٹائیں ہوں　　بھیگی بھیگی خنک فضائیں ہوں
چوٹ کھایا ہوا ہو دل خستہ　　اور برسات کی ہوائیں ہوں

غزل

(۱)

بے خودی کی شراب پیتا ہوں — غفلتوں کے سبوئے پیتا ہوں
یہ مرے دم کے ساتھ ہیں ہر وقت — میں تمناؤں کا جیتا ہوں
وہ مسرت کے چند لمحے ، آہ — یاد کرکے انھیں کو جیتا ہوں
میری آنکھیں بھی سرخ رہتی ہیں — جیسے میں بھی شراب پیتا ہوں

شاید اک دن امید بر آئے
ہائے کس آسرے پہ جیتا ہوں

(۲)

دلِ فسردہ میں کچھ سوز و ساز باقی ہے — وہ آگ بجھ گئی لیکن گداز باقی ہے
نیاز کیش بھی میری طرح نہ ہو کوئی — امید مرچکی ، ذوقِ نیاز باقی ہے
مجھے مناظرِ غم خوں نہیں رلاتے اب — اگرچہ دل میں غمِ دل گداز باقی ہے
وہ ابتدائے محبت کی لذتیں ، اللہ — کہ اب بھی روح میں اک اہتزاز باقی ہے

نہ سازِ دل ہے اب اختر نہ حسن کی مضراب
مگر وہ فطرتِ نغمہ نواز باقی ہے

(۳)

محبت کرنے والوں کے بہار افروز سینوں میں — رہا کرتی ہے شادابی خزاں کے بھی مہینوں میں
ضیائے مہر آنکھوں میں ہے ، نورِ مہ جبینوں میں — کہ فطرت نے بھرا ہے حسن اپنا ہی حسینوں میں

ہوائے تند ہے، گرداب ہے، پُرشور دھارا ہے
لئے جاتے ہیں ذوقِ عافیت سی تہی سفینوں میں

میں ہنستا ہوں مگر اے دوست اکثر ہنسنے والے بھی
لئے پھرتے ہیں سجدوں کی تڑپ اپنی جبینوں میں

وہی غزلیں پڑھیں سب اہلِ دل اور مست ہو جائیں
شرابِ عشق لایا ہوں میں لفظی آبگینوں میں

کسی شاعر کی اب اس سے زیادہ قدر کیا ہوگی
مرے اشعار کے چرچے ہیں اختر نازنینوں میں

تنقید و تبصرہ

رسائل :-

صدائے نسواں ۔ رفیق الطلبہ ۔ انجمن طلبہ قدیم سٹی کالج کا سالانہ ۔ تسریعت ۔ راز حیات
دی ویج ٹیچر ۔ سلسلہ داستان گو ۔ ایشیا ۔

صدائے نسواں | ایڈیٹر انور بزمی الہ آبادی ۔ سائز ۲۰ × ۳۰/۸ ۔ یہ رسالہ علیاحضرت ہر ہائی نس حضور نواب سلطان جہاں صاحبہ مرحومہ کی یادگار میں نکلا ہے علامہ اقبال اور محترمہ بیگم صاحبہ مولانا محمد علی نے اس کی سرپرستی قبول فرمائی ہے اور اختہ الکریم صاحبہ اس کی نگراں ہیں رسالے میں علمی ادبی اخلاقی مذہبی اور اصلاحی مضامین نظمیں اور اصلاحی افسانے بھی ہیں آخر میں صنعت و حرفت ۔ امور خانہ داری، کشیدہ کاری وغیرہ مستقل عنوانات ہیں عورتوں کے لئے مفید رسالہ ہے ۔ البتہ خیالستان کے زیر عنوان علامہ اقبال پر جو مضمون ہے وہ کچھ بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے ۔ فہرست مضامین کی بھی ضرورت ہے ۔ تفریحی صفحہ بھی مردوں کے اخبار یا رسالے کے لئے زیادہ موزوں تھا ۔

رفیق الطلبہ | (سہ ماہی) ایڈیٹر رفیق احمد ذکریا و سر جہانگیر حسین ۔ سائز جامعہ کا ضخامت حصہ اُردو ۷۵ صفحے حصہ انگریزی ۲۰ صفحے کتابت و طباعت نہایت نفیس قیمت عہ ملنے کا پتہ اینگلو اُردو ہائی اسکول پونا ۔

یہ خوب صورت رسالہ اینگلو اُردو ہائی اسکول کے بچے سات سال سے نہایت سلیقے اور نفاست سے نکال رہے ہیں ۔ زیر نظر نمبر میں سوائے دو ایک کے سب مضمون بچوں ہی کے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بہت محنت اور توجہ سے لکھے ہیں نظمیں بھی اچھی ہیں ۔ متعدد اسکولوں کے پرچے ہماری نظر سے گزرے ہیں مگر ہم نے یہ حسن ترتیب یہ خوش سلیقگی اور یہ نفاست کسی پرچے میں نہیں دیکھی ۔ یہ دیکھ کر اس پرچے کی اہمیت ہماری نظروں میں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس علاقے میں صرف یہی ایک رسالہ اُردو زبان کا ترجمان ہے ۔ رسالے میں بچوں کے ساتھ بچیوں کے مضامین بھی ہیں آخر میں انگریزی کے بھی ۲۰ صفحے ہیں جس میں بھی اسکول کے حالات کے علاوہ لڑکوں اور لڑکیوں کے ایک ایک دو صفحے کے مضمون ہیں شروع

میں ایک تصویر بھی ہے۔

انجمن طلبہ قدیم سٹی کالج کا سالنامہ | مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور تقطیع بڑی ضخامت ۲۲۲ صفحات کاغذ لکھائی چھپائی بہایت عمدہ قیمت عا ، ملنے کا پتہ سٹی کالج کمڈ یو حیدرآباد۔

سٹی کالج حیدرآباد کے طلبۂ قدیم کا سالنامہ ہے جو سال میں ایک بار نکلتا ہے۔ زیر نظر نمبر میں اداریہ کے بعد سٹی ہائی سکول کی مختصر سی تاریخ ہے اور اس میں بتایا گیا ہے کہ اس کالج نے کس طرح ابتدائی حیثیت سے ترقی کی اور اب وہ ترقی کی کس منزل پر ہے پھر انجمن طلبہ قدیم کی تشکیل اور اس کی تاریخ پر دو مضامین ہیں اس کے بعد مختلف قدیم طلبہ کے مضامین ہیں نظمیں اور غزلیں ہیں بعض حضرات نے اپنے زمانۂ طالب علمی کے دلچسپ حالات لکھے ہیں چند قدیم طلبہ کے حالات زندگی جناب مرتب کی جانب سے درج کئے گئے ہیں پھر انجمن کی پچھلے سال کی روداد اور آخر میں انجمن کے قواعد و ضوابط ہیں روداد کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب سے یہ انجمن قائم ہوئی ہے کتنی سرگرمی سے کام کر رہی ہے۔ رسالہ بہ حیثیت مجموعی کامیاب ہے اور اُن لوگوں کے لئے بھی دلچسپی کا سامان رکھتا ہے جو اس حلقے میں شامل نہیں ہیں ہم جناب مرتب کو اس کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں نیز وہ ادارہ بھی مستحق تبریک ہے جس کی آغوش میں ایسے ہونہار فرزندوں نے تربیت حاصل کی۔ رسالے میں سٹی کالج کی قدیم و جدید عمارتوں بعض اُستادوں اور طلبہ قدیم کی تصاویر بھی ہیں

شریعت | (ہفتہ وار) محمد حبیب اللہ بی اے علیگ کی ادارت اور مولانا حافظ محمد عبداللہ ام ال اے کی نگرانی میں یہ اخبار عبداللہ پور لائل پور سے نکلتا ہے۔ مضامین زیادہ تر سیاسی مذہبی اور تاریخی ہیں۔ پرچہ قابلیت سے ترتیب دیا جاتا ہے لکھائی چھپائی اور کاغذ بھی اچھا ہے قیمت للعہ، سالانہ فی پرچہ ار

رازحیات | (پندرہ روزہ) یہ اخبار بھی سید الطاف حسین صاحب مشہدی الرضوی کی ادارت میں پہلی اکتوبر سے نکل رہا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ عوام کو اُن کے شہری اور ملکی حقوق سے آگاہ کیا جائے" قیمت سالانہ عا اور

ملنے کا پتہ بھوانہ بازار لائل پور۔

<u>دی ویلیج ٹیچر</u> (سہ ماہی) تقطیع چھوٹی۔ حجم ۸۰ صفحات کتابت و طباعت اور کاغذ اوسط قیمت مدارس متعلقہ انجمن سے ۸ع مع محصول دیگر مدارس سے ۔ ۱۲ع۔

یہ رسالہ انجمن اساتذہ صوبۂ ورنگل نے چند فاضل مدرسین کی زیر ادارت دیہاتی استادوں کی اصلاح و رہنمائی کی غرض سے نکالا ہے۔ زیر نظر نمبر پہلی جلد کا پہلا پرچہ ہے۔ اس میں محاطبے کے علاوہ زیادہ تر مضامین منصوباتی طریقے یا پروجیکٹ میتھڈ سے متعلق ہیں۔ بہت سے مدرسین نے اپنے تعلیمی تجربے بیان کئے ہیں جو دلچسپ کار آمد اور قابل تقلید ہیں۔ آخر میں مہدی یار جنگ کا خطبۂ صدارت ہے جو انھوں نے مدرسین کے ایک جلسے میں پڑھا تھا۔

ابتدائی تعلیم کی اہمیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور اس کے لئے آئے دن نئے نئے اصول وضع ہو رہے ہیں ساتھ ہی ساتھ اس امر کی بھی کوشش کی جا رہی ہے کہ استادوں میں ان طریقوں پر پڑھانے کی اہلیت پیدا ہو اور اس اعتبار سے یہ رسالہ دیہاتی و شہری دونوں جگہ کے مدرسین کے لئے یکساں مفید ہے۔ فاضل مرتب نے دیہاتی مدرسوں کا جو خاکہ کھینچا ہے وہ کچھ حیدرآباد ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے ہر جگہ یہی حالت ہے ہمیں یقین ہے کہ یہ رسالہ ان کے لئے صحیح رہنمائی کا کام دے گا۔

<u>سلسلۂ داستان گو</u> مہتمم علی احمد صاحب بی اے عثمانیہ تقطیع ۲۲×۱۸ لکھائی چھپائی اوسط درجے کی کاغذ معمولی۔ قیمت ۱۲ع سالانہ ملنے کا پتہ مہتمم سلسلہ داستان گو مجبوبیہ کارخانہ جلد سازی روبرو معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد دکن۔

یہ رسالہ ہر مہینے کتابی صورت میں شائع ہوتا ہے اور صرف افسانوں کے لئے مخصوص ہے ہر مہینے ٹائٹیل پر کسی خاص افسانے کی مناسبت سے ایک تصویر بھی ہوتی ہے۔ زیر نظر نمبر میں رقاصہ کی تصویر فنی اعتبار سے خوب ہے۔ افسانے بھی اچھے خاصے ہیں۔ امید ہے کہ علی احمد صاحب کی یہ جدت مقبول ہوگی۔

ایشیا (مصور) ایڈیٹر جناب ساغر نظامی سائز بہت بڑا ضخامت ۱۲۴ صفحات لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ بسالانہ قیمت پرچے پر درج نہیں اس نمبر کی قیمت ۱۲ مقام اشاعت ادبی مرکز بیپٹ اسٹریٹ میرٹھ -

یہ ماہوار رسالہ جناب ساغر نظامی نے میرٹھ سے بہت اہتمام کے ساتھ جاری کیا ہے - زیر نظر نمبر اکتوبر اور نومبر کا مشترک نمبر ہے شروع میں مادر ہند کے نام کوہ ہمالیہ کا پیام ہے جو میسو پال رچرڈ نے لکھا ہے اس کے بعد بھکاری کی صدا کے عنوان سے ایک ہندی آمیز نظم ہے پھر مرتب کے قلم سے افکار و مباحث ہیں جن میں مضمون نگاروں اور ان کے مضامین نظم و نثر کا تعارف ہے اور اردو ہندی کے مسئلے پر اظہار خیال کیا گیا ہے - اس کے بعد مضامین کا سلسلہ شروع ہوتا ہے - پہلا مضمون ایشیا پر ہے جو اگرچہ مختصر ہے لیکن جامع ہے اس کے بعد حضرت جوش ملیح آبادی کی ایک بہت اچھی نظم ہے - پھر اختر رائے پوری صاحب کا ایک مضمون ہے جو انھوں نے اپنے خاص انداز میں لکھا ہے - اس کے بعد موسیو پال رچرڈ کی ایک کتاب کا اقتباس ہے جو مشہور محب وطن صوفی آربندو گھوش کے مختصر سوانح حیات ہیں اسی طرح دوسرے مضامین نظم و نثر ہیں - آخر میں مائیس ینیس مسٹر کا ایک اخلاقی ڈرامہ ہے - جو محنت اور توجہ سے لکھا گیا ہے، غرض رسالہ بحیثیت مجموعی شاندار ہے مضامین نثر اور نظموں کا معیار خاصا بلند ہے - اور ہر قسم کا تنوع موجود ہے ظاہری خوش نمائی میں بھی خاص سلیقے سے کام لیا گیا ہے ایک سہ رنگی اور ایک چار رنگی تصویر ہے ان کے علاوہ دو تصویریں مضمون نگاروں کی ہیں - سرورق بھی بہت خوش نما ہے -

ساغر صاحب کہنہ مشق ایڈیٹر ہیں اس سے پہلے بھی وہ پیمانہ اور دوسرے ادبی رسالوں کو ترتیب دے چکے ہیں، اس لئے ان سے ایسا ہی رسالہ نکالنے کی توقع تھی ہمیں امید ہے کہ وہ اسے مستقل طور پر جاری رکھیں گے

کتب :-

انشائے لطیف - افسانہ نگاری - ہمارے افسانے جشن اور اطالیہ - آداب السلطنت سلطان الہند - علاج الانسان ماحرار الحیوان - کرشن جی - حسن کار -

انشائے لطیف | از جناب لطیف الدین احمد صاحب۔ تقطیع چھوٹی۔ ضخامت ۱۱۰ صفحات کتابت وطباعت بہتر کاغذ سفید دبیز۔ قیمت اور ملنے کا پتہ کتاب پر درج نہیں۔

جناب لطیف الدین احمد صاحب سے جو رسائل میں ل احمد کے نام سے معروف ہیں۔ اُردو داں حضرات اچھی طرح روشناس ہیں۔ یہ ان ہی کے چند رومانی افسانوں کا مجموعہ ہے جو ملک کے مختلف ادبی رسائل میں شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ یہ کل ۱۵ افسانے ہیں۔ ان میں سے چار مختار ہیں یعنی ان کا پلاٹ کسی مغربی افسانے سے لیا گیا ہے باقی طبعزاد۔ تمام افسانے عشق و محبت کے رومان ہیں اکثر افسانوں کا ہیرو جمالی ہے جس کا کیرکٹر قصے کی مناسبت سے بدلتا رہتا ہے۔ لیکن اس کی ایک چیز سب میں مشترک ہے اور وہ اس کی رومانیت پسندی ہے دوسرے افسانوں کے کرداروں میں بھی کم و بیش یہ ہی خصوصیات ہیں جناب لطیف الدین احمد صاحب کو اس قسم کے افسانے لکھنے میں غیر معمولی کمال حاصل ہے۔ وہ مخصوص طرز انشا کے مالک ہیں ممکن ہے کہ لوگوں کو ان کی بعض الفاظ ترکیبیں اور جملے ثقیل معلوم ہوں لیکن عام طور پر ان کی عبارت میں ایک خاص دل کشی اور ندرت ہوتی ہے جو اوروں کے یہاں بہت کم ہے۔ کتاب مجلد ہے اور اس پر سنہرے حرفوں میں کتاب اور مصنف کا نام لکھا ہوا ہے اور پر ڈسٹ کور بھی ہے۔

افسانہ نگاری | از جناب سید وقار عظیم صاحب ایم اے۔ تقطیع چھوٹی حجم ۲۰۸ صفحات کتابت وطباعت اور کاغذ بہتر قیمت عہ ملنے کا پتہ سرسوتی پبلشنگ ہاؤس الہ آباد۔

افسانہ نویسی کا ذوق اُردو زبان میں برابر ترقی پذیر ہے اور بعض اچھے اچھے لکھنے والے اس ملک میں پیدا ہو گئے ہیں لیکن اب ضرورت اس امر کی تھی کہ اس فن لطیف کے اصول و قواعد کا بغور مطالعہ کیا جائے اور افسانہ لکھتے وقت ان اصول کو پیش نظر بھی رکھا جائے انگریزی میں اس قسم کی کتابیں بہت سی ہیں اُردو میں متفرق مضامین کے علاوہ سب سے پہلے عبدالقادر سروری صاحب لکچرر عثمانیہ یونیورسٹی نے اس موضوع پر مستقل کتاب لکھی تھی لیکن اُن کی تصنیف کا موضوع وسیع تھا اور انھوں نے افسانوں کے ساتھ ساتھ ناول وغیرہ بھی شامل کر لئے تھے۔ اب جناب وقار عظیم صاحب نے ایک اور کتاب لکھی ہے۔ اس کا

موضوع صرف مختصر افسانوں تک محدود ہے ۔ اس میں انھوں نے افسانے کی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے افسانہ اور ناول افسانہ اور ڈراما میں فرق بتایا ہے پھر افسانے کا پلاٹ افسانے کی سرخی افسانے کی فنی ترتیب ابتدا اور خاتمہ افسانہ اور کردار نگاری افسانہ اور حقیقت افسانہ اور محبت افسانہ اور اتحاد و اثر پر تفصیلی بحث کی ہے ہر ایک مستقل عنوان کے تحت بہت سے ذیلی عنوانات ہیں مثلاً افسانے کے پلاٹ کے زیر عنوان ۔ منتہا کی اہمیت افسانہ اور منتہا کا تعلق منتہا کے غلط معنی نفسیات اور منطق کی پابندی سادہ اور پیچدار پلاٹ وغیرہ انھوں نے افسانہ نویسی کے صرف اصول ہی نہیں بیان کئے ہیں بلکہ بہت سے اُردو افسانوں کو اس کسوٹی پر جانچا بھی ہے اور متعدد مقامات پر جہاں سمجھانے کی ضرورت پیش آئی وہاں بھی اُردو افسانوں کو پیش نظر رکھا ہے کتاب شروع سے آخر تک دلچسپ ہے طرز بیان کی سادگی اور تحریر کی شگفتگی نے اس دلچسپی میں اور اضافہ کردیا ہے ہمارے خیال میں نومشق اور مشاق دونوں قسم کے افسانہ نگاروں کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہوگا ۔

ہمارے افسانے | از جناب وقار عظیم صاحب ام اے تقطیع چھوٹی حجم ۱۴۳ صفحات کتابت وطباعت اچھی کاغذ دبیز قیمت عہ ملنے کا پتہ سرسوتی پبلشنگ ہاؤس الہ آباد ۔

اس کتاب میں جناب مصنف نے شروع میں افسانے کی تاریخ بتائی ہے پھر اس کی ابتداء ارتقاء پر بحث کی ہے پھر بتایا ہے کہ اُردو افسانوں میں مقامی رنگ کس حد تک ترقی کر رہا ہے ۔ پھر اس امر پر بحث کی ہے کہ اصلاحی مقصد اور فنون لطیفہ میں کیا تعلق ہے اس سلسلے میں انھوں نے بہت سی کام کی باتیں بتائی ہیں ترجمے کے باب میں انھوں نے بتایا ہے کہ اس سے اُردو ادب کو کیا کیا فائدے اور کیا کیا نقصان پہنچ رہے ہیں پھر افسانوں میں عورت کے تخیل محبت اور نفسیات پر مفصل بحث ہے پھر ان افسانوں پر بحث ہے جن میں عورت اور محبت کی رنگ آمیزی نہیں ہے اس کے بعد بتایا ہے کہ ہمارے افسانہ نگاروں کا مستقبل کیسا شاندار ہے ساتھ ہی یہ بھی تنبیہ کی ہے کہ . . . ۔ جہاں ہر سال چند اچھے افسانہ نگاروں کا اضافہ ہوتا ہے وہاں دوسری طرف اُن سے کہیں زیادہ افسانہ نگار ایسے بھی پیدا ہو جاتے ہیں جنھیں افسانہ نگاری کے صحیح مفہوم تک کا پتہ نہیں اُن کی آنکھیں بند ہیں بُرے بھلے کے دیکھنے کا امتیاز نہیں اس لئے وہ

جو کچھ کرتے ہیں وہ اُن کے لئے تو مضر ہے ہی لیکن اس سے زیادہ ستم خود افسانے پر ہے جو بجائے بلندی کی طرف جانے کے پستی کا رخ کرنے پر مجبور ہے ۔۔۔۔۔"

آخر میں انھوں نے اُردو کے چند مشہور و غیر مشہور افسانہ نگاروں پر تنقید بھی کی ہے جناب مولف نے قصداً افسانہ نگاروں کے محاسن زیادہ گنائے اور قابل اعتراض پہلوؤں پر نظر نہیں ڈالی ہے اس کی وجہ بھی انھوں نے ایک حد تک معقول بتائی ہے ۔ تاہم اگر وہ اُن کے نقائص بھی شائستہ الفاظ میں آجاگر کر دیتے تو یہ چیز نوسِتق حضرات کے لئے خاص طور پر مفید اور سبق آموز ہوتی ۔ افسانہ نگاروں کی فہرست میں بھی بعض اچھے اچھے نام چھوٹ گئے ہیں مثلاً پروفیسر محمد مجیب صاحب فیاض محمود صاحب اور بعض دوسرے حضرات ۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ حضرات جناب مصنف کی شرائط کے ماتحت انتخاب میں آسکتے تھے ۔ ان معمولی فروگذاشتوں کو چھوڑ کر کتاب پوری محنت اور توجہ سے لکھی گئی ہے ۔ اور ایک طرح سی اُن کی پہلی کتاب افسانہ نگاری کا گویا دوسرا حصہ ہے اور یہ وقار صاحب نے سچ کہا ہے کہ دونوں کتابوں میں سے ایک میں بھی پوری دلچسپی نہیں آسکتی جب تک دونوں کتابیں ساتھ نہ پڑھی جائیں "

حبش اور اطالیہ | مرتبہ جناب اختر حسین صاحب رائے پوری بی اے ۔ حجم ۸۰ صفحات ۔ کتابت و طباعت اور کاغذ اوسط قیمت ۸ ملنے کا پتہ انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن ۔

روان واقعات میں سب سے اہم آج کل اٹلی و حبش کی آویزش ہے اختر صاحب نے یہ بہت اچھا کام کیا ہے کہ اس وقتی مسئلے پر مستند معلومات ایک جگہ جمع کر دیں ۔ کتاب کے شروع میں قاضی عبدالغفار صاحب کا ایک دیباچہ ہے اس کے بعد شیخ چاند صاحب ام اے ۔ ال ال بی کے قلم سے حبش کے جغرافی حالات ہیں پھر سبط حسن صاحب بی اے نے حبش کی تاریخ لکھی ہے ۔ مظفر حسین صاحب شمیم نے حبش کی تہذیب و معاشرت پر خامہ فرسائی کی ہے حبش کے دور حاضر پر اختر صاحب رائے پوری کا مضمون ہے ۔ حبش اور عرب کے تعلقات کی وضاحت ڈاکٹر حمیداللہ صاحب پی اچ ڈی نے کی ہے پھر حبش اور اطالیہ پر سبط حسن صاحب کا مضمون ہے ۔ پھر لیگ ، استعمار اور حبش اور اس کے بعد حبش کے مستقبل پر

احمد صاحب نے لکھا ہے۔ آخر میں ایک ضمیمہ ہے جس میں اوائل ستمبر ۳۵ء تک کے اہم واقعات ہیں اور مجلس قومی کے میثاق کی چند اہم دفعات ہیں۔ سب سے آخر میں حبش کا ایک نقشہ بھی دیا گیا ہے۔

حبش اور اٹلی کی جنگ ابھی جاری ہے اور اس کتاب کی اشاعت کے بعد بہت سے اہم حادثات رونما ہو چکے ہیں مصالحت کی تجویز جو برطانیہ اور فرانس کی ملی بھگت کا نتیجہ تھی قبل از وقت منکشف ہو جانے کی وجہ سے ردی کی ٹوکری میں ڈال دی گئی ہے اور بعض اس حادثے کی وجہ سے۔ برطانیہ کی وزارت زیر و زبر ہو گئی ہے اٹلی کی چیرہ دستیاں بڑھتی جا رہی ہیں اور قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ بہرحال اس کتاب کو شائع کر کے احمد صاحب نے ایک بڑی ضرورت کو پورا کر دیا اسے پڑھ کر لوگوں کو نہ صرف حبس کے متعلق صحیح معلومات حاصل ہوں گی بلکہ حبش و اٹلی کی صحیح پوزیشن کا علم ہو جائے گا نیز مغرب کی استعماری اور حرص کے متعلق اُن کے خفیہ ارادوں اور اندرونی سیاست کا بھی پتہ چل جائے گا۔

آداب المراسلت | از جناب عابد حسین صاحب عابد لکھنوی مرحوم حجم ۴۸ صفحات۔ یہ کتاب جناب عابد حسین صاحب مرحوم نے بچوں کے لئے لکھی ہے۔ مراسلت کے آداب محکمہ ڈاک کے قاعدے۔ عرضیاں بنانا۔ پٹواری کے کاغذات کی تفصیل درج ہے۔ طالب علموں اور بڑی عمر کے لوگوں کے لئے بھی کام کی چیز ہے۔ قیمت ۴ر ملنے کا پتہ صوفی محمد فصیح اردو بازار مکان نمبر ۱۴۹/۵ بنارس۔

سلطان الہند | از جناب محمد اکمل خاں صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۲۰ صفحات قیمت فی جلد ۸ر ملنے کا پتہ ادارہ نوامیس الہیہ دائرہ بہادر گنج الہ آباد۔

اس کتاب میں حضرت خواجہ غریب نواز معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات بیان کئے گئے ہیں شروع کے چالیس صفحوں میں ہندوستان سے اسلام کا تعلق ہندوستان سے ابتدائی تعلقات صوفیائے کرام مسلمان اور عیسائی مسلمان اور زرتشت مسلمان اور ہندو کے تعلقات پر گفتگو کی گئی ہے پھر پچھلے زمانے کے ہندو اور مسلمان حکمرانوں کے ان سے تعلق پر اظہار خیال ہے پھر تصوف اسلام پر ایک سرسری نظر ڈالی گئی ہے اسے

گویا دیباچہ سمجھئے۔ اصل کتاب حضرت خواجہ غریب نوازؒ کے حالات سے شروع ہوتی ہے اس میں حضرت خواجہ صاحب کے سوانح حیات اجمیر میں تشریف آوری ، آن کے عادات و اخلاق ، کرامات و خوارق عادات ملفوظات اور تعلیمات ہیں ان میں بعض ایسے حالات بھی ہیں جو زبان زد عوام ہیں اور قصے کہانیوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے ان میں سے بعض پر جناب مرتب نے تنقید بھی کی ہے ۔ غرض حضرت خواجہؒ کے حالات میں یہ غالباً پہلی کتاب ہے جو جدید انداز میں لکھی گئی ہے ۔

علاج الانسان باجزاء الحیوان | ازجناب حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر قیمت عہ جناب مصنف سے فراش خانہ دہلی کے پتے پر مل سکتی ہے ۔

اس کتاب میں جناب حکیم صاحب نے یہ بتایا ہے کہ حیوانوں کے جسم کے اجزا سے بھی انسان کا علاج ہو سکتا ہے ۔ آپ نے تمام جسمانی عوارض اور ان کا علاج بالتفصیل لکھا ہے اور اپنے نسخوں میں حیوانات کے اجسام کے مختلف اجزا لکھے ہیں ۔ ہمارے خیال میں اس فن میں یہ پہلی کتاب ہے اور اس کی جمع و ترتیب میں جناب حکیم صاحب کو کافی محنت اٹھانا پڑی ہوگی حکیموں اور ڈاکٹروں کے لئے اس کا مطالعہ فائدے سے خالی نہ ہوگا ۔

کرشن جی | ازجناب رئیس احمد صاحب کرشن جی کے حالات پر ایک مختصر سا رسالہ قیمت ۱ر

محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم | از زہرا بیگم ۔ آں حضرت کے مختصر سوانح حیات از زہرا بیگم قیمت ۲ر

دونوں کتابیں ملنے کا پتہ

مہتمم صاحب بچوں کا کتب خانہ

۵ کلائیو روڈ ۔ نئی دہلی

حسن کار | ازجناب محمد صادق ضیا بی اے تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۱۱ صفحات کتابت و طباعت بہتر کاغذ

[illegible] ہے، قیمت ۱ر مقام اشاعت قصر الادب آگرہ ۔

یہ ضیا صاحب کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے سیماب لٹریری سوسائٹی کے مختلف جلسوں میں پڑھے تھے شروع میں جناب احمد علی صاحب نجم آفندی اکبرآبادی اور مرزا عظیم بیگ چغتائی کے دیباچے شامل ہیں ضیا صاحب نوجوان ادیب ہیں یہ مضامین انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں لکھے ہیں لیکن ان کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے محنت اور توجہ سے لکھا ہے ۔

دنیا کی رفتار

جنگ حبش اور سیاست مغرب | موسیو لاوال اور سر سیمول ہور نے جنگ کو ختم کرانے کے لئے جو شرائط تجویز کئے تھے ان کا حشر تو اچھا نہ ہوا۔ اب نہ سر سیمول انگلستان کے وزیر خارجہ ہیں نہ موسیو لاوال فرانس کے وزیر اعظم۔ دونوں ملکوں میں ان کے جانشین اٹلی کے اتنے ہی حامی نہیں جتنے کہ یہ لوگ تھے۔ اور دونوں ملکوں کی رائے عامہ بھی اٹلی کے رویہ کو بہت ناپسند کرتی ہے۔ لیکن یہ یہ سمجھنا چاہئے کہ اس رائے عامہ کا علم لاوال اور ہور کو نہ تھا۔ غالباً صورت حال میں ایسے عناصر موجود تھے جن کی وجہ سے اٹلی کو بالکل اپنا مخالف بنا لینا ان ملکوں کی آئندہ سیاست کے لئے مفید نہ ہوتا۔ اور یہ عناصر اب بھی موجود ہیں۔ اس لئے کیا تعجب ہے کہ پھر کچھ دن میں کسی طرف سے حبش اور اٹلی میں صلح کرا دینے کی کوششیں شروع ہوں یعنی اٹلی کے مطالبات کو کچھ کم کرکے مان لیا جائے اور حبش کی تسجا عانہ مدافعت کی داد بس یوں دینا تجویز ہو کہ ملک تو "شہنشاہ" کا رہے مگر "حکم" اٹلی کا ہے۔ کہ سچ تو یہ ہے کہ حبش سے ہمدردی صرف ایک دکھاوے کی بات ہے، اصل چیز تو دول مغرب کے اپنے اپنے اغراض ہیں۔ اور حبش کے معاملہ پر دول مغرب کا ادھر یا ادھر ہونا دراصل یورپی سیاست کی چالیں ہیں۔ مغربی بساط سیاست کا مرکزی مسئلہ اس وقت یہ ہے کہ دول یورپ میں کونسا نیا توازن قائم ہو، عہد نامہ ورسائی سے جن ملکوں کو نقصان پہنچا ہے وہ اپنے نقصان کی تلافی کس طرح کریں، خود بزور بازو کریں، یا جمعیۃ اقوام کی پنچائت میں تصفیہ کرائیں اور عہد ناموں کی ناموافق دفعات کو بدلوائیں۔

فرانس کی خواہش تو یہ ہے کہ جنگ عظیم کے بعد کے عہد ناموں میں کوئی تغیر نہ ہو اور ان عہد ناموں کے ذریعہ اس نے جو حصار اپنی حفاظت کے لئے تعمیر کیا تھا وہ اپنے حال پر قائم رہے۔ برطانیہ چاہتا ہے کہ جو غیر مطمئن دول ہیں ان کی بھی بات رہ جائے، عہد ناموں میں مناسب تبدیلیاں کر دی جائیں، مگر جمعیۃ اقوام کی وساطت سے۔ یعنی خود برطانیہ کی نگرانی میں۔ پھر فرانس اور برطانیہ دونوں اس فکر میں بھی ہیں کہ

جمعیۃ ان کے قبضہ میں رہے ۔ اس لئے فرانس نے جمعیۃ میں اپنے نئے دوست روس کو شریک کرایا ہے۔ ادھر جرمنی کی قومی اشتراکیت سب کے لئے تشویش کا باعث ہے اس لئے کہ ابھی کوئی نہیں جانتا کہ اپنی فوجی، بحری اور ہوائی قوت کو بڑھانے کے موجودہ دور سے گذر جانے کے بعد جرمنی کس کا ساتھی اور کس کا مخالف ہوگا۔

فرانس واٹلی اسی بے اطمینانی اور تشویش کی حالت میں، خصوصاً جرمنی کی ابھرتی ہوئی قوت کے خوف سے، جسے فرانس جمعیۃ اقوام اور عہد نامہ ورسائی کے ہتھکنڈوں سے دبائے نہ رکھ سکا، فرانس کی اغراض کا تقاضا یہ ہے کہ اٹلی سے اس کی ان بن نہ ہو۔ اور اٹلی کہیں اس کے خلاف جرمنی سے نہ مل جائے فرانس کی آبادی ۴ کروڑ ہے اور جرمنی کی ۷ کروڑ۔ یہ سات کروڑ انتقام کی آگ میں جل رہے ہیں۔ ان کو گرمانے کے لئے قومی عزت کو برقرار رکھنے کا طلسم ہے۔ عہد نامہ ورسائی نے انھیں جن اسلحہ سے محروم کیا تھا ان کے حصول کی خواہش ان میں جنون کے درجہ کو پہنچی ہوئی ہے۔ فرانس کیسے اس قوت میں اٹلی کی طاقت کو ملنے دے سکتا ہے اس کا تو لازمی طور پر مقصد یہ ہے کہ کسی طرح اٹلی سے ساز باز کرے تاکہ جو عظیم الشان فوج فرانس اور اٹلی کی سرحد پر رکھنی پڑتی ہے وہ جرمنی کی سرحد پر رکھی جا سکے اور اٹلی بھی فرانس کی سرحد سے فوج ہٹا کر برنر کے درہ کو جرمن اقدام سے محفوظ کرنے کے کام میں لائے۔ چنانچہ اس نے جرمن میں قومی اشتراکیت کی فتح کے ساتھ ہی اٹلی سے اپنے پرانے جھگڑے چکانا شروع کئے اور بہت کچھ دب کر سب متنازعہ امور کا تصفیہ جیسے تیسے کر ہی لیا۔ وہ اس وقت کہ جرمنی کی فوجی تیاریاں پوری قوت سے جاری ہیں کیسے اٹلی کا ساتھ چھوڑ کر سب کئے کرائے کام کو تباہ کر لے اور اٹلی کی قوت کو جو شکست کے بعد بھی بہر حال ایک قابل لحاظ قوت رہے گی آنے والے معرکہ میں جرمنی کا حلیف بنا دے۔ یہی وجہ تھی کہ موسیو لاوال نے سر سیمول ہور کو جکڑ کے پیرس کے شرائط صلح منوائے تھے۔ اور اگرچہ موسیو سورو کے متعلق خیال یہ ہے کہ وہ اٹلی کی ویسی حمایت نہ کریں گے مگر ملکی مفاد کا تقاضا انھیں بھی مجبور کرے گا کہ وہ اٹلی کی حمایت کریں چاہے دبی زبان ہی سے سہی تاکہ اٹلی پر فرانس کا کچھ احسان رہے اور جمعیۃ سے بھی باہر نہ نکل جائے۔ کہ اگر ایسا ہوا تو وہ سارا نظام جو عہد نامہ ورسائی کے بعد قائم ہوا تھا درہم برہم ہو جائے گا اور سرحدوں کی تشکیل نو کا کام جمعیۃ کے اثر

سے باہر نکل میں آنے لگے گا۔ سامراجی اٹلی اور امن پسند جمعیۃ میں رشتہ قائم رکھنے کی یہ کوشش واقعی بڑی دشوار ہے، مگر سیاست اسی بازی گری کا نام ہے!

انگلستان اور اٹلی | جمعیۃ اقوام کے دوسرے سرپنچ برطانیہ کے لئے بھی اس قضیہ میں بڑی دشواریاں درپیش ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی سیاست میں بھی نرم و گرم کی مناسب آمیزش دکھائی دیتی ہے۔ ان کا وزیر خارجہ فرانس سے مل کر ایسے شرائط صلح بھی طے کر لیتا ہے جن سے حبش کی سیاسی ہستی بالکل ختم ہو جائے اور اٹلی کو سب نہیں تو بہت کچھ وہ مل جائے جس کا وہ طالب ہے، اور پھر اسی رائے عامہ کے دباؤ سے گھبرا کر ان کی وزارت اپنے بچانے کے لئے ایک ہونہار وزیر خارجہ کی سیاسی زندگی کا خاتمہ بھی کر دیتی ہے۔ وہ اٹلی کے خلاف دباؤ ڈالنے کی کارروائیوں میں دنیا کی رہنمائی بھی کرتی ہے اور پھر اس میں اعتدال اور میانہ روی پر بھی اصرار کرتی جاتی ہے۔ اس دوہری سیاست کی وجہ بھی یہ ہے کہ ایک طرف اٹلی کی ضرورت سے زیادہ طاقت ور ہو جانے کا ڈر ہے، دوسری طرف اسے زیادہ دبانے سے جمعیۃ اقوام کے ڈھونگ کا خاتمہ ہوا جاتا ہے۔ برطانیہ چاہتا ہے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ برطانوی سیاست کے نہایت وقیع ترجمان "راؤنڈ ٹیبل" کی دسمبر کی اشاعت میں جمعیۃ اقوام کے مستقبل سے بحث کرتے ہوئے ایک ہی مضمون میں ذیل کی دو عبارتیں ملتی ہیں۔ ایک جگہ ہے:- "یہ باور کرنے کے وجوہ موجود ہیں کہ مسولینی عرصہ سے اس نتیجہ پر پہنچ چکا ہے کہ اگر اٹلی اپنی آبادی کے لئے نکاس کی، اور اجناس خام حاصل کرنے اور نئی منڈیاں نکالنے کی کوئی صورت پیدا کر سکتی ہے تو برطانوی سلطنت کو نقصان پہنچا کر۔ کہتے ہیں کہ اس کا خیال ہے کہ اپنا بیڑہ ایسا بنائے کہ بحر روم میں برطانوی بحری تسلط کا خاتمہ ہو جائے، حبش کو اپنی سلطنت میں شامل کرے کچھ تو اس لئے کہ وہاں اٹلی والوں کو بسائے، کچھ اس لئے کہ اجناس خام کے ملنے اور مصنوعہ مال بیچنے کی منڈی ملے، اور کچھ اس لئے بھی کہ حبشی جاں نثاروں کا ایک عظیم الشان لشکر تیار کرے اور لیبیا میں ہوائی مرکز قائم کرکے اور ریلوں اور سڑکوں کا ایک جال بچھا کر مصری اور سوڈانی سرحد تک پہنچا دے تاکہ جہاں بین الاقوامی انتشار کے کچھ آثار نمایاں ہوں مصر پر اور مشرقی بحر روم کے تمام برطانوی علاقوں پر قبضہ کر لے۔" ایسے حریف کے خلاف جو کچھ احتیاطی کارروائیاں

نکل جائیں کم ہے۔ مگر پھر اسی مضمون میں یہ بھی ہے کہ۔ "لیکن یہ بھی لازم ہے کہ جب صلح کی کانفرنس بیٹھے تو وہ اٹلی کے مسئلہ کے بنیادی عناصر پر ضرور نظر کرے۔ اور یہ دو ہیں۔ ایک طرف تو یہ کہ اٹلی نہایت شدید دشواریوں سے دوچار ہے۔ اس کا ملک مقابلتہً کم زرخیز ہے اور اس کی آبادی بڑھ رہی ہے۔ سنہ ۱۹۰۰ء اور سنہ ۱۹۱۴ء کے درمیان ہر سال ۶ لاکھ ۰۷ ہزار اطالوی اپنے دیس سے جاکر دوسرے ملکوں میں بسے۔ آج ملک میں آنے والوں اور ملک سے جانے والوں کی تعداد کا مقابلہ کیجئے تو ایک آدمی بھی زیادہ باہر نہیں جارہا ہے۔ نہایت ضروری ضروری اجناس کے لئے اٹلی دوسرے ملکوں کا دست نگر ہے۔ خود ملک کے اندر لوگوں کی ضروریات فراہم کرانے میں مسولینی نے معجزے دکھائے ہیں لیکن اس کی بھی کوئی حد ہے۔ صلح کی کانفرنس کا پہلا فرض یہ ہونا چاہئے کہ اس کی ضروریات کو معقولیت سے پورا کیا جائے۔ اور اسی وجہ سے ہمیں امید ہے کہ اس کانفرنس میں جرمنی، جاپان اور ریاستہائے متحدہ امریکہ بھی شامل ہوں گی تاکہ ان وسیع تر مسائل پر توجہ کی جاسکے، دنیا کی تجارت میں جو رکاوٹیں پیدا ہوگئی ہیں وہ ہٹائی جاسکیں، ہجرت کرکے دوسرے ملکوں میں بسنے کے لئے پھر آسانیاں پیدا ہوں، تمام نوآباد علاقوں میں سب کے لئے دروازہ یکساں کھلا رہے ...... سنہ ۱۸۵۰ء اور سنہ ۱۹۱۰ء کے درمیان ۵ کروڑ آدمی یورپ سے جاکر امریکہ میں بسے، آج ایک آدمی نہیں جاسکتا۔ اگر بین الاقوامی تجارت کے کل پرزے پھر سے چلنے لگیں تو آبادی کی نکاسی کے امکانات کچھ افریقہ ہی تک محدود نہیں ہیں۔ ریگستانی افریقہ میں ۱۰ کروڑ انسان بستے ہیں اور زرخیز جنوبی امریکہ میں صرف ½ ۷ کروڑ۔"

غرض اٹلی سے اگر ڈر ہے اور ناراضی تو ساتھ ہی اس کے مسائل کے حل کرنے کے لئے دوسروں کو ساتھ بیٹھنے کی بھی فکر ہے۔ "تاکہ زد صرف اپنے ہی اغراض پر نہ پڑے دوسرے یہ کہ اٹلی ہمیشہ کے لئے جمعیتہ سے الگ ہوکر جاپان، امریکہ، اور جرمنی کی طرح جو اسے پہلے سے ترک کرچکے ہیں سیاست عالم میں مزید پیچیدگی کی وجہ نہ بنے۔

جرمنی اور اٹلی | بین الاقوامی سیاست میں توحش کی جنگ دراصل جمعیتہ اقوام اور اٹلی کا جھگڑا بن گئی ہے اور جرمنی چونکہ مدت ہوئی جمعیتہ ہی کو خیرباد کہہ چکا اس لئے بظاہر اس قضیہ سے الگ تھلگ ہے۔

لیکن دراصل اس کا رہ یہ بہت اہم ہے۔ اس لئے کہ اگر جرمنی چاہے تو اٹلی کے ساتھ تجارت بڑھا کر جمعیتہ نے جو معاشی کاروائی اٹلی کے خلاف کی ہے اسے تقریباً کالعدم کردے۔ لیکن جرمنی نے فی الحال اس جھگڑے میں بالکل غیر جانبداری کا اعلان کیا ہے۔ مگر یہ غیر جانبداری دراصل دو متضاد رجحانات میں احتیاط کی درمیانی راہ ہے۔ کہ بعض عناصر ایسے ہیں جن کی وجہ سے جرمنی کو اٹلی کا ہمنوا ہونا چاہیئے تھا، اور بعض ایسے ہیں جو اسے اٹلی کے مخالف گروہ میں بھیج سکتے ہیں اٹلی اور جرمنی کو موجودہ حکمراں جماعتوں کے سیاسی مسلک میں جو مشابہت ہے پھر اٹلی اور جرمنی دونوں کے دل میں جو یہ خواہش ہے کہ جنگ عظیم کے بعد کے معاہدے ختم ہوں اور مختلف ممالک اپنے اغراض و مقاصد کے پیش نظر آپس میں عہد و پیمان کرلیں پھر ان دونوں کا یہ مشترک عقیدہ کہ ہر چند حتی الوسع سیاسی امور کو مفاہمت اور گفت و شنید سے طے کرنا اچھا ہے لیکن بالآخر فیصلہ تلوار کا ہوتا ہے، اسے نیام میں رکھنا اچھا ہے لیکن اس پر زنگ آنے دینا دانشمندی نہیں۔ یہ سب چیزیں اس کی متقاضی تھیں کہ جرمنی اٹلی کا ساتھ دیتا۔ مگر ان کے مقابلہ میں دوسری زیادہ اہم چیزیں ہیں جمعیتہ کی قوت کو ٹوٹتے، اور جرمنی کی قوت کو اُبھرتے دیکھ کر فرانس نے روس سے سمجھوتہ کر لیا ہے اور اس طرح مغربی سیاست میں اپنی اہمیت کو ختم ہونے سے بچا لیا ہے۔ جرمنی جانتا ہے کہ اس معاہدہ کی رد اس پر ہے۔ اس کے مقابلہ میں وہ برطانیہ اور شمالی یورپ کی دوسری قوموں سے اتحاد کی فکر میں ہے خصوصاً برطانیہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بڑی کوششیں کر رہا ہے برطانیہ چونکہ اس وقت اٹلی کے ساتھ نہیں اس لئے جرمنی آیندہ برطانوی اعانت کی امید پر اٹلی سے الگ ہے۔

دوسرا مسئلہ آسٹریا کا ہے جرمن قوم میں، بلا امتیاز عقاید سیاسی، آسٹریا کو جرمنی کے ساتھ ملانے کی خواہش عرصہ سے ہے اور بہت قوی ہے۔ اس خواہش کے پورا ہونے میں اگر کوئی حائل ہے تو اٹلی جس نے رفتہ رفتہ آسٹریا کو اپنے حلقہ اثر میں لے لیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی جرمنی اٹلی کی شکست بھی نہیں چاہتا اس لئے کہ اس کی شکست دراصل جمعیتہ کے جمہوریت پسند ممالک کی فتح ہوگی اور اس فتح کا اثر جرمنی کی اندرونی سیاست پر بہت بُرا پڑے گا۔ مگر اٹلی کو اس شکست سے بچانے کے لئے

عملاً کچھ کرنا بھی نہیں چاہتا اس لئے کہ خود اپنی اندرونی دشواریوں اور معاشی اور فوجی مصروفیتوں کی وجہ سے اس وقت کچھ کر بھی نہیں سکتا۔ ہمارا خیال ہے اگر اس سیاسی معرکہ میں جو اس وقت اٹلی اور جمعیۃ اقوام کے درمیان ہو رہا ہے اٹلی کامیاب ہوا اور فرانس اور انگلستان کی مدد کے بغیر کامیاب ہوا تو تو جرمنی اٹلی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے گا، آسٹریا کے معاملہ کو ایک عرصہ کے لئے اٹلی کی خاطر پس پشت ڈال دے گا، اور اٹلی کی مدد سے فرانس کے خلاف ایک گروہ بنائے گا۔ لیکن اگر جمعیۃ کو کامیابی ہوئی اور جمعیۃ کا اقتدار بڑھا تو یہ انگلستان کے سہارے سے جمعیۃ ہی کی معرفت اپنے مطالبات کو ذرا نرم شکل میں منوانے کی کوشش کرے گا۔

بحر الکاہل کے چند گمنام جزیرے | جنگ عظیم کے بعد جمعیۃ اقوام کے میثاق کی بائیسویں دفعہ نے ملک گیری کی ایک نئی شکل اختراع کی تھی جس کا نام "مینڈیٹ" رکھا گیا تھا۔ "جو علاقے گذشتہ جنگ کی وجہ سے ان ریاستوں کے زیر اقتدار نہیں رہے ہیں جو پہلے ان پر حکمران تھیں اور جن میں ایسے لوگ آباد ہیں جو جدید دنیا کی کشاکش میں تنہا اپنے پیروں پر نہیں کھڑے ہو سکتے، ان پر یہ اصول عاید ہونا چاہئے کہ ایسے لوگوں کی بہبود اور نشو ونما تہذیب کی مقدس امانت ہیں اور اس امانت کے فرائض کو پورا کرنے کے لئے اس میثاق میں تحفظات شامل ہونے چاہئیں۔

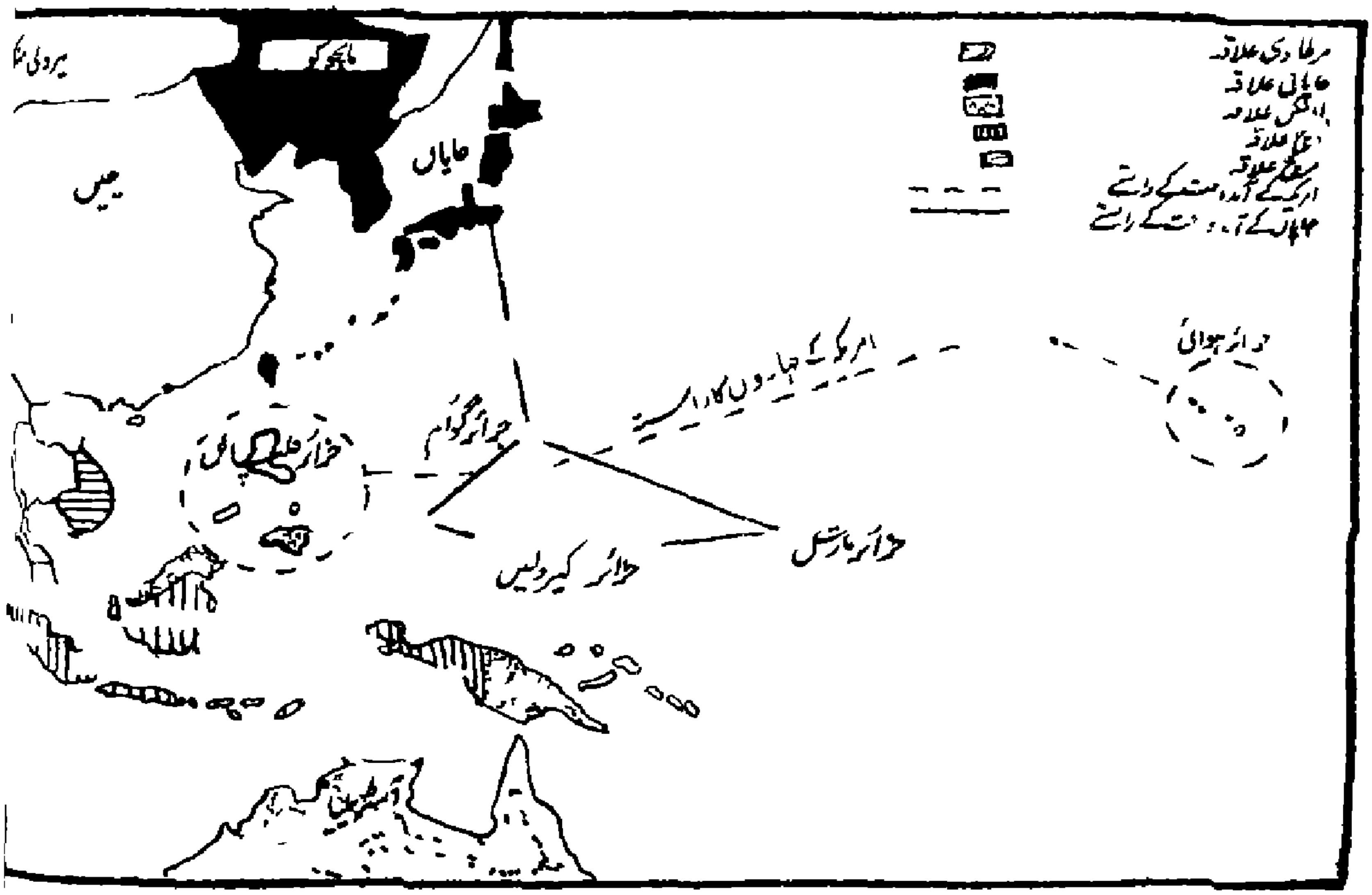
اس اصول کو عملی جامہ پہنانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان لوگوں پر اقتدار ایسی ترقی یافتہ قوموں کے سپرد کیا جائے جو اپنے وسائل، اپنے تجربہ اور اپنے جغرافی موقع کی وجہ سے اس ذمہ داری کو سب سے اچھی طرح اٹھا سکیں، اور جو اس کو اٹھانے پر آمادہ ہوں، اور ان کا یہ اقتدار جمعیۃ اقوام کے منتدب کی حیثیت سے ہو۔"

ان ہی پس ماندہ ممالک میں بحر الکاہل کے سابقہ جرمن مقبوضات بھی تھے۔ جنگ سے پہلے بحر الکاہل کے جزائر مارشل، کرولین، اور ماریانا پر جرمنی کا قبضہ تھا۔ جزائر مارشل پر تو جرمنی نے ۱۸۸۵ء میں قبضہ کر لیا تھا اسی زمانہ میں کرولین پر بھی اس کے دانت تھے مگر اسپین نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ پاپائے روم

کو ثالث مقرر کیا گیا اور ان کا فیصلہ اسپین کے موافق ہوا۔ مگر تیرہ سال بعد جب اسپین اور امریکہ میں جنگ ہوئی تو بحرالکاہل میں اسپین کے مقبوضات کا خاتمہ ہی ہو گیا۔ اس وقت جرمنی نے یہ جزیرے اسپین سے خرید لئے۔ صرف ایک جزیرہ گوام جو پہلے ہی جزائر فلپائن کے ساتھ امریکہ کو دیا جا چکا تھا جرمنی کو نہ ملا۔ دیکھنے کو تو یہ بہت حقیر سے جزیرے تھے، کل رقبہ ۲۱۵۰ کلومیٹر۔ پیداوار میں کچھ گرم ملکوں والے پھل اور کچھ فاسفیٹ اور بس۔ لیکن ان کی جنگی اہمیت خاصی تھی اور جرمنی نے انھیں خاصی ترقی بھی دی تھی ۱۹۱۰ء تک ایک کمپنی یہاں تجارت کرتی رہی مگر پھر جرمن حکومت نے سب کاروبار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بحری راستے کھولے گئے، ایک بہت بڑا لاسلکی کا اسٹیشن بنا۔ لیکن جنگ عظیم نے جرمنی کے منصوبوں کو ختم کر دیا اور ۱۹۱۴ء کے آخر میں شمالی جزیروں پر جاپانی اور جنوبی پر آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کی فوج نے قبضہ کر لیا۔

پھر جمعیۃ اقوام کی اس مذکورہ بالا اختراع ''مینڈیٹ'' کے تحت یہ علاقے انہی ملکوں کے سپرد کر دئے گئے اور انھوں نے "تہذیب کی اس امانت" کو اٹھانے کے لئے بکمال ایثار آمادگی ظاہر کی۔ مہذب فاتحوں کو جو ملک یوں تفویض کئے گئے تھے ان کی بھی بہ اعتبار ترقی تین تقسیمیں تھیں، یہ علاقہ تیسری یعنی آخری تقسیم میں رکھا گیا۔ اور جاپان اپنے حصہ کے جزیروں کی پاسبانی کرتا رہا۔ لیکن اب لوگ کہتے ہیں کہ اس نے ان جزیروں کو نہایت طاقتور بحری مرکز بنا لیا ہے جس کی اہمیت کا اندازہ ساتھ کے نقشہ سے ہو سکتا ہے۔ منچوریا کے معاملہ پر جاپان اور جمعیۃ اقوام میں اختلاف ہوا تو جاپان نے جمعیۃ کی رکنیت سے استعفا دیدیا۔ لیکن یہ بار امانت جو اس نے لیگ کے مندوب کی حیثیت سے اٹھایا تھا اب بھی اسی کے شانوں پر ہے اور وہ اسے اتارنے کے لئے تیار بھی نہیں۔ اور اب کہ جمعیۃ کی رکنیت سے الگ ہے اس پر جمعیۃ کی ان ہدایات کا ماننا بھی ضروری نہیں کہ ان جزیروں کو کسی فوجی کام میں نہ لایا جائے۔ اسی قسم کی پابندی عہد نامہ واشنگٹن سے جاپان پر عائد ہوئی تھی مگر اب وہ بھی ختم ہو چکا۔ جاپان ان جزیروں کو بحری مرکز بنا سکتا ہے اور بنا رہا ہے۔ لوگوں کو یہ بہت ناگوار ہے۔ مگر سچ ہے "زبردست مارے اور رونے نہ دے"۔ ابھی جمعیۃ اقوام کے سامنے ایک مغربی

سیاح نے شکایت نامہ پیش کیا تھا کہ ان جزیروں میں اسے جاپانیوں نے بہت تنگ کیا اور جاسوس کا سا سلوک کیا۔ استفسار حال پر جاپان سے جواب ملا کہ زیادتی کا کیا سوال ہے سیاح موصوف کی مالی، جانی حفاظت کے مناسب انتظامات کئے گئے تھے۔ اسی قسم کے انتظامات غالباً اور محققین کے لئے بھی ہوا کریں گے۔ اس لئے دنیا کو صحیح طور پر اس کا پتہ چلانا بھی مشکل ہوگا کہ ان جزیروں میں امن عالم کی تباہی کا کیا کیا سامان کیا جا چکا ہے اور کیا جا رہا ہے۔



جاپان کا ظلم | جاپان نے چین کے ساتھ جو طرز عمل اختیار کر رکھا ہے اس پر رائے زنی کرنے والے بہت ہیں۔ مگر مغربی اور خصوصیت کے ساتھ برطانوی اور امریکی اخبارات و رسائل جاپان کے ظلم پر رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ذیل کے اعداد شاید دلچسپی کا باعث ہوں۔

چین میں ریاستہائے متحدہ امریکا ۲۰ کروڑ ڈالر کا سرمایہ لگا ہوا ہے، ۸ کروڑ عیسائی مشنوں

کا اور ۱۵ کروڑ تجارت میں۔ برطانیہ کا کوئی ایک ارب ۵۰ کروڑ کا سرمایہ وہاں لگا ہوا ہے یعنی امریکہ سے کوئی ۱۰ گنا۔

امریکہ کے ایک رسالہ جو عام رائے سے ذرا الگ ہے برطانیہ کے سرمایہ کی اس زیادتی کا ذکر کرکے اپنے ملک کے سیاسیین پر یہ الزام لگاتا ہے کہ وہ خواہ مخواہ اتنے بگڑتے ہیں۔ ان کی چیخ پکار دراصل برطانیہ کی سیاست کی حمایت ہے اور کچھ نہیں اور سرمایہ میں جو تفاوت ہے سو ہے مشرق بعید میں امریکن تجارت کے متعلق لکھتا ہے۔ " ریاستہائے متحدہ امریکہ ہر سال جاپان کو دس کروڑ ڈالر کے اجناس خام اور مصنوعات بیچتا ہے اس برآمدہ مال میں نصف کے قریب قیمت تیل، تمباکو، اور کپاس کی ہوتی ہے اور یہ وہ اجناس ہیں جو جاپان میں پیدا نہیں ہوتیں باقی ۵ کروڑ کے مال میں سے نصف کے قریب جاپانیوں کے ہاتھ میں جاتا ہے اس لئے امریکن مال جو جاپان سے براہ راست مقابلہ میں آتا ہے بس ڈھائی کروڑ ڈالر کا ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے امریکن مال جو خود جاپان کو جاتا ہے وہ کوئی ۲۴ کروڑ، ۴۰ لاکھ ڈالر کا ہوتا ہے۔ جاپان امریکن مال کے خریداروں میں دوسرے نمبر میں ہے اور توازن تجارت میں امریکہ جاپان کو ½ ۸ کروڑ ڈالر زیادہ کا مال بیچتا ہے یعنی اگر محض مادی فوائد کو دیکھا جائے تو جاپان سے جنگ کی صورت میں امریکہ کو جو نقصان ہوگا وہ سرمایہ کے اعتبار سے تو برطانیہ کا گیارہواں حصہ ہوگا اور تجارت کے اعتبار سے جس مال کے بیچنے کے لئے یہ جنگ ہوگی وہ اس تجارت کا ½ ہوگا جس کی نکاسی جنگ کی صورت میں یک لخت بند ہو جائے گی۔ کیا تعجب ہے کہ برطانوی سیاسی اور مدبرین اس قسم کے مادی امور کا ذکر نہیں فرماتے بلکہ مارکویس لوتھین کے الفاظ میں " ہمارے مشترک تصور کائنات کی گہرائیوں' اور ہماری عدل و انصاف کی پاسداری اور جنگ سے نفرت، ہماری حریت کے لئے شیفتگی اور ظلم سے بیزاری " کے ذکر ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔"

(لونگ ایج، جنوری ۱۹۳۶ء)

بسم اللہ

جامعہ

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی ایچ ڈی — پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد ۲۹	مارچ سنہ ۱۹۳۶ء	نمبر ۳

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر محمد مجیب بی اے (آکسن) ... جامعہ برقی پریس ... چھپوا کر شائع کیا

ہندوستان میں تعلیم یافتہ طبقے کی بے روزگاری

ہندوستان میں بے روزگاری کے متعلق اعداد و شمار تو کہیں موجود نہیں اس لئے یہ بتلانا مشکل ہے کہ تعلیم یافتہ طبقے میں بے روزگاری کا فی صدی اوسط کیا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اس طبقے میں بے روزگاری روز بروز بڑھتے بڑھتے اب خطرناک صورت اختیار کر چکی ہے اور اگر موجودہ صورت حال کی اصلاح کے لئے جلد از جلد مناسب تدابیر نہ اختیار کی گئیں تو اندیشہ ہے کہ اس کے نتائج اچھے نہ ہوں گے۔ گذشتہ دس سال کے اندر اندر بار بار اس کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ سنہ ۲۶ء میں لیجسلیٹو اسمبلی میں یہ مسئلہ پیش ہوا لیکن حکومت ہند نے یہ آڑ لی کہ جو مؤثر تدابیر اس سلسلے میں سوچی جا سکتی ہیں اُن کا نفاذ صوبجاتی حکومتوں کے اختیار میں ہے اس لئے حکومت ہند خود کچھ نہیں کر سکتی البتہ صورت حال کی نزاکت کو تسلیم کرتے ہوئے اسمبلی کی کارروائی صوبجاتی حکومتوں کی خدمت میں بھیج دی جائے گی اور یہ درخواست کی جائے گی کہ اس معاملے پر پوری ہمدردی سے غور کیا جائے۔" اسی کارروائی کا یہ نتیجہ تھا کہ تقریباً ہر صوبے نے بے روزگاری کی تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی۔ لیکن ان کمیٹیوں نے صرف سرسری طور پر یہ بتلا دیا کہ موجودہ بے روزگاری کے اسباب اس ملک کے اجتماعی نظام کے پیدا کردہ ہیں، ظاہر ہے کہ اس قسم کی تحقیقات سے اصلاح کی کیا صورت نکلتی۔ بعض کمیٹیوں نے یہ عذر کیا کہ بے روزگاری کا بہت گہرا تعلق ملک کی عام معاشی حالت ~~سے~~ ہے اور چونکہ معاشی مسائل کی تحقیقات کمیٹی کے حدود اختیارات میں شامل نہیں۔ اس لئے کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔

چند سال ہوئے معاشی تحقیقاتی بورڈ بھی پہلے پنجاب، پھر صوبجات متحدہ اور بنگال میں اس غرض سے قائم کئے گئے ہیں کہ معاشی معاملات میں حکومت کو مشورہ دیں اور تدابیر بتلائیں۔ مگر انھوں نے بھی بے روزگاری کے مسئلے پر اب تک کچھ توجہ نہیں کی ہے۔ گذشتہ چند سال کی کساد بازاری کے زمانے میں جب بے روزگاری زیادہ بڑھ گئی تو پنجاب، صوبہ متحدہ اور بہار نے دوبارہ تحقیقاتی کمیٹیاں مقرر کی ہیں

حال ہی میں معاشی دستور العمل (Economic plan) اختیار کرنے کی تجویزیں بھی پیش کی گئی ہیں اور صوبہ متحدہ کی کونسل میں مسٹر جینا منی کی یہ تجویز کہ اس صوبے کے لئے ایک پنج سالہ دستور العمل تیار کیا جائے معاشی تحقیقاتی بورڈ کے زیر غور ہے۔ صوبہ مدراس نے بھی ایک معاشی کونسل قائم کی ہے اور یہ کونسل غالباً منجملہ دیگر امور کے معاشی دستور العمل اور بے روزگاری کے مسائل پر بھی توجہ کرے گی۔ لیکن یہ تمام کوششیں جو اس وقت تک کی گئی ہیں اس سے کوئی امید افزا نتیجہ پیدا ہونے کی توقع نہیں قائم ہوئی بلکہ جس انداز سے اب تک کام کیا گیا ہے اس سے تو یہ شبہ بھی ہوتا ہے کہ ابھی تک بے روزگاری کے اسباب و علل تحقیق کرنے کی حقیقتاً کوئی خواہش بھی پیدا نہیں ہوئی ہے۔

تعلیم یافتہ اور بے روزگاروں کی تعریف

اس موضوع پر بحث کرنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ تعلیم یافتہ اور بے روزگاری کا مفہوم اچھی طرح واضح کر دیا جائے۔ صوبہ متحدہ کی بے روزگاری کمیٹی نے تعلیم یافتہ کی تعریف یہ کی ہے کہ ایک شخص جس نے ورنا کیولر فائنل یا اس سے اعلیٰ کوئی امتحان پاس کیا ہو۔ یہ تعریف ممکن ہے کہ بعض کاموں کے لئے کارآمد ہو لیکن ہم چونکہ معاشی نقطۂ نظر سے بے روزگاری کے مسئلے پر بحث کرنا چاہتے ہیں اس لئے تعلیم یافتہ کی تعریف ہمارے لئے یہ ہونا چاہئے کہ "وہ شخص جن کا معیار زندگی تمام آبادی کے معیار زندگی سے زیادہ بلند ہو۔ نیز یہ کہ اس کی قوت، دولت آفرینی بھی اسی لحاظ سے زیادہ ہو، چنانچہ معاشی نقطۂ نظر سے تعلیم یافتہ کی تعریف صرف معیار زندگی اور قوت دولت آفرینی کے اعتبار سے کی جاسکتی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ معیار زندگی اور قوت دولت آفرینی کے متعلق ضروری اعداد و شمار دستیاب نہیں ہو سکتے اس لئے یہ تعریف ہمارے لئے بے سود ہے، بہر حال یہ ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ اگر معاشی نظر سے اس مسئلے کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ تعلیم یافتہ طبقے کا معیار زندگی عام آبادی کے معیار زندگی سے بلند ہوتا ہے۔ اور قوت دولت آفرینی بھی زیادہ ہوتی ہے گو یہ ممکن ہے کہ معیار دولت آفرینی معیار زندگی سے نسبتاً کم درجے کا ہو۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی خصوصیت سے قابل ذکر ہے کہ بے روزگاری اور معیار زندگی کا ایک اضافی تعلق ہے یعنی اگر کسی شخص کی آمدنی اتنی نہیں کہ وہ اپنے معیار زندگی کو قائم رکھ سکے تو اسی حد تک معاشی نقطۂ نظر سے گویا وہ بے روزگار سمجھا جائے گا ۔ یونیورسٹی کے اکثر گریجوٹ اگر چاہیں تو انھیں کوئی نہ کوئی روزگار ، کچھ نہیں تو ایک مزدور ہی کی حیثیت سے مل سکتا ہے اور جو لوگ روزگار سے لگے ہیں ان میں سے اکثروں کی آمدنی ایک اچھے کاریگر کی آمدنی سے کم ہی ہوتی ہے ۔ اس لئے ان لوگوں کا شمار بھی ایک حد تک بے روزگاروں میں کیا جائے گا ، ایک قابل گریجوٹ جس نے اپنی روزی کمانے کے لئے جوتے پر پالش کرنے کا کام شروع کیا ہے ۔ اور اس طرح میں سمجھتا ہوں کہ وہ کسب حلال کے لئے ہر قسم کی محنت اور مزدوری کرنے کا ایک سبق ہم لوگوں کو دینا چاہتا ہے اس کا بھی شمار اس تعریف کے ماتحت بے روزگاروں میں کیا جائے گا ۔ روزگار سے لگنے کے یہ معنی ہیں کہ ایک شخص اتنا کما سکے کہ اپنے معیار زندگی کے مطابق وہ خود اپنی اور اپنے بال بچوں کی پرورش کر سکے ، بلکہ بعض لوگوں کے نزدیک مزید برآں اس کی آمدنی میں اتنی اور گنجائش بھی ہونا چاہئے کہ وہ آئندہ ترقی اور فراغت سے زندگی گذارنے کا انتظام بھی کر سکے ۔

مسئلے کی تشریح

اس میں شک نہیں کہ موجودہ کساد بازاری سے بے روزگاری بہت بڑھ گئی ہے لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ بے روزگاری کلیتہً یا زیادہ تر کساد بازاری کی وجہ سے ہے ۔ بلکہ اس کی تہ میں بہت سے اسباب مستقل طور پر کارفرما ہیں ، کساد بازاری سے قبل بھی بے روزگاری اور برابر بڑھتی جا رہی تھی ، کساد بازاری کے نتائج اور بے روزگاری کے اسباب میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے اس موضوع پر گفتگو کرتے وقت بہت زیادہ خلط مبحث اس زمانے میں کیا گیا ہے ۔ اس وقت میں کساد بازاری کے اسباب سے بحث نہیں کرنا چاہتا ۔ یہ صورت حال گو اس وقت بہت نازک ہو گئی ہے مگر بہرحال عارضی ہے اور امید ہے کہ رفتہ رفتہ اصلاح پذیر ہوتی جائے گی ۔ میں اس مضمون میں بے روزگاری کے

مستقل اس مسئلہ پر اپنے خیالات ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے کہ یہ اس وقت بھی باقی رہیں گے جب کہ سرمایہ داری کا یہ زمانہ ختم ہو جائے گا۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ کسی معاشی نظام میں جہاں قوانین وراثت اور املاک میں جلد جلد تبدیلیاں نہ واقع ہوتی ہوں۔ قومی آمدنی کا جو حصہ کسی ایک کے حصے میں آتا ہے وہ کم و بیش قائم رہتا ہے۔ پریٹو نے سب سے پہلے اس معاشی اصول کی تحقیق کی تھی۔ بعد میں دوسرے لوگوں نے بھی اس کی تصدیق کی۔ اگر یہ تحقیق صحیح ہے تو جب تک کہ قومی آمدنی کی تقسیم میں مختلف طبقات کا حصہ معین اور قائم ہے اس وقت تک مختلف طبقات کی آبادی کے اضافے کی بھی کچھ حد مقرر ہونی چاہیئے یہ حد بالعموم اونچی آمدنی والے طبقے میں نسبتاً جلد آجاتی ہے، بمقابلہ کم آمدنی والے طبقات کے، اور کوئی قوم ایک عرصے تک کسی ایسے طبقے کا بار نہیں اٹھا سکتی جس کا معیار زندگی عوام الناس کے معیار زندگی سے بہت زیادہ بلند ہو۔ اگر اونچے طبقے کی آبادی میں زیادہ اضافہ ہو جائے اور اس طبقے کی آمدنی میں اسی نسبت سے اضافہ نہ ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ اس طبقے میں یا تو بے روزگاری پھیلے گی یا معیار زندگی کم ہوگا یا دونوں مشکلات کا ایک وقت سامنا ہوگا، اور اگر یہ خواہش ہے کہ اس طبقے کی آبادی میں تیزی کے ساتھ اضافہ بھی ہوتا رہے اور معیار زندگی بھی نہ گھٹے تو دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو [illegible] آمدنی میں مجموعی طور پر اسی قدر اضافہ کیا جائے جس نسبت سے کہ اس طبقے میں آبادی بڑھتی ہے یا پھر قوانین املاک اور وراثت میں اس قسم کی تبدیلیاں کی جائیں کہ قومی آمدنی کا بیشتر حصہ اس طبقے کے حصے میں آجائے۔

ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقے میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے، اگر یہ مان لیا جائے کہ تعلیم یافتہ سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے کم از کم ورنیکولر فائنل کا امتحان پاس کیا ہے تو اس زمانے میں اوسطاً ۳۰ ہزار اشخاص کا سالانہ اضافہ صرف صوبہ متحدہ میں اس طبقے کے اندر ہو رہا ہے، پھر اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ گذشتہ ۳۳ سال کے اندر کم و بیش اسی قدر تعداد کا اضافہ ہوتا رہا ہے نیز یہ کہ ان میں سے ہر شخص امتحان پاس کرنے کے بعد کم از کم ۳۳ سال زندہ بھی رہتا ہے تو یہ تعلیم یافتہ طبقہ ۳ فیصدی کے حساب سے سال بہ سال بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ تو کم از کم تخمینہ ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ

کہ تین فی صدی سے زیادہ اضافہ ہو رہا ہے اور یہ اضافہ پانچ فی صدی سے ہرگز کم نہ نکل سکے گا۔ ملک کی کل آبادی میں گذشتہ دس سال کے اندر صرف ایک فی صدی سالانہ اضافہ ہوا ہے اور اس سے پہلے کی مردم شماری میں اس سے بھی کم اضافہ ہوا تھا۔ اگرچہ ہماری قومی آمدنی کے متعلق اعداد و شمار موجود نہیں ہیں۔ لیکن پھر بھی عام آبادی کی معاشی حالت میں جو تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں ان کا کچھ نہ کچھ اندازہ مجموعی حیثیت سے ہر شخص کر سکتا ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ آبادی کے اضافے کے ساتھ ساتھ قومی آمدنی میں بھی برابر اضافہ ہوا ہے تب بھی یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ کسی صورت میں یہ اضافہ پانچ فی صدی سالانہ تک نہیں پہنچا ہے، بالفاظ دیگر جتنا کہ آبادی میں اضافہ ہوا ہے اس کا پانچ گنا اضافہ قومی آمدنی میں ہرگز نہیں ہوا ہے۔ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ قومی آمدنی میں سے جو حصہ تعلیم یافتہ طبقہ کو ملتا ہے اس میں اس شرح سے اضافہ نہیں ہو رہا ہے جس شرح سے کہ اس طبقے کی آبادی میں اضافہ ہوا ہے، اور اس لئے اس طبقے میں بے روزگاری پھیل رہی ہے اور معیار زندگی بھی گھٹتا جا رہا ہے۔

مسئلۂ بے روزگاری کی اس تشریح سے موجودہ حالت کی اصلاح اور علاج پر بھی روشنی پڑتی ہے اگر مقصد صرف یہ ہو کہ تعلیم یافتہ اشخاص کی تعداد اور جو روزگار ان کو مل سکتا ہے اس میں توازن پیدا کیا جائے۔ تب تو یہ انتظام کیا جا سکتا ہے کہ زیادہ لوگوں کو تعلیم ہی نہ دی جائے۔ لیکن یہ ممکن نہیں اس لئے کہ تعلیم بجائے خود ایک پسندیدہ چیز ہے اور اس کی معاشی حیثیت جس سے ہم اس وقت بحث کر رہے ہیں تعلیمی نقطۂ نظر سے محض اتفاقی طور پر پیدا ہوئی ہے۔ ہندوستان ایسے ملک میں جہاں تعلیم یوں ہی بہت کم ہے۔ آئندہ تعلیم پر کسی قسم کی پابندیاں عائد کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن اس میں شک نہیں کہ نظام تعلیم میں اس قسم کی تبدیلیاں ضرور کرنی چاہئے جس سے تعلیم یافتہ اشخاص کی قابلیت دولت آفرینی میں اضافہ ہو۔ اور اس مسئلے پر اسی مضمون میں آئندہ میں اپنے خیالات بھی ظاہر کر دوں گا۔ بہرحال اگرچہ یہ صحیح ہے کہ تعلیم پر قیود نہ عائد کی جائیں اور تعلیم یافتہ طبقہ اس رفتار سے بلکہ اس سے بھی زیادہ تیزی سے بڑھتا جائے تو پھر دو ہی صورتیں نظر آتی ہیں جن کے ذریعے روزگار کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ یا تو کوئی ایسی تدبیر اختیار کی جائے کہ قومی آمدنی میں اپنے حصے سے زائد

کچھ اس طبقے کو مل جائے یا قومی آمدنی میں مجموعی حیثیت سے اتنا اضافہ ہو جائے کہ حصہ رسدی بڑھ جائے
پہلی صورت میں اندیشہ ہے کہ بحالات موجودہ کوئی نمایاں فرق نہیں پیدا ہوگا۔ جہاں تک عام آبادی کا تعلق ہے وہ جو اتنی زیادہ غریب ہے کہ اس حصے میں سے کچھ اور چھین لینا ناانصافی ہی نہیں بلکہ ظلم ہے۔ اب امرا رہ جاتے ہیں مگر ان کی تعداد اتنی تھوڑی ہے کہ اگر ان سے کچھ کھسوٹ لیا جائے تب بھی کوئی معتدبہ مالی فائدہ نہ ہوگا۔ یہ ممکن ہے کہ بعض خاص حالات میں معاشی نقطۂ نظر سے انصاف کا تقاضا یہی ہو کہ ایک طبقے سے لے کر دوسرے طبقے کو دے دیا جائے اور یہ اعتراض بھی شاید صحیح ہو کہ ہندوستان میں محصولات اور ٹکس کا نظام اتنا ترقی یافتہ نہیں ہے جتنا کہ ہونا چاہئے۔ لیکن اگر نظام محصولات اور ٹکس کے نقائص کی اصلاح کر بھی دی جائے تب بھی میرا یہ خیال ہے کہ اس اصلاح سے تعلیم یافتہ طبقے کی آمدنی کا کوئی حصہ ٹکس اور محصول لگا کر دوسرے طبقے کو منتقل کر دینے سے کوئی حقیقی فائدہ نہیں پہنچ سکتا اور نہ تعلیم یافتہ طبقے کی بے روزگاری کا مسئلہ اس طرح حل ہو سکتا ہے۔

اس لئے اب دوسری صورت صرف رہ جاتی ہے کہ قومی آمدنی میں مجموعی حیثیت سے اضافہ کیا جائے تاکہ ہر طبقے کے حصہ رسدی میں خود بخود اضافہ ہو جائے۔ ہندوستان جیسے غریب ملک میں آبادی کے کسی قلیل سے قلیل حصے کی بے روزگاری دور کرنے کا مسئلہ حقیقتاً معاشی تنظیم کا مسئلہ ہے اور میرا خیال ہے کہ اس کے علاوہ کوئی دوسری ترکیب جو اختیار کی جائیگی اس کا فائدہ بہت ہی محدود ہوگا۔

معاشی تنظیم

گذشتہ چند سال کے عرصے میں حکومت نے ملک کی معاشی تنظیم کے لئے متعدد تجاویز منظور کی ہیں اگر ان تدابیر کا بنظرِ غائر سے مطالعہ کیا جائے تو ان میں چند مشترک خصوصیات نظر آئیں گی ان تجاویز سے ظاہر ہوتا ہے کہ اول تو حکومت کے پاس ملک کی معاشی ترقی کے لئے کوئی مستقل اور مرتب دستور العمل موجود نہیں دوسرے یہ کہ حکومت ملک کی معاشی زندگی کی تنظیم کی ذمہ داری اپنے سر لینے کے لئے دل سے آمادہ نہیں ہے۔ الا یہ کہ حالات اس کو اس قسم کی ذمہ داری لینے پر مجبور ہی کر دیں۔ نیز یہ کہ حکومت معاشی

ترقی کی بعض کارروائیوں کو جزوی طور پر اختیار کرلیتی ہے اور ان میں سے ہر ایک پر علیحدہ علیحدہ توجہ کرتی ہے۔ کل معیشت قومی کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ معاشی ترقی اور اصلاح کا یہ طریقہ قابل اعتراض ہے اور کامیاب بھی نہیں ہو سکتا۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ملک کی معاشی ترقی کے لئے قابل اطمینان انتظام کیا جائے تو پھر یہ ضروری ہے کہ موجودہ لایعنی عمل کو ترک کیا جائے اور اس کی جگہ باقاعدہ معاشی تنظیم شروع کی جائے اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ حکومت کا مقصد ایک ایسی معاشی تنظیم ہونا چاہئے کہ اشیاء کی قیمتیں تک بجائے مقابلے کے سرکاری قانونوں کے بموجب مقرر ہوا کریں۔ بلکہ میں جس قسم کی معاشی تنظیم چاہتا ہوں وہ بغیر مزید ذمہ داریوں کے حکومت اگر چاہے تو کر سکتی ہے حالانکہ اگر واقعی حکومت تعلیم یافتہ طبقے کی بے روزگاری کا مسئلہ حل کرنا چاہتی ہے تب تو اس کو مجبوراً مزید ذمہ داریاں بالآخر قبول کرنا ہی پڑیں گی۔ یہ سمجھنا غلطی ہے کہ معاشی تنظیم کوئی انقلابی اصول کے ماتحت کی جاتی ہے۔ ہر اجتماعی نظام کا بنیادی اصول تنظیم ہے اور معاشی تنظیم کا مطلب یہ ہے کہ کسی معاشی مقصد کے حصول کے لئے تمام قومی وسائل کو منظم طور پر استعمال کیا جائے۔ اس وقت سرکاری قواعد وضوابط ایک مفصل لیکن غیر مربوط دستور العمل بنتا چلا جا رہا ہے اور اتفاقی حالات سے مجبور ہو کر جب کبھی کسی طبقے کی طرف سے مطالبہ کیا جاتا ہے یا زور ڈالا جاتا ہے تو دفع الوقتی کے لئے قواعد وضوابط بن جاتے ہیں یا کوئی ترمیم و تنسیخ کر دی جاتی ہے نہ کوئی سوچا ہوا پروگرام پہلے سے موجود ہے اور نہ مختلف قسم کی معاشی کارروائیوں میں کوئی ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اگر حکومت معاشی تنظیم کا اصول تسلیم کرلے تو پھر اس غرض کے لئے حکومت کو ضروری انتظامات بھی کرنا چاہئے۔ سب سے پہلے ایک ایسے ادارے کی ضرورت ہے جو معاشی پروگرام کو سوچ کر تیار کرے اور اس سلسلے میں ضرورت ہے کہ ہر قسم کے اعداد و شمار اور معلومات نہ صرف فراہم کئے جائیں بلکہ ان کو مرتب کرکے شائع بھی کرایا جائے۔ اس کے علاوہ مختلف معاشی مسائل کی تحقیقات اور چھان بین بھی وقتاً فوقتاً کرنا ضروری ہے اور معاشی پروگرام تیار کرنے والے ادارے کا یہ فرض

بھی ہوگا کہ حکومت کی تمام معاشی کارروائیوں میں ہم آہنگی اور رابطہ پیدا کرے اور حکومت کی معاشی پالیسی میں تسلسل قائم کیا جائے جس ادارے کے سپرد معاشی پروگرام تیار کرنے کا کام کیا جائے اس کا ایک مستقل عہدیدار ہونا چاہیئے اور غیر سرکاری اراکین کی ایک مجلس شوریٰ مشورہ دینے کے لئے مقرر کی جائے۔

بہتر یہ ہوگا کہ موجودہ محکمہ اعداد وشمار کی بجائے ایک محکمہ معاشیات قائم کیا جائے جس میں ادارہ معاشی تنظیم اور محکمہ اعداد وشمار دونوں شامل کر دیئے جائیں۔ محکمہ معاشیات کے تین شعبے قرار دیئے جائیں۔ ایک شعبے کا کام یہ ہوگا کہ اعداد وشمار جمع کر کے ترتیب دے اور ان کو شائع کرے۔ دوسرے شعبے میں ان تبدیلیوں کا مطالعہ اور تحقیقات کی جائے جو آئے دن معاشی زندگی میں ہوتی رہتی ہے اور تیسرا شعبہ دیگر معاشی مسائل کی تحقیقات کرے گا جو وقتاً فوقتاً حکومت کے سامنے پیش کئے جائیں۔

محکمہ معاشیات کو اچھے اور قابل ماہر فن معاشیات کی نگرانی میں قائم کرنا چاہیئے اس محکمے کے افسر کا یہ فرض ہوگا کہ جو تجاویز اس کے پاس بھیجی جائیں ان کو اچھی طرح جانچ کر یہ بتلائے کہ ان کا اثر معاشی پالیسی کے خلاف تو نہ پڑے گا۔ چونکہ یہ محکمہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے اس لئے حکومت ہند کے سکریٹریوں کے درجہ کا ایک افسر اس محکمے کا افسر بھی ہونا چاہیئے۔ لیکن دفتری انداز پر اس محکمے کو ہرگز نہ چلانا چاہیئے۔ جو ماہرین فن مقرر کئے جائیں ان کو پوری آزادی کے ساتھ اظہار رائے کا موقع دینا چاہیئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ حکومت کو اگر کسی رائے سے اتفاق نہ ہو یا مناسب نہ سمجھے تو اس کو شائع نہ کرے

اب سوال یہ ہے کہ کابینہ کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہو۔ بحالات موجودہ میرے نزدیک صرف دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو یہ محکمہ موجودہ وزراء میں سے کسی ایک کے ماتحت کر دیا جائے یا کابینہ کی ایک معاشی کمیٹی بنائی جائے اور یہ محکمہ اس کے ماتحت قرار دیا جائے پروفیسر اے' ال، باؤلے، اور ڈی، ایچ بنڈرسن نے آخر الذکر صورت تجویز کی تھی اور میرا بھی یہی خیال ہے کہ یہی صورت زیادہ

مناسب ہو گی ۔ معاشی کمیٹی کا صدر وزیر اعظم ہو اور ایک اور وزیر جن کا تعلق معاشی معاملات سے ہو گا۔ وہ صرف اسی محکمے کا ذمہ دار مقرر کیا جائے تاکہ اطمینان کے ساتھ تمام معاملات پر وہ سنجیدگی سے غور کرے جو اس محکمے کی طرف سے پیش کئے جائیں اور معاشی کمیٹی میں اس کی رائے کا وزن بھی ہو

صوبجات میں بھی اسی طریقہ پر معاشی محکمے قائم کئے جائیں جن کے مستقل دفتر اور عملہ بالکل علیحدہ ہو اور حسب ضرورت ماہرین فن معاشیات کی خدمات حاصل کی جائیں

اس محکمے کے مستقل ملازم کارکنان کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے لیکن دیگر غیر سرکاری ماہرین اور تجربہ کار لوگوں کے خیالات اور رائے بھی اور بالخصوص ان لوگوں کی رائے جن کا تعلق تجارتی کاروبار سے ہے۔ قابل وقعت سمجھا چاہئے ۔ اس لئے مرکز کی طرح صوبجات میں بھی مشاورتی کمیٹی مقرر کی جائیں ۔ گذشتہ دس سال کے اندر مختلف قسم کی معاشی کونسلیں اور کمیٹیاں دنیا کے مختلف ممالک میں قائم کی گئی ہیں لیکن ساخت کے لحاظ سے ان کی دو قسمیں قرار دی جاسکتی ہیں ۔ ایک تو وہ جس میں نمائندگی کا خیال رکھا گیا ہے ۔ دوسرے وہ جو حکومت سے نامزد کر دی ہیں فرانس اور جرمنی میں اول الذکر طرز کی کونسل قائم کی گئی ہیں ۔ برخلاف اس کے برطانیہ میں مشاورتی معاشی کونسل حکومت کی طرف سے نامزد کی جاتی ہے ۔ میرا یہ خیال ہے کہ ہندوستان میں برطانوی طرز کی کونسل زیادہ مفید اور قابل عمل ہو گی اس کونسل کو مرکزی و صوبجاتی محکمہ معاشیات کے افسروں کی رائے سے نامزد کرنا چاہئے ۔ سر آرتھر سالٹر کی رائے تھی کہ ہندوستان میں بھی فرانس کے طرز کی کونسل قائم کی جائیں ۔ مگر انھوں نے شاید یہ نظر انداز کر دیا کہ ہندوستان میں ابھی تک معاشی کاروبار کرنے والوں کی کوئی ایسی منظم جماعت موجود نہیں جس کی حقیقی نمائندگی کی جائے اور اگر نمائندگی کے اصول پر معاشی کونسل کی تشکیل کی جائے گی تو بعض صورتوں میں لیجسلیٹو کونسل کے انتخاب سے کم ہنگامہ آرائی نہ ہوا کرے گی ۔ اس لئے اصولاً نمائندگی کا طریقہ خواہ کسی قدر پسندیدہ ہو ۔ لیکن بحالت موجودہ مجھے تو ناقابل عمل نظر آتا ہے ۔ اس لئے میری تجویز ہے کہ مرکز میں نیز صوبجات میں مشاورتی

معاشی کونسل کے اراکین کا تقرر نامزدگی کے ذریعے ہوا کرے مرکزی کونسل میں ارکان کی تعداد بیس ہونا چاہیئے اور صوبجاتی معاشی کونسل میں پندرہ کی تعداد کافی ہے۔ وزیر معاشیات جو کابینہ کا بھی رکن ہوگا۔ اس کونسل کے صدر اور اس محکمے کا افسر اعلیٰ۔ کونسل کے سکریٹری کے فرائض انجام دے۔

یہ محکمہ کس قسم کے کام کرے گا؟

اگر یہ محکمہ معاشیات قائم ہوجائے تو کام کا محل حاکہ ہندوستان کی موجودہ معاشی حالت کو پیش نظر رکھ کر تیار کیا جائے گا۔ زیادہ تفصیل سے یہاں بحث کرنے کی ضرورت نہیں، سب جانتے ہیں کہ ہندوستان کی کثیر آبادی کا دارومدار زراعت پر ہے اور زراعت بھی بہت ہی قدیم طریقے کی۔ اس لئے اس محکمے کو سب سے پہلے اسی مسئلے کو لینا چاہیئے کہ اول زراعت کو زیادہ پیدا آور بنایا جائے اور پھر تنہا زراعت پر اتنی کثیر آبادی کی روزی کا دارومدار نہ رہے پہلی مشکل کا حل یہ ہے کہ کاشتکاروں کے طریقوں میں اصلاح کی جائے اور دوسری مشکل کا علاج یہ ہے کہ دیسی صنعتوں کو ترقی دی جائے جب تک زراعت کی اصلاح اور ترقی کا سوال ہے حسب ذیل امور توجہ طلب ہیں۔ اول آبپاشی کا مناسب انتظام، دوسرے بہتر قسم کے بیج اور پیداوار تیسرے اچھی کھاد اور عمدہ نسل کے مویشی، زراعت کے محکمے بہت کچھ کام اس سلسلے میں کر رہے ہیں لیکن اس سے بہت زیادہ کرنے کی ابھی ضرورت ہے۔ نیز یہ بات بھی تحقیق کرلی چاہیئے کہ ملک کے مختلف علاقوں میں ایک کھیت کا رقبہ کاشت کم از کم کیا ہونا چاہیئے تاکہ جو وقت اور محنت اس وقت بہت چھوٹے چھوٹے کھیت کے ٹکڑوں پر ضائع ہوجاتی ہے وہ کام آجائے

زرعی آبادی میں جو اضافہ روز بروز ہوتا جاتا ہے اس کو روکنے کے لئے ملکی صنعتوں کو ترقی دینے کی ضرورت ہے اور یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ صرف موجودہ ضرورت کے لئے مصنوعات فراہم کر دینا کافی نہیں اور اس سے کام نہیں چلے گا۔ ضرورت ہے کہ مصنوعات کی طلب میں بھی اضافہ

کیا جائے ۔ زرعی پیداوار کی طلب کے مقابلے میں مصنوعات کی طلب زیادہ تغیر پذیر ہوتی ہے کہ اگرچہ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ آبادی کا بہت بڑا حصہ پیٹ بھر کر کھانے سے بھی محروم ہے اور اس لئے ابھی غلے کی طلب میں اضافے کی بہت گنجائش ہے ۔ پھر بھی مصنوعات کے مقابلے میں زرعی مال کی طلب محدود ہی ہوتی ہے ۔ اور مصنوعات کی طلب میں اضافے کی کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی ۔ معیارِ زندگی جتنا بلند ہوتا جائے گا اسی قدر مصنوعات کی طلب میں اضافہ ہوتا جائے گا ۔ اس لئے ملک کی مجموعی قومی آمدنی میں حقیقی اضافے کی توقع صرف صنعتی ترقی سے ہو سکتی ہے ۔

لیکن جب کبھی صنعتی ترقی کا ذکر کیا جاتا ہے تو بالعموم اس کا مطلب بڑے پیمانے کی صنعتوں سے ہوتا ہے ۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں ، چھوٹی چھوٹی صنعتوں کی اور بالخصوص ان صنعتوں کی تنظیم زیادہ ضروری ہے ۔ جن کا تعلق زراعت سے ہے ۔ ان صنعتی ممالک میں جہاں بڑے پیمانے کی صنعتوں کا زیادہ رواج ہے ۔ گھریلو صنعتوں کو بھی ساتھ ساتھ ترقی دی گئی ہے اور ہندوستان کے مخصوص معاشی حالات میں گھریلو صنعتوں کی اہمیت دیگر ممالک کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے ۔

زراعت اور صنعت و حرفت کے وسائل کی تنظیم تو خیر ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہے لیکن اس کے علاوہ اور بھی چند باتیں توجہ طلب ہیں ۔ مثلاً بجلی کی قوت سے کما حقہٗ فائدہ اٹھانا ذرائع نقل حمل کو اور زیادہ ترقی دینا ۔ زراعت اور صنعت و حرفت کے لئے سرمائے کی فراہمی اور مصنوعات فروخت کرنے کے لئے منڈیوں کی تنظیم وغیرہ ۔ انیسویں صدی میں جو غیر معمولی معاشی ترقی بعض ممالک نے حاصل کی وہ بھاپ کی قوت استعمال کرنے کی بدولت تھی ۔ لیکن آج کل بجلی کی قوت بھاپ کی جگہ لیتی جا رہی ہے اور اس طرح ایک جدید دورِ انقلاب شروع ہو گیا ہے کوئلے کی بجائے بجلی اور پٹرولیم کا استعمال روز بروز بڑھتا جا رہا ہے ۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں بجلی کی قوت سے کام لینا زیادہ مفید اور ارزاں ہوگا اس لئے کہ کوئلہ ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانے میں مصارف باربرداری بہت زیادہ ہو جاتے ہیں ۔ چنانچہ ضرورت

ہے کہ بجلی کے چشمے جو انہے میسر آئیں سب سے فائدہ اٹھایا جائے اور کام لیا جائے اس کے علاوہ کوئلہ سے پٹرولیم تیار کرنے کے انتظامات بھی تجارتی نقطہ نظر سے تحقیق طلب ہیں انگلستان میں تو کوئلہ سے پٹرول نکالنے کا تجربہ کامیاب ثابت ہو چکا ہے اور اب اس سے تجارتی فائدہ بھی اُٹھایا جا رہا ہے۔ ہندوستان میں بھی کوئلہ کافی مقدار میں موجود ہے اسلئے اگر کوئلہ سے پٹرولیم تیار کرنے کی تدابیر تجارتی حیثیت سے مفید ہوں تو جہاں بجلی نہ پہنچ سکے اس کی جگہ پٹرولیم سے کام لیا جا سکتا ہے

ہندوستان میں ذرائع آمد و رفت یعنی ریل اور سڑکیں خاصی ترقی یافتہ حالت میں اس وقت بھی ہیں لیکن اس ضرورت ہے کہ موٹروں کی آمد و رفت کے لئے چھوٹی چھوٹی سڑکوں کو اور زیادہ پھیلایا جائے تھوڑے فاصلوں کو طے کرنے کیلئے ان علاقوں میں جہاں مسافروں کی آمد و رفت زیادہ نہیں ہر ریل کے مقابلے میں موٹر کا سفر کم خرچ ہوگا اسلئے موٹروں کے ذریعے نقل و حمل کو اس صورت سے ترقی دینے کی ضرورت ہے کہ ریلوں سے مقابلے کی بجائے موٹریں ریلوں کی معاون بن جائیں اور ان علاقوں سے ریل کا تعلق پیدا کر دیں جہاں سے ریل نہیں گذرتی

جہاں تک ملک کے بنکوں اور ساہوکاروں کا تعلق ہے موجودہ حالت بہت زیادہ ناقابل اطمینان ہے اور اس کی از سر نو تنظیم کی ضرورت ہے سب سے بڑا نقص تو یہ ہو کہ صنعتی کاروبار کے لئے سرمایہ حاصل کرنے کا کوئی معقول انتظام موجود نہیں اس لئے پہلے تو اس قسم کے بنکوں کی شدید ضرورت ہو جو صنعتی کاروبار کے لئے سرمایہ فراہم کر سکیں حال ہی میں صوبجات متحدہ میں صنعتی مالیات کی ایک کمیٹی نے صنعتی بنک قائم کرنے کی تجویز کی ہے۔ مجموعی حیثیت سے یہ تجویز معقول ہے لیکن مجھے کمیٹی کی اس رائے سے اتفاق نہیں کہ کل پچیس لاکھ کے سرمایے سے ایک بنک قائم کیا جائے اس لئے کہ اس وقت بھی صوبہ متحدہ کے نئے بڑے صنعتی کارخانوں میں ۸ کروڑ سے زیادہ سرمایہ لگا ہوا ہو ظاہر ہے کہ اس قدر چھوٹے سرمائے کے بنک سے پورے صوبے کے صنعتی کاروبار کو اگر کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہو تو بہت ہی قلیل ہوگا ضرورت ہے کہ اور زیادہ وسیع پیمانے پر صنعتی بنک ہر ہر صوبے میں قائم کئے جائیں اور ان کا رشتہ ملک کے مرکزی ساہوکاروں سے ضرور قائم کر دیا جائے۔

یوں تو ہر قسم کے مصنوعات کے لئے منڈی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن بڑے پیمانے پر جو کارخانے قائم کئے گئے ہیں وہ اپنے مال کی نکاسی کے لئے کچھ نہ کچھ انتظام کر ہی لیتے ہیں۔ البتہ

چھوٹی چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کے لئے منڈی تیار کرنے کی خاص ضرورت ہے۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ جب تک حکومت چھوٹی چھوٹی صنعتوں کے لئے منڈی تیار کرنے کی کوشش کرے گی ان صنعتوں کا احیا مشکل ہے۔

معاوضے کے کاموں کو وسیع پیمانے پر شروع کرنے کا مناسب اور موزوں ترین وقت میرے نزدیک یہی ہے اس لئے کہ اس وقت حکومت صرف ۳ فی صدی کی شرح سود پر جتنا چاہے قرض لے کر ان تعمیری کاموں میں لگا سکتی ہے۔ اتنی کم شرح سود پر اس صدی کے آغاز سے اس وقت تک کبھی روپیہ نہیں مل سکتا تھا۔ اس لئے محکمہ معاشیات کے لئے یہ موقع ہے کہ بلا کسی لیس و پیش کے اگر وہ چاہے تو بڑی سے بڑی اسکیموں کا آغاز کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ معاشی اور کاروباری نقطۂ نظر سے بھی اس کی تجاویز صحیح اور مفید ہوں

معاشی امور کے علاوہ محکمہ معاشیات کو بعض دیگر تمدنی اصلاحات کی طرف بھی توجہ کرنا ہوگی۔ مثلاً تعلیم، حفظان صحت، اور طبی امداد، اس کے علاوہ ایک چیز اور ہے۔ جس کو ہمیشہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور وہ سکونتی مکانوں کا معاملہ ہے، جس پر میرے نزدیک معیار زندگی بلند کرنے کا دار و مدار ہے۔

نظام تعلیم کی اصلاح

تعلیم یافتہ طبقے کی بے روزگاری کا بہت گہرا تعلق مروجہ نظام تعلیم سے بھی ہے ہمارے نظام تعلیم کا سب سے بڑا نقص ۔ اس کے بندھے ٹکے اصول ہیں جن میں ضرورت کے لحاظ سے تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ ایک اچھے نظام تعلیم کی خصوصیت یہ ہونا چاہئے کہ نوجوانوں کو آئندہ زندگی کی ضرورت کے لئے پوری طرح تیار کر دے اور چونکہ زندگی کی ضروریات مختلف ہوتی ہیں اس لئے تعلیم میں بھی تنوع ہونا چاہئے۔ مگر ہندوستان کے نظام تعلیم میں یہ بات بالکل مفقود ہے۔ ہمارے ملک میں صرف ایک ہی طرح کے مدارس ہیں ایک ہی نصاب تعلیم ہے اور سب

کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد ہر لڑکا یونیورسٹی میں جاتا ہے اور کوئی دوسری راہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس لئے سب سے پہلے تو اس نقص کو دور کرنا چاہیئے اور اسکول ہی میں مختلف حرفوں اور فنوں کی تعلیم کا انتظام کر دینا چاہیئے۔ تاکہ اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد لڑکے کسی کاروبار میں لگ سکیں۔

اسکول کی مدت تعلیم کے مدارج دوبارہ مقرر کرنے پر حکومت صوبہ متحدہ نے اپنی ایک قرارداد میں زیادہ زور دیا ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ بات اتنی زیادہ اہم نہیں ہے جتنی یہ کہ اسکول کی تعلیم کے مقاصد میں تبدیلی پیدا کی جائے۔ ثانوی تعلیم کا یہ مقصد ہرگز نہ ہونا چاہیئے کہ انٹرنس پاس کرنے کے بعد طلباء یونیورسٹیوں میں داخل ہو جائیں۔ اسکول کی تعلیم خود کافی بالذات ہونا چاہیئے اور یہ اسی طرح ممکن العمل ہے کہ یونیورسٹیوں کے داخلے کے لئے علیحدہ ایک امتحان مقرر کیا جائے اور اسکول کے نظام تعلیم سے اس کا کوئی واسطہ نہ ہو۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ تمام ثانوی مدارس حرفہ ہی کی تعلیم کے لئے مخصوص کر دیئے جائیں بلکہ میری رائے یہ ہے کہ حرفہ کی تعلیم عام تعلیم سے علیحدہ ہونا چاہیئے ایک ہی مدرسے میں عام تعلیم کے ساتھ حرفہ کی تعلیم کا جہاں کہیں انتظام کیا گیا ہے کامیاب نتائج نہیں نکلے ہیں۔

عام تعلیم کے نصاب میں بھی اصلاح کی بہت ضرورت ہے تاکہ انٹرنس پاس کرنے کے بعد طالب علم کسی پیشہ کے لائق بن جائے۔ اس وقت مدرسے کے نصاب میں خالص علمی اور ادبی رنگ اتنا زیادہ غالب ہے کہ انٹرنس پاس کرنے کے بعد سوائے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے اور کوئی دوسرا کام طالب علم نہیں کر سکتا۔ اس لئے اگر شروع ہی سے طلباء میں ایسی صلاحیتیں اور ذوق پیدا کرنے کا خیال رکھا جائے کہ طلباء انٹرنس کے بعد کسی تجارت میں یا کسی اور کاروبار میں لگ جائیں تو بہتر ہے۔ ہمارے نظام تعلیم میں دوسرا نقص یہ ہے کہ عام تعلیم اور حرفتی تعلیم کا ایک دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، حرفتی تعلیم کا انتظام محکمہ صنعت و حرفت کے سپرد ہے اور زرعی تعلیم محکمہ زراعت سے متعلق ہے۔ اگر مختلف قسم کے حرفہ اور زراعت

کے ادارے زیادہ تعداد میں قائم کئے گئے اور کسی ایک نظام میں نہ لائے گئے تو پھر نظام تعلیم کے مختلف شعبوں میں کوئی ہم آہنگی پیدا نہ ہو سکے گی۔

اس سلسلے میں یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ تعلیم کے عمدہ نتائج خواہ یہ تعلیم حرفی کی ہو خواہ محض ادبی تعلیم، نظام تعلیم کے بہتر ہونے نہ ہونے پر اس کا اتنا زیادہ انحصار نہیں جتنا کہ اسکول کے اندر کام کرنے والوں پر اور عام ماحول پر، اس لئے نصاب تعلیم طریق تعلیم، اساتذہ کی تعلیم اور ان کی اخلاقی حالت کے مسائل اس سلسلے میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ مگر میں اس وقت ان مسائل پر بحث نہیں کروں گا صرف اشارہ کر دینا کافی ہے۔ تاکہ جو لوگ اس مسئلے کی تحقیق کرنا چاہیں وہ اس اہم پہلو کو نظر انداز نہ کر دیں

جہاں تک یونیورسٹی کی تعلیم کا تعلق ہے میری یہ قطعی رائے ہے کہ ایسے طلبہ کے داخلے کو بالکل روک دینا چاہئے۔ جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی قابلیت اور اہلیت نہ رکھتے ہوں۔ اس وقت جس کو دیکھئے خواہ اس میں کوئی صلاحیت ہو یا نہ ہو یونیورسٹی میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیاں بجائے اس کے کہ پڑھے لکھے اعلیٰ قابلیت کے گریجوٹ پیدا کریں ایسے آدمی تیار کر رہی ہیں جو گریجوٹ تیار ہونے کے بعد بھی کلرکی کے لئے در بدر مارے مارے اور ہر دفتر کے دروازے پر دستک دیتے پھرتے ہیں۔ یونیورسٹی کی تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ایسے لوگ تیار کئے جائیں جو علم و فن کو ترقی دیں اور مفکرین اور محققین کی حیثیت سے رہنمائی کریں، یونیورسٹی کی کامیابی کا معیار طلبہ کی تعداد کو نہ سمجھنا چاہئے۔ بلکہ دیکھنا یہ چاہئے کہ جو لوگ تعلیم حاصل کر کے نکلے وہ کس قابلیت کے ہیں۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ یونیورسٹی کی تعلیم کا معیار اتنا بلند کر دینا چاہئے کہ کوئی شخص جو غیر معمولی قابلیت نہ رکھتا ہو آسانی سے یونیورسٹی میں داخلے کا خیال نہ کرے۔ اور بالعموم طلبہ اسکول کی تعلیم کے بعد کسی حرفے یا پیشہ کی تعلیم میں لگ جائیں۔

ایک غلط فہمی جو بالعموم پھیلتی جارہی ہے اس کا ازالہ بھی ضروری ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ آج کل نظام تعلیم کی اصلاح کی جو تجاویز پیش کی جارہی ہیں ان میں صنعت و حرفت اور تجارت

کی تعلیم پر اتنا زیادہ زور دیا جاتا ہے کہ اس کے مقابلے میں گویا ادبی تعلیم کی کوئی اہمیت ہی نہیں اور افادیت ہے کہ صنعت و حرفت کی تعلیم کے حامی اپنے جوش میں ادبی تعلیم کی ضرورت اور اہمیت کو کہیں بالکل نظر انداز نہ کردیں۔ اگر ایسا ہوا تو یہ صورت بھی اسی قدر افسوسناک ہوگی، جتنا کہ صنعت و حرفت کی تعلیم کو نظر انداز کرنا۔ اس لئے کہ حقیقی قومی ترقی اس وقت تک بالکل نہیں ہوتی جب تک افراد قوم خواہ وہ زندگی کے کسی شعبے میں کام کر رہے ہوں۔ قومی تمدن، قومی اخلاق اور قومی روایات کے حامل نہ ہوں۔ یہ خصوصیات صرف تمدنی اور ادبی تعلیم ہی کے ذریعے حاصل کی جاسکتی ہے۔ آج کل ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں خود اعتمادی، کام کرنے کی اُپج اور حوصلہ بالکل نہیں ہوتا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان کی صنعتی اور تجارتی پستی کی اصل وجہ یہ ہے کہ کافی سرمایہ دستیاب نہیں ہوسکتا۔ یا ماہر کاریگر موجود نہیں اور حکومت سرپرستی نہیں کرتی۔ لیکن میرے نزدیک ان سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے نوجوانوں میں اپنے بل بوتے پر کام کرنے کی 'اُپج' حوصلہ اور ہمت ہی باقی نہیں رہی ہے۔ ہماری تمدنی اور ادبی تعلیم کا یہ کام ہونا چاہیے کہ ہمارے نوجوانوں میں اس قسم کی خصوصیات پیدا کی جائیں اور جب تک یہ نہیں کیا جائے گا زندگی کے کسی شعبے میں خواہ تجارت ہو، یا صنعت و حرفت، نہ تو رہنمائی پیدا کرنے والے نوجوان پیدا ہوں گے اور نہ ملک کی ترقی کی کوئی امید کی جاسکتی ہے۔

ان مسائل پر جب میں غور کرتا ہوں تو مجھے سانٹ اینڈریوز یونیورسٹی کے رکٹروں کے دو خطبے یاد آجاتے ہیں۔ بیری کا خطبہ "حوصلہ اور ہمت" پر، اور نان سین کا خطبہ (اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنے کے جذبہ) پر صرف یہ کافی نہیں ہے کہ ہمارے نوجوانوں میں جسمانی طاقت اور وہ ہمت پیدا کی جائے جس سے کرۂ ہوائی مسخر کیا جائے۔ اور قطبین تک ہماری فتوحات پہنچ جائیں۔ بلکہ خیال اور ذہن کی دنیا میں بھی ہمت اور حوصلے سے کام لے سکیں۔ اس لئے کہ یہ خیال ہی کی قوت ہے جس سے زندگی کا کارخانہ چل رہا ہے

جدید تحقیق اور ہندوستان کا مسئلہ آبادی

(بسلسلہ گذشتہ)

ہندوستان کی جدید مردم شماری یوں تو ۲۸ ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی ہے جن کی مجموعی تعداد صفحات ۲۰ ہزار سے زائد ہے مگر ان میں اہم ترین صفحات وہ ہیں جن میں ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کے خطرات سے آگاہ کیا گیا ہے ہندوستان کی آبادی جس کی تعداد ۱۹۲۱ء میں ۳۲ کروڑ تھی ۱۹۳۱ء میں یعنی صرف ۱۰ سال کے قلیل عرصے میں ۳۵ کروڑ کی حد کو تجاوز کر چکی اندازہ کیا جاتا ہے کہ اب تک ۴۰ کروڑ کی حد تک پہنچ چکی ہوگی اس تیز رفتار اضافہ آبادی کی اہم ترین وجہ وہ امن و امان ہے جو برطانوی تسلط کی وجہ سے ہندوستان کو حاصل ہے وہ بین الاقوامی لڑائیاں جو انگریزوں کی آمد آمد تک ہوا کرتی تھیں مفقود ہو گئیں اور جو لاکھوں افراد لوٹ اور غارت گری میں تہ تیغ کر دئے جاتے تھے شمشیروں سے محفوظ ہیں۔ ساتھ ہی ہماری معاشرتی رسوم و رواج میں جو مغربی اثرات اور سیاسی قوانین کی مجبوری سے تبدیلیاں ہو رہی ہیں ان سے بھی آبادی کی رفتار تیز تر ہو رہی ہے بچپن کی شادی ستی اور طفل کشی تو قانوناً ممنوع ہیں۔ مگر بیواؤں کی دوبارہ شادی کی رسم اب عام ہوتی جا رہی ہے۔ پرانے زمانے کی مہیب یادگاریں اب صرف دو رہ گئی ہیں جن کی وجہ سے آبادی ملک سرعت سے نہیں بڑھ رہی ہے یعنی قحط اور وبائیں۔ قحطوں اور وباؤں کی وجہ سے لاکھوں نفوس بے وقت موت کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ آبادی کو تیز رفتار سے بڑھنے نہیں دیتے مگر ان کا وجود ہر ملک و مذہب کے لئے، ہر تہذیب و تمدن کے لئے ایک بدنما داغ اور انسان کے لئے جو خود کو اشرف المخلوقات سمجھتا ہے ایک شرمناک اور عبرت انگیز واقعہ ہے۔ ہندوستانی قحطوں اور وباؤں کی طولانی داستان عقل انسانی کے لئے عبرت ناک اور حساس دلوں کے لئے ناقابل برداشت قصہ ہے، بمقابلہ عہد قدیم و قرون وسطیٰ کے نہ صرف قحطوں کی شدت و وسعت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ بلکہ وبائیں

بھی بہت زیادہ پھیل رہی ہیں باایں ہمہ آبادی بڑھتی جارہی ہے۔

مثل تمام افلاس زدہ اور غیر تعلیم یافتہ ممالک کے ہندوستان میں بھی شرح پیدائش اور شرح اموات زیادہ ہیں[۵] انگلستان میں فی ہزار نفوس سالانہ ۲۲ بچے پیدا ہوتے ہیں اور ۱۳ افراد مرتے ہیں لہٰذا انگلستان کی شرح بقا دس فی ہزار سالانہ ہے۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں فی ہزار نفوس سالانہ ۴۵ بچے پیدا ہوتے ہیں مگر ۳۵ مرتے ہیں جس کی وجہ سے ہندوستان کی شرح بقا صرف دس فی ہزار سالانہ رہ جاتی ہے مگر چونکہ آبادی ۳۵ کروڑ پر مشتمل ہے لہٰذا سالانہ ۳۵ لاکھ اشخاص کا اضافہ ہو رہا ہے اور اس کا بار زیادہ تر زراعت اور کماؤ پوتوں پر پڑ رہا ہے۔

زراعت کے متعلق تو ہم سب جانتے ہیں کہ یہ ہندوستان کا اہم ترین ذریعہ معاش ہے جس پر آبادی کے تقریباً ۷ فی صدی اشخاص کا دار و مدار ہے۔ ہم سے یہ حقیقت بھی مخفی نہیں کہ زراعت پر آبادی کا بار سال بہ سال بجائے کم ہونے کے بتدریج بڑھ رہا ہے جس کی اصلی وجہ صنعتی تنزل اور تجارت کی سست ترین رفتار ترقی ہے صنعتی تنزل اور تجارت کی سست رفتاری کی وجہ جیسا کہ ہم میں سے اکثر کو معلوم ہے حکومت اور معاشرت کی غفلت و لاپرواہی ہے کاروبار کی سرپرستی حکومت و معاشرت کی طرف سے ٹھیک ٹھیک کی جاتی ہے۔ بجز معدودے چند فنی تعلیم گاہیں عنقا ہیں اور

---

* It is well known that the tendency to [۵] multiplication is greatest where men have no stake in existence, where they have no prospect of improving their condition. Poverty accentuates the process of multiplication, multiplication intensifies poverty." Prof P A Wadia and G N Joshi "The Wealth of India" Macmillan, London 1925, p 74

اسی طرح تجارتی اور پیشہ وری تعلیم کا انتظام انتہائی طور پر غیر تشفی بخش ہے۔ اس تصویر کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ ملک میں کاروبار چلانے والے، معتبر، محنت پسند اور حوصلہ مند اشخاص کی تعداد بہت ناکافی ہے۔ آخر دوں کو قومی ضروریات اور جدت پسند زمانے کے رجحانات سے ناواقفیت ہے تجدد کا حوصلہ تو در کنار تقلید کا مادہ بھی نہیں چنانچہ ہماری بیشتر صنعتیں یورپ و امریکہ کی صنعتوں سے کم از کم نصف صدی پیچھے ہیں۔ ندامت سے اقرار و اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ وہ صنعت بھی جسے علم و ادب سے سب سے گہرا تعلق ہے یعنی طباعت و اشاعت زبوں حالت میں ہے۔ دیسی زبانوں میں شائع ہونے والی کتابوں کا ذکر نہیں ہندوستان میں چھپی ہوئی انگریزی کتابوں ہی کو دیکھئے آپ فوراً امریکی اور یورپی صنعت کی بلندی اور ہندوستانی طباعت کی پستی کو محسوس کریں گے جو حال طباعت و اشاعت کا ہے اس سے بدتر عالم جمود و سکون میں ہندوستانیوں کی اکثر صنعتیں، کارخانے، تجارت گاہیں اور کاروبار ہیں۔

ان حالات کے تحت یہ کس طرح ممکن ہے کہ ذرائع معاش میں اضافہ ہو سکے؟ یا یہ کہ ہندوستانیوں کو خدمات کے مواقع زیادہ ملیں اور زیادہ تعداد میں نوکریاں ہندوستانیوں کے لئے مختص کی جائیں دنیا میں بغیر محنت و مشقت کے، بغیر ایثار و قربانی کے، بغیر جدوجہد کے بغیر کوشش و مستقل مزاجی کے اور بغیر محنت و اقبال کے کسی کو ثمر نہیں ملتا۔ بخت و اقبال پر ہمارا زور نہیں، مگر کیا محنت و مشقت کو، ایثار و قربانی کو، کوشش و مستقل مزاجی کو ہم اپنا مطیع نہیں کر سکتے؟ بہر طور حکومت کی مصلحتوں اور قوم کی کوتاہیوں کی وجہ سے آج ہندوستان کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ ذرائع معاش کی رفتار اضافہ نہایت سست اور آبادی میں اضافے کی رفتار نہایت تیز ہے۔ آپ کو سن کر سخت حیرت ہوگی کہ جدید مردم شماری کی روئداد کے مطابق ہندوستان میں ان لوگوں کی تعداد جو کسی نہ کسی طرح بھلے برے طور پر کماتے ہیں صرف ۱۰ کروڑ ۸۸ لاکھ ہے[۱] حالانکہ ہندوستان میں ۱۵ تا ۵۵ عمر کے افراد کی تعداد

---

۱ دیکھیے Statistical Abstract for British India from 1922-23 to 1931-32 سرکاری اشاعت مطبوعہ دہلی ۱۹۳۴ء صفحہ ۸

۲ ان برسر روزگار افراد کی تعداد میں ان "پیشہ وروں" کا بھی لحاظ کیا جا سکتا ہے جو ذرائع معاش غیر پیداآور ہیں چنانچہ سرکاری اصطلاح کے بموجب یہ Unproductive Means of occupation ہیں ان لوگوں کی تعداد جو غیر پیداآور "خدمت" انجام دینے کے باوجود کمانے والوں میں شمار کئے جاتے ہیں ½ ۱۷ لاکھ ہے۔

۱۸ کروڑ ۸۰ لاکھ ہے[۵۴]۔ بالفاظ دیگر اگر ہم ۱۵ برس سے کم اور ۵۵ سے زیادہ عمر والے افراد کی تعداد اس خیال سے منہا کر دیں کہ وہ پیدائش دولت میں حصہ نہیں لیتے۔ تب یہ تلخ حقیقت ایک ڈراؤنی شکل میں نمودار ہوتی ہے کہ ہندوستان میں ان لوگوں کی تعداد جو بے روزگار ہیں ۱ کروڑ ۹۰ لاکھ ہے ان ۱ کروڑ ۹۰ لاکھ بے روزگاروں کا بار کمانے والوں پر پڑ رہا ہے اور آپ کو ہندوستان کے گوشے گوشے میں ایسے لوگ نظر آئیں گے جو دس دس بارہ بارہ کو پال رہے ہیں اور اس بوجھ سے خود پسپا ہوتے جا رہے ہیں ان ایک کروڑ ۹۰ لاکھ بے روزگاروں کے جم غفیر میں ۵ ہزار سے زیادہ وہ لوگ ہیں جو ہماری اور آپ کی طرح ڈگری یافتہ ہیں۔ کوئی بی اے ہے، کوئی ایل ایل بی ہے۔ کوئی ایم اے ہے، کوئی ایم ایس سی ہے کوئی ایم ڈی ہے مگر باوجود ان ڈگریوں کے بے روزگار ہیں[۵۵] اور ان ۵ ہزار میں ۳۰ برطانوی یونیورسٹیوں کے اعلیٰ ڈگری یافتہ ہیں جنھیں کہیں کوئی خدمت نہیں ملتی۔

یہ ہے ہندوستان کی عظیم بے روزگاری اور قلت معاش کا حال۔ اسی بے روزگاری اور قلت معاش کی وجہ سے قومی صحت ناگفتہ بہ حالت میں ہے۔ بیماری کی شدت و کثرت ہے۔ وبائیں آئے دن پھیلتی رہتی ہیں عام شرح اموات زیادہ اور بچوں کی شرح اموات زیادہ تر ہے جس کثرت سے ہندوستان میں شیر خوار معصوم بچے مرتے ہیں اس کا اندازہ آپ کو ان اعداد سے ہوگا کہ سالانہ جو بچے پیدا ہوتے ہیں ان میں ۵ سال کے اندر ہی فی لاکھ اطفال میں ۵۰ ہزار موت کا شکار ہوتے ہیں۔

اس طرح سالانہ بھارت ماتا نصف کروڑ شیر خوار معصوم اور بھولے بھالے صغیر سن بچوں کو

---

۵۴ ملاحظہ ہو "Statistical Abstract" from 1922-23 to 1931-32 مطبوعہ دہلی ۱۹۳۳ء صفحہ ۲۵

۵۵ ایک موقر اخباری اطلاع کے بموجب مگر حیرت ہے کہ ہٹن صاحب نے ڈگری یافتہ بے روزگاروں کی تعداد ۲½ ہزار سے کم یعنی صرف ۲۲۲۲ بتائی ہے۔ سرکاری اعداد و شمار میں شبہ کرنا کفر ہے مگر مسٹر رائس سے سرکاری اعداد صحیح نہیں معلوم ہوتے ہٹن صاحب نے یہ اعداد Census of India کی رپورٹ ۱۹۳۱ء جلد اول صفحہ ۳۲ پر دیے ہیں۔

ملک الموت کے سپرد کرتی ہے۔ اس تلخ داستان کے سلسلۂ ناختتامی کا خاتمہ صرف اس ملنے طور پر ہی کیا جا سکتا ہے اور اب صرف اس سوال کا جواب دینا باقی رہ جاتا ہے کہ ان حالات کے تحت مسئلۂ آبادی کو کیوں کر حل کیا جا سکتا ہے۔

مسئلہ آبادی کی تحلیل

گذشتہ صفحات میں ہم نے اس امر کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ موجودہ زمانے میں مسئلۂ آبادی کا دار و مدار مقدار دولت پر نہیں رہا بلکہ اس کا تعلق ذرائع معاش سے ہو گیا ہے کیونکہ اس میکانکی عہد میں پیدائش دولت بہت زیادہ آسان ہو گئی ہے اور اس کثیر مقدار دولت کو پیدا کرنے کے لئے نسبتاً ومقابلتہً بہت کم اشخاص کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم نے نظریہ موافق توازن آبادی کے بیان سے اس امر کو بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر ملک و ہر زمانے میں موجودہ حالات سیاسی و معاشرتی کے مدنظر ملک میں صرف ایک خاص تعداد آبادی ہی کو انسانوں کے شایان شان معقول معیار آرام پر پالنے کی صلاحیت رہتی ہے۔ نیز ہم نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ آج اکثر ممالک میں اضافی کثرت آبادی پائی جاتی ہے۔ اس تحقیق کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یہ بیان کرتے ہیں کہ مسئلۂ آبادی کو کیوں کر حل کیا جا سکتا ہے۔

تحلیل مسئلۂ آبادی کی صرف دو صورتیں ممکن ہیں ایک تو یہ کہ جس رفتار سے آبادی میں اضافہ ہو رہا ہو اسی رفتار سے ذرائع معاش فراہم کئے جائیں تاکہ کوئی شخص جو محنت کا متلاشی ہو۔ روزی نہ ملنے کی وجہ سے ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے۔ اگر کسی وجہ سے یہ ناممکن ہو کہ جس رفتار سے آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے اسی رفتار سے ذرائع معاش میں بھی اضافہ کیا جائے تو پھر مسئلۂ آبادی کو حل کرنے کی دوسری صورت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ آبادی کی رفتار کو کم کیا جائے۔ ذرائع معاش کی رفتار اور اضافہ آبادی کی رفتار میں تناسب اور موافق توازن قائم رہنا چاہئے ورنہ بہت زیادہ عرصے تک یہ عدم تناسب قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ قوانین قدرت کا اٹل دستور ہے کہ بنی نوع انسان کو موقع دیا جائے کہ وہ خوشحالی سے، محبت و شفقت سے، باہمی رواداری و باہمی اختلاط سے، یک جہتی اور باہمی امداد

سے ، آبادی کے مسئلے کو حل کرے اور صرف اسی صورت میں مداخلت کرے جب کہ انسانی مخلوق اس اہم ترین مسئلہ کی تحلیل سے بے فکر ہو جائے مثل جانوروں کے اپنی پود بڑھاتی رہے اور اس بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے ذرائع معاش فراہم نہ کرے جب اس ابدی جہالت اور گمراہی میں قومیں زندگی بسر کرتی ہیں تو قدرت کچھ دنوں صبر و تحمل سے کام لے کر انسانوں کو متعدد مواقع دیتی ہے کہ وہ اپنی غلطیوں کو محسوس کریں ۔ ان غلط کاریوں سے باز آئیں اور گذشتہ بد اعمالیوں کی تلافی کریں مگر جب ان پر بھی انسان جہالت اور گمراہی میں مبتلا رہتا ہے تو مجبوراً قدرت کو مداخلت کرنی پڑتی ہے اور وہ اپنی مرضی کے مطابق اس مسئلے کو حل کر دیتی ہے[۵۱] ۔ بھونچال طوفان ، آندھیاں اور زلزلے اگر ہزاروں کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیتے ہیں تو خوفناک بین الاقوامی لڑائیاں اور بھیانک جنگیں لاکھوں کو فنا کر دیتی ہیں اس پر بھی جو زائد آبادی بچ رہتی ہے وہ قحطوں اور بالخصوص وباؤں کے ذریعے کروڑوں کی تعداد میں ملک عدم پہنچائی جاتی ہے ۔ بے شمار مرتبہ انسان کو ان غلط کاریوں کا خمیازہ بھگتنا پڑا ۔ اور بے شمار ایسے اجتماعی گناہوں کا کفارہ انسانوں کو اپنی روحانی راحت اور اپنی جسمانی حیات سے ادا کرنا پڑا ۔ متعدد مرتبہ نوع انسان کو یہ تلخ تجربہ ہوا کہ قدرت کا انتقام نہ صرف بے رحمانہ ، جابرانہ اور ظالمانہ ہوتا ہے

---

[۵۱] "The practical question for the mass of mankind is not whether the population shall be kept down or not, but whether the population shall be kept down by preventing the conception of children or by bringing them into the world and then slaughtering them abortion, exposure, starvation, neglect, illusage, plague, pestilence and famine battle, murder and sudden death" Bernard Shaw "The Intelligent Women's Guide to Socialism and Capitalism" Constable London, 1928, p 89

بلکہ یہ بھی کہ جب وہ انتقام پر آتی ہے تو اچھے برے میں، نیک و بد میں، عاقل و جاہل میں امیر و غریب میں تفریق و امتیاز نہیں کرتی۔ انسان کو پے در پے یہ تلخ تجربے ہوئے مگر اس کے باوجود آج بھی وہ اجتماعی طور پر اسی قدر جاہل اور گمراہ ہے جس طرح آج سے صدیوں قبل وہ جہالت و گمراہی میں مبتلا تھا۔

تمام علوم عمرانی اس بات پر متفق ہیں کہ ترقی کے صحیح معنی یہی ہیں کہ ہر نسل کا معیار آرام و معیار زندگی گذشتہ نسل کے معیار زندگی اور معیار آرام سے بلند تر ہو۔ ترقی کا مفہوم چاہے کچھ ہو یہ لازمی ہے کہ آئندہ آنے والی نسلوں کا معیار زندگی موجودہ نسل کے معیار زندگی سے بہتر و بلند تر ہو۔ یہ ایک قطعی فیصلہ ہے جس میں شک و شبہہ کی کوئی گنجائش نہیں اسی طرح تمام موقر معاشیین و عمرانیین اس امر پر متفق ہیں کہ معیار زندگی کے ساتھ ساتھ معیار آرام کا بلند تر ہونا بھی لابدی اور ضروری ہے اس بات سے بھی تمام علماء معاشیات و عمرانیات متفق ہیں کہ معیار آرام کو بلند تر کرنے کے لئے پیدائش دولت سے اہم تر تقسیم دولت میں منصفانہ طریق اور مساوات قائم کرنا ضروری ہے یعنی یہ کہ جب تک پیدائش دولت کی افزونی کے ساتھ ساتھ تقسیم دولت میں مساوات اور انصاف کا زیادہ لحاظ نہ رکھا جائے قوم کا معیار آرام بلند تر ہونا ناممکن ہے۔ ہمیں اس تحقیق کے مدنظر ہندوستان کے مسئلہ آبادی پر غور کرنا چاہئے لہذا ہندوستان کے مسئلہ آبادی کا لب لباب یہ ہے کہ کیا جس رفتار سے ہندوستان کی آبادی بڑھ رہی ہے اسی رفتار سے ذرائع معاش میں بھی اضافہ ہو رہا ہے؟ اور کیا ملک کے موجودہ ذرائع معاش موجودہ آبادی کے لئے کافی ہیں؟ ان دونوں کا جواب معاشیات ہند کی تمام مستند کتابیں اور حکومت ہند کی تمام رویدادیں نفی میں دیتی ہیں کس قدر ناواقف اور کوتاہ نظر ہیں۔ وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ توسیع زراعت کے بے شمار امکانات ہیں، ترقی زراعت کے لامحدود ذرائع ہیں، دنیا کے طول و عرض میں ہزاروں نہیں لاکھوں نہیں بلکہ بلا مبالغہ اب بھی کروڑہا ایکڑ زمین بےکار پڑی ہے کیا ان سے استفادہ نہیں کیا جا سکتا؟ طعن آمیز لہجے میں اشتراکیت کے مشہور حامی فریڈرش انگلز (FRIEDRICH ENGELS) نے صحیح کہا ہے کہ "کثرت آبادی کا ذکر ہی مضحکہ انگیز ہے، صرف وادی مسسی پی اور

آموزن میں اس قدر غیر افتادہ زمین ہے کہ اس پر تمام یورپ کی آبادی منتقل کی جاسکتی ہے، اب تک دنیا کی قابل کاشت زمین کا صرف ایک تہائی حصہ زیر کاشت ہے اور اس تہائی حصہ زمین کی پیداوار دریافت شدہ طریقہ ہائے زراعت ہی کے انطباق سے چھ گنی بلکہ اس سے بھی زیادہ کی جاسکتی ہے[۵]:

اس میں شک نہیں کہ فریڈرک اینگلز کا خیال بڑی حد تک صحیح ہے معاشی جغرافیہ کے نقطہ نظر سے وسیع زراعت و ترقی صنعت و حرفت کے جو وسیع امکانات ہیں اُن کا ذکر کیا جائے تو وہ الف لیلہ کا قصہ معلوم ہو حالانکہ حقیقت میں یہ امکانات فطری نقطہ نظر سے ظہور میں آسکتے ہیں ساری دقتیں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب کہ ان امکانات کی عملی ترجمانی ہونے لگتی ہے۔ قومی بغض و حسد کا بنی نوع انسان پر ایسا تسلط ہے کہ آزاد توطن کی عام اجازت ہونا تو درکنار امریکہ، آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ میں بسنے والے یہ بھی نہیں جانتے کہ دنیا کے ہم نسل ہم مذہب، ہم قوم اور ہم رنگ افراد اُن کے اُن کے

---

[۵] اصل عبارت یہ ہے۔ "Es ist aber lächerlich, von Übervölkerung zu reden, so lange das 'Tal des Mississippi wüsten Boden genug besitzt, um die ganze Bevölkerung von Europa dorthin verpflanzen zu können. So lange erst ein Drittel der Erde für bebaut angesehen werden und die Produktion dieses Drittels selbst durch die Anwendung jetzt schon bekannter Verbesserungen um das Sechsfache und mehr gesteigert werden kann."

ماخوذ از Karl Diehl & P. Mombert مرتبہ "Bevölkerungslehre" مطبوعہ Braun مقام Karlsruhe سنہ ۱۹۲ء صفحہ ۲۲۵۔

ملک میں بستے ہیں۔ جو خود دوسرے ممالک سے آئے تھے وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ انہی کی ذات اور ایمان والے ان ہی کی تہذیب اور تمدن پر چلنے والے ان ہی کی پیروی کریں، چنانچہ بین الاقوامی آزاد توطن کی اب کسی ملک میں اجازت نہیں۔ صرف محدود پیمانے پر بین الاقوامی توطن کی اجازت ہے وہ بھی زیادہ تر صرف عیسائیوں، گوروں، تعلیم یافتہ لوگوں اور پیسہ والوں کے لئے، مگر ان کے لئے بھی توطن آسان نہیں کیونکہ نئے دن توطن میں نئی نئی دقتیں پیدا کی جا رہی ہیں! کچھ دنوں سے تو دنیا یہ عجیب و غریب منظر بھی دیکھ رہی ہے کہ ایک ہی شہنشاہیت بلکہ ایک ہی سلطنت میں بین الصوبہ داری توطن میں بھی دقتیں پیدا کی جا رہی ہیں۔ جب طاقت ور اور مختار قوموں کے افراد کو توطن کی اجازت نہیں ملتی تو غریب ہندوستانیوں کا کیا ذکر؟ ان کا جو حشر غیر ممالک میں نہیں بلکہ شہنشاہیت برطانیہ کے دوسرے علاقوں میں ہو رہا ہے وہ ایک درد انگیز اور عبرت آگیں داستان ہے لہذا ہندوستانیوں کے مسئلہ آبادی کو حل کرنے کے لئے یہ خیال عملی اعتبار سے لایعنی ہے کہ ہم توطن اختیار کر سکتے ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں غیر ممالک جا کر وہاں از سر نو آباد ہو سکتے ہیں۔ ساری دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں جہاں ہمارا جانا نفع بخش ہو سکتا ہو اور ہم وہاں جا سکتے ہوں، جا سکنا تو درکنار ہم وہاں سے بھی نکالے جا رہے ہیں جہاں ہم میں سے چند جا کر آباد ہو گئے تھے۔ یہی حال توسیع زراعت اور ترقی صنعت و حرفت کا ہے۔ دنیا میں آج جو شور ہے وہ قلت غذا کا نہیں بلکہ غذا کی فراوانی کا، تجارت کی سرد بازاری کا سبب یہ نہیں کہ دولت کی پیدائش کم ہو گئی ہے بلکہ یہ کہ تیار شدہ مال کے خریدار مفقود ہوتے جا رہے ہیں! کاروبار پر سستی اس لئے نہیں چھائی ہوئی ہے کہ کارخانے نہیں بلکہ اس لئے کہ کارخانے نفع بخش طور پر نہیں چلائے جا سکتے۔ ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا یہ کہنا مہمل نہیں ہے کہ توسیع زراعت و ترقی صنعت و حرفت کے بے شمار ذرائع چونکہ موجود ہیں۔ لہذا اضافہ آبادی کی وجہ سے کوئی خطرہ پیدا نہیں ہوتا اور تحدید آبادی کی بالکل کوئی ضرورت نہیں اس قسم کے مہمل خیالات عملی نقطۂ نظر سے ناقابل لحاظ ہیں محض اس لئے کہ وہ عملاً ظہور میں نہیں آ سکتے مسئلہ آبادی کا دارومدار توسیع زراعت اور ترقی صنعت و حرفت کے امکانات پر نہیں ہے اور نہ اس امر پر کہ کس قدر دولت پیدا کی جا سکتی ہے۔ بلکہ مسئلہ آبادی کا تمام دارومدار ان حقائق پر ہے

اگر کس قدر دولت دراصل پیدا ہوتی ہے اور وہ کیوں کر تقسیم ہوتی ہے! ہو سکتا تو بہت کچھ ہے دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں کر ہو رہا ہے۔ امکانات تو یقیناً موجود ہیں۔ توقعات بھی قائم کی جا رہی ہیں امیدیں بھی کی جا رہی ہیں۔ اور دعائیں بھی مانگی جا رہی ہیں۔ مگر نہ تو امکانات ظہور میں آئے ہیں نہ توقعات پوری ہوتی ہیں۔ نہ امیدیں بر آتی ہیں اور نہ دعائیں سنی جاتی ہیں نہ تو اتنی دولت پیدا ہوتی ہے جس قدر کہ پیدا کی جا سکتی ہے اور نہ پیدا شدہ دولت معقول طور پر تقسیم ہونے پاتی ہے لہذا بحث یہ نہیں ہے کہ تمام یورپ کی آبادی کے لئے وادی مسس پی و آموزون میں جگہ ہے یا نہیں بلکہ یہ کہ آزاد وطن کی عام امارت ہے یا نہیں، سوال یہ نہیں ہے کہ دولت پیدا کی جا سکتی ہے یا نہیں بلکہ یہ کہ دولت مساوی طور پر تقسیم ہو رہی ہے یا نہیں! عاشتینیں نے اس حقیقت کو اچھی طرح ثابت کر دیا ہے کہ صرف پیدائش دولت سے افلاس کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اس کے لئے لازمی ہے کہ تقسیم دولت کا مسئلہ بھی حل کیا جائے مگر ہم تقسیم دولت کے مسئلے کو حل کرنے سے گریز کر رہے ہیں ساتھ ہی پیدائش دولت میں میکانیت کا حصہ سال بسال بڑھ رہا ہے جس کی وجہ سے تقسیم دولت میں اور دولت کی نکاسی میں ناقابل بیان دقتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ پھر ہماری سیاست و معاشرت تقسیم دولت میں مساوات پیدا کرنے کے بجائے تقسیم دولت کی ناہمواریوں کو قانوناً سوا اور اخلاقاً جائز رکھ کر دولت کی مساوی تقسیم میں مزید دقتیں پیدا کر رہی ہے۔ ہماری معیشت سیاست اور معاشرت کی غفلت اور نادانی کا یہ حال ہے بایں ہمہ آبادی تیز رفتاری سے بڑھتی جا رہی ہے جس کا لازمی نتیجہ خصوصاً ہندوستان میں یہ ہے کہ ہمارا معیار زندگی بلند ہونے نہیں پاتا تعلیم و تربیت کے ذریعے اگر ہم ذرائع معاش میں اضافہ کرتے ہیں تو اس سے بھی ہمارا معیار زندگی بلند نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ذرائع معاش کی رفتار اضافے سے زیادہ آبادی کی رفتار اضافہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے طول و عرض میں آج بھی اسی قدر غربت پائی جاتی ہے جس طرح آج سے صدیوں قبل پائی جاتی تھی اور بے شمار افراد بھوک اور فاقہ کشی کی مصیبتیں جھیل رہے ہیں اور خصوصاً قحط یا خشک سالی کے زمانے میں ناقابل برداشت دقتوں کا سامنا کرتے ہیں شرح پیدائش کی زیادتی اور شرح اموات کی زیادتی کا نتیجہ لازمی طور پر یہ ہوتا ہے کہ یہاں کی شرح بقا معمولی ہے۔ مگر

ذرائع معاش میں اضافہ کی رفتار جوں کہ نہایت سست ہے ۔ اس لئے ہندوستان کے اضافہ آبادی کا بار بہت بڑھ رہا ہے ۔ حالیہ تحقیق اور معاشیات ہند کے حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے مسئلہ آبادی ہند کی تحلیل کی صرف یہی صورت ہو سکتی ہے کہ ضبط تولید یا تحدید نسل کی تحریک کو وسیع ترین پیمانے پر کامیاب بنانے کی ممکنہ کوشش کی جائے اس کا ذریعہ نہ صرف تعلیم ہو بلکہ یہ بھی کہ جا بجا سرکاری طور پر تمام شفاخانوں میں ضبط تولید کے لئے عمل گاہیں قائم کی جائیں ۔ ہندوستان میں ان لوگوں کی عظیم اکثریت ہے جو اس تحریک کے سراسر مخالف ہیں اور نام نہاد مذہبی اعتقادات اور فرقہ وارانہ تعصبات کی وجہ سے اس قسم کی تمام تجاویز پر حقارت آمیز الفاظ میں سخت تنقید کرتے ہیں مگر نفس موضوع پر متانت و سنجیدگی ، علمیت و عقلیت سے تبصرہ کرنے کی کوشش نہیں کرتے چونکہ ہندوستان کی غربت کا ایک بڑا سبب ہندوستان کی اضافی کثرت آبادی ہے ۔ لہذا ہندوستان کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ وہ اپنی آبادی کی تعداد میں کمی کرے جس کا معقول ترین طریقہ ضبط تولید اور تحدید نسل ہے ۔ بالخصوص اس لئے کہ ہندوستان کے لئے خارجی توطن عملاً ناممکن ہے اور توسیع زراعت وصنعت وحرفت کی معقول توقع نہیں جو کچھ سست ترین رفتار سے ترقی و توسیع زراعت وصنعت وحرفت میں ہو رہی ہے ۔ وہ معیار زندگی اور معیار آرام کی بلندی کے لئے صرف ہونی چاہئے نہ کہ مزید اضافہ آبادی کی پرورش کے لئے ۔ اگر ہندوستان کو سوراج یا پورا سوراج مل جائے تب بھی اس کے لئے کم از کم نصف صدی کے لئے ناممکن ہو گا کہ وہ ۴۵ کروڑ افراد کو معقول معیار آرام پر پال سکے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۰ کروڑ افراد کو پال سکے گا اور موجودہ محکومیت یا نیم غلامی کی حالت میں تو معقول معیار آرام پر زیادہ سے زیادہ ۱۰ کروڑ افراد پل سکتے ہیں لہذا ہر لحاظ سے ہندوستان کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی تعداد میں

کمی کرے جس کے لئے بہترین طریقہ تحدیدِ نسل اور ضبطِ تولید ہے۔

ضبطِ تولید یا تحدیدِ نسل کا مفہوم

ضبطِ تولید سے مراد وہ طریق ہے جس کی بدولت افزائشِ انسانی میں موانعات پیدا کئے جائیں، اور جنسی یا صنفی تلطف Sexual Satisfaction میں رکاوٹ پیدا کئے بغیر پیدائشِ اطفال کو محدود کیا جائے۔ یہ ایک واقعہ ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دنیا میں بکثرت بچے ماں باپ کی مرضی کے خلاف پیدا ہوتے ہیں اور محض اس وجہ سے کہ اکثر والدین میں بچوں کی پرورش و نگہداشت تعلیم و تربیت کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ وہ قبل از وقت فوت ہو جاتے ہیں یا غربت و جہالت میں گذر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں[1]۔

---

[1] ہندوستان کی اعلیٰ شرحِ اموات کا ذکر کرتے ہوئے مولوی الیاس برنی صاحب نے لکھا ہے کہ "پریشانی صدمہ اور بیماری کے سوا ہندوستان کی اعلیٰ شرحِ پیدائش کا اور کیا نتیجہ ہے۔ جہاں موت کا بازار اس قدر گرم ہو وہاں پیدائش کی کیا خوشی۔ اس سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ بچے کم پیدا ہوں اور زیادہ زندہ رہیں، افلاس و ناداری، عام جہالت اور اصولِ حفظِ صحت کی ناواقفیت بھی کثرتِ اموات کا باعث ہے۔ ممکن ہے کہ مالی حالت کی درستی اور تعلیم کی اشاعت سے شرحِ اموات کچھ گھٹ جائے لیکن یہ بھی ضرور ہے کہ شرحِ پیدائش میں کچھ تخفیف ہو۔ والدین کی نوعمری میں کم زور بچے پیدا نہ ہوں اور وہی لوگ شادی بیاہ کریں جو بچوں کو اچھی طرح پرورش بھی کر سکیں" (معیشت الہند جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ۱۹۲۹ء صفحہ ۵۰) رائے بھگوان داس کیلانے جو کتاب مدراس کے متعلق ہندی بھاشا میں لکھی ہے اس میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے چنانچہ صاحب موصوف لکھتے ہیں۔ "इस समय विशेष आवश्यकता यह नहीं है कि नागरिकों की संख्या बढ़े, वरन यह है कि नागरिक सुयोग्य, सुशिक्षित, स्वस्थ और बलवान हों" ("भारतीय नागरिक और उन की उन्नति के उपाय" लेखक :

خواہش اولاد ایک فطری جذبہ ہے جو ہر تندرست انسان میں پیدا ہوتا ہے اور اس جذبے کو کافی تشفی ہو جاتی ہے۔ جبکہ دو تین یا زیادہ سے زیادہ چار یا پانچ بچے پیدا ہو جاتے ہیں مجھے اس شخص سے ملنے کی حسرت ہی رہی جس کی آمدنی قلیل ہو اور جو تین یا چار بچوں کا باپ ہونے کے باوجود اولاد ہونے کی تمنا رکھتا ہو ہاں یہ اور بات ہے کہ وہ اس اولاد کو بھی چاہے جو اس کی خواہش اور تمنا کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کے جنسی جذبات اور اس کی مجبوریوں کا نتیجہ ہو۔ انسان کی جنسی احتیاجات تمام

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) भगवानदास केला। प्रकाशक· भारतीय ग्रन्थमाला वृन्दावन। सन् १९३० ई० ।)

پی وٹل نے جو کتاب ہندوستان کے مسئلہ آبادی کے متعلق ۱۹۱۶ء میں لکھی تھی P W Wattal "The Population Problem in India Bennett, Coleman, Bombay, 1916 آپ اس میں اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندوستان کی اعلیٰ شرح پیدائش کو کم تر کرنا چاہئے راما دیوے اسی موضوع پر جو کتاب لکھی ہے اس میں تو وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ "What we want is not only that there should be no increase in our numbers, but that our population should go on declining for some years to come" (S T Ranadive "Population Problem of India" Longmans, Bombay 1930, p 206.)

ایک مقالے میں جو ہندوستان کی سالانہ معاشی کانفرنس میں پڑھا گیا تھا میں نے لکھا ہے کہ:-

"Our population should lessen not by hundreds or thousands but by millions and crores"

تفصیلی بحث کے لئے دیکھئے "The Problem of India over population" مطبوعہ Indian Journal of Economics کانفرنس نمبر بابت جنوری ۱۹۳۶ء صفحات ۲۸۳ تا ۲۸۸ اور ۵۵۰ تا ۵۵۴۔

جسمانی احتیاجات سے زیادہ طاقت ور ہوتی ہیں اور ان ہی کی تسکین کی خاطر وہ جنسی تعلقات قائم کرتا ہے جس کا نتیجہ اکثر صورتوں میں پیدائش اولاد ہوتا ہے۔ یہ غیر متمنی اور غیر ضروری اولاد والدین کی خوشی کا باعث نہیں ہوتی وہ ان کی تمناؤں کا نتیجہ ان کی آرزوؤں کا ثمر، اُن کی خواہشوں کا حصل نہیں ہوتی بلکہ یہ فالتو اولاد اُن کی مالی پریشانیوں کا باعث ان کی فکروں کا سرچشمہ اور ان کے سوہانِ روح کا باعث ہوتی ہے کیوں کہ یہ اولاد ان کی دلی مرادوں کا نہیں بلکہ ان کی خواہشات نفسانی کا نتیجہ ہوتی ہے میں ایسے متعدد اشخاص کو جانتا ہوں جو یہ معلوم کرکے کہ ان کی رفیق حیات ایک نئی ہستی کو عالم وجود میں لانے والی ہیں۔ یہ خیال کرکے خاموش ہوجاتے ہیں کہ از ماست کہ بر ماست! میرے عزیزوں اور قریبی دوستوں میں بھی ایسے متعدد احباب ہیں جو باوجود قلیل آمدنیوں کے کثیر العیال ہیں۔ مگر وہ عقلاً کثیر العیالی کو دولت اولاد سے تعبیر کرنے پر آمادہ نہیں۔ باوجود شفقت پدری کے وہ کثرت اولاد کو ایک بار محسوس کرتے ہیں اور اگرچہ وہ پہلی اولاد کی آمد کے خوشی خوشی منتظر رہتے ہیں مگر دفعہ وقفہ سے ولادتوں کے سلسلہ لاانتہاہی کو پسند نہیں کرتے یہ اور بات ہے کہ وہ ماحول کی مجبوری اور علم و عمل کی ناواقفیت کی وجہ سے اس سلسلے کو حسب دل خواہ محدود نہیں کرسکتے۔

تحدید نسل اور ضبط تولید کی ضرورت لکھ پتیوں اور کروڑ پتیوں کے لئے نہیں بلکہ معقول اور متوسط آمدنی والے انسانوں کے لئے ہے تاکہ خود ان کی اور ان کی اولاد کی زندگی کثرت اطفال کی وجہ سے ایک بار گراں نہ ہوجائے۔ اور راحت و آرام کے بجائے کوفت اور مصیبت میں ان کی زندگی گذرنے لگے۔ موجودہ ہندوستان کی فرقہ دارانہ اور نام نہاد مذہبی فضا میں ہم توقع نہیں کرسکتے کہ تحدید نسل کے زریں مسلک پر وسیع پیمانے پر عمل شروع ہوسکے گا۔ سلطنت کے لئے یہ ناممکن بھی ہوگا کہ وہ اس طریقے کو کامیاب بنانے کے لئے اپنی طرف سے کسی قسم کی پیش قدمی کرے اور اس کو مخالفین میں مقبول عام بنانے کے لئے تبلیغ کرے اور ابھی سے قانون کے ذریعے لوگوں کو مجبور کرنے کی بے سود کوشش کرے۔ خود ہماری دانش مند اور مصلحت آمیز حکومت اس اصول کو تسلیم نہ کرے گی کہ تحدید نسل اور ضبط تولید کے مخالفین میں ان خیالات کی اشاعت کرے

مگر حکومت یہ ضرور کر سکتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ حکومت کا فرض ہونا چاہئے کہ وہ تحدید نسل کے خواہشمندوں اور ضبط تولید کے موافقین کی ہر ممکن امداد کرے۔ تمام بڑے بڑے دواخانوں میں ضبط تولید کے متعلق لوگوں کو مشورہ دینے کے لئے اور بوقت ضرورت طلبگاروں کو عملی امداد دینے کے لئے Birth Control Clinics قائم کرے۔ اس کی شدید ترین ضرورت کا احساس آپ کو اس وقت ہو سکے گا جب کہ ان بے شمار خاندانوں کی مالی پستی اور ان لاکھوں معصوم بچوں کا خیال کریں جو والدین کی غربت اور والدین کی بیماریوں کی وجہ سے یا تو قبل از وقت فوت ہو جاتے ہیں یا اگر زندہ درگور رہتے ہیں وہ بھی کس طرح کہ ان کی فطری طاقت اور توانائی غذا کی قلت اور قسم غذا کی خرابی کی وجہ سے ماہ بماہ بدتر ہوتی جاتی ہے اور وہ گوناگوں بیماریوں اور دماغوں میں مبتلا ہو کر لقمۂ اجل یا دائم المریض بن جاتے ہیں۔ اگر صحیح اور تندرست اولاد کو ہماری معاشی پستی بیکار کرکے دائم المریض، ہزاروں کو نحیف اور ناتواں، اور لاکھوں کو موت کا شکار بناتی ہے تو کیا اس سے یہ بہتر نہیں کہ کثرت اولاد کے بجائے معقول تعداد اولاد رہے اور ہر شخص اپنی مالی حیثیت کے مطابق پرورش اولاد کی ذمہ داری لے؟ ہندوستان میں نہ صرف ان غریبوں کی اولاد مصیبت اور آفت میں ہے بلکہ ان سے بدتر حال ان بدقسمتوں کا ہے جن کے والدین جذامی ہیں، مخبوط الحواس ہیں اور امراض خبیثہ میں مبتلا ہیں۔ جن کے امراض کی وجہ سے ان کی معصوم اولاد نابینا، اپاہج اور مخبوط الحواس پیدا ہوتی ہے۔

ہماری قابل ناز تہذیب و شائستگی، ہماری قابل فخر حکومت و سلطنت، ہمارا قدیم و باوقار تمدن، ہمارا ترقی یافتہ اور روشن خیال زمانہ، حیوان، جانوروں، پرندوں، اور مویشیوں کی نسل کو بہتر بنانے کے لئے کوشش کر رہا ہے مگر کیا یہی حکومتی اور قومی ادارے انسانوں کی نسل کو بہتر بنانے کے لئے کوشش نہیں کریں گے؟ ہمارا روحانیت پر ناز کرنے والا ہندوستان اگر جدت کی صلاحیت نہیں رکھتا تو کیا معقول اور مفید طریقوں کو منطبق کرنے کی بھی اور ان پر عمل پیرا ہونے کی بھی استعداد نہیں رکھتا؟ ہم میں جدت کی صلاحیت نہیں تو کیا ہم میں تقلید کی بھی توفیق

نہیں، اگر ہم یہاں مویشیوں اور پرندوں کی حفاظت کرتے ہیں تو کیا ہم میں معصوم بچوں کی جان اور صحت کے تحفظ کا احساس نہیں، کیا وہ وقت عنقریب آنے والا ہے جب کہ ہم اپنی غفلت سے بیدار ہو کر دلیری اور جواں مردی سے اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے کوشش کریں گے۔

نظام الملک کے آباواجداد

(بسلسلۂ گذشتہ)

ابوالحسن نے بیجاپوریوں کی مدد کے لئے انباجی پنڈت کی سرکردگی میں ایک فوجی دستہ بھیجا تھا اورنگ زیب نے اس بات کو فراموش نہیں کیا تھا۔ اس کے علاوہ گولکنڈہ کی کثیر دولت اور بیش بہا مال ومتاع سے بھی شہنشاہ بے خبر نہیں تھا۔ محاصرۂ بیجاپور کے دوران میں مغل جاسوسوں نے ابوالحسن کا ایک خط اپنے قبضہ میں کیا جس میں اس نے اپنے نمائندوں کو لکھا تھا کہ وہ چالیس ہزار سپاہیوں پرمشتمل ایک فوج خلیل اللہ خاں کے ماتحت بطور کمک بیجاپور روانہ کرنا چاہتا ہے۔ تجویز یہ تھی کہ یہ فوج بائیں جانب سے اور سنبھاجی کی فوج دائیں جانب سے آکر شاہی فوجوں سے جنگ شروع کرے گی (ماثر عالمگیری ص ۲۶۰) یہ سن کر شہنشاہ نے شاہ عالم کی سرکردگی میں ایک زبردست فوج حیدرآباد کو فتح کرنے کے لئے روانہ کی۔ جب شاہی فوجیں مالکھیڑ Malkhed پہنچیں تو شہزادہ شاہ عالم نے بہت کوشش کی کہ خلیل اللہ خاں سے صلح ہو جائے اور جنگ نہ ہو مگر اس میں ناکامی ہوئی۔ شہزادہ یہاں دو ماہ مقیم رہا تاکہ بارش تھم جائے۔ شہنشاہ نے جب سنا کہ شہزادہ ابھی آگے نہیں بڑھا ہے تو اس نے شاہ عالم کو ایک سخت خط لکھا۔ جب شہزادہ کو یہ خط ملا تو وہ حیدرآباد کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں شاہی فوجوں نے شیخ منہاج اور رستم راؤ کی فوجوں کو شکست فاش دی، اب حیدرآباد تک راستہ صاف تھا۔ جب ابوالحسن نے اس شکست کی خبر سنی تو وہ بہت خوفزدہ ہوا اور اپنے چند ملازموں کے ساتھ رات کو فرار ہو کر قلعہ گولکنڈہ میں پناہ لی۔

حیدرآباد میں بے چینی اور اضطراب پھیل گیا۔ شاہی فوجوں نے شہر پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ شاہ عالم نے اپنے افسران کو یہ ہدایات دے کر شہر میں متعین کیا کہ لوٹ مار نہ ہونے پائے اور ایسا کرنے والوں کو سزا دی جائے، چند دنوں کے بعد ابوالحسن اس بات پر راضی ہو گیا کہ وہ سالانہ ایک کروڑ

بیس لاکھ ہن (سونے کا سکہ) ادا کرے گا اور اپنی ملازمت سے مدنا اور اکنا AKanna
کو الگ کرے گا۔ (خافی خاں جلد دوم ص ۳۰۸) اس کے بعد شاہی فوجوں نے ابوالحسن کی سلطنت
کو خالی کر دیا۔

بیجاپور کی فتح کے بعد اورنگ زیب نے اپنی توجہ گولکنڈہ کی طرف کی۔ یہ بہانہ کرکے کہ وہ
گلبرگہ میں گیسو دراز حسنؒ کے مقبرہ کی زیارت کرنا چاہتا ہے وہ سلطنت گولکنڈہ کی حدود میں داخل ہو گیا
اور فیروز جنگ کو قلعہ ابراہیم گڑھ[1] کی تسخیر کے لئے روانہ کیا۔ یہ قلعہ اس سڑک پر واقع تھا جو حیدرآباد کو
جاتی تھی۔ اس کی خدمات کے صلہ میں فیروز جنگ کو ایک خلعت اور ایک ہاتھی مرحمت کیا گیا۔ مندرجہ
ذیل لوگ اس کے ساتھ تھے۔ دلیر خاں، شار زا خاں، جمشید خاں، مالاجی گوپال رائے، کمال الدین،
راؤ دلپت، صف شکن خاں، آقا علی خاں، عبدالقادر خاں، جہانگیر علی خاں، صوفی خاں، عودت
سنگھ بہادر اور سربراہ خاں چیلا۔ ان سب لوگوں کو خلعت، گھوڑے، ہاتھی، لقب اور ترقیاں دی
گئیں۔ (ماثر عالمگیری ص ۲۸۴) فیروز جنگ گولکنڈہ کے قریب شہنشاہ سے آملا۔ شہنشاہ نے
اسے سپہ سالار بنا کر قلعہ گولکنڈہ کی تسخیر کے لئے روانہ کیا۔ قطب شاہی افواج کی مزاحمت کے باوجود
فیروز جنگ قلعہ کے بالکل نیچے پہنچ گیا اور وہ چاہتا تھا کہ اسے اچانک حملہ سے فتح کرلے۔ قلیچ خاں
حملہ کرنے والی فوج کے آگے تھا۔ اس کے ایک گولہ آلگا اور تین دن کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ فیروز جنگ
نے باقاعدہ محاصرہ شروع کر دیا۔ خلاف توقع محاصرہ لے طول کھینچا۔ محصورین نے شیخ نظام اور عبدالرزاق
کی وجہ سے بہت صبر و استقلال سے کام لیا۔ فیروز جنگ نے صف شکن خاں کو حکم دیا کہ وہ قلعہ
کی خندق کے پاس اونچے اونچے ٹیلے بنا کر قلعہ پر گولہ باری کرے۔ شہنشاہ کی موجودگی سے سپاہیوں کے
دل اور بڑھ گئے۔ جب سب تیاریاں مکمل ہو گئیں تو صف شکن نے اس حسد سے کہ فیروز جنگ کی تنہا
کے دل میں زیادہ عزت ہے میر آتش کے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا۔ صلابت خاں اور اس کے بعد

---

[1] بعد میں یہ قلعہ فیروز گڑھ کے نام سے مشہور ہوا (ماثر الامرا، جلد دوم ص ۸۷۵)۔

عزت خاں اس عہدہ پر مقرر کئے گئے۔ محصورین نے کبھی کبھی جرأت سے حملے کرکے ٹیلوں کو گرادیا۔ ۔ اور عزت خاں کو گرفتار بھی کرلیا۔ مارٹن نے وہ تمام کام جو فیروز جنگ اور اس کے ساتھیوں نے محنت سے کیا تھا خراب کر ڈالا۔ خافی خاں کے الفاظ میں انھوں نے ایک سال کا کام ایک مہینہ اور کچھ دنوں میں پورا کرلیا۔ ۔ (جلد دوم ص ۴۴۶)۔

قلعہ کی تسخیر میں دیر اس لئے ہوئی کہ افسر ایک دوسرے سے حسد کرتے تھے۔ ان حالات سے شہنشاہ کو سخت تکلیف پہنچی۔ اس حسد کو دور کرنے کے لئے اس نے محمد اعظم کو سپہ سالار مقرر کردیا اس کے علاوہ شہنشاہ کی آنکھوں کے سامنے فیروز جنگ کو دو تیر آلگے تھے جب وہ قلعہ پر حملہ کررہا تھا اور اس وجہ سے وہ زخمی بھی ہوگیا تھا۔ (ماثر عالمگیری ص ۲۹۵ اور خافی خاں جلد دوم ص ۳۵۴)۔

۲ مئی ۱۶۸۶ء کو فیروز جنگ نے فیصلہ کیا کہ وہ رات کو دیواروں پر زینے لگا کر قلعہ فتح کرلیگا قلعہ کے برج کے نیچے ایک زینہ لگایا گیا اور چند بہادر دیوار تک پہنچ گئے۔ لیکن بدقسمتی سے ایک کتا قریب ہی گھوم رہا تھا۔ اس نے آدمیوں کو دیکھ کر بھونکنا شروع کردیا۔ اس آواز سے سپاہیوں کا ایک دستہ جاگ اٹھا انھوں نے حملہ آوروں کو تلوار کے گھاٹ اتار ڈالا اور جو سیڑھی پر چڑھ رہے تھے ان کا گولوں سے خاتمہ کردیا۔

حاجی شفیع [illegible] اورنگ زیب کا خاص ملازم تھا۔ جب اس نے سنا کہ فیروز جنگ نے زینے لگا کر قلعہ فتح کرنے کا ارادہ کرلیا ہے تو وہ بغیر نتیجہ معلوم کئے علی الصبح شہنشاہ کے پاس گیا۔ اورنگ زیب ابھی نماز میں مشغول تھا۔ جب شہنشاہ نے اس سے پوچھا کہ کیا ماجرا ہے تو اس نے کہا قلعہ فتح ہوگیا ہے یہ خبر سن کر شہنشاہ نے حکم دیا کہ فتح کے نقارے بجائے جائیں۔ لیکن جب حقیقت کا پتہ چلا تو شہنشاہ اور دوسرے لوگ بہت مایوس ہوئے۔ (خافی خاں جلد دوم۔ ص ۳۴۲)

مرزا محمد نعمت خاں جس کا تخلص عالی تھا۔ اس حادثہ پر نظم و نثر میں غیر ہمدردانہ مضمون لکھے ہیں۔ (واقعہ نعمت خاں عالی)۔

ستمبر ۱۶۸۷ء میں روح اللہ خاں نے ابوالحسن کے ایک معتمد افسر عبداللہ خاں سے لان مست خاں کی وساطت سے خفیہ بات چیت شروع کی عبداللہ خاں قلعہ کے دروازوں میں سے ایک دروازہ کا محافظ تھا۔ آپس کے فیصلہ کے مطابق اس نے ۲۱ ستمبر کی رات کو دروازہ کھول دیا اور مغل فوجیں قلعہ میں داخل ہوگئیں۔ فتح کے نقارے بجائے گئے اور قلعہ پر قبضہ کر لیا گیا۔ ابوالحسن کو گرفتار کر کے جاں سپر خاں کی حفاظت و نگرانی میں دولت آباد بھیج دیا گیا۔ مال غنیمت میں ۸ لاکھ ۵۱ ہزار ہن ۲ کروڑ پچاس ہزار روپیوں کے علاوہ جواہرات اور سونے چاندی کے قیمتی ظروف بھی تھی۔ (خافی خاں، جلد دوم ص ۳۷۷)۔

قلعہ کی تسخیر کے بعد فیروز جنگ کو ہفت ہزاری کے علاوہ ایک خلعت، مکمل اسلحہ جات اور جواہرات سے لگی ہوئی چھڑی دی گئی (ماثر عالمگیری ص ۲۹۶)۔

اب شہنشاہ نے حکم دیا کہ گھومنے والی بڑی بڑی جماعتیں گولکنڈہ اور بیجاپور کے علاقوں کو فتح کرنے کے لئے بھیجی جائیں۔ فیروز جنگ کو پچیس ہزار سواروں کے ساتھ قلعہ ادونی جو تنگ بعدرا کے جنوب میں ہے فتح کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ یہ قلعہ سیدی مسعود کے قبضہ میں تھا جو سکندر عادل شاہ کا غلام افسر تھا۔ محاصرہ بیجاپور کے دوران میں بہ بہت سے جواہرات اور خزانہ لے کر یہاں چلا آیا تھا۔ (ماثر عالمگیری ص ۳۰۸)۔

ادونی کے نواح میں پہنچ کر فیروز جنگ نے سیدی مسعود کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ بغیر خون بہائے قلعہ خالی کر دے۔ لیکن جب اس نے انکار کر دیا تو فیروز جنگ نے خندقیں کھدوانا شروع کیں اور قلعہ پر گولہ باری ہونے لگی۔ جو لوگ مقابلہ کے لئے نکلے انھیں تہ تیغ کر دیا گیا۔ جب سیدی مسعود نے دیکھا کہ مقابلہ فضول ہے اور کوئی دم میں قلعہ فتح ہوا چاہتا ہے تو اس نے قلعہ خالی کر دیا، وہ قلعہ سے باہر آیا اور معافی کا خواستگار رہا۔ شاہی فوجوں نے قلعہ پر قبضہ کر کے اس کا نام بدل کر امتیاز گڑھ رکھ دیا۔ ادونی کی فتح سے شہنشاہ کو بیحد مسرت ہوئی۔ فوراً فتح کے نقارے بجوائے گئے۔ فیروز جنگ نے سیدی مسعود سے اچھا سلوک کیا۔ اور اس کے بیٹوں کو اورنگ زیب کے حضور میں بھیج دیا گیا۔ اورنگ زیب نے قصداً سیدی مسعود کو دربار میں نہیں بلایا اس لئے کہ اس میں بیچارہ کی ذلت تھی

اس کی غیر موجودگی میں شہنشاہ نے اسے ہفت ہزاری کے منصب کے علاوہ مراد آباد کا فوج دار مقرر کر دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک نائب مقرر کیا گیا تھا کہ وہ سب انتظامات کرے اس لئے کہ شہنشاہ نے حکم دیا تھا کہ جب تک سیدی مسعود زندہ ہے وہ فیروز جنگ کی ملازمت میں رہے گا (مآثر عالمگیری ص ۳۱۷) جب اس کے بیٹے قلعہ ادونی کی کنجیاں جو سونے کی تھیں لے کر دربار میں حاضر ہوئے تو انھیں تحائف اور انعامات دے گئے فیروز جنگ کے عہدہ میں بھی اضافہ ہوا[۹]
ادونی اور اس کے گرد و نواح کا نظم و نسق قائم کرنے کے بعد فیروز جنگ بیجاپور میں اورنگ زیب سے آملا شہنشاہ نے اسے کئی تحفے مرحمت کئے۔ وہاں یہ خبر ملی کہ سنبھاجی اور اس کے افسر ہیاو کنگرت اور گلشن آباد میں بدامنی پھیلا رہے ہیں شہنشاہ نے فیروز جنگ اور شیخ نظام (مقرب خان) کو اس طرف روانہ کیا تاکہ اس حصہ میں مغلوں کا اقتدار پھر قائم کر دیں۔ شیخ نظام ابوالحسن کا ساتھ چھوڑ کر مغلوں سے آملا تھا۔ جب مغلوں کی فوجیں گولکنڈہ کے محاصرہ میں مصروف تھیں اس وقت سنبھاجی اور اس کے مشہور جنرل سنتاجی نے مغل علاقہ میں لوٹ مار مچا رکھی تھی اور بہت سے گھوڑے اور فوج فراہم کر کے اپنی طاقت میں بہت اضافہ کر لیا تھا۔
جب مرہٹوں پر حملہ کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں تو نومبر ۱۶۸۶ء میں شاہی خیمہ میں طاعون پھیل گیا۔ اس کا حملہ اس قدر شدید تھا کہ بہت کم لوگ جو اس میں گرفتار ہوئے بچ سکے۔ بہت سے افسروں کے علاوہ شاہ بیگم اورنگ آبادی محل مہاراجہ جسونت سنگھ کی لڑکی جس کی پرورش شاہی خاندان میں ہوئی تھی اور فاضل خاں صدر ہلاک ہو گئے۔ اس وبا میں تقریباً ایک لاکھ جانیں ضائع ہوئیں۔ شہنشاہ کو بیجاپور سے اکلوج ضلع شولاپور میں

---

[۹] ۔ خان عالم کے بیٹے سیدی مسعود نے فیروز جنگ کی وساطت سے شہنشاہ سے درخواست کی تھی کہ اسے دربار کی حاضری سے معاف رکھا جائے اور اس کی بجائے اس کے بیٹوں کو حاضر ہونے کی اجازت مرحمت ہو۔ (جلد دوم ص ۲۷۲)۔

آنا پڑا۔ بہادر گڈھ روانہ ہونے سے پیشتر فیروز جنگ بھی اس مرض میں مبتلا ہوا اور اس کی بینائی جاتی رہی۔ (ماثر عالمگیری ص ۳۱۸، ۳۱۹) اس حادثہ کی وجہ سے وہ مرہٹوں کے خلاف جنگ میں حصہ نہیں لے سکا، ور سنبھاجی کو گرفتار کرنے کا فخر شیخ نظام (مقرب خاں) کو ملا۔ اس کو خانِ زماں بہادر فتح جنگ کے لقب کے علاوہ پچاس ہزار روپے نقد ایک خاص خلعت، جواہرات کے ساز و سامان کے ساتھ ایک گھوڑا، سنہری ساز و سامان کے ساتھ ایک ہاتھی اور ایک جواہرات میں جڑا ہوا خنجر ملا۔ اس کے موجودہ عہدہ میں بھی اضافہ ہوا۔ شیخ نظام کے بڑے لڑکے اخلاص خاں کو پنج ہزاری کا منصب اور خانِ عالم کا خطاب ملا، شیخ میراں اور شیخ عبداللہ اس کے چھوٹے بھائیوں کو مسور خاں اور اختصاص خاں کے لقب عطا ہوئے۔

اب شہنشاہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ مرہٹوں کے تمام قلعوں کو فتح کر کے رہے گا۔ اس نے یہ مہم فوراً شروع کر دی، اعتقاد خاں نے جو بعد میں ذوالفقار خاں نصرت جنگ مشہور ہوا کون کان پر حملہ کیا اور اکتوبر ۱۶۸۹ء میں رائے گڈھ کے مشہور قلعہ کو فتح کر لیا۔ سیواجی کی بیواؤں، سنبھاجی اور راجہ رام کی بیویوں، بیٹیوں اور لڑکوں کو گرفتار کر کے شاہی حضور میں بھیج دیا۔ ذوالفقار خاں نصرت جنگ کو تین ہزار روپیہ نقد، ایک خاص خلعت اور جواہرات سے لگا ہوا تیر و کمان عطا ہوا اور عہدہ میں بھی اضافہ کیا گیا۔ (ماثری عالمگیری ص ۳۳۲)۔

اس ہزیمت سے سنبھاجی کے بھائی راجارام نے فیصلہ کر لیا کہ وہ از سر نو فوج جمع کر کے مغلوں کو اپنے علاقہ سے باہر نکال دے گا۔ اس نے سنتاجی گارپاڑے کو سپہ سالار مقرر کیا۔ اس نے نئی بھرتی شروع کر دی اور سپاہیوں کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی بیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک فوج مغربی دکن میں شاہی فوجوں کے خلاف لڑنے کے لئے بھیج دی گئی۔ دس ہزار سپاہی راجارام کے ماتحت تھے باقی سپاہیوں کو تین برابر حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ یہ تین حصے لوٹ مار کرنے کے لئے سنتاجی، پارسوجی بھونسلا، اور سدوجی راؤ نبالکار کی سرکردگی میں تھے ان دستوں کی لوٹ مار سے شہنشاہ سخت تنگ آگیا۔ بلگاؤں کے نواح میں سنتاجی نے مغلوں سے کئی قلعے

چھین لئے تھے۔ دوسرے دستوں نے بھی شاہی فوجوں کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ ان افسروں میں سنتاجی پراس آبادی اور مغل افواج کے لئے دہشت اور خوف کا باعث ہوگیا تھا۔ کرناٹک میں مغل فوج جو ذوالفقار خاں کی سرکردگی میں تھیں اس نے اچانک حملے مغربی دکن میں شروع کردئے۔ قاسم خاں کو اس کے خلاف روانگی کا حکم ہوا۔ سنتاجی نے اُسے سخت شکست دی اور قلعہ دودیری پر قبضہ کرلیا۔ ہمت خاں جو قاسم خاں کی مدد کے لئے روانہ ہوا تھا اس کی مٹھ بھیڑ راستہ ہی میں سنتاجی کی فوجوں سے ہوگئی اور ہمت خاں مارا گیا۔

سنتاجی اپنے انتہائی عروج پر تھا مگر اس وقت دھانا جادو سے اس کا جھگڑا ہوگیا۔ دھانا جادو کو اس بات پر سخت غصہ تھا کہ سنتاجی کو سپہ سالار مقرر کردیا گیا ہے، دھانا جادو نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے رقیب سے بزورِ شمشیر اس جھگڑے کا فیصلہ کرے گا چنانچہ اس نے نئے سپاہیوں کی بھرتی شروع کردی۔ سنتاجی نے نئی بھرتی نہ ہونے دی اور دھانا جادو کی زندگی کے لئے وبال بن گیا۔ سنتاجی نے اس کا پیچھا مرہٹہ علاقہ میں کیا۔ مارچ ۱۶۹۷ء میں بیجاپور کے نواح میں دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ شہنشاہ نے بھی یہ حکم دے رکھا تھا کہ سنتاجی کا تعاقب کیا جائے اس لئے کہ اس نے ملک کی اس حد میں قیامت برپا کر رکھی تھی۔ فیروز جنگ کو یہ خبر ملی کہ سنتاجی پچیس ہزار سواروں کے ساتھ بیجاپور سے اٹھارہ میل کے فاصلہ پر موجود ہے۔ فیروز جنگ نے بھی مناسب سمجھا کہ سنتاجی سے مقابلہ نہ کیا جائے۔ وہ اپنی فوج بڑھانے کے لئے بیجاپور روانہ ہوگیا۔ اس دوران میں اُسے اطلاع دی گئی کہ دھانا جادو اور ہنومنت راؤ سنتاجی کے خلاف متحد ہوگئے ہیں اور ایک فوجی جنگ ہونے والی ہے۔ وہ اس جانب روانہ ہوگیا اور راستہ میں اُسے خبر ملی کہ سنتاجی کو شکست فاش ہوئی ہے اور وہ فرار ہوگیا ہے۔ اس کی فوج کا خاتمہ ہوگیا ہے اور بہت سے سپاہی دشمن سے جاملے ہیں۔ سنتاجی اب تنہا رہ گیا ہے اور اس کے چند وفادار سپاہی مختلف سمتوں میں بھاگ گئے ہیں۔ ناگوجی نے جو پہلے شاہی فوج میں تھا اور بعد میں اپنے ہم وطنوں سے جاملا تھا سنتاجی کو گرفتار کرکے قتل کر ڈالا۔ وہ سنتاجی سے بدلہ لینا چاہتا تھا کیوں کہ اس نے اس کے بھائی کو ایک

معمولی سی غلطی پر مروا ڈالا تھا۔ سنتا جی کی طبیعت میں بیحد غصہ تھا اس لئے وہ مرہٹہ فوج کے ایک حصہ میں سخت ناپسند کیا جاتا تھا۔

خافی خاں کے نزدیک سنتا جی تھکا ماندہ ایک ندی میں نہا رہا تھا جب ناگو جی مانے نے اس کو گرفتار کر لیا اور اس کا سر کاٹ کر ایک تھیلے میں رکھ کر یہ تھیلا زین کے پیچھے باندھ لیا۔ وہ دھنا جادو کے پاس جا رہا تھا کہ یہ تھیلا زمین پر گر گیا لیکن اسے خبر نہ ہوئی۔ اتفاق سے فیروز جنگ کے جاسوس سنتا جی کے تعاقب میں ادھر سے گزرے۔ انھوں نے تھیلا کھول کر دیکھا تو اس میں سنتا جی کا سر تھا جسے انھوں نے پہچان لیا۔ وہ فوراً یہ سر فیروز جنگ کے پاس لائے۔ اس نے یہ سر فوراً شہنشاہ کے پاس بھجوا دیا اور نگ زیب نے پیغام بر کو خوش خبر خاں کا لقب دیا۔ بعد میں یہ سر دکن کے مختلف شہروں میں گھمایا گیا۔ (خافی خاں جلد دوم ص ۴۴۴، مآثر عالمگیری ص ۴۲۰)

اب شہنشاہ دکن اور کرناٹک میں مرہٹوں کے خلاف مہمات شروع کرنے کے علاوہ عادل شاہی اور قطب شاہی علاقوں کے نظم و نسق کی طرف بھی متوجہ ہوا۔ اس نے فیروز جنگ کو برار کا نظم و نسق ٹھیک کرنے کے لئے روانہ کیا۔ دو سال کے بعد ۱۷۰۰ء میں اُسے واپس بلایا گیا اور مرہٹوں کے تازہ حملوں کے متعلق اس کی رائے پوچھی گئی۔ بعد ازاں اسے اسلام پوری میں عمدۃ الملک اسد خاں کی جگہ پر مقرر کیا گیا۔ اسلام پوری ایک بہت اہم فوجی مقام تھا[1]۔ شہنشاہ کو اس بات کا بہت خیال تھا کہ فیروز جنگ کی بصارت جاتی رہی ہے چنانچہ اس نے خواہش ظاہر کی کہ فیروز جنگ ایک ہی جگہ مقیم رہے اور دوسرے افسروں کی طرح مختلف مقامات پر جانے کی ضرورت نہیں۔

---

[1] اس جگہ کا اصلی نام برہم پوری تھا۔ اورنگ زیب نے اس کا نام بدل کر اسلام پوری رکھ دیا۔ یہیں سے وہ فوجیں روانہ کی جاتی تھیں جو جنوب میں بیجاپور اور شمال میں دریائے سنجرا کے علاقہ میں مرہٹہ حملوں کو روکتی تھیں۔ یہ وہ اہم مقام تھا جہاں سے حربی مہمات کی ابتدا کی جاتی تھی۔

ایک سال کے بعد بہادر گڈھ سے واپسی پر شہنشاہ کو اسلام پوری کے قریب سے گذرنا پڑا۔ حسب معمول وہ فیروز جنگ کی فوج کا معائنہ کرنے کے لئے آیا۔ اسے دیکھ کر بہت تعجب ہوا کہ رکھ رکھاؤ اور خیموں کی حالت نہایت عمدہ ہے۔ سپاہی نہایت منظم ہیں۔ توپ خانہ اتنا بڑا ہے کہ کسی شاہی افسر کے پاس نہیں۔ فیروز جنگ نے شہنشاہ کی خدمت میں بہت سے تحائف پیش کئے مگر اس نے ایک چھوٹا سا نیچہ قبول کیا اور اس کا نام "غاری بچہ" رکھا۔ واپسی پر شہنشاہ اپنے ساتھ کچھ بڑی توپیں بھی لے گیا اور یہ حکم جاری کیا کہ کسی افسر کو توپوں کی ایک خاص تعداد سے زیادہ رکھنے کی اجازت نہیں۔ ایک خط شہزادہ بیدار بخت کو لکھا گیا کہ "فیروز جنگ جس کا عہدہ صرف ہفت ہزاری ہے اسلحہ جات پر اپنے پاس سے روپیہ صرف کرتا ہے۔ اس میں توڑے دار بندوقیں اور چھوٹے بڑے گولے بھی شامل ہیں۔ اس کے پاس سب ضروری سامان موجود ہے، اس کے لئے وہ شاہی خزانہ سے کچھ زیادہ نہیں لیتا ہے۔ تم جو اس سے کہیں زیادہ لیتے ہو روپیہ فضول برباد کرتے ہو۔ تم ایسی چیزوں پر روپیہ صرف کرے ہو جن پر نہیں کرنا چاہئے (ماثر عالمگیری ص ۴۷۹) ۵۸

فیروز جنگ دو سال تک اسلام پوری ہی میں مقیم رہا۔ لیکن اس دوران میں وہ برار کے نظم و نسق میں برابر دلچسپی لیتا رہا۔ فیروز جنگ کو رستم خاں پر کامل اعتماد تھا۔ اس کی سفارش سے شہنشاہ نے رستم خاں کو برار کا نائب صوبہ دار مقرر کر دیا تھا (ماثری عالمگیری ص ۴۹۳) جب نیما جی سندھیا نے رستم خاں کو شکست دے کر اسے گرفتار کر لیا تو اورنگ زیب نے فیروز جنگ کو پھر برار بھیجا تاکہ وہ حکومت کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے اور مرہٹوں کو آگے نہ بڑھنے دے نیما جی سندھیا نے برار اور مالوہ پر جوابی حملے شروع کر دئے تھے۔ اس نے اور بہت سے مرہٹہ سرداروں کی ایک

---

۵۸ سیف خاں کو حکم دیا گیا تھا کہ بغیر شاہی حکم کے بیدار بخت کو اور روپیہ نہ بھیجا جائے۔ (دیکھئے فرمان عالمگیری، آصفیہ کتب خانہ، فارسی قلمی نسخہ نمبر ۱۲۷۵ (تاریخ))۔

بڑی فوج اس مقصد کے لئے جمع کر لی تھی کہ مغل صوبوں میں لوٹ مار مچائی جائے۔ تارا بائی نے اپنے بیٹے سیواجی کی جگہ جس کی عمر ابھی دس برس کی بھی نہیں تھی حکومت کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اس کے عہد میں نیما جی سندھیا نے وسط ہند میں اپنے آپ کو مضبوط کر لیا تھا۔ شاہی فوجوں کو مرہٹوں کے خلاف مسلسل ہزیمتوں کا سامنا ہوا جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ ان کے حوصلے پست ہو گئے۔

نیما جی سندھیا اور دھاناجادو نے اپنی تمام کوششیں اس بات پر صرف کر دی تھیں کہ لوگوں میں خوچی سوچ پیدا ہو جائے اور مغل اقتدار کا خاتمہ کر دیا جائے۔

نیما جی سندھیا نے رستم خاں کو شکست فاش دینے کے بعد دریائے نربدا کو عبور کیا اور اس کے حملوں کا اثر مالوہ تک پہنچ گیا۔ اس نے بندیلکھنڈ کے چھتر سال سے گفت و شنید کی کہ وہ مغلوں کے خلاف اس کے ساتھ شامل ہو جائے (ماثر عالمگیری ص ۴۲۴) فیروز جنگ نے نیما جی سندھیا کا تعاقب کیا۔ سرونج کے نواح میں دونوں کا آمنا سامنا ہوا۔ مرہٹوں کو بری طرح شکست ہوئی اور ان کی فوجیں تتر بتر ہو گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ فیروز جنگ اس ہاتھی تک پہنچ گیا تھا جس پر نیما جی سندھیا سوار تھا۔ مگر وہ ہاتھی پر سے کود گیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگ نکلا۔ وہ تمام ساز و سامان مغل فوجوں نے واپس لے لیا جو برار میں نیما جی سندھیا رستم خاں سے چھین چکا تھا۔ نیما جی سندھیا نے چھتر سال کے ساتھ بندیلکھنڈ کے جنگلات میں پناہ لی۔ ان خدمات کے بدلہ میں فیروز جنگ کے منصب میں اضافہ ہوا، ایک کروڑ دام نقد انعام میں دئے گئے اور سپہ سالار کا لقب عطا کیا گیا (ماثر عالمگیری ص ۴۸۱) دلیر خاں جو فیروز جنگ کے ماتحت ایک بڑا افسر تھا اسے ہفت ہزاری کا منصب ملا۔

فیروز جنگ کو نیما جی سندھیا کے خلاف مقامی مغل افسروں سے زیادہ مدد نہیں ملی تھی اس لئے کہ یہ افسر مرہٹوں کی جرار فوج سے ڈر کر اپنے قلعوں میں بند ہو گئے تھے اور میدان میں آ کر ان کا مقابلہ نہیں کرتے تھے۔ جب شہنشاہ کو صوبہ کے انتظام کے متعلق اس حالت کی اطلاع کی گئی تو اس نے سختی سے اس طرف توجہ کی اور منڈو کی فوجداری سے نوازش خاں کو الگ کر کے خاندیس بھیج دیا

مگر بعد میں وہ پھر اپنی پہلی جگہ پر بحال ہو گیا۔ یہ سوچ کر کہ سرکاری تبدیلیوں کا کچھ اثر نہیں ہوگا شہنشاہ نے صوبہ مالوہ کی صوبیداری پر بیدار بخت کو مقرر کر دیا اور شائستہ خاں کے بیٹے ابوظفر کو بنگال کی صوبیداری سپرد کی گئی جہاں ان دنوں نسبتاً زیادہ امن تھا (مآثر الامرا، جلد اول ص ۲۹۳)[٩٥]

فیروز جنگ نے نیما جی سندھیا کا تعاقب جاری رکھا اور فروری ۱۷۰۴ء میں وہ بھام گڑھ سے چتر سال کے خلاف چندیری اور دھامنی کے راستہ سے گڑھ کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے جنرل غضنفر خاں نے جو ہراول کا افسر تھا اپنے اچانک حملوں سے دشمن کی فوجوں کے کئی دستوں کو بھگا دیا۔ اس کے بعد فیروز جنگ برہان پور اور وہاں سے برار واپس آیا اس لئے کہ وہاں اس کی موجودگی کی سخت ضرورت تھی۔

نیما جی سندھیا نے نربدا کی کئی مغل چوکیوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ کئی ماہ تک شمالی ہندوستان اور دکن کی شاہراہوں کو مرہٹوں نے بند کئے رکھا۔ ابتدائے مارچ ۱۷۰۴ء سے سرکاری خطوط

---

٩٥ شہنشاہ نے ابوظفر خاں کو مندرجہ ذیل خط سخت الفاظ میں لکھا تھا " باوجودیکہ فیروز جنگ مرہٹوں کا تعاقب کر رہا تھا کیا تم قلعہ میں بیٹھے تماشا دیکھ رہے تھے؟ اگر فیروز جنگ سرونج کے قریب نیما کو شکست دے کر اس کا تعاقب کر رہا ہے اور وہ مندیشور اور گڑھ کی طرف بھاگ رہا ہے۔ اگر تم میری ملازمت میں رہنا چاہتے ہو تو اپنے قلعہ سے نکلو، فوج لو جو داروں کو جمع کرو اور دشمنوں کی ہزیمت خوردہ فوج اور باغی افغانوں پر حملہ کرو جو اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر کسانوں کو تنگ کر رہے ہیں انھیں قتل کر دو اور اپنے علاقہ سے نکال دو۔ نوازش خاں کو برہان پور بھیج دو۔ مندسور کو اپنی جاگیر سمجھو اور نئے قلعہ دار کے حوالہ دھار کر دو۔"

نوازش خاں کو اس طرح خطاب کیا گیا تھا " نصرت جنگ کی درخواست پر تم اپنی ملازمت پر برقرار رکھا گیا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے تم اپنے آپ میں نہیں تھے۔ مندسور کو چھوڑ کر دھار میں پناہ لینے کا مطلب کیا ہے؟ برہان پور آؤ اور بیدار بخت کے ماتحت کام کرو۔ میں تمھیں دکن میں جاگیریں دوں گا لیکن اگر تم پسند کرو تو تمہیں ہزار سالانہ تنخواہ ملے گی۔ (احکامات طلبیات آصفیہ نمبر ۱۱۲ انشا)۔

کتابت کے تقریباً ۵ ہتھیلے اور ۵ پیلٹ کی ٹوکریاں جو کابل اور کشمیر کے صوبیداروں نے شہنشاہ کی خدمت میں روانہ کی تھیں دریائے نربدا کے کنارہ پر رکھی رہیں اس لئے کہ فوجدار کے پاس ان اشیاء کو منزل مقصود تک پہنچانے کا کوئی سامان نہیں تھا (سرکار جلد پنجم ص ۲۸۶)۔

۳ مارچ ۱۷۰۷ء کو اورنگ زیب نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس وقت فیروز جنگ بحیثیت صوبیدار برار ایلچ پور میں مقیم تھا۔ دکن کے تقریباً تمام بڑے بڑے امراء نے شہزادہ اعظم کی اطاعت قبول کی۔ بعض نے تو اس لئے کہ وہ واقعی شہزادہ موصوف کو چاہتے تھے اور بعض نے اس وجہ سے کہ ان میں مخالفت کی طاقت نہیں تھی۔ لہذا انھوں نے عقلمندی سے کام لیا اور اعظم کے حلقۂ اطاعت میں داخل ہو گئے جب شہزادہ اعظم اورنگ آباد کی طرف روانہ ہوا تو چن قلیچ خاں (نظام الملک) اور اس کا چچیرا بھائی محمد امین بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے اعظم نے چن قلیچ خاں کو خان دوران کا خطاب مرحمت کیا تاکہ اُسے اپنی طرف کرلے اور اس کے ذریعہ سے تورانی فوج کو۔ لیکن وہ بلدی شہزادہ کے مغرور اور حقارت آمیز رویہ سے جو وہ اپنے افسروں اور سرداروں سے روا رکھتا تھا بد دل ہو گئے۔ اعظم ہمیشہ قدیم بہادروں کو نفرت کی نظر سے دیکھتا تھا اُس نے توپ خانہ کی افسری سے بڑے ذلیل طریقہ سے تربیت خاں کو الگ کرکے اس کی بجائے ایک کم ذات نوجوان کو افسر مقرر کر دیا۔ (ارادت خاں ص ۱۲) شہزادہ اس قدر مغرور تھا کہ چن قلیچ خاں اور محمد امین اس کے اس رویہ سے تنگ آ گئے اور انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اُس سے الگ ہو جائیں، اور اس معرکہ میں جو تخت حاصل کرنے کے لئے اورنگ زیب کے بیٹوں میں ہونے والا تھا غیر جانبدار رہیں۔ دونوں نے اپنی فوج کے ساتھ شہزادہ سے علیحدگی اختیار کرلی اور اورنگ آباد کے نواح میں بہت سے اضلاع پر قبضہ کرلیا (خافی خاں جلد دوم ص ۲، ۵)۔

اعظم کو معلوم تھا کہ فیروز جنگ بھی اس لڑائی میں حصہ لینا نہیں چاہتا جو شہنشاہ کے انتقال کے بعد ہونے والی تھی۔ اگرچہ وہ فیروز جنگ سے سخت ناراض تھا اس نے یہی مناسب خیال کیا کہ شمالی ہندوستان روانہ ہونے سے قبل اُسے اپنی طرف سے برہان پور کا منتظم مقرر کردے۔ تاکہ

وہ کوئی اور طریقہ اختیار نہ کر سکے جو اس کے لئے نقصان کا باعث ہو اس لئے کہ اُس حد میں کام بخش موجود تھا۔

ماثر الامراء کے بیان کے مطابق جب ذوالفقار خاں اورنگ آباد کے نواح میں اعظم سے آملا تو شہزادہ نے اُس سے کوئی مشورہ طلب کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ذوالفقار خاں نے یہ کہا تھا ”عقل و دانش کا تقاضہ ہے کہ اپنے خاندان کو دولت آباد ہی میں چھوڑ جائے جس طرح آپ کے والد ماجد نے کیا تھا جب وہ انھیں حالات میں داراشکوہ سے لڑنے روانہ ہوئے تھے۔ سپاہی بہت تنگی کی حالت میں ہیں۔ آپ کو چاہئے کہ اپنے خزانہ میں سے دو ماہ کی پیشگی تنخواہ ان کو دے دیجئے۔ اچھا یہ ہے کہ درہ فرداپور کی بجائے درہ دیول گھاٹ میں سے گذرا جائے تاکہ اس طرح آپ فیروز جنگ کے ہیڈ کوارٹر کے قریب سے گذر سکیں۔ اس سے فیروز جنگ کو موقعہ ملے گا کہ آپ کے ساتھ شامل ہو جائے“۔ شہزادہ نے بڑے غرور سے جواب دیا ”یقیناً اپنے خاندان کو دولت آباد میں چھوڑ جانا زیادہ مناسب تھا اگر دشمن داراشکوہ کی طرح ہوتا۔ ہم جانتے ہیں معظم کی حالت کیا ہے۔ اس کے آدمی صرف آداب جانتے ہیں۔ انھیں جنگ کا کوئی تجربہ نہیں اور میں اپنے آدمیوں سے بڑے بڑے کاموں کی توقع رکھتا ہوں۔ جہاں تک فیروز جنگ کا تعلق ہے میں نہیں چاہتا کہ اندھے کی خاطر سیدھا راستہ چھوڑ دوں“۔ (جلد دوم ص ۷۸ - ۸۷۷)۔

جنگ جاجو جو آگرہ کے نواح میں لڑی گئی تھی ہندوستان کے تخت کا فیصلہ معظم کے حق میں کیا۔ اعظم اور اس کا بیٹا بیدار بخت مارے گئے اور معظم نے بہادر شاہ کا لقب اختیار کر کے اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس نے معافی اور صلح کی حکمت عملی اختیار کی۔ ان تمام لوگوں کے ساتھ جو بہادر شاہ کے ساتھ شامل نہیں ہوئے تھے بلکہ جنھوں نے اعظم اور کام بخش کا ساتھ دیا تھا بڑا اچھا سلوک کیا گیا۔ جب چند حاسدوں نے نئے شہنشاہ سے یہ کہا کہ اعظم کے ساتھیوں پر اعتماد کرنا خطرناک غلطی ہے تو اُس نے یہ جواب دیا کہ اگر اس وقت اس کے بیٹے دکن میں ہوتے تو صورت حالات کا یہی تقاضہ تھا کہ وہ اپنے چچا کے ساتھ رہیں۔ (خافی خاں جلد دوم ص ۴۰۰)۔

شہنشاہ نے سلطنت کے بڑے بڑے امرا کو دربار میں آنے کی دعوت دی۔ اسی قسم کی دعوت فیروز جنگ کو بھی بھیجی گئی۔ وہ بہادر شاہ سے بہت ڈرتا تھا کیونکہ گول کنڈہ کے محاصرہ میں اسی کی رپورٹ پر شہنشاہ نے شہزادہ کو قید کر دیا تھا۔ لیکن ان خطوط سے جو بہادر شاہ کے وزیر اعظم منعم خاں نے بھیجے تھے اُسے اطمینان ہو گیا۔ ارادت خاں کے الفاظ میں "تجربہ کار مدبر نے جو زمانہ کے انقلابات سے خوب واقف تھا اس میں اپنا فائدہ سمجھا کہ ملک معظم اس کے گذشتہ قصور کو معاف کر دیں، اُسے تباہ و برباد نہ کریں اور وہ شہنشاہ کی اطاعت قبول کرے۔" اس نے وزیر اعظم کے وعدوں کا دلی شکریہ ادا کیا اور احمد آباد (گجرات) کی صوبیداری قبول کر لی۔ اس نے نربدا کو عبور کیا اور بغیر کسی شورش کے دکن سے روانہ ہوا لیکن وہ ڈر سے دربار میں حاضر نہیں ہوا۔ (ص ۵۲)۔

فیروز جنگ نے یہ رعایت حاصل کر لی کہ وہ بذات خود شہنشاہ کے حضور میں حاضر نہیں ہو سکا اس لئے کہ اٹھارہ برس سے اس کی آنکھوں میں بینائی نہیں ہے۔ اور خود شہنشاہ عالمگیر نے اس کی گذشتہ خدمات کی وجہ سے اُسے ذاتی حاضری سے معاف کر دیا تھا۔

شہنشاہ کے احکام کے بموجب فیروز جنگ نے گجرات کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لیا۔ صوبہ کے دیوان عبدالحمید، مہر علی خاں بخش اور محمد بیگ خاں نے نئے صوبیدار کا استقبال کیا۔ پہلا کام جو فیروز جنگ نے کیا یہ تھا کہ اس نے صوبہ کے مختلف حصوں میں نئے تھانیدار اور فوجدار مقرر کئے۔ اس نے سید عاقل خاں کو شہزادہ جہاندار شاہ کی جاگیر کا متصدی مقرر کیا۔ اسے بنجھ پور کی تھانیداری کے فرائض بھی سپرد ہوئے۔ یہاں کا تھانیدار پہلے اس کا بھائی میر عبدالوہاب تھا جو منڈون کے خلاف ایک لڑائی میں مارا گیا تھا۔ مصنف، مراۃ احمدی کے والد کو بدستور واقع نگار رہنے دیا گیا (مراۃ احمدی جلد اول ص ۳۸۲)۔[۵۱]

---

۵۱ اور تقرر حسب ذیل ہوئے۔ معتمد خاں، قلعہ دار قلعہ جہادیر۔ میر عبدالبقا کو توال اور اسکیر گھٹا بانچہ

بادشاہ کو جب یہ خبر ملی کہ جودھ پور کے راجہ اجیت سنگھ نے بغاوت کردی ہے اور وہ شہنشاہ کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کرتا ہے اور اس نے جودھ پور کے نائب فوجدار جعفر علی کو شکست دے کر اجمیر اور دوسرے شاہی علاقہ پر قبضہ کرلیا ہے تو اس نے فیروز جنگ کو حکم دیا کہ وہ راجہ اجیت سنگھ کے خلاف روانہ ہو اور راجپوتانہ کے اس علاقہ میں جہاں بدامنی ہے امن قائم کردے۔ فیروز جنگ کو جب شاہی احکام ملے تو اس نے اپنی قدیم فوج اور سامان کے علاوہ تین ہزار سوار اور پانچ ہزار پیدل بھرتی کئے۔ سواروں کی تنخواہ ۲۵ روپئے ماہوار اور پیدل کی چار روپئے ماہوار مقرر ہوئے۔ اس طرح ایک لاکھ ۲۵ ہزار روپئے ماہوار خرچ کا اندازہ ہوا۔ شاہی احکام کی رو سے صوبہ کے دیوان حامد خاں اور شریف خاں نے گیارہ لاکھ روپئے فیروز جنگ کے حوالہ کئے۔ یہ رقم مقامی فوج کے لئے آٹھ ماہ اور ۲۴ ایام کے لئے کافی تھی۔ دیوان کو یہ بھی حکم تھا کہ وہ فیروز جنگ کے لئے شاہی توپ خانہ پچاس پہیہ دار توپیں ۱۵۰ اونٹوں پر لادنے والی بندوقیں، تین ہزار ہوائیاں، ایک ہزار من سیسہ، ایک ہزار من بارود اور ایک ہزار من بان مہیا کرے، اس کے علاوہ دو ہزار کھودنے والے، ایک ہزار کلہاڑے والے آدمی اور دس ہزار سقّے فوج کے ساتھ روانہ کرے۔ (مراۃ احمدی جلد اول ص ۳۰۲)۔

راجپوتانہ کی مہم پر روانہ ہونے سے قبل فیروز جنگ کی طبیعت خراب ہوگئی لیکن چند دنوں کے بعد وہ بالکل اچھا ہوگیا۔ اس نے اپنی صحت کی خوشی میں مقامی امراء، علما اور سیدوں سے بڑی فیاضی کا سلوک کیا۔ تین راتوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ دریائے سابرمتی کے کنارہ روشنی کی گئی اور آتش بازی چھوڑی گئی (مراۃ احمدی جلد اول ص ۳۰۲)۔

میر ابو القاسم بیگ شیخ نجم الدین کی جگہ محمد حاتم بیگ داروغہ چہرہ یاف خانہ۔ خواجہ عوض خاں داروغہ خزانہ شہر۔ شیخ نور اللہ داروغہ خزانہ صوبہ اعتماد خاں متصدی کھمبایت امانت خاں کی جگہ، اور تھانہ دار کھمبہ سید علی خاں کی جگہ۔ (مراۃ احمدی جلد اول ص ۴۴۔

فیروز جنگ احمد آباد سے میواڑ کی طرف روانہ ہوا۔ پہلا مقام جہاں اس نے قیام کیا دریائے سابرمتی کے کنارہ موضع اچھیر تھا۔ جاگیرداروں نے اس کی خدمت میں تحفے تحائف پیش کئے۔ اس کے بعد وہ اوپرہ ٹھیرا۔ یہاں شہنشاہ کی طرف سے بھیجے ہوئے پچاس جاسوس اس کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ جاسوس شہنشاہ نے فیروز جنگ کی درخواست پر بھیجے تھے تاکہ راجہ اجیت سنگھ کی تمام حرکتوں کی خبر اُسے ہوجایا کرے۔ سپاہیوں کی طرح ان جاسوسوں نے بھی پیشگی تنخواہ کا مطالبہ کیا۔ اس بات کی خبر ایک تیزرو پیغام بر کے ذریعہ شہنشاہ کو کی گئی اور اس نے احمد آباد کے بخشی کو حکم دیا کہ ان کا مطالبہ پورا کردے۔

جب فیروز جنگ دستا پہنچا تو جلندر کی بیماری پھر عود کر آئی، وہ بہت کم زور ہوگیا اور علاج کے لئے احمد آباد واپس ہوا۔ چند دنوں کی بیماری کے بعد اس کا انتقال ہوگیا (سنہ ۱۱۲۲ھ) اس کے انتقال کی خبر سن کر شہنشاہ نے دیوان کو فرمان بھیجا کہ مرحوم فیروز جنگ کی جائداد ضبط کرلی جائے۔ شہنشاہ کو اطلاع دی گئی کہ فیروز جنگ کے متصدی عوض خاں نے سپاہیوں میں بہت سارو پیہ تقسیم کرنا شروع کردیا ہے اور وہ جائداد کو نہیں چھوڑتا۔ اس نے اپنے لئے بھی اس بہانہ سے بہت سارو پیہ جمع کرلیا ہے کہ اسے فیروز جنگ کا قرض ادا کرنا ہے۔ کارخانہ کے دیوان جے کشن نے بھی روپئے کو اپنے تصرف میں لانے کے لئے بہت سی جعلی دستاویزیں بنائی تھیں (مرآۃ احمدی جلد اول ص ۳۹۱)۔

بہادر شاہ نے فیروز جنگ کے نائب محمد بیگ خاں پٹن کے فوجدار اور امانت خاں (جو بعد میں شہامت جنگ کے لقب سے مشہور ہوا) متصدی بندرگاہ سورت کو حکم دیا کہ وہ مرحوم صوبیدار کی جائداد کو اپنے قبضہ میں کرلیں۔ اس نے ہر ایک چیز کی تفصیل سے ایک فہرست بنائی تاکہ دارالخلافہ میں ان کی جانچ ہوسکے۔ جے کشن، الماس اور نیک روز (تینوں خواجہ سرا) گرفتار کرلئے گئے اور ذمہ دار آدمیوں نے اس جائداد کو اپنی نگرانی میں لے لیا۔ اس کی جائداد مندرجہ ذیل اشیاء پر مشتمل تھی۔ ½۱ لاکھ روپیہ جو ہنڈیوں کی شکل میں ساہوکاروں کے پاس تھا۔ ۱۳۳۰۰۰ سونے کی مہریں۔ ۲۵،۰۰۰ ہون (سونا) اور اتنی ہی تعداد میں نیم پاؤلی، (سونا) ۱۷،۰۰۰ پاؤلی (سونا)

۴۰۰ اونٹنیاں، ۸۰۰۰ پاؤنڈ (چاندی) ۴۰ گھوڑے، ۴۰۰ اونٹ، ۴۰۰ بیل اور ۸۳ ہاتھی (Maadere Alomgeer جلد اول ص ۲۷۰)۔

فیروز جنگ کی جائداد کی ضبطی مغل حکومت کے رسم ورواج کے مطابق تھی۔ بالخصوص اس موقعہ پر تو اس کی سخت ضرورت تھی اس لئے کہ اپنے انتقال سے تھوڑی ہی مدت قبل فیروز جنگ نے بہت سارا پیشگی شاہی خزانہ سے لیا تھا۔ چونکہ راجپوتانہ کی مہم کا خیال ترک کر دیا گیا تھا اس لئے گیارہ لاکھ کی رقم حکومت کو واپس کرنا ضروری تھی جو اس مقصد کے لئے دی گئی تھی کہ راجہ اجیت سنگھ کے خلاف لڑائی میں صرف کی جائے۔ اس قدم کو اٹھانے کی اس لئے بھی ضرورت تھی کہ جو روپیہ شاہی خزانہ سے لیا گیا ہے اس کی ادائیگی کا یقین ہو جائے۔ بعض غیر ملکی مصنفین کو اس رواج سے غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے حکومت ان متوفی امیروں اور افسروں کی جائداد اور مال ومتاع کو اپنے قبضہ میں نہیں کر سکتی تھی جیسا کہ ان کا خیال ہے[۵۱]۔ شہنشاہ اورنگ زیب کا فرمان مورخہ ۲۴ جولائی ۱۶۶۷ء جو صوبہ کے ہر دیوان کے پاس بھیجا گیا تھا اس میں صاف صاف یہ لکھا تھا کہ صرف ان امرا اور افسروں کی جائداد قبضہ میں کی جائے جو حکومت کے قرضدار ہیں[۵۲]۔

Manucci's Storia do mogor vol II, P 417, ۵۱

(Bernier's Travels pp 163, 211 and 212)

۵۲ فرمان کے الفاظ حسب ذیل ہیں:۔ اگر شہنشاہ کے کسی ملازم کا انتقال ہو جائے اس کا کوئی وارث نہ ہو اور سلطنت کا اس کے ذمہ بھی کچھ نہ ہو تو اس کا مال ومتاع بیت المال میں جمع کر دیا جائے۔ اگر متوفی کو حکومت کا کچھ دینا ہے تو وہ رقم لے کر باقی بیت المال میں جمع ہو جائے۔ اگر اس کا کوئی وارث ہے اور جائداد کا دعوے دار تو اس وقت تین دن انتظار کے بعد مال ومتاع پر قبضہ کر لیا جائے۔ اگر کوئی جائداد اس رقم سے زیادہ ہو جو حکومت کی متوفی کے ذمہ ہے تو یہ رقم منہا کر کے باقی جائداد حقیقی وارث کے سپرد کر دی جائے جب وہ قانونا اپنا حق ثابت کرے۔ اگر حکومت کا قرض متوفی کی جائداد سے بھی زیادہ ہو تو اس صورت میں ہر چیز پر قبضہ کر لیا جائے اگر قانوناً

فیروز جنگ کا انتقال باسٹھ (قمری) برس کی عمر میں ہوا۔ اس کی لاش دہلی روانہ کی گئی اور اجمیری دروازہ کے قریب اس مقبرہ میں دفن کی گئی جو اس نے اپنی زندگی میں بنوایا تھا۔ یہ مقبرہ شاہ وجیہ الدین کی آرام گاہ سے زیادہ دور نہیں (مآثر الامرا، جلد دوم ص ۸۷۸)۔

فیروز جنگ تورانی مغلوں کا سردار تھا۔ وہ بہت قابل اور ہوشیار جنرل تھا۔ دکن میں اس نے بہت بر دست اثر پیدا کر لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہاں اس کی موجودگی کو بہادر شاہ خطرناک سمجھتا تھا اپنی تمام زندگی بھر وہ حکومت کا وفادار رہا۔ حاسدوں نے اس کے خلاف اورنگ زیب کے بہت کان بھرے لیکن اسے ہمیشہ فیروز جنگ پر اعتماد رہا۔ وہ ہمیشہ فیروز جنگ کو پسند کرتا رہا جیسا کہ ان خطوط سے ظاہر ہوتا ہے جو اورنگ زیب نے اس کے نام لکھے تھے سلہ۔ اس کی سیرت کے متعلق خافی خاں نے مندرجہ ذیل الفاظ لکھے ہیں "وہ ایسا آدمی تھا جس کو ہمیشہ فتح ہوتی تھی وہ اتنا منتظم تھا کہ اپنے دشمن پر چھا جاتا تھا۔ اگرچہ وہ زبردست مطلق العنان تھا مگر طبیعت کا اتنا نرم اور اچھا کہ تورانیوں میں شاید ایسا آدمی دیکھا یا سنا گیا ہو" (جلد دوم ص ۱۷۶)۔

پہلی بیوی صفیہ خانم کے انتقال کے بعد جس سے قمر الدین خاں (نظام الملک آصف جاہ خلد آشیاں) نے تولد فرمایا تھا انھوں نے یکے بعد دیگرے سعد اللہ خاں کے بیٹے حفظ اللہ کی دو لڑکیوں سے شادی کی جس سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ (مترجمہ سید نصیر احمد بی اے از انگریزی)۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) یہ ثابت ہو جائے کہ متوفی کے ذمہ حکومت کا قرض نہیں ہے تو ساری جائداد وارث کے حوالہ کر دی جائے (مرآۃ احمدی جلد اول ص ۲۶۶، ۲۶۷)۔

سلہ رقعات عالمگیری

ہندوستانی قومیت کی تعمیر میں مسلمانوں کی اہمیت

(گذشتہ سے پیوستہ)

تمدن یا کلچر: تمدن یا کلچر کا لفظ بھی قوم یا نیشنلزم کی طرح کا ہے ہماری آیندہ منزل ہمارے قومی معیار ہمارے قومی نظریے کے اعتبار سے ہندو تمدن اور مسلم تمدن اتنے ہی مغالطہ آمیز ہیں جتنا ہندو قوم یا مسلم قوم میں یہ کہہ چکا ہوں کہ ہندو تمدن اور مسلم تمدن کے بھی کچھ معنی ضرور ہیں لیکن اسی طرح جیسے بنگالی تمدن یا گجراتی تمدن برہمن تمدن یا اچھوت تمدن جین تمدن یا پارسی تمدن یا آریہ تمدن یا دراوڑ تمدن وغیرہ کے بھی اپنے اپنے معنی ہیں لیکن ہمارا معیار ان جداجدا تمدنوں پر مبنی نہیں ہے انھیں الگ الگ تمدن کہنا بھی ایک درجہ تک غلط ہے ہمارا مقصد ان سب کو ملا کر ایک متحدہ ہندوستانی تمدن پیدا کرنا اور اسے ترقی دینا ہے جس میں یہ سب تمدن اس طرح ایک دوسرے سے گتھے ہوئے ہوں جس طرح ایک خوبصورت تھان کے اندر تانے بانے کے تار ہوتے ہیں۔

اس بارے میں دنیا کی مختلف تہذیبوں کی تاریخ ہمارے لئے نہایت سبق آموز ثابت ہو سکتی ہے پرانی یا نئی کسی بھی تہذیب کو ہم لے لیں ہمیں معلوم ہوگا کہ ایک ملک کا قومی تمدن ہمیشہ ایک ملی جلی چیز کی صورت میں رہا ہے اور اسی میل جول پر ہر تہذیب اور ہر تمدن کی ترقی اور اس کا ارتقا منحصر ہوتا ہے۔

آج کل کی یورپین تہذیب کو لے لیجئے آج کل کے باشندگان یورپ اگر ارادہ کر لیں کہ انھیں اپنی تمدنی زندگی سے ایشیا کی تمام چیزوں کو خارج کر دینا ہے۔ تو سب سے پہلے انھیں عیسائی مذہب کو خیرباد کہنا ہوگا۔ اگر عیسائی مذہب سے بھی خالص عیسائیت کے سوا دہ سب چیزوں کو خارج کرنا چاہیں تو صلیب کا نشان قدیم مصریوں کے 'نشان حیات' کی نقل ہے اتوار کی چھٹی بڑے دن اور ایسٹر کے تیوہار سب زرتشت کے مصری مذہب کے اس فرقہ کی یادگار ہیں جو عیسائی مذہب سے پہلے تمام یورپ میں پھیلا ہوا تھا عیسائی مذہب کے تمام بنیادی اصولوں پر بودھ مذہب کی لافانی اثر ہے اور یہ ایک تاریخی

واقعہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائیش کے وقت تمام علاقہ شام بدھ مذہب کے معبدوں سے بھرا ہوا تھا ان سب باتوں سے حضرت عیسیٰ یا عیسائی مذہب کی عزت ہمارے دلوں میں کم نہیں ہوتی سب مذہبوں کے بنیادی اصول اس لئے ایک ہیں کہ سب کا مرجع ایک خدا ہے اور رسم و رواج اور شریعت سب کے آس پاس کے ماحول سے لی جاتی ہے۔ اور کثر ملکی حالت کے مطابق فرق ہو جاتا ہے

مذہب سے ہٹ کر گر یورپ کے مختلف سائنسوں سے یونانی الفاظ اور یورپین قوانین سے رومن اصطلاحات نکال دی جائیں تو کم از کم ایک بار یورپ کے عالموں کا ایک دوسرے کی بات سمجھ سکنا کچھ زمانہ کے لئے ناممکن ہو جائے گا۔ الفاظ کی کمی کچھ زمانہ میں شاید پوری بھی کی جا سکے لیکن اگر یونان کے دئیے ہوئے خیالات اور اصول مصر کی دی ہوئی سیاہی اور کاغذ چین سے لئے ہوئے جہازوں کے آر سمت نما ٹائپ بارود اور ہیئت عربوں سے لئے ہوئے ہند سے یورپ والوں سے لے لئے جائیں تو ساری یورپین تہذیب اس بری طرح لڑکھڑا کر گر پڑے جس طرح یونکال لیسے پر دیوار۔ یورپ کے بادشاہوں اور پادریوں کی ساری پوشاکیں ایشیائی پوشاکیں ہیں شطرنج سنڈمش اور پولو میوں مسلمہ طور پر ہندوستان کے کھیل ہیں میں اس مضمون کو طویل کرنا نہیں چاہتا۔

اس طرح پر اگر قدیم یونانی تہذیب سے مصر کا علم ریاضی نجوم اور جبر المقابلہ فیثاغورث اور پارمینڈیز کے اصولوں میں سے ہندوستانی فلسفہ اور معرفت کو نکال دیا جائے تو تمام یونانی تہذیب ایک مردہ لاش نظر آئے گی اگر سکندر کے سر پر سے وہ شاہی تاج آتار لیا جائے جس کا پہننا اس نے ایران میں سیکھا تو سکندر کی ساری عظمت ختم ہو جائے سکندر چنگیز خاں کا ایک کمزور اور ناقص نقال نظر آئے گا اور اس کے ساتھ ساتھ تمام یورپ کی بعد کی زندگی اور اس کے سیاسی تصورات اور تلازمے کچھ کے کچھ ہو جائیں گے۔

ٹھیک یہی حالت دنیا کی ہر ایک زبان اور ہر ایک تمدن کی ہے۔

تقریباً دو ہزار سال ہوئے چین کے ایک شہر میں تین سیاح جمع ہوئے جن میں سے ایک چینی ایک جاپانی اور ایک ہندوستانی تھا ان دونوں نے چینی سے پوچھا ہم یہاں کیا کر رہے ہیں" چینی نے جواب دیا کہ غرور کی گرمی سے ستائی ہوئی نسل انسانی کو ہوا کرنے کے لئے ہم ایک پنکھا تیار کر رہے ہیں چین اس

پیچھے کا دستہ ہے جاپان چاروں طرف کو دوڑنے والی تیلیوں کی مثال ہے اور ہندوستان ان تیلیوں کے اوپر کا غدہ ہے بے شبہ اس زمانہ کا ایشیائی تمدن کا یہ ماضا خوبصورت خاکہ ہے۔

اگر ایک ہزار سال اور ادھر ہٹ کر ہم چین سے بغداد آجائیں تو اس سے بھی خوبصورت منظر دیکھنے کو ملے گا۔ عباسی خلفاء کے دربار میں سنسکرت اور پالی چینی اور یونانی زبانوں کی کتابیں تلاش کر کر کے منگائی جاتی تھیں قابل برہمنوں بودھ بھکشوؤں اور یونانی فلسفیوں کا جمگھٹ رہتا تھا اور ان کتابوں کے ترجمے عربی میں ہو کر بغداد سے ہسپانیہ تک کے مدرسوں میں پڑھائے جاتے تھے اگر اب اس زمانہ یا اس کے بعد کے مسلمان صوفیوں کی کتابوں کو پڑھیں تو آپ کو تعجب ہوگا کہ آپ بھگوت گیتا کا ترجمہ پڑھ رہے ہیں یا ویدانت ہمہ اوست کے سنسکرت فلسفہ کی تفسیر افسوس اس بات کا ہے کہ ہم میں سے بیشتر تعلیم یافتوں کو مسلم تاریخ اور مسلم لٹریچر کا علم اس سے زیادہ نہیں ہے جتنا صرف مس میو کی کتاب مدر انڈیا پڑھ کر کسی انگریز عورت کو ہندوستان کے تمدن سے واقفیت ہو جائے۔

کسی بھی ملک کی تہذیب (یا تمدن) تخمی جیسے نہیں ہوتی بلکہ قلمی ہوتی ہے قومی تمدن صرف بزرگوں کے دئے ہوئے بیجوں سے پیدا نہیں ہوتا وہ سودیشی پودے کے تنے کو حیل کر باہر کے نئے نئے درختوں کی ڈالیوں کی قلم لگانے سے پیدا ہوتا ہے۔ تخمی آم میں نہ وہ ذائقہ ہوتا ہے اور نہ وہ خاصیت جو قلمی آم میں ہوتی ہے۔

جس تالاب میں باہر سے پانی آنا بند ہو جائے وہ یا تو تھوڑے ہی دنوں میں سوکھ جائے گا یا اس کا پانی سڑنے لگے گا دریا کے پانی کی تازگی اس میں ہے کہ روانی جاری رہے۔ مختلف معاون ندیاں چاروں طرف سے آکر اپنے اپنے پانی کی بھینٹ چڑھاتی رہیں اسی پانی کو ہمیشہ سمندر اپنی طرف کھینچتا رہے۔ باہر سے آکر حملہ کرنے والے دو چار مسلمان فاتحوں نے نہیں بلکہ مذہب اسلام نے اور عرب اور ایرانی تمدن نے جو اسلام کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں آیا سب سے بڑا فیض اس ملک کو یہ پہنچایا کہ باہر کی دنیا کے ساتھ اس کے ٹوٹے ہوئے تعلق کو پھر سے جوڑ دیا تقریباً ایک ہزار سال پہلے یہی خدمت ہندوستان کی بودھ مذہب نے کی تھی اور اس عمل کے ذریعہ ہندوستان کی مردہ ہڈیوں

میں پھر سے جان ڈال دی تھی۔ ہندوستان کے بودھ مذہب کے زوال کے ساتھ ساتھ بہتے ہوئے تمدن کی وہ نالیاں ٹوٹ کر ختم ہو گئی تھیں اسلام نے تمام نسل انسانی کے دل کے ساتھ اسے زمانہ کے سب سے زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ ملکوں کے ساتھ ہمارا تعلق پیدا کرکے پھر سے ہماری نسلوں میں سے تازہ خون جاری کیا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ زندگی ہمیشہ روانی میں ہے زندگی مسلسل لین دین کا نام ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم آنکھ بند کرکے اپنی پرانی چیزوں کو پھینکنا اور باہر کی اچھی یا بری ہر قسم کی چیزوں کو لینا شروع کردیں لیکن اس کا یہ مطلب ضرور ہے کہ ہم بے تعصب ہو کر نسل انسانی کی محنت سے متاثر ہو کر اپنے گھر کے باغ کی دیکھ بھال کرتے رہیں جو درخت سوکھتے جاتے ہیں انہیں کاٹ کر الگ کرتے رہیں ان کی جگہ نئی نئی قلمیں اور خوبصورت پھول باہر سے لا لا کر اپنے باغ کو آراستہ کرتے رہیں اپنے یہاں کے پودے بیج اور قلمیں دوسروں کی نذر کرتے رہیں اور نئی کھاد اور پانی سے باغ کی خبرداری رکھیں تاکہ باغ کی چھب خوبصورتی ہی بڑھتی رہے بلکہ تمام زمین پر جہاں تک فطری اختلافات کے ہوتے ہوئے ممکن ہے ایک ہی طرح کا باغ ایک ہی ہمہ گیر انسانی تمدن ترقی کرتا ہوا دکھائی دے جس کا سینچنا انسانی محبت کے پانی سے ہمیشہ جاری رہے دنیا کی عظیم الشان ہستیوں رشیوں پیمبروں اور اہل نظر کا یہی نظریہ رہا ہے

مشترکہ ہندوستانی تمدن | پندرھویں سولھویں اور سترھویں صدیوں کے اندر ہندوستان میں ایک اسی طرح کے خوبصورت قومی تمدن کی بنیاد پڑ رہی تھی مذہبی اور روحانی میدان میں کبیر معاشرتی اور سیاسی میدان میں اکبر اس کے سب سے بڑے بانی تھے یہ تمدن نہ ہندو تمدن تھا اور نہ مسلم تمدن بلکہ یہ خاص ہندوستانی تمدن تھا پندرھویں سولھویں اور سترھویں صدیوں میں اور اس کے بعد بھی نیپال سے افغانستان تک اور کشمیر سے لنکا تک سینکڑوں ہندو اور مسلمان سنت مہاتما (فقرا اور اولیا) اعلیٰ روحانی تلقین کے ذریعہ اس کی نیو کو مضبوط کرنے میں لگے رہے تھے قوم کی معاشرت خورد و نوش صنعت و حرفت زبان اور علوم و فنون سب پر اس کا گہرا اثر پڑا قوم میں ایک نئی بیداری چاروں طرف دکھائی دینے لگی

اس مشترکہ تمدن کی صرف ایک درخشاں مثال آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں وہ مثال فن

تعمیر کی ہے۔ اس فن میں اگر آپ کو قدیم ہندو معیار دیکھنا ہو تو دکن کے بہت سے پرانے مندر میں عظیم شاندار کرسی کے اوپر کرسی اور کنگرے کے اوپر کنگرہ ہندوستان کے گھنے جنگلوں کی طرح ایک ایک انچ دیوی دیوتاؤں (بتوں) اور تصویروں سے بھری ہوئی اس کی عظمت جامعیت اور خوبصورتی سے حیرت زدہ ہو کر دیکھنے والے کی آنکھیں اسی طرح راستہ بھول جاتی ہیں جس طرح ہندوستان کے جنگلوں میں۔ دوسری طرف اگر آپ کو باہر سے آئے ہوئے مسلم تہذیب کی مثال دیکھنی ہو تو دلی اور اجمیر کی خوبصورت مسجدیں ہیں عرب کے ریگستان کی طرح اونچی ننگی دیواریں نیلے آسمان سے بات کرنے والے مینار بڑے بڑے گنبد اور اس کی عظمت کے اندر عابدوں کے دھیان کو بٹانے والی سوائے اللہ کے کوئی دوسری چیز نہیں لیکن اگر آپ کو اس کی فطرت ان دونوں الگ الگ معیاروں کی محبت آمیز ہم آہنگی کو دیکھنا ہو تو آگرہ کا وہ تاج محل ہے جو نہ صرف اس وقت تک ہندوستان کے فن تعمیر کا سب سے خوبصورت پھول ہے بلکہ ہندوستان بھر کے اندر سب سے زیادہ بیش بہا نعمتوں میں سے ہے۔

جس تاج نے دس برس تک لگاتار بیس ہزار مزدوروں اور کاریگروں کی پرورش کی جس نے بے نور کی پتھر کی کاریگری کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ ایسے چار چاند لگا دئیے جو شاعر اعظم رابندر ناتھ ٹیگور کے لئے بہترین شاعری اور دنیا کے ماہرین فن کے لئے پیام حیرت ہے یہ ہماری اس مصیبت زدہ حالت میں بھی ہندوستان کے بیمار جسم اور جھکے ہوئے سر پر جھومر کی طرح چمک رہا ہے۔

کئی وجوہ سے ہماری غلطیوں اور باہر کی دستبرد سے ہماری وہ رفتار رک گئی لیکن پھر بھی اس مجموعی رفتار کا دخل ہمارے روزمرہ کی زندگی میں اتنا گہرا ہو چکا ہے کہ اس سے انکار کرنا یا اس سے پھرنے کی کوشش کرنا خودکشی کرنا ہوگا اور بغیر اپنی کھال اور اپنا گوشت نوچ کر پھینکے ہوئے ہندو اور مسلمان دونوں کے لئے اس طرح کی کوشش غیر ممکن ہے۔ یہ صرف ہماری تنگ نظری اور جہالت کا اظہار ہے کون سمجھدار ہندو اپنے باغ سے گلاب اس لئے نکال کر پھینک دے گا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ایران سے آیا تھا ہماری مٹھائیوں میں سے تین چوتھائی شاہجہاں کے وقت کی ایجاد ہیں جیسے کہ اس کے فارسی اور عربی ناموں سے ابھی تک پتہ چلتا ہے ہماری پوشاک میں آدھی سے زیادہ چیزیں ایسی ہیں کہ ہم مندروں میں اپنے دیوتاؤں کا

سنگار کرتے ہیں مسلمانی رمانہ کی ہیں ہمارے بہت سے خوبصورت اور لذیذ میوے اسی دور کے ہیں کم سے کم شمالی ہندوستان میں ہر ہندو شادی کے زمانہ میں 'زستاہ' متاہے ہندو کی شادی بغیر سہرے اور جامہ کے نہیں ہوتی ۔ اور کروڑوں مسلمانوں کی ساری بغیر کنگن کے نہیں ہوتی ۔ سہرا اور جامہ مسلمانی ہے اور کنگنا ہندو مجھے نہیں معلوم ہندوستان بھر میں کتنے مسلمان گھر ملیں گے جن میں لڑکیوں اور لڑکوں کے کان اور ناک چھدنے کی رسم نہ ہوتی ہو دونوں رواج ہندوانہ ہیں جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں مجھے ان مثالوں کے بڑھانے کی ضرورت نہیں ہے اگر اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو ہم ایمانداری سے دیکھیں تو متعدد باتوں میں ایک پشاور کے ہندو اور ایک مدراس کے ہندو میں کہیں زیادہ فرق ہے بہ نسبت پشاور کے ایک ہندو اور پشاور ہی کے ایک مسلمان میں ۔

اگر ہم مذہب یا مذہبی اصولوں کی نظر سے دیکھیں تو بے تعصبانہ مطالعہ کرنے پر ہمیں ہندو مذہب اور اسلام دونوں میں ایک حیرت انگیز یکسانیت اور دونوں میں ایک سی لہر چلتی ہوئی دکھائی دیں گی یا ہندو مذہب کے کسی کسی فرقہ کے درمیان کہیں زیادہ فرق ہے بہ نسبت ہندو مذہب اور اسلام کے اس بارے میں بابو بھگوان داس کی خوبصورت کتاب THE UNITY OF ALL RELIGIONS تمام مذہبوں کی یکسانیت ہر ہندوستانی کے پڑھنے کے قابل ہے ۔

میں کہہ چکا ہوں کہ ہر مذہب ملک میں لوگوں کو پوری مذہبی آزادی ہونی چاہئے لیکن اگر ہم فرقہ وارانہ اختلافات سے اوپر اٹھ کر حقیقی یعنی گہرا انسانی مذہب کی جانب جانا چاہیں اگر ہم اپنے ملک کی ہزاروں سال پہلے کی اس قدیم تعلیم کو زندگی میں جگہ دینا چاہیں جو اپنشدوں کے اندر بند ہے تو ہمیں محسوس کرنا ہوگا کہ کسی قسم کی بھی تنگ دلی کسی دوسری چیز کے لئے اتنی مہلک نہیں ہے جتنی سچی مذہبی زندگی کے لئے ۔ عالمگیر صلح جوئی کی اگر کہیں بھی سب سے زیادہ ضرورت ہے تو مذہب میں ۔

اپنشدوں کا یہ قول ہے کہ گائیں تو مختلف رنگوں کی ہوتی ہیں مگر دودھ ایک ہی رنگ کا ہوتا ہے عارف گایوں کے رنگ کے اختلاف کو نہیں دیکھتا دودھ کے رنگ کو دیکھتا ہے ۔

اور مسلمان صوفی کا یہ قول ہے ۔

جام صد رنگ راں خم صفا ؎ سادہ یک رنگ گشتہ چوں صبا

مطلب دونوں باتوں کا ایک ہی ہے۔

ہمہ گیر انسانی مذہب کا سہارا کسی خاص علامت پر نہیں ہے انسانی مذہب ایک دل کی چیز ہے وہ ہمہ گیر محبت کا مذہب ہے دنیا کی تمام مذہبی کتابوں میں انسانوں کو حقیقتاً اس سمت لے جانے کی کوشش کی گئی ہے رسم و رواج اور شریعت صرف طریق کار ہے اس انسانی مذہب کی صنی جامع واضح اور خوبصورت تشریح کبیر، نانک، دادو وغیرہ پندرھویں سولھویں اور سترھویں صدی کے بے شمار ہندوستانی سنتوں اور ان کے ہمعصر یا ان سے پہلے کے مسلمان صوفیوں کی تعلیموں میں ملے گی اس سے بڑھ کر اور کہیں ملنا دشوار ہے۔

کبیر کا کلام

پورب دشا ہری کو باسا پچھم اللہ مقاما — ۱؎ طرف

دل میں کھوج، دل ہی میں کھوجو اہی کریم راما

جتنے عورت مرد اُپانی سو سب روپ تمہارا — ۲؎ پیدا کئے

کبیر پونگرا اللہ رام کا سو گرو پیر ہمارا — ۳؎ غلام

ہندو کہیں رام ہوں پیارا ترک کہیں رحمانا — ۴؎ مجھکو

آپس میں دونوں لڑ لڑ موے مرم نہ کاہو جانا — ۵؎ بھید

دادو کا کچھ کلام ہے

آپا میٹے ہر بھجے تن من تجے وکار — ۱؎ خودی ۲؎ چھوڑے ۳؎ برائیاں

نربیری سب جیو سوں دادو یہہ مت سار — ۴؎ عدم عداوت ۵؎ سے ۶؎ خلاصہ مذہب

سب ہم دیکھیا سودہ کر دوجا ناہیں آن — ۷؎ غور کرکے ۸؎ دوسرا ۹؎ کوئی

سب گھٹ ایکے آتما کیا ہندو مسلمان

ناری پرش کا نام دھرا ای ششے بھرم بھلان — ۱۰؎ عورت ۱۱؎ مرد ۱۲؎ مغالطہ ۱۳؎ بھول

سب گھٹ ایکی آتما کیا ہندو مسلمان

دونوں بھائی ہاتھ پگ دونوں بھائی کان — ۱۸ پیر

دونوں بھائی مین بچ ہیں ہندو مسلمان — ۱۹ آنکھ

کس سوں بیری ہور کا دوجا کوئی ناہیں — ۲۰ نہیں

جس کے انگ تصرف بھیا سوئی ہے سب ناہیں — ۱۸ سدا ہوا ۱۹ میں

سچے انسانی مذہب کی تشریح کرتے ہوئے داودے کہا ہے۔

ہندو ترک نہ ہو نگا صاحب سیتی کام — ۲۰

شٹ درشن کے سنگ نہ جاسا رنکش بیارام — ۲۱ ۲۲ تا ستر ۲۳ بے تعصب

نا ہم ہندو ہوئیں گے نا ہم مسلمان

شٹ درشن میں ہم نہیں ہم راتے رحمان — ۲۴ یہ لفظ بہت جامع ہے مختصراً اسکے معنی رنگے ہوئے یا لگے

کرنی ہندو ترک کی اپنی اپنی ٹھور — ۲۵ اعمال ۲۶ طرف

دو کہوں بیچ مارگ سادھ کا۔ سنتوں کی رہ اور — ۲۷ دونوں ۲۸ مارگ ۲۹ دردیش

دادو ہندو ترک کا دوے کچھ نیتہ نوار — ۳۰ دورجہ ۳۱ مسلک ۳۲ ختم کر

جگ ساچے سادھ کی سائیں کو سنبھار — ۳۳ ساتھی ۳۴ سچے ۳۵ سمحال

ہندو لاگے دیوہرے مسلمان مسیت — ۳۶ چھکے ۳۷ مندر ۳۸ مسجد

ہم لاگیں ایک الکھ سوں سدا نرنتر پریت

نہ تہاں ہندو دیوہرا نہ تہاں ترک مسیت

دادو اپنے آپ ہے نہیں تہاں رہ ریت — ۱ وہاں ۲ راہ رسم

یہ مسیت یہو دہورا ست گورو دیا دکھائے — ۳ مرشد برحق

بھیتر سیوا بندگی باہر کاہے جائے — ۴ اندر ۵ خدمت

دونوں ہاتھی ہے رہے مل رس پیا رجائے — ۶ دونوں

دادو آیا بیٹ کر دو جور سے سمائے
دلو دودے[5] کچھ دور کر[6] نزدیکچہ[7] رل مادُں[8] — ۵ روشہ ۶ راہ ۷ بے راہ ۸ پاک ۹ نام
آیا بیٹے ہیر سمجھے تاکے میں بل جادں[10] — ۱۰ قربان

کبیر پیدایش سے مسلمان تھے اور دادو ہندو لیکن دونوں ہندو مسلمان کے اختلاف سے کوسوں اوپر تھے اس کے بعد نمونے کے طور پر دو چار اقتباسات اورنگ زیب کے ہمعصر دہلی کے ایک مسلم سنت (درویش) یاری صاحب کے سنئے۔

کبیاری بھگتی کرو ہر کی۔ دل دن رین ادھک[13] سونہ ہر کی — ۱۳ زیادہ
کام کرودھ[14] جنجال بھسم[15] ہو۔ رہ اگن لگے[16] دھدھکی — ۱۴ خواہشات نفسانی ۱۵ عصہ ۱۶ جل گیا

ہمارے ایک اللہ پیا پیارا ہے۔
سب مون بچون اکیلا ہے، ترک سے نیارا ہے
ادبکار کے پار بیج تیج ابھمان[18] کلیس — ۱۸ غرور
تیموں آچھر[19] پریم کے یہی بڑا اپدیش[20] — ۱۹ حرف ۲۰ وعظ
گھٹ[21] گھٹ بولے رستا رام[22]۔ ما درں ماراین نام — ۲۱ دل ۲۲ سما ہوا
عرش بیچ[23] میں رہے سماتے۔ تاکا آداگون[24] ساتے[25] — ۲۳ حسن دم ۲۴ آنا جانا ۲۵ ختم
وے اپدیس ملاویں رام۔ ہوں بلہاری[26] گرو کے نام — ۲۶ قربان
کاف کمارنگ[27] کوپ[28] گوالا۔ ترسنا[29] موہ بھرم جنجالا — ۲۷ براراستہ ۲۸ کنواں ۲۹ لالچ
یہ آیو ہیں سوں تج کے پرالی بت گرو بھیں[30] امرت[31] بانی[32] — ۳۰ آب حیات ۳۱ کلام
لابھ لوبھ لالچ چترائی[33]۔ ان کے چھوڑے ہوئے بھلائی — ۳۳ ہوشیاری
جھنڈا[34] ار لنگوٹی راکھی۔ سب سادھوں مل بولیں ساکھی[35] — ۳۴ نشان ۳۵ تصدیق
بسم مہادیو اور سکھدیو۔ تینوں لوک کے حاضر بھیو[36] — ۳۶ بھید
جو ان کے مارگ منہہ چلے۔ رنگھون سوتھے اور پت[37] ملے — ۳۷ مراد۔ خدا سے

گوتم ہیر دسر کی کایا ۔ نا تو جنم اکارتھ جاتا
رام نہ سمرو تجو بکارا ۔ بھج بھگونت اتر بھو پارا
داؤد ہی ہے اور نہ دوجا ۔ آپ ہی ٹھاکر آپ ہی پوجا
آپ ہی آپ اور نہیں آنی ۔ ایسا سادھو ہے برہم گیانی

بے شک ہندو اور مسلمان پارسی اور عیسائی اختلافات سے اوپر رسم و رواج شریعت اور کورانہ تقلید سے اوپر عوام کے لئے معمولی کاروبار اور سیاسی تعلقات میں معرفت کا راستہ بتانے والی جو مذہبی صلح جوئی اس وقت ہندوستان میں ظہور میں آرہی تھی اس سے بالاتر صلح جوئی کا قیاس ہی نہیں کیا جا سکتا آئندہ ہندوستان میں جبکہ سب مذہبوں کو پوری آزادی ہوگی ان لوگوں کو جو اس ملک یا قوم میں دوست قائم کرنا چاہتے ہیں یہی اونچا معیار ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھنا ہوگا مجھے معلوم ہے کہ ہمعصر دکھنی فقرا کا کلام بھی انہی خیالات سے پر تھا

ہندوؤں میں ذات پات | بے شک اس قومی صلح جوئی میں ذات پات یا چھوت اچھوت کے امتیاز کا کوئی گذر نہیں اس بارے میں مجھے آپ کا وقت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اس قسم کی باتوں میں کھری اور صفات کہاں ہی اصل ہو سکتا ہے۔ اچھے سے اچھا پھل بھی اگر بہت دیر تک رکھا جائے تو سڑنے لگتا ہے اور آخر میں بجائے آب حیات کے زہر ہلاہل کا کام کرنے لگتا ہے۔ روح لافانی ہے مگر جسم فانی ہے اسی طرح اصول دین باقی اور حقیقی ہے لیکن جن انسانی جماعتوں میں اسے مقید کیا جاتا ہے وہ ہمیشہ نہ رہنے والی فانی اور تغیر پذیر ہیں ہندوؤں میں ذات پات کا امتیاز کسی وقت میں کسی ابتدائی شکل میں سوسائٹی کے نظام کا کتنا ہی مناسب عمل اور خوبصورت کیوں نہ رہا ہو اب صدیوں سے ایک خطرناک مرض کی طرح اس ملک کو مکمل فنا کی طرف لئے جا رہا ہے۔

اس زمانہ کی اس زہریلی رسم کو ایک بار جڑ سے اکھاڑ کر پھینکنا ہوگا میرا مطلب یہ نہیں کہ ہم اس بارے میں کسی کے ساتھ کسی طرح کی زبردستی کریں میں صرف اس معیار کو آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں جو ہر ایسے ہندوستانی کے سامنے رہنا چاہئے جو اس ملک میں قومیت یا قوم پرستی قائم کرنے میں حصہ لینا

چاہتا ہے۔ سبھا سینہ بھارتی آنجہانی کے قائل زبان کے محسن اس بارے میں سونے کے حروف میں لکھ لینے کے قابل ہیں میں صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ جو لوگ بھی قوم پرستی قائم کرنے میں حصہ لینا چاہتے ہیں ان کا دل ان کا مزاج ان کا قول ان کا سلوک ہر قسم کی فرقہ پرستی صوبہ پرستی اور ذات پات سے اوپر ہو جانا چاہئے جسے اس ہندوستانیت اس طرح کے قومی اتحاد یا اس قسم کی مکمل صلح جوئی میں اعتقاد نہیں جس کا خیال اور جس کا سلوک اس قسم کی تنگدلی سے اوپر نہیں اٹھا وہ قومیت کے قیام میں ہارج ہو سکتا ہے معاون نہیں ہو سکتا اور قومی زبان کا قیام قومیت کے قیام کا صرف ایک پہلو ہے۔

<u>ہندی اُردو اور ہندوستانی</u> آخر میں تھوڑے سے الفاظ ہندی بھاشا اور ہندی اُردو کے جھگڑے کے بارے میں اور کہنا چاہوں گا میری خوش قسمتی ہے مجھ سے پہلے کے چاروں مقرروں نے اور خاص کر پنڈت رام رتن جی ترپاٹھی نے بڑی خوبی کے ساتھ اس مضمون کو آپ کے سامنے رکھا ہے جس زبان کو آج کل ہندی بھاشا کہتے ہیں اس کی پیدائش اس ملک میں مسلمانوں کے زمانہ میں ہوئی مسلمانوں نے ہی اس کا نام ہندی رکھا امیر خسروؒ اور ملک محمد جائسی اس کے شروع کے شاعر مسلمان ہی تھے مسلمانوں ہی کی حکومت کے زمانہ میں اور خاص کر دکن میں بہمنی اور آخر میں مغل سلطنت میں ہی اس نے سب سے زیادہ ترقی کی اُردو نام ہندو اور مسلمان دونوں نے بہت بعد میں استعمال کرنا شروع کیا اگر ہم رام اور رحیم دونوں ناموں کے پیچھے ایک ہی مالک کو دیکھ سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندی ہندوستانی اور اُردو اس تلبیس میں بھی بس ایک ہی زبان کیوں نہ دکھائی پڑے حقیقت میں ہندی اور اُردو دو زبانیں نہیں ہیں زیادہ سے زیادہ دو شکلیں ہیں خسرو اور جائسی غالبؔ ذوقؔ میرؔ اور دردؔ اسی طرح ہماری قومی زبان کی تعمیر کرنے والوں میں سے اور ہماری قومی جائداد ہیں جیسے تلسی اور سورداس جیون اور بلیٹو، گردھر اور کبیرؔ اگر عثمانیہ یونیورسٹی والوں کی اُردو کو ترقی دینے کی کوشش میں آپ کی ایسی ہی کوشش کا عکس اپنے لئے ایک مبارک مدد دکھائی نہیں دیتی اگر اسی طرح آپ کی کوشش سے محبت اور ہمدردی نہیں ہوتی اس میں اپنا پن محسوس نہیں ہوتا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی قومی زبان کی طرف سے ابھی آپ دونوں کے منہ پھیرے ہوئے ہیں۔

جو زبان آپ کے سامنے بول رہا ہوں وہ ابھی قومی زبان نہیں ہے زیادہ سے زیادہ اس کی طرف ایک

ادھوری اور ناکام کوشش سے ہماری نئی زبان ابھی دھیرے دھیرے قائم ہو رہی ہے۔ یہ سنسکرت بھری ہندی ہماری قومی زبان ہو سکتی ہے اور نہ وہ فارسی عربی بھری اُردو جو بڑے بڑے شہروں سے آگے نہیں دھنس سکی۔ ہماری آئندہ قومی زبان میں سنسکرت فارسی اور عربی کے مروجہ لفظوں اور محاوروں کے ساتھ ساتھ تامل تیلگو گجراتی بنگالی وغیرہ صوبائی زبانوں کے بہت سے لفظ اور محاورات اور انگریزی کے بھی بہت سے الفاظ اور محاورے گنگا جمنا سری کی طرح ملے ہوئے ہوں گے۔

شاید آپ کو یہ معلوم نہ ہو کہ جب کہ ایک طرف ہندی میں بہت زیادہ سنسکرت اور اُردو میں عربی فارسی الفاظ بھرنے کی غلط کوشش ہو رہی ہے دوسری طرف ایک آسان عام فہم مشترکہ زبان کی طرف چلنے کی کوشش بھی دونوں طرف جاری ہے۔ اُردو کے رسالوں میں اکثر اس مضمون پر بحثیں ہوتی رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر اسی سال جولائی کے زمانہ میں جودھپور سے مرزا عظیم بیگ نے اُردو ہندی کا تصفیہ کے عنوان سے ایک عالمانہ مضمون لکھا ہے جس میں انھوں نے اُردو کے اندر نئے عربی الفاظ ٹھونسے جانے کی روش کی ملامت کی ہے اور ہندو مسلمانوں کی ایک آسان عام فہم مشترک زبان بنائے جانے پر زور دیا ہے۔

مرزا عظیم بیگ لکھتے ہیں :-

میری دانست میں اُردو ہندی کا سوال پیدا کرنے والے وہی لوگ ہیں جو اپنے کو اُردو ہندی کا ادیب کہتے ہیں۔ خطا اُردو اور ہندی ادیبوں (دونوں) کی ہے مگر زیادہ سرزنش کے قابل اُردو کے حامی خصوصاً ہمارے مولوی صاحبان ہیں۔ گذشتہ بیس سال کے عرصہ میں اُردو کے حامیوں بالخصوص مسلمانوں نے اُردو میں اتنے نئے عربی الفاظ ٹھونس دئے ہیں کہ ہندوؤں کو اُردو پڑھنے میں بڑی دقت ہو گئی ہے۔ اُن لفظوں کو جو عرصہ دراز سے اُردو میں داخل ہو گئے تھے نکال کر پھینک دیا اور ان کے بدلے عربی الفاظ ٹھونس دئے مثلاً جراحی کے بجائے حاذق لکھنے لگے مہر کی جمع مہریں کے بجائے مواہیر ہو گئی ہے ایروپلین کے بجائے ہوائی جہاز ناپسند طیارہ زیادہ پسند ہے۔ اب یہ بتائیے کہ عام فہم اور ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان کے مروجہ لفظوں کو نکال کر عربی لفظ ٹھونس کر آپ نے ہندوؤں کو ملک کی واحد مشترکہ زبان سمجھنے سے کیوں محروم کر دیا۔ میں پھر عرض کرتا ہوں کہ اصل رونا ذہنیت کا اور واقعی نام ضد اور تعصب کا ہے

آج کل ہر اُردو کا ادیب ہمیشہ عربی ترکیبوں پر مرتا اور جس سے ذہنیت بگڑی ہوئی ہے ہندو در کنار خود مسلمانوں کے لئے اُردو وبال جان بنائی جا رہی ہے۔

لازمی نتیجہ اس زبان کی پیدائش ہے جس کو ہندوستانی کہتے ہیں دراصل یہ زبان پیدا ہو چکی ہے مجھے تو یہی زبان مستقبل میں ہندوستان کی مشترکہ زبان قرار پاتی نظر آتی ہے اس میں نہ عربی کے ثقیل لفظ ہیں اور نہ سنسکرت کے موجودہ اردو اور موجودہ ہندی ادیب دونوں اسے غلط کہیں گے مگر دونوں اسے سمجھ سکیں گے اس میں اُردو داں اور ہندی داں دونوں کے لئے یکساں سہولت ہوگی یہ درۂ خیبر سے راس کماری تک بولی اور سمجھی جائے گی دکن میں دکھنی کا مقامی اثر قبول کرے گی پنجاب میں پنجابی کا اور بنگال میں بنگالی کا۔

اس آسان عام فہم زبان میں لکھنے کی کوشش بھی اُردو کے کچھ صاحبِ دل مسلمان مصنفوں کی طرف سے ہو رہی ہے، ستمبر کے نیرنگ خیال میں فرید جعفری کے قلم سے 'پریم کا مندر' عنوان سے ایک نفیس کہانی چھپی ہے جس کی شروع کی چار سطریں یہاں زبان کے نمونے کے طور پر نیچے نقل کرتا ہوں

کنول اور پریم پڑوسی تھے دونوں گھرانوں میں بھائی چارہ تھا ایک تو ہندوؤں میں پردے کی رسم یوں بھی نہیں ہے پھر کنول اور پریم تو بچپن کے ساتھی تھے بچپن ساتھ گذرا لڑکپن ساتھ گذرا جوانی کے حوصلے میں بھی دونوں ساتھ ہی بیٹھے میونسپلٹی کے مکتب سے لے کر مڈل تک دونوں ہم جماعت تھے پھر پریم الہ آباد چلا گیا اور وہاں جا کر انگریزی اسکول میں داخل ہو گیا کنول گھر میں بٹھا دی گئی یہ دوری بھی کیسے ہی کو تھی ادھر سنیچر آیا اُدھر شام کی لاری سے پریم مالویول پور موجود کنول بھی راہ دیکھا کرتی پریم کو دیکھتے ہی وہ کھِل کھلا پڑی۔ وغیرہ

شروع سے آخر تک تمام کہانی اسی زبان میں بلکہ اس سے بھی آسان خوبصورت اور چلتی زبان میں لکھی ہوئی ہے۔ یہ ہندی ہے یا اُردو۔

اکتوبر کے نیرنگ خیال میں 'متوالے تیرے میں' کے عنوان سے ایک اُردو نظم ایک مسلمان شاعر ماسط بسوانی کی لکھی ہوئی چھپی ہے شاعری غزل کے انداز کی ہے۔ لیکن صرف زبان کا نمونہ دکھانے

کے لئے میں اسے نیچے نقل کرتا ہوں ۔

سوالے تیرے مین سکھی متوالے تیرے مین

سدر بھیب دکھلانے والی ۔ دل پر آفت ڈھانے والی آنکھ چرا کر جانے والی ۔ نیر جل کی برسانے والی

میوں کی یہ بس سکھی متوالے تیرے مین

صورت تیری بھولی بھالی ۔ زلف تیری کالی کالی ناگن جیسی او متوالی ۔ دیکھ رسیلی چتون والی

ہر دے ماہیں چین سکھی متوالے تیرے میں

ماسٹ جاسے درشن ہر ے ۔ کون جتن سے تھکو ہرے ۔ تیری گلی کے ارے پھیرے کرتا ہے وہ سانجھ سویرے

تڑپت ہے دن رین سکھی متوالے تیرے مین

یہ آردو ہے یا ہندی ۔

اسی شاعر کی ایک اور نظم ۔ کوئی نہیں ہے غیر کے عنواں سے نومبر کے نیرنگ خیال میں شایع ہوئی ہے ۔ مجھ سے کوئی پوچھے تو ہندوستان بھر کے سب اخباروں اور رسالوں میں یہ نظم نقل ہونی چاہیے نظم یہ ہے :-

کوئی نہیں ہے غیر ماما کوئی نہیں ہے غیر

ہندو مسلم سکھ عیسائی ؛ دیکھ سبھی ہیں بھائی بھائی
بھارت ماتا سب کی ماتا ؛ گنگا دیوی سب کی مائی

مت رکھ من میں بیر ماما کوئی نہیں ہے غیر

بھارت کے سب رہنے والے ؛ کیسے گورے کیسے کالے
چھوت اچھوت کے جھگڑے پالے ؛ پڑ گئے جس سے جان کی لالے

کاہے کا یہ بیر ماما کوئی نہیں ہے غیر

رام سمجھ رحیم سمجھ لے ؛ دھرم سمجھ ایمان سمجھ لے
مسجد کیسی مندر کیسا ؛ ایشور کا استھان سمجھ لے

کر دو نوں کی سیر بابا کوئی ہیں ہے غیر
سوچے گا کس پن میں بابا ، کیوں بیٹھا ہے بن میں بابا
خاک ملی کیوں تن میں بابا ، ڈھونڈھ لے اسکو من میں بابا
مانگ سبھوں کی خیر بابا کوئی نہیں ہے غیر
دھن دولت میں من اٹکایا ، کا ہے باسط جی للچایا
سب سے نرالی تیری مایا ، کرتا ہے کیوں اپنا پرایا
ناحق کا یہ بیر بابا کوئی ہیں ہے غیر

ذرا غور کیجئے کہ یہ نظم لاہور سے نکلنے والے اردو کے ایک مسلمان اخبار میں شائع ہوئی ہے اور آج کل کے ایک مسلمان اردو شاعر کے قلم سے نکلی ہے ۔

<u>ہماری امید</u> | بہت دنوں سے بچھڑے ہوئے دل ایک دوسرے کو ہم آغوش کرنے کے لئے امنڈ رہے ہیں صرف آپس کی غلط فہمیاں تعصب اور تنگدلی کی ہوائیں حقیر دنیاوی خود غرضیوں کے جھونکے انھیں ملنے نہیں دیتے لیکن کب تک ہندوستان کا دکھا ہوا دل خون کے آنسو بہا کر دریافت کر رہا ہے ۔ کب تک بھائی بھائی کے خون کا پیاسا رہے گا یہ قوم فروشی کا بازار کب تک گرم رہے گا ہندوستان کے ہندو اور مسلمانو ! کب تک تاریخ کی پھیکی روشنی میں ادراک اور اعتماد دونوں اندر سے جواب دے رہے ہیں ۔ کسی کی حالت ہمیشہ ایک سی نہیں رہی ہے یہ دلسوز تماشا بھی چند روز ہے آخر دل سے دل کو راہ ہے بہت دنوں سے رکے ہوئے دریا پھر روروں کے ساتھ ملیں گے پھر ایک بار منبعِ ہندوستانیت کے سنگم سے زوروں کے ساتھ محبت کی دھارا بہے گی اور اس بدقسمت ملک کے بھی دن پھریں گے ۔

میں کہہ چکا ہوں کہ ایک قومی زبان کی ضرورت کو کسی سے کم محسوس نہیں کرتا آپ کی کوشش اس بارے میں نہایت مبارک ہے اسی طرح ، اور اتنی ہی مبارک کوشش میری رائے میں انجمن ترقی اردو حیدرآباد جیسی انجمنوں کی ہے خدا کرے آپ دونوں کو دن دونی رات چوگنی ترقی حاصل ہو اور دونوں پوری طرح اس بات کو دیکھیں کہ دونوں ایک دوسرے کے معاون ہیں مخالف نہیں ۔ بھائی کنھیا لال جی اور منشی پریم چند

جی کی جدوجہد سے اس بارے میں بہت کچھ امید ہوسکتی ہے۔

ساتھ ہی ہمیں کبھی بھی ذریعہ یا وسیلہ کو آخری مقصد نہ مان بیٹھنا چاہئے اگر ہم اوپر کی صلح جویانہ قومی اور محبت آمیز تاثرات سے لبریز ہو کر اس بارے میں آگے نہیں بڑھ سکتے تو ہمارے قدم رک جائیں تو بہتر ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ امریکہ جیسے آزاد ملک میں مرکزی حکومت کے احکام قریب ۱۹ زبانوں میں شائع ہوتے ہیں اور ان میں سے کچھ کے رسم الخط بھی الگ الگ ہیں سوئٹزرلینڈ جیسے چھوٹے سے اور معیاری آزادی حاصل کئے ہوئے ملک میں چار زبانیں سرکاری طور پر منظور شدہ ہیں روس میں تو اب الگ الگ زبانوں کے سہارے پر ہی ایک مشترکہ سوویٹ حکومت کا سسٹم چلایا جا رہا ہے انگریزی دفتروں اور دیسی راج درباروں میں اردو کو نکال کر ہندی کرنے اور ہندی کو نکال کر اردو کرنے کی کوششیں صرف ہماری تنگدلی اور فرقہ وارانہ ذہنیت کا نتیجہ ہیں اور قومیت سوز ہیں اس طرح کی کوشش خاصکر صوبہ متحدہ میں کن کے اشاروں سے شروع ہوئیں کون پردہ کے پیچھے ہندو اور مسلم دونوں کٹھ پتلیوں کے تار کھینچنے والے تھے ان کوششوں کی وجہ سے کس کو حقیقی فائدہ اور کس کے گھروں میں گھی کے چراغ جلے ۔ اس المناک کہانی میں میں پڑنا نہیں چاہتا غیروں کو الزام دینا بے معنی ہے ہمیں اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھنا چاہئے پچھلے تجربہ سے فائدہ اٹھانا چاہئے اور اگر ہم سچ مچ ہندوستانی قومیت کے پجاری ہیں اور ہمارے دلوں میں اس کا ایمان ہے تو اسی کے مطابق ہمیں آیندہ کے لئے اپنا راستہ طے کرنا چاہئے۔

رسم الخط کا سوال زبان سے ایک الگ سوال ہے ٹھیک ٹھیک لکھنے اور ٹھیک پڑھنے کے لئے دیوناگری رسم الخط زیادہ موزوں ہے متعدد صوبوں کے لوگ اسے آسانی سے صوبجاتی رسم الخط کی جگہ بھی دے سکتے ہیں فارسی یعنی اردو رسم الخط ہمارے لئے ایک بڑے خوبصورت شارٹ ہینڈ کا کام دے سکتی ہے ہمیں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ ایشیا کی سیاسی حالت پر نظر رکھتے ہوئے کم از کم آیندہ چند صدیوں کے لئے ہمارے ملک کی قسمت چین جاپان اور کوریا کی قسمت کے ساتھ اس طرح وابستہ نہیں ہے جس طرح افغانستان ایران اور ترکی کی قسمتوں کے ساتھ سنہ ۱۹۲۱ء کی تحریک خلافت کے مذہبی پہلو کو چھوڑ کر اس کا ایک زبردست سیاسی پہلو تھا جسے ہم نے پوری طرح نہیں سمجھا ۔ امان اللہ خاں رضا شاہ پہلوی اور

کمال پاشا کو صرف ہماری اپنی خودغرضی کی نظر سے ہی ہندوستانیوں کے دلوں میں جو جگہ ملنی چاہیئے وہ ابھی تک نہیں ملی یہ سوال ذرا گہرا اور سنجیدہ ہے۔ بمبئی سے جاتے وقت ہر ایک ہندوستانی کے محبوب امان اللہ خاں نے مہاتما گاندھی کے لئے جن محبت آمیز لفظوں کا استعمال کیا تھا وہ صرف رسمی آداب نہ تھے بلکہ ان لفظوں کے پس پشت ایک گہری سیاسی حقیقت اور اپنی جان پر کھیلنے والا ایک بہادر دل تھا۔
فارسی رسم الخط ابھی بہت دنوں تک ہمیں مغربی ایشیا کے تحریکوں کو سمجھنے اُن سے اپنا ناطہ جوڑے رکھنے اور اسے زیادہ مضبوط کرنے میں مدد دے گی اور اگر آخر میں ایک قومی زبان کے لئے ایک رسم الخط کا ہونا ضروری ہے تو یہ سوال بھی اگر کبھی حل ہو سکتا ہے تو باہمی اعتماد اور ایک دوسرے کی محبت ہی سے مضبوط ہو جانے پر ہو سکتا ہے۔

مجھے یاد آتا ہے کہ مہاتما گاندھی نے کسی زمانہ میں یہ صلاح دی تھی کہ ہر ہندو اور ہر مسلمان کو ناگری رسم الخط اور اُردو رسم الخط دونوں سیکھنے چاہئیں کسی بھی معمولی سے معمولی دماغ والے انسان کے لئے یہ کام کچھ بھی مشکل نہیں ہے خاص طور پر آپ لوگوں سے میری یہ سفارش ہے کہ اگر آپ لوگ اپنے ملک کی اور باہر کی اسلامی تاریخ جاننا چاہتے ہیں اگر آپ مسلم صوفیوں اور اُردو شاعروں کے خیالات سے واقف ہونا چاہتے ہیں اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ فی زمانہ ہندوستان کے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے خیالات اور جذبات سے واقف رہیں اور دلوں میں محبت قایم ہو تو آپ میں سے جتنے بھی لوگ ہیں اور خاص کر وہ سب بھائی جن کا مقصد قومی زبان کے قایم کرنے میں حصہ لینا ہے جتنی جلدی ہو سکے اُردو رسم الخط کا علم بھی حاصل کر لیں اور اُردو ادب سے بھی واقفیت حاصل کریں۔

میں نے آپ کا بہت وقت لیا جس محبت اور سکون کے ساتھ آپ نے میری اس زیادتی کو برداشت کیا اس کے لئے میں آپ کا نہایت ممنون ہوں۔

دکن بھارت ہندی پرچار سبھا کے کام اس کے اصولوں اس کے طریقوں اور اس کے لائق کارکنوں سے میں خوب اچھی طرح واقف ہوں میرے دل میں آپ کی اور آپ کے کام کی گہری عزت ہے میں قومیت کے قیام کے متعدد دوسرے چند سچے تعمیری کاموں میں عظیم سے عظیم اور پاک سے پاک کاموں میں آپ کے کام

کو شمار کرتا ہوں میرا دل اس بارے میں بھی امیدوں سے بھرا ہوا ہے۔

آپ کی اس وقت تک کی حیرت انگیز کامیابی مستقبل کی اس سے کہیں زیادہ حیرت انگیز کامیابی کا پیش خیمہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ پنڈت ہری ہر شرما پنڈت ستیہ نراین پنڈت رشی کیش شرما اور ان کے بے غرض ساتھی صدیوں تک ہماری قومیت اور قومی زبان کے سچے ساتھیوں میں شمار ہوں گے سبھا کے طالبعلموں کا پاک فرض ہے کہ وہ اس پاک کام کو اور اس پاک جذبہ کو ترقی دینا اور قومی زبان کے پیغام کو ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچانا ہمیشہ اپنی زندگی کے کاموں میں سے ایک خاص کام سمجھیں۔ خدا آپ کی اور ہماری دلی خواہشوں کو پورا کرے۔

اسکول

جب میں شروع شروع میں مڈل اسکول کا ہیڈ ماسٹر ہو کر یہاں آیا تھا تو ایک بالکل اجنبی کی حیثیت رکھتا تھا۔ قصبے بھر میں میرا کوئی دوست نہ تھا۔ صرف منشی سعید الدین سے کچھ مراسم تھے۔ جس کا سبب یہ تھا کہ جب میں نے پہلے دن ریل کے اسٹیشن سے باہر نکل کر قصبے میں قدم رکھا تھا تو منشی صاحب بہت اخلاق اور محبت سے پیش آئے تھے، اور ایک نو وارد پردیسی کو جن مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان کو عبور کرنے میں اُنھوں نے نہایت خلوص کے ساتھ میری مدد کی تھی۔ اُن کے اس احسان سے قطع نظر، ان میں اور بھی بہت سی ایسی خوبیاں تھیں جن کی بنا پر میں اُن سے وقتاً فوقتاً ملتے رہنے پر مجبور تھا۔ ان خوبیوں کا تذکرہ غیر ضروری اور غیر متعلق ہوگا کیوں کہ یہاں مجھے منشی صاحب کی بابت نہیں بلکہ منشی صاحب کے اکلوتے بیٹے اقبال کی بابت گفتگو کرنی ہے۔

اقبال اُس وقت تقریباً چھ سال کا ایک ہونہار بچہ تھا۔ چھریرا جسم جس کو کبھی قرار نہ تھا، دُبلے پتلے ہاتھ پاؤں جن میں بجلیاں بھری ہوئی تھیں، بڑی بڑی چمکدار آنکھیں جن سے شوخی، شرارت، اور ذہانت ٹپکتی تھی۔ وہ کبھی نچلا نہ بیٹھ سکتا تھا۔ ہر وقت اُچھلتے رہنا اور ہر لحظہ ایک نیا ہنگامہ بپا کئے رہنا، اس کے کردار کی نمایاں خصوصیت تھی۔ بات کرتا تھا تو ہنستا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ باپ کی سنجیدگی سے شاید اس کو کوئی حصّہ نہیں ملا تھا۔ جب کبھی میں منشی صاحب سے ملنے جاتا تھا تو سب سے پہلے وہ ڈیوڑھی میں آکر گرمجوشی کے ساتھ مجھ سے ملاقات کرتا، سلام کرکے دلیرانہ انداز میں مصافحہ کرتا اور پھر چہک چہک کر باتیں بناتا۔ میں دل میں سوچتا کہ یہ بے باک، تیز زبان، اور شوخ مزاج لڑکا اُن سہمی ہوئی بسورتی اور ٹھٹکی ہوئی مورتیوں سے کس قدر مختلف ہے جو میرے اسکول میں فرش پر بیٹھی ہوئی اُونگھا کرتی ہیں۔ اس لڑکے میں اور اُن لڑکوں میں کتنا فرق ہے۔ یہ ایک بجلیوں سے بنا ہوا پتلا ہے، وہ بے جان مجسمے ہیں۔ یہ ایک جیتا جاگتا انسان ہے، وہ مردہ

تصویریں ہیں۔ پھر میں منشی صاحب سے کہتا، "منشی صاحب! آپ کا یہ لڑکا ایک جوہر قابل ہے۔ اس کی ہر بات اور ہر انداز سے ایک درخشاں مستقبل کا پتہ چلتا ہے۔ اگر اس کو مناسب تربیت اور صحیح تعلیم نصیب ہوئی تو کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کیا بن جائے گا۔" منشی صاحب کہتے، "بھئی اگر یہ بات ہے تو میں اس کو تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ جس طرح چاہو پڑھاؤ لکھاؤ، ورنہ مجھے تو اس شہدے میں کھیل کود، شرارت اور گستاخی کی قابلیت کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔" اس کے جواب میں میں بچوں کی نفسیات پر ایک طویل اور مدلل تقریر کرتا اور منشی صاحب کو سمجھاتا کہ جس کو ہم لوگ کھیل کود، شرارت اور گستاخی کی قابلیت کہتے ہیں وہ بڑی قابل قدر چیز ہے بشرطیکہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔

جب اقبال آٹھ برس کا ہو گیا تو اُسے اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ اس بات کو اب تقریباً تین مہینے ہو گئے ہیں اور وہ برابر اسکول آتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ اسکول میں داخل ہو کر اُس نے (غیر شعوری طور پر) محسوس کیا ہوگا کہ یہ دنیا اس دنیا سے بہت مختلف ہے جس میں میں نے اب تک اپنی زندگی گزاری ہے۔ یہاں متواتر پانچ گھنٹے پاؤں توڑ کر بیٹھنا پڑتا ہے۔ یہاں زندگی اور حرکت کا نہیں، جمود کا سبق دیا جاتا ہے۔ فکر کی آزادی پر تعصب اور تنگ نظری کے پہرے بٹھائے جاتے ہیں۔ جو طالب علم کہے وہ غلط، جو استاد کہے وہ صحیح۔ بے تکلفی کے ساتھ بولنے کی اجازت نہیں۔ اگر تم کہنا چاہتے ہو تو منہ بند رکھو اور صرف ہاتھ اٹھا لو۔ اجازت مل جائے تو بولو، ورنہ دل کی بات دل ہی میں رہنے دو۔ تمہاری مرضی کو کسی کام میں دخل نہیں۔ جو استاد کہے وہ کرو۔ اور جس طرح کہے اس طرح کرو۔ اس نے سوچا ہوگا کہ مزے مزے کی باتیں، پرلطف کہانیاں، دل لبھانے والے مشاغل، یعنی وہ تمام چیزیں جو باہر کی دنیا میں مجھے ہر وقت میسر تھیں یہاں نصیب نہیں۔ یہاں تو کتابوں سے سر پھوڑنا پڑتا ہے، ان کتابوں سے جن میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اور کوئی مزے کی بات نہیں ہوتی۔ مہمل الفاظ کو رٹنا پڑتا ہے۔ صوبوں، کمشنریوں اور ضلعوں کے بے معنی ناموں کو حفظ کرنا پڑتا ہے۔ اور جب حفظ نہیں ہو سکتے تو استاد کے بید پڑتے ہیں۔ بید کی ضرب سے بے حد تکلیف ہوتی ہے، جان سی نکلنے لگتی ہے، کئی کئی

دن تک یہ ماریا و رہتی ہے۔ یہاں، اس اسکول کے اندر، یہی سب ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ نفرت انگیز کتابیں، بے لطف اسباق، تنگ و تاریک کمرے، غراتے ہوئے استاد، لد، ان کے خوفناک بید، ان مصیبتوں کے سوا یہاں کوئی راحت نہیں۔ اور اس چار دیواری کے باہر؟ اس کے باہر کھلی ہوئی فضا ہے، کشادہ میدان ہیں، لہلہاتے ہوئے کھیت ہیں، طرح طرح کے کھیل ہیں ہنسی ہنسی کی باتیں ہیں، دوستوں کی محبت ہے، ماں باپ کا پیار ہے

ہاں میرا خیال ہے کہ اقبال نے اسکول میں داخل ہونے کے بعد یہ اور اس قسم کی اور بہت سی باتیں محسوس کی ہوں گی اور دیکھی ہوں گی۔ اور ان سب باتوں سے اس کا ذہن متاثر ہوا ہوگا خوفناک طریقے پر متاثر ہوا ہوگا۔

چنانچہ اب ——— اب جب کبھی میری اس کی مڈبھیڑ ہو جاتی ہے، اسکول میں یا اسکول سے باہر، تو وہ شرما کر، جھینپ کر، خوفزدہ انداز میں، دور سے سلام کرتا ہے۔ قریب آتے ہوئے جھجکتا ہے، بات کرتے ہوئے ہچکچاتا ہے۔ شوخی، شرارت، چلبلاپن، بے باکی، اور وہ تمام اوصاف جو نو ماہ پہلے تک اس میں شدت کے ساتھ پائے جاتے تھے اس کے اندر سے غائب ہو چکے ہیں۔

اور میں یہ سوچتا ہوں کہ اسکول نے اس لڑکے کو بنا دیا یا بگاڑ دیا، اس کی زندگی سنوار دی یا برباد کر دی، اس کو تہذیب و علم کی دولت بخشی یا اس کی شخصیت کو کچل ڈالا اور فنا کر دیا۔

ہندوستانی ڈراما

(دہلی ایمپیریل براڈکاسٹنگ اسٹیشن کے کارکنوں کی اجازت سے پریم چند کا وہ مضمون درج کرتے ہیں جو حضرت موصوف نے وہاں سنایا تھا)

آدمی دنیا میں آیا تو تماشے کا چسکا اپنے ساتھ لایا پہلے جب اسے بولنا بھی اچھی طرح نہیں آیا تھا وہ اپنے من کی موجوں کو اچک پھاند اور نقل میں ظاہر کرتا تھا۔ جیسے جیسے اس کی قابلیت بڑھتی گئی اس کے حوصلے بھی بڑھتے گئے۔ اس کی اچک پھاند ترقی کرکے ناچ بن گئی۔ اور نقل کرنے کی خواہش نے آخر میں ناٹک کی صورت پائی۔ آدمی کا مذاق بھی ساتھ ہی بدلتا رہا۔ اور جب دنیا میں ناٹک کا رواج ہوا۔ آدمی کا حوصلہ خالی کرتب دکھانا نہیں تھا بلکہ آپ بیتی سنانا۔ اور اس طرح ناٹک کو اپنے دل کا آئینہ بنانا۔ آدمی کو آدمی کے مرتبے پر پہنچانے میں سب سے زیادہ ہاتھ مذہب یا دھرم کا رہا ہے۔ اور ناچ اور ناٹک شروع میں پوجا پرستش کے طریقے تھے۔ پھر وہ دھرم سے الگ ہوتے گئے۔ اور آخر میں ایسا وقت آیا جب لوگ انھیں مہا پاپ سمجھنے لگے۔ خیر اس سے ہمیں مطلب نہیں مطلب ہمیں اس سے ہے۔ کہ ناٹک یا ڈراما اس وقت ہمیں دنیا کی جیتی جاگتی تصویریں دکھا کر اپنی زندگی کو سمجھنا اس کی قدر کرنا اور اسے سدھارنا سکھاتا ہے۔ لیکن آدمی کے لئے سب سے دلچسپ تماشا اس کا اپنا دل اور اس دل کی کیفیتیں ہوتی ہیں۔ انھیں کو وہ ہر طرف اور ہر حالت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لئے زندگی کی جیسی بھی تصویر دکھائی جائے ہمیں سب سے زیادہ خیال اس کا رکھنا چاہئے کہ ہم آدمی کو اس کی اپنی صورت دکھا رہے ہیں۔ ہندوستانی ناٹک کی سب سے پرانی اور سدا بہار شکل رام لیلا جیسے مذہبی تہوار ہیں۔ اور اس قسم کے ڈرامے ہمارے یہاں اب تک موجود ہیں۔ لیکن ناٹک کی دوسری شکل جسے کالی داس اور بھوبھوتی نے کمال کو پہنچایا اب دیکھنے میں نہیں آتی۔ اس لئے کہ ظلم نے اس کی جڑ کاٹ دی ہے۔ اس طرح ناٹک کی تیسری شکل بھی اب مٹی جا رہی ہے۔ ہمارے دیس کے باہر تو وہ اب بھی بہت مشہور ہے۔ جرمنی اور فرانس میں لوگ اب بھی ہندوستانیوں سے اس کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں۔ لیکن ہم خود اس کی

قدر نہیں کرتے۔ شاید اس سبب سے کہ ہم بدیسی زبان بولتے اور بدیسی کپڑے پہنتے پہنتے مذاق اور پسند میں بھی بدیسی ہوگئے ہیں۔ اور ناٹک کا یہ تیسرا سوپ ٹھیٹھ دیسی ہے بھلا بتائیے آپ کو بندر کا تماشہ دیکھے کتنے برس ہوگئے؟ آپ کہیں گے کہ اب بندر والے دیکھنے ہی میں نہیں آتے میں بھی یہی کہتا ہوں اب یہ بچارے آئیں تو کس اُمید پر؟ آپ خود ہی سوچئے کہاں صاحب بہادر اور کہاں ڈگڈگی، کہاں آج کل کے قیمتی فراک اور ساریاں، کہاں وہ سیدھی سادی دیہات کی گھنگھریا۔ کہاں آج کل کے شاندار سینما اور کہاں وہ بھیڑ اور سڑک کا کنارہ، کہاں آج کل کے بکنگ آفس اور ٹکٹ اور کہاں بندر والے کی میلی ٹوپی کہ دو پیسے ڈال دیجئے تو حضور سرکار رعگواں کہلائیے۔ اور کچھ نہ دیجئے تو بھی کہا سُنا معاف۔ اور پھر بیچاری بندریا کی ہستی کیا۔ یہ بھی تو نہیں کہہ سکتے کہ آدمیوں کی سی صورت ہے۔ جو اسے سدھاتا اور ناٹک کے گُر سکھاتا ہے۔ وہ بھی ایک گنوار ہی ہوتا ہے۔ نہیں تو یہ کہنے کو ہو جاتا کہ خیر، صورت شکل کچھ نہیں، تعلیم تو اچھی ہے۔ لیکن یاد رکھئے کہ بندر بندریا کے ناچ تماشے میں سینکڑوں پتے کی باتیں ہوتی ہیں۔ جو اب تک ہمارے ڈراما اور فلم میں نہیں ملتی ہیں یورپ کے جن پنڈتوں نے اس میں سوچ بچار کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ مرد عورت کا سب سے پرانا اور اچھا رشتہ وہی ہے جو اس تماشے میں دکھایا جاتا ہے۔ اور اگر ناٹک کا مقصد ہمیں زندگی کے بھید بتانا ہے تو اسے اپنی نظر مرد عورت کے رشتے کے اسی پہلو پر جمانا چاہئے جو اس ٹھیٹھ دیسی تماشے میں نہایت مزیدار طریقہ پر پیش کیا جاتا ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے۔ کہ بندریا کوئی خوبصورت پری ہونے کا دعویٰ نہیں کرتی۔ اور بندر کوئی سمور راجہ یا کروڑپتی نہیں ٹھہرایا جاتا۔ یہ بات بالکل کھلی ہوئی ہوتی ہے۔ کہ دونوں معمولی بندر ہیں اور معمولی آدمیوں کا پارٹ کر رہے ہیں۔ پھر بھی بندر والا ہمیں جو کچھ دکھاتا ہے۔ وہ بہت دلچسپ اور زندگی کا ایک سچا نقشہ ہوتا ہے۔ اس تماشے میں ایک اور بھی بڑا بھید ہوتا ہے اس میں کوئی مسخرہ کوئی پاگل۔ کوئی اَفیمی نہیں ہوتا۔ لیکن اسے دیکھ کر ہمیں ہنسی آتی ہے اور ایسی ہنسی بڑی مفید ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ہم اپنے اوپر ہنستے ہیں۔ اور زندگی میں مزا اسی کو آتا ہے جو کبھی اپنے اوپر بھی ہنس لیا کرے۔

اسی وجہ سے میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ڈراما لکھنے والوں اور ہماری فلم کی کمپنیوں کو اس پرانے اُستاد یعنی بندر والے سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ آج کل ہندوستان کی کایا پلیٹ رہی ہے۔ ہر طرف آزادی اور انقلاب کا شور سنائی دیتا ہے۔ اور ہمارے نوجوان پرانی زندگی کا تختہ پلیٹ دینے پر تلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ہماری ناؤ لنگر توڑ کر دریا کے کنارے سے منجدھار میں پہنچ گئی ہے۔ اور اب کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کہاں جا کر پار لگے گی۔ ڈراما لکھنے والے کے لئے ہماری بدلتی زندگی رنگ رنگی تصویروں کا ایک خزانہ ہے جو کسی طرح خالی نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ خزانہ اسی وقت کھلے گا جب ہم اپنے اسٹیج پر سے کوڑا کرکٹ ہٹا دیں اگر ہم کو ہنسی مذاق پسند ہے تو ہمیں چاہئے کہ بیہودہ مسخروں کو جو اپنے سارے کرتب دکھا چکے ہیں۔ رخصت کریں پاگلوں کو پاگل خانے اور افیمچیوں کو چنڈو خانے کا رستہ بتا دیں۔ اور اپنی نئی زندگی میں دلچسپی کا نیا سامان تلاش کریں ہم میں سے جو عاشق مزاج ہیں انھیں سمجھ لینا چاہئے کہ دل کھونا اور دل لینا شام کی سیر کی طرح روز کی تفریح نہیں ہے اور سچا عشق اُسی وقت ظاہر ہوگا جب ہم یہ دکھانا چھوڑ دیں کہ حسین عورتیں عیاشوں کے پنجے میں کیسے گرفتار ہوتی ہیں اور جوان مرد شریف ڈاکو بن کر اور لکڑی کی تلوار سے چلا کر انھیں کس طرح چھڑاتے ہیں فوجداری کی وارداتوں کے ساتھ ہمیں ان قصّوں کو بھی کم کر دینا چاہئے جن میں نئے فیشن کے مطابق ماں باپ کی مرضی کے خلاف شادی کرنے والا عشق دکھایا جاتا ہے۔ اور جن میں کبھی کبھی تو صاف پتہ چل جاتا ہے کہ کسی بے چارے غریب کو پکڑ کر زبردستی عاشق بنایا گیا ہے۔ میں نے دو تین مہینے ہوئے ایک فلم دیکھا تھا۔ جس میں ایک صاحب عاشق تو ہو گئے تھے مگر شروع سے آخیر تک یہی سوچتے اور پوچھتے رہے کہ بتاؤ۔ میں کیا کروں۔ میں جان اور مال سب کچھ قربان کرنے پر تیار ہوں مگر بتاؤ میں کیا کروں؟ ایسی بے بسی سے تو بہتر ہے کہ ہم اس کوچے میں ذرا ہوشیاری سے قدم رکھیں اور اپنے دل سے یہ خیال بھی نکال دیں کہ شادی کے بعد زندگی کی تمام دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔ بندر بندریا کے تماشے میں جو کچھ ہوتا تھا شادی کے بعد ہوتا تھا۔ اور ان میاں بیوی کا ماری ماری سے روٹھنا نخرے کرنا۔ اور پھر مل جانا ایسا مضمون تھا جو ہر مرتبہ نیا اور انوکھا معلوم ہوتا تھا۔

لیکن اس وقت یہ کافی نہیں ہوگا کہ ہم اگلے زمانے کے ہندوستانی یا اسی زمانے کے یورپ کے بازاری مذاق کی نقل کرنا چھوڑ دیں۔ ڈراما کا مقصد یہ ہے کہ وہ ہم کو ہماری زندگی سمجھائے۔ اس لئے اس میں کوئی ایسی باتیں نہ ہونا چاہئیں جو ناممکن اور عقل کے خلاف ہوں۔ دکھانے کو تو ہم دکھا سکتے ہیں کہ ایک پیر یا جوگی کی دعا سے چاندنی چوک کے مالدار تاجروں کے بکس کھل گئے۔ ان کے اندر کے روپے پیسے پھرا مار کر اڑ گئے اور فقیروں کی جھولیوں میں پہنچ گئے۔ مگر یہ سوشلسٹ انقلاب نہیں ہوگا۔ انصاف کرنے کا ایک طریقہ۔ یہ اپنی آنکھوں میں ایک دھول جھونکنا ہے۔ اسی طرح ہمیں مبالغہ یا بات کو بہت زیادہ بڑھانے سے پرہیز کرنا چاہئے۔ یہ بھی ایک قسم کا جھوٹ ہے۔ اور اگر ہمیں اس کی عادت ہوگئی تو پھر ہم کھری اور سچی بات کی قدر کرنے کے قابل نہیں رہیں گے۔ ڈراما کے قصے کو ایسا ہونا چاہئے کہ ہماری روزمرہ زندگی میں کھپ جائے۔ پیوند نہ معلوم ہو۔ اور کسی نہ کسی طرح سے ہم سب کی آپ بیتی کہا جاسکے۔ سچے ڈراما اور ان واقعات میں جو ہم روز سنتے یا دیکھتے ہیں بس یہ فرق ہوتا ہے کہ ایک جگہ بے پروائی یا خود غرضی کے سبب سے ہماری سمجھ کام نہیں دیتی۔ اور دوسری جگہ ہماری آنکھیں اس طرح کھول دی جاتی ہیں کہ معمولی سے معمولی بات بھی ایک بھید یا ایک اچنبھا یا علم کے ایک خزانے کی کنجی بن جاتی ہے۔

اسی لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ڈراما کو ہم جو شکل دیں وہ ہماری جانی بوجھی ہو۔ ہندوستانی ڈراما میں صرف ہندوستانی زندگی پیش کی جاسکتی ہے اگر ہم یورپ یا کسی خیالی دنیا کا نقشہ اتارنے جائیں گے تو وہ بہت ٹیڑھا میڑھا ہوگا اور شاید اسے ٹھیک دیکھنے کے لئے ہمیں سر کے بل کھڑا ہونا پڑے۔ اپنی زندگی کی تصویر دکھاتے وقت بھی ہمیں ہر طرح سے مناسبت کا دھیان رکھنا چاہئے۔ مکان، رہن سہن، لباس ہر چیز کو ایسا ہونا چاہئے کہ دیکھنے والے کا مطلب، قصہ کا رنگ اور قصہ کے اشخاص یا کیرکٹر کی کیفیت اس سے جھلکتی ہو۔ پرستان۔ محل۔ بھڑکیلے کپڑے۔ بناؤ سنگھار۔ زیور یہ سب خوبی سے دکھائے جاسکتے ہیں۔ ڈراما میں اثر پیدا کرنے کے لئے ان کی ہرگز ضرورت نہیں۔ اور ان کی لے مانگ میں اس کا ڈر رہتا ہے کہ ڈراما کا اصل مطلب نظر سے چھپ جائے گا۔ ڈراما کا سب سے نازک اور

لطیف حصہ۔ ڈرامہ کا رس اس کی جان ڈراما کے اشخاص یا کیرکٹر ہوتے ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ہیروئن جتنی خوب صورت اور ہیرو جتنا منچلا ہوگا اتنا ہی ڈراما اچھا اور دلچسپ ہوگا۔ آج کل ہم نے چند ملے نیپ' آدمیوں کی چند قسمیں بنائی ہیں۔ اور ڈرامہ میں دکھایا جانا انھی کا حق سمجھتے ہیں۔ ایک دو قسموں کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں' یعنی وہ خوب صورت لڑکی جسے کوئی بدمعاش پکڑے لے جاتا ہے۔ وہ شریف ڈاکو جو اسے چھڑاتا ہے۔ وہ لڑکی جو باپ کی مرضی کے خلاف شادی کرنا چاہتی ہے۔ اور وہ بے چارہ جو اس کا سودائی ہے اس کی مدد کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی چند قسمیں ہیں۔ مسخرہ۔ ایچی۔ سڑی سودائی۔ ظالم باپ۔ جوتا اور جھاڑو چلانے والی بیوی اور اس کے حسبِ حال جوتا کھانے والا شوہر۔ اب ان میں ایک نئی قسم۔ دیش سیوک کی شامل کر دی گئی ہے۔ جو تقریریں کرتا ہے۔ اور اس کے انعام میں اسے ایک بڑی بیک اور خوب صورت بیوی ملتی ہے۔ کبھی کپڑے اور نام بدل کر یہی تقریریں ایک دیش سیوک کی زبانی سنادی جاتی ہیں۔ اب ہم کو سوچنا یہ ہے کہ ہمارے دیس میں کیا جتنے لوگ بستے ہیں وہ ان قسموں میں سے ایک کا نمونہ ہیں یا یہ تقسیم غلط ہے۔ اور ہندوستانی طبیعت۔ مزاج اور وضع کو دکھانے کے لئے ہمیں کوئی اور تدبیر کرنا چاہیئے دوسروں کی نسبت میں کہہ نہیں سکتا' لیکن کیرکٹروں کی جتنی قسمیں میں نے بیان کی ہیں ان میں میں خود کہیں بھی نہیں کھپ سکتا۔ اور اس لئے میں تو یہی کہوں گا کہ اس تقسیم کو چھوڑ کر ہمیں بیچ بیچ کے ہندوستانیوں اور گھڑے ہوئے کیرکٹروں کی جگہ جیتے جاگتے آدمیوں کی تصویر اتارنا چاہیئے۔ ڈراما نویس کو اس کا حق نہیں ہے کہ وہ کیرکٹر کو خاص مطلب کے لئے بنائے۔ کیونکہ وہ خدا کی طرح نئے آدمی نہیں پیدا کر سکتا اور ایسے کیرکٹر لکڑی کے کھلونے یا گراموفون کے ریکارڈ معلوم ہوں گے۔ اور ڈراما کھلونوں کی دکان یا اسکول کا کلاس روم بن کر رہ جائے گا۔ اصل زندگی کی اس میں بو باس نہ ہوگی۔ جس طرح ڈراما نویس کا فرض ہے کہ زندہ آدمیوں کو اپنے ڈراما کے کیرکٹر بنائے' ویسے ہی ایکٹر یا ایکٹریس کا کام ہے۔ کہ ڈراما نویس کی کوشش کو اسٹیج پر کامیاب کر دکھائے اور جو خیال ڈرامہ نویس کے ذہن میں ہو اس کی زندہ تصویر بن جائے یہ کام ڈراما لکھنے سے کچھ کم مشکل نہیں ہے۔ اس لئے کہ ذرا سی غلطی۔ ذرا سا مبالغہ اچھے خاصے کیرکٹر کا خون کر سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے

ایکٹر عام طور سے اثر پیدا کرنے کی فکر میں مبالغے سے کام لیتے ہیں۔ اور ان کی ہر بات پر بناوٹ کا شبہ ہوتا ہے۔ وہ چلّاتے بہت ہیں۔ اگر چلّاتے نہیں تو رونے لگتے ہیں۔ اور جہاں نہ چلّانے کا موقع ہوتا ہے۔ نہ رونے کا۔ وہاں وہ ہمارے ریڈیو اسٹیشن کے اناؤنسر صاحب کے لہجے میں بولتے ہیں۔ کہ جو کوئی بھی سنے وہ سمجھ سکے۔

میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اس سے میرا مطلب کسی پر اعتراض کرنا نہیں ہے۔ بلکہ تھوڑے سے وقت میں یہ سمجھانا کہ ہندوستانی ڈراما کو ترقی کرنے کے لئے کونسا رستہ لینا چاہیئے۔ لیکن اگر کوئی صاحب میرے خیالات کو صحیح سمجھتے ہوں تو میں انھیں اجازت دیتا ہوں کہ جہاں ضرورت ہو مناسب اعتراض کریں ہم کو اصل میں ہمیشہ غور کرتے اور اعتراض کرتے رہنا چاہیئے۔ مگر انصاف تو یہ ہے کہ ہمارے فلم اور ڈراما نے پچھلے دس بیس سال میں بہت ترقی کی ہے۔ اور بنگال اور گجرات میں دوسرے صوبوں کی رہنمائی کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں ناٹک کا رواج پھیل رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ دن بھی بہت جلد آجائے گا جب ہر شہر میں دس سینما ہوں تو ایک تھیٹر بھی ہوگا۔ اور ہونہار ایکٹر اور ایکٹریسیں ویں سے شہرت کی سیڑھی پر چڑھنا شروع کریں گی۔ یہاں تک کہ وہ آسمان کے تارے بن جائیں۔

موزہ

(ذیل میں ہم ایک روسی ادیب کے مختصر افسانہ کا ترجمہ لندن کے رسالہ سوا سٹیٹس ایڈیشن سے
لے کر درج کرتے ہیں جس میں جدید روسی دفتریت کا ایک طنز۔ خاکہ پیش کیا گیا ہے۔)

جی ہاں ٹرام کے اندر موزہ کھونے میں لگتا ہی کیا ہے۔ ایک طرف سے لوگوں نے دبایا۔ پیچھے کسی ہٹے کٹے مسٹنڈے نے آپ کے ربر کے موزے کی اڑی پر اپنا پیر دھر دیا۔ آپ آگے بڑھے اور موزہ غائب! موزہ کھونا یا ٹھوکر کھا کر گرنا ایک ہی سی بات ہے اور صاحب میرا موزہ تو ایسا کھسٹ پٹ پیر سے کھنچ گیا کہ مشکل سے ایک مرغ بھی دو چسکیاں بجا پائی، نہ کچھ کہہ سکا نہ سن سکا۔

جب ٹرام میں بیٹھا تھا تو دونوں ربر کے موزے موجود تھے، ٹھیک درست۔ مجھے ایسا یاد ہے جیسے ابھی کی بات ہو۔ میں تو حالوں سوار ہوتے وقت میں نے ہاتھ سے چھو کر دیکھ بھی لیا تھا، تھے صاحب موجود تھے۔

مگر ٹرام سے اترا ہوں تو ایک موزہ وہ جو مجھے زیادہ پسند تھا۔ موجود ہے، مگر دوسرا غائب۔ کتاب بھی وہ موجود ہے، پاتابہ تھا ہے، پتلون، حاضر جناب، مگر موزہ، غائب۔ یہ کیا کیجئے۔ آپ کچھ ٹرام کے پیچھے دوڑ تو سکتے نہیں۔ ناچار دوسرا موزہ بھی اتارا، اور اسے اخبار میں لپیٹ آگے بڑھا جی میں سوچا " کام ختم کر لوں، تو موزہ کی تلاش کی فکر کروں گا۔ چیز بھی کام کی چیز، کام کی چیز کو کوئی یوں تو اٹھا کے دے نہیں دیتا۔ جیسے تیسے کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈھ ہی نکالوں گا "

کام کر چکا تو تلاش شروع کی۔ پہلے ہی اپنی جان پہچان کے ٹرام چلانے والے سے مشورہ کیا

اس نے فوراً ہی بڑی امید دلائی۔ کہا "شکر کرو، شکر کہ موزہ ٹرام میں کھویا۔ اور کہیں کھویا ہوتا۔ تو میں کیا بتاؤں، میں کسی اور کی طرف سے کیا کہہ سکتا، مگر بھائی ٹرام میں کھونا تو۔ تو۔ ہاں مقدس امر ہے۔ ہمارا گم شدہ چیزوں کا دفتر، کیا پوچھتے ہو، ایسا ہے کہ بس۔ پیچھے اور چیز موجود۔ سچ کہتا ہوں مقدس معاملہ ہے مقدس۔"

میں نے کہا "اچھا بھائی، تمھارا بہت بہت شکریہ۔ تم نے تو میرے سر سے بڑا بوجھ ہٹا دیا اس لئے کہ بھائی موزہ بھی تو تقریباً نیا تھا۔ چل چل۔ زیادہ سے زیادہ تین جاڑے گزرے ہوں گے۔"

میں دوسرے ہی دن گم شدہ چیزوں کے دفتر میں گیا پوچھا "کیوں، کھویا ہوا موزہ بھی واپس مل سکتا ہے؟ ٹرام میں پیر سے نکل گیا تھا، ٹرام میں۔"

"کیوں نہیں۔ مل کیوں نہیں سکتا۔ کیسا موزہ تھا؟"

میں نے کہا "معمولی قسم کا موزہ ہے، نمبر ۱۲۔"

جواب ملا "ہمارے یہاں اسی ۱۲ نمبر ناپ کے بارہ ہزار موزے ہیں۔ اپنے موزہ کی صفات ذاتی بتاؤ۔"

میں نے جواب دیا "صفات ذاتی بھی یہی معمولی قسم کی ہیں۔ ایڑی البتہ ٹوٹی ہوئی ہے اور اندر کا استر — ہاں، استر ہے نہیں، گھس کر نکل گیا ہے۔"

انھوں نے کہا: "ٹھیک ان صفات کے بھی ہزار سے اوپر موزے یہاں ہیں۔ تمھارے موزہ میں کوئی خاص علامات نہیں ہیں؟"

میں نے کہا۔ "ہاں ہیں، خاص علامات ہیں۔ انگوٹھے کے پاس سے چونچ یوں سمجھئے کہ بالکل پھٹ گئی ہے۔ اس جگہ شکل ہی سے کچھ سہارا دیتا ہے۔ اور پیچھے کی طرف تلا بھی، ہاں، تقریباً ختم ہی سا ہے۔ جی ہاں، گھس گیا ہے۔ لیکن پہلوؤں پر، ہاں پہلوؤں پر بالکل ٹھیک ہے، ایسا گیا گزرا نہیں، ابھی چل سکتا ہے۔"

فرمایا "ٹھہرو۔ ہم دیکھتے ہیں۔" اور صاحب، جو اندر سے نکلے تو میرا موزہ لیے ہوئے! واہ واہ! خوشی سے میرا دل کیا کیا اچھلا ہے۔ کیا مسرت تھی! جی میں میں نے کہا ریاست کا بھی کیا

انتظام ہے! اور واہ، کیا لوگ ہیں۔ کیا کیا زحمت انھوں نے اٹھائی، اور سب میرے ایک موزے کے لئے۔ میں نے ان سے کہا "جیتے جی آپ کا شکر گذار رہوں گا۔ لائیے، تو میں ابھی اسے پہن لوں"
جواب ملا "نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم تمھارے نام موزہ نہیں جاری کر سکتے۔ ہمیں کیسے معلوم ہو کہ تمھارا ہی موزہ کھویا تھا۔"

میں نے کہا "میں کہتا ہوں! میں نے ہی کھویا تھا۔ میرا ہی ہے۔"

انھوں نے کہا "بہت ممکن ہے۔ لیکن ہم اسے جاری نہیں کر سکتے۔ ایک صداقت نامہ بدیں مفاد کہ تم نے ہی یہ موزہ کھویا تھا۔ محلہ کی کمیٹی کا صداقت نامہ لے آؤ تو تمھیں زیادہ دوڑائیں گے نہیں، مزید ضابطہ کی کارروائی بغیر موزہ تمھارے نام جاری کر دیں گے۔"

"ارے لوگو" میں نے کہا "معزز ساتھیو، غریب محلہ کی کمیٹی کو اس کی کیا خبر وہ تو واقعہ سے بالکل ناواقف ہے۔ وہ تو غالباً صداقت نامہ نہ دیں۔"

انھوں نے کہا "نہیں نہیں دیں گے کیوں نہیں۔ صداقت نامے دینا ان کا کام ہے۔"

میں نے حسرت سے ایک نظر اپنے موزہ پر ڈالی اور باہر نکل آیا۔ دوسرے دن میں محلہ کی کمیٹی کے صدر کے پاس گیا۔ عرض کیا "صداقت نامہ دیدیجئے۔ وہ میرا موزہ ختم ہوا جاتا ہے۔"

انھوں نے فرمایا "مگر یہ بات سچ بھی ہے کہ تمھارا موزہ کھویا تھا۔ کسی اور کا موزہ تو پہن کر آزمانا نہیں چاہئے؟" میں نے کہا "بخدا۔ میں نے ہی کھویا تھا۔"

انھوں نے فرمایا۔ "اچھا تو بیان حلفی داخل کرو۔" میں نے بیان کا فارم پر کیا۔ دوسرے دن پھر حاضر ہوا تو صداقت نامہ مل گیا۔

یہ صداقت نامہ لے کر گم شدہ چیزوں کے دفتر پہنچا۔ اور ان لوگوں نے واقعی مزید ضابطہ کی کارروائی کے بغیر میرا موزہ مجھے دیدیا۔ اور اب کہ موزہ پھر میرے پیر میں تھا کیا کہوں کہ مجھ پر کیا کیفیت طاری تھی۔ جی میں کہہ رہا تھا "دیکھ تو۔ ریاست کا بھی کیا انتظام ہے۔ کسی پس ماندہ غیر ترقی یافتہ ملک میں کیا کوئی میرے موزہ کے لئے اتنا وقت صرف کرتا اور اتنی زحمت اٹھاتا؟ نہیں، ہرگز نہیں۔

بس اسے ٹرام سے اٹھا کر پھینک دیتے، اور معاملہ ختم ہوتا۔ لیکن یہاں، اسی عرضی دیئے شکل سے یک ہفتہ ہوا ہے اور میرا موزہ مجھے واپس مل گیا۔ "کیا انتظام ہے" واہ کیا انتظام ہے!"

لیکن ایک کسر ہو گئی۔ اس ہفتہ کے انتشار میں وہ ایک موزہ جو مجھے زیادہ پسند تھا، وہ کھو گیا میں اسے کاغذ میں لپیٹ کر بغل میں دبائے دبائے پھرتا تھا۔ اور اب گردن کاٹو تو یاد نہیں آتا کہ کہاں بھول آیا۔ مگر اصل مصیبت یہ ہے کہ ٹرام میں نہیں بھولا۔ افسوس ٹرام میں نہیں بھولا۔ اب اسے کہاں ڈھونڈنے جاؤں۔

لیکن پھر بھی کیا مضائقہ ہے۔ وہ دوسرا موزہ تو ہے۔ اور میں نے اسے اپنے کمرہ میں آتش دان کے اوپر رکھ دیا ہے۔ جب زندگی سے ذرا تھک جاتا ہوں تو اس پر ایک نظر ڈال لیتا ہوں۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فکریں مٹ گئیں اور جی ہلکا ہو گیا۔ دل میں کہہ لیتا ہوں" واہ رے نظم۔ واہ رے انتظام!"

جواہرلال نہرو

پنڈت جواہرلال نہرو اس وقت قومی تمناؤں اور اُمیدوں کا مرکز ہیں۔ قوم کی نگاہیں بے انتہا امید کے ساتھ ان کی طرف اُٹھی ہوئی ہیں۔ انھوں نے اپنی ذاتی زندگی کو قومی زندگی میں اتنا جذب کر دیا ہے کہ اب دونوں کو جدا کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ جواہرلال قومی تحریک میں اور قومی تحریک جواہرلال ہے۔ گذشتہ سولہ سال تک مہاتما جی قوم کے جس اعتماد کے مالک رہے ہیں اب اس کا حق اگر کسی کو پہنچتا ہے تو وہ جواہرلال ہیں۔ مہاتما جی کا تاج ـــــ کانٹوں کا اور عزت کا تاج ـــــ صرف جواہرلال پہن سکتے ہیں۔ بوڑھے رہنماؤں نے اپنے وقت میں اعلیٰ کام انجام دئے لیکن اب وہ کچھ دنوں کے مہمان ہیں۔ ان کی ہمتیں کمزور ہو گئی ہیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں جواب دے رہے ہیں۔ ضرورت نئی امنگوں، نئے جوش، نئے عزم اور نئی قوت کی ہے۔ ضرورت ایسے گرم خون کی ہے جسے تجربہ اور آزمائش نے پختہ کر دیا ہو۔ ضرورت ایسے مرد میدان کی ہے جس کا قلب وسیع، نگاہ بلند اور ارادہ اٹل ہو۔ یہ جوان پختہ کار، یہ رہنمائے کامل جواہرلال ہے۔

جواہرلال نہرو اس وقت ہندوستان کے سب سے زیادہ عزیز رہنما ہیں۔ ملک کے مختلف فرقوں، مختلف صوبوں، مختلف طبقوں، عورتوں مردوں، جوان بوڑھوں کے دلوں میں آج جو محبت جواہرلال کے ساتھ ہے وہ کسی دوسرے رہنما کو نصیب نہیں ہے۔ ان سے لوگوں کو جو وابستگی ہے اس میں ذاتی تعلق کی جھلک نظر آتی ہے۔ بوڑھے ان کی کامیابی سے اس طرح خوش اور ان کی تکلیف سے ایسے رنجیدہ ہوتے ہیں جیسے اپنا ہونہار بیٹے کی کامیابی اور ناکامی سے۔ جوان انھیں اپنا رفیق اور ہم سفر سمجھتے ہیں، ان سے پُرخلوص ہمدردی رکھتے ہیں اور ان پر جان نثار کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔ بچے انھیں اپنا مشفق اور مہربان بڑا بھائی جان کر ان کی

دکھ سے بے چین اور ان کے سکھ سے مگن ہو جاتے ہیں۔ جواہر لال چونکہ جوان ہیں اس لئے قوم کی گذشتہ کامیابیاں یا ناکامیاں ان کی ذات کے ساتھ اتنی منسوب نہیں کی جاتیں جتنی مستقبل کی تمنائیں اور آرزوئیں ان کے ساتھ وابستہ کی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے عمر رسیدہ رہنما بھی مثلاً مہاتما گاندھی، پنڈت مدن موہن مالویہ، رابندر ناتھ ٹیگور، ڈاکٹر انصاری انھیں اپنا ہونہار جانشین سمجھ کر ان کی مناسب قدر و عزت کرتے ہیں۔ جواہر لال صرف سروپ رانی اور پنڈت موتی لال آنجہانی کے چہیتے بیٹے نہیں ہیں بلکہ وہ بھارت ماتا کے دل کی ٹھنڈک، آنکھ کا اجالا اور جان کی راحت ہیں۔

جواہر لال ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوئے اور امارت کے ان تمام لوازمات کے ساتھ ان کی پرورش ہوئی جو ایک شہزادہ کو ہی نصیب ہو سکتے ہیں۔ وہ پنڈت موتی لال کے اکلوتے بیٹے تھے۔ پنڈت موتی لال جی کو پبلک زندگی میں جو عزت و شہرت حاصل تھی اس کا یہ نتیجہ تو لازمی طور پر ہونا چاہئے تھا کہ جواہر لال پبلک سے روشناس ہو جاتے۔ لیکن جواہر لال نے جو امتیاز سروری و سرداری قومی زندگی میں حاصل کی وہ ان کی اپنی ذاتی صلاحیتوں اور کارگذاریوں کی بنا پر ہے۔ اپنے والد کے تعلقات، اثر اور دولت سے اس میں شک نہیں انھیں امداد بہت ملی لیکن ان کی ذاتی خوبیوں کو بھی ان کی کامیابی میں بہت بڑا دخل ہے۔ ملک میں اور بھی رہنما ہیں۔ ان کے بیٹے بھی ہیں لیکن کسی کو وہ شرف و بزرگی نصیب نہیں ہوئی جو جواہر لال کو ملی ہے۔ بلکہ بہت سوں کے لئے تو یہ تعلق خرابی اور گمراہی کا باعث ہو گیا ہے۔ اس لئے جواہر لال جی کی زندگی کے حالات تمام نوجوانوں کے سامنے ایک کامیاب اور مکمل زندگی کا ایک نہایت اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہیں۔

جواہر لال ۱۴ نومبر ۱۸۸۹ء میں الہ آباد کے محلہ میر گنج میں پیدا ہوئے۔ پنڈت موتی لال جی اس وقت اسی محلہ کے ایک مکان میں رہتے تھے۔ آنند بھون انھوں نے ۱۹۰۰ء میں خریدا تھا۔ ان کی تعلیم و تربیت شروع سے ہی انگریزی ڈھنگ پر ہوئی۔ پنڈت موتی لال جی نے

مغربی طریقہ بود و باش اختیار کر لیا تھا اور پانچ برس کی عمر سے ان کے لئے انگریز استانیاں مقرر کر دی گئی تھیں اور گیارہ برس کی عمر تک آپ انھیں سے تعلیم پاتے رہے۔ اس زمانہ میں موتی لال جی تعلیم کے مقابلہ میں ان کی صحت کی طرف زیادہ توجہ کرتے تھے۔ اور اسی لئے ۱۸۹۸ء میں کل خاندان کے ساتھ انھیں کشمیر لے گئے تھے ۱۹۰۰ء میں مشہور تھیاسوفسٹ مسٹر بروکس الٰہ آباد آئے اور پنڈت موتی لال جی نے اپنے تھیاسوفسٹ دوستوں کے مشورے سے انھیں جواہر لال جی کا اتالیق مقرر کر دیا۔ مسٹر بروکس آنند بھون میں ہی رہتے تھے وہ سادہ زندگی اور اعلیٰ خیالات کے اصول پر عامل تھے اور مذہبی رواداری، انسانیت دوستی اور عمل صالح پر اعتقاد رکھتے تھے۔ مسٹر بروکس نے جواہر لال کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا کیوں کہ جواہر لال جی میں آج تک یہ تینوں خصوصیات بہت نمایاں نظر آتی ہیں ۱۹۰۴ء میں پنڈت موتی لال جی نے مسٹر بروکس کے مذہبی خیالات کی طرف سے غیر مطمئن ہو کر اور جواہر لال جی پر ان کا بڑھتا ہوا اثر دیکھ کر انھیں اتالیقی سے برطرف کر دیا۔ اس کے بعد اور دوسرے استاد آپ کو پڑھاتے رہے اسی زمانہ میں آپ نے ہندی اور سنسکرت کو بھی معمولی طور پر سیکھ لیا۔

۱۹۰۵ء میں یعنی پندرہ سال کی عمر میں جواہر لال جی اپنے والد اور والدہ کے ساتھ انگلستان گئے اور ہیرو کے مشہور پبلک اسکول میں ان کا داخلہ کرا دیا گیا۔ ہیرو اور ایٹن انگلستان کے بہترین اسکول مانے جاتے ہیں اور ان میں صرف راجاؤں اور امیروں کے لڑکے ہی پڑھ سکتے ہیں ہیرو میں بڑودہ اور کپورتھلہ کے راج کمار آپ کے ہم سبق تھے۔ اسکول کی زندگی میں ہی جواہر لال جی لالہ ہردیال سے جو ان دنوں آکسفورڈ میں پڑھتے تھے ملا کرتے تھے ۱۹۰۷ء میں ہیرو سے انٹرنس کا امتحان پاس کر کے جواہر لال جی نے ٹرنیٹی کالج کیمبرج میں اعلیٰ تعلیم پائی۔ یہاں انڈین مجلس نامی ہندوستانی طالب علموں کی انجمن کے آپ ایک مشہور رکن تھے۔ کیمبرج میں آپ کے ہم عصر سیف الدین کچلو، تصدق احمد خاں شروانی، ڈاکٹر سید محمود، مسٹر عبدالمجید خواجہ اور شاہ محمد سلیمان تھے۔ نیچرل سائنس، کیمسٹری، زوالوجی اور باٹنی میں آپ نے ۱۹۱۲ء میں دوئم درجہ کی

بی۔اے (امتیازی) ڈگری حاصل کی۔ اوران کی اعلیٰ قابلیت کو دیکھتے ہوئے کارکنان یونیورسٹی نے آپ کو بلا کسی مزید امتحانی آزمائش کے ایم۔اے (امتیازی) کی ڈگری عطا کر دی اسی سال آپ نے ازنسل سے بیرسٹری کا بھی امتحان پاس کر لیا۔ اور یورپ کا پہلا سفر کرتے ہوئے ہندوستان واپس آگئے۔

اپنے انگلستان کے زمانۂ قیام میں جواہر لال ہندوستان کے معاملات سے بڑی دلچسپی کا اظہار کرتے رہے سنہ ۱۹۰۷ء میں جب لاجپت رائے جلاوطن کئے گئے تو اس بات کا ان کے دل پر بہت اثر ہوا۔ اور اس زمانہ میں "بال' پال اور لال" یعنی بال گنگا دھر تلک' بپن چندر پال اور لالہ لاجپت رائے کا جو چرچا تھا اس سے انھیں بہت دلچسپی رہی۔ یہ تین بڑے رہنما اور مسز بسنٹ اس زمانہ کی ہندوستانی سیاسی زندگی میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے اس لئے ان کے خیالات کا جواہر لال پر خاصا اثر پڑا تقسیم بنگال کی شورش کا بھی ان پر شاید اثر ہوا ہوگا مگر نوجوانی کے اس دور میں جواہر لال کے خیالات میں کوئی پختگی اور قیام پیدا نہ ہوسکا۔

جواہر لال جی کی طبیعت بہت اثر پذیر تھی جس طرح دس سال پہلے مسٹر بروکس سے متاثر ہو کر وہ سادگی کی مجسمہ بن گئے تھے اسی طرح ہیرو، کیمبرج اور لندن نے انھیں شوقین اور فیشن ایبل بنادیا۔ ان کے طور طریق اور عادتیں سب انگریزوں کے ڈھانچے میں ڈھل گئی تھیں۔ جب آپ ہندوستان آئے تو ایڑی سے چوٹی تک مغربی رنگ میں رنگ چکے تھے۔ ہندوستان پردیس سا معلوم ہوتا تھا اور وہ آئے دن خاندان والوں سے انگلینڈ لوٹ جانے کا خیال ظاہر کیا کرتے تھے۔ مارچ سنہ ۱۹۲۲ء میں عدالت کے سامنے بیان دیتے ہوئے آپ نے خود کہا تھا "دس سال سے کم ہوئے جب کہ انگلینڈ میں بہت دن رہنے کے بعد میں ہندوستان واپس آیا میں نے وہاں پبلک اسکول اور کالج میں جو تعلیم و تربیت رائج تھی وہی حاصل کی تھی اس لئے ہیرو اور کیمبرج کے تعصبات میرے اندر خوب راسخ ہوگئے تھے اور اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی میں شاید ہندوستانی کے مقابلہ میں انگریز زیادہ تھا۔ میں دنیا کو تقریباً ایک انگریز کی نگاہ سے ہی دیکھتا تھا اور اسی لئے

میں انگلینڈ اور انگریزوں کا اتنا ہی طرفدار ہو کر ہندوستان آیا تھا جتنا کسی ہندوستانی کے لئے ہو سکتا تھا"

جواہرلال جی ۱۹۱۲ء میں ہندوستان واپس آئے اور اسی سال سے ہائی کورٹ میں پریکٹس کرنے لگے۔ اگرچہ پنڈت موتی لال جی کی برابر یہی کوشش رہتی کہ آپ بھی انھیں کی ٹکر کے وکیل بنیں لیکن اس کام میں آپ نے کوئی لائق ذکر کامیابی حاصل نہیں کی سنہ ۱۹۲۰ء تک آپ نے پریکٹس جاری رکھی لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آپ کا دل اس کام میں نہ لگتا تھا۔ ستمبر ۱۹۲۰ء میں عدم تعاون کے شروع ہونے پر آپ نے اپنی وکالت کو خیرباد کہا اور غالباً اب دوبارہ اسے شروع نہ کریں گے۔

انگلستان سے واپسی کے کچھ ہی دنوں بعد آپ تماشائی کی حیثیت سے ۱۹۱۲ء میں بانکی پور کانگریس کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ اس سے پہلے ۱۹۰۴ء میں بھی جب آپ کی عمر بارہ سال کی تھی آپ ایک مرتبہ بمبئی کانگریس کے اجلاس میں پنڈت موتی لال جی کے ساتھ شریک ہوئے تھے یہ وہی سال تھا جب سب سے پہلی بار اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں کے دو گروہ کانگریس میں بنے تھے۔ پنڈت موتی لال جی پورے طور پر اعتدال پسند تھے لیکن جواہرلال جی اس زمانہ میں ان باتوں کو نہ جانتے تھے۔ کانگریس کی کارروائی کو پوری طور پر سمجھنے کا موقع پہلی مرتبہ انھیں ۱۹۱۲ء کے اجلاس ہی میں ملا۔ جواہرلال جی یو۔ پی۔ کانگریس کمیٹی کے باقاعدہ رکن ۱۹۱۳ء میں بنے۔ اپنی پریکٹس کے زمانہ میں آپ سیاسی اور سماجی معاملات سے گہری دلچسپی لیتے رہے۔ جواہرلال جی انگلینڈ سے لوٹنے کے بعد سے ہی کہا کرتے تھے کہ میں اپنا آدھا وقت وکالت کے کام میں صرف کروں گا اور آدھا سیاسی کاموں میں۔ چنانچہ افریقہ کے ہندوستانیوں کے لئے چندہ اکٹھا کرنے کے لئے اور فجی کے ہندوستانی مزدوروں کو غیر مناسب اقرار نامے لکھوا کر لے جانے کے خلاف جو تحریکیں چلائی گئیں ان میں آپ نے حصہ لیا۔ ۱۹۱۱ء میں جب مسٹر گوکھلے نے چندہ کے لئے اپیل کی تو جواہرلال نے تقریباً ۴۰ ہزار روپیہ جنوبی افریقہ فنڈ کے لئے جمع کیا۔ گوکھلے کے انتقال پر ماتمی جلوس کے انتظام کے سلسلہ میں آپ نے بڑی دوڑ دھوپ کی۔ ۱۹۱۶ء میں مسز بسنت کی ہوم رول لیگ تحریک شروع ہوئی۔ اس میں آپ نے نمایاں حصہ لیا اور آپ الہ آباد

ہوم رول لیگ کے سکرٹری مقرر کر دیئے گئے۔ چندہ اکٹھا کرنے اور جلسہ کرنے کا بوجھ آپ ہی کے کاندھوں پر تھا اور اسے آپ خوبی سے پورا کرتے تھے۔ لوکمانیہ گنگادھر تلک کی ہوم رول لیگ میں بھی آپ نے نمایاں کام کیا۔ اُسی وقت سے آپ کا رجحان انتہا پسند جماعت کی طرف ہوا۔ اور الٰہ آباد کی انتہا پسند جماعت کے رہنما سندر لال جی اور مسٹر منظر علی سوختہ سے آپ کی صحبت رہنے لگی۔ پنڈت موتی لال جی کو آپ کا یہ رجحان اور صحبت پسند نہ تھی۔ لیکن ان کی بہت کوشش سے بھی ان دونوں باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ آئے دن انند بھون میں اسی سوال پر بحث رہا کرتی تھی۔

جواہر لال جی کی شادی فروری ۱۹۱۶ء میں دہلی کے ایک کشمیری خاندان شری یت جواہر مل کول کی سلیقہ شعار لڑکی کملا کول سے ہوئی کملا کول ایک نہایت ذہین اور تعلیم یافتہ خاتون تھیں انھیں جواہر لال جی کے خیالات سے پوری ہمدردی تھی اور یہ آخری دم تک جواہر لال جی کا ان کی تمام آزمائشوں اور تکلیفوں میں پورا پورا ساتھ دیتی رہیں۔ شادی کے موقع پر الٰہ آباد کے تمام شہر کو دعوت دی گئی تھی اور آنند بھون کو دولہن بنا دیا گیا تھا۔ ہندوؤں، انگریزوں، پارسیوں اور مسلمانوں کے لئے الگ الگ انتظامات کئے گئے تھے۔ جواہر لال جی کے کملا جی سے ۲۶ اکتوبر ۱۹۱۰ء کو ایک لڑکی اندرا پریہ درشنی پیدا ہوئی جو آج کل سوئٹزرلینڈ میں تعلیم پا رہی ہیں۔ جواہر لال جی کی تاریخ عالم کے متعلق ضخیم کتابیں دراصل ان خطوط کا مجموعہ ہیں جو انھوں نے اسی چہیتی بیٹی کو جیل کی ویران تنہائیوں میں لکھے تھے۔ ۱۹۲۴ء میں جواہر لال جی کے ایک لڑکا بھی ہوا تھا۔ مگر وہ تین دن سے زیادہ نہ جی سکا۔ کملا جی نہرو ایک طویل عرصہ تک بیمار رہیں ۱۹۲۶ء میں جواہر لال جی انھیں علاج کے لئے یورپ لے گئے۔ وہاں سے تندرست ہو کر واپس آئیں اور شوہر کے ساتھ آزادی کی تحریک کے لئے دوش بدوش کام کرتی رہیں۔ دو تین مرتبہ گرفتار ہوئیں اور ۱۹۳۱ء میں کئی ہفتہ جیل میں رہیں۔ جیل میں ان کی تندرستی دوبارہ خراب ہو گئی۔ اس کے بعد سے علالت کا سلسلہ برابر جاری رہا تاآنکہ فروری ۱۹۳۶ء میں انھوں نے یورپ میں انتقال فرمایا۔

پنڈت جی کی چونکہ انگریزی طرز پر تعلیم و تربیت ہوئی تھی اس وجہ سے آپ کو گھوڑے کی

سواری، تیرنے، پہاڑ پر چڑھنے اور برف میں کھیلنے کا شوق ہے ٹینس بھی آپ کا خاص کھیل ہے۔ لیکن فی الحال ملک کی خاطر سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔ ایک مرتبہ ناروے میں جہاں آپ سیر و سیاحت کے لئے گئے تھے سمندر کے کنارے نہا رہے تھے کہ ایک برف کے ٹکڑے میں آپ پھنس گئے۔ ایک انگریز نے ان کو وقت پر ایک زبردست خطرے سے بچایا۔ اسی طرح سے ۱۹۱۶ء میں آپ لداخ گئے اور ایک برف کے ٹکڑے میں پھنس گئے اگر رسیوں سے کھینچ کر آپ کو نہ نکالا جاتا تو نہ معلوم کیا ہوتا۔ ایک طرف اٹھارہ ہزار فٹ بلند پہاڑی تھی اور دوسری طرف گیارہ ہزار فٹ نیچا ایک کھڈ تھا۔

۱۹۱۹ء میں موتی لال جی نے ایک انگریزی روزانہ اخبار انڈیپنڈنٹ نکالا۔ جواہر لال اس کمپنی کے ایک ڈائرکٹر مقرر کئے گئے اور یہی اس کے ایک بڑے مضمون نگار بھی تھے۔ یہ پرچہ زیادہ دنوں تک نہیں چل سکا۔ لیکن اس کی ختم ہونے کی ذمہ داری جواہر لال پر کسی طرح عاید نہیں کی جا سکتی۔ ۱۹۱۹ء میں ہی مہاتما جی نے تحریک ستیاگرہ شروع کی اور جواہر لال جی نے اپنے والد کی مخالفت کے باوجود ستیاگرہ کا عہد نامہ بھر دیا۔ ستیاگرہ شروع ہونے کے بعد پنجاب کے مظالم کے خلاف تحریک شروع ہو گئی اور پنڈت موتی لال جی کی صدارت میں ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر ہوئی اور جواہر لال جی بھی اپنے والد کے ساتھ ایک سب کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے مظالم کی تحقیقات کرنے کے لیے پنجاب گئے۔ سرکاری افسروں کے ظلم کی داستان نے آپ کے دل پر سب انقلاب انگیز اثر ڈالا۔ انہی دنوں مہاتما جی کے قربت اور صحبت کا بھی آپ کو موقع ملا۔ اور اسی وقت سے آپ گاندھی جی کے چیلے بن گئے۔ ان زبردست قوتوں نے آپ کی زندگی میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا اور آپ وطن کی محبت اور آزادی کے پجاری بن گئے۔

(باقی)

مسلمانانِ ہند کے لئے آیندہ راہِ عمل

مسلمانانِ ہند کی سیاسی اور معاشرتی زندگی میں اس وقت جو انتشار اور جمود نظر آرہا ہے اس کا سبب میرے خیال میں یہ ہے کہ گذشتہ ربع صدی سے ہمارے رہنماؤں کے سامنے نظری مسائل زیادہ اور عملی مسائل کم رہے ہیں۔ اس عرصہ میں ہم نے آس پاس کی ٹھوس چیزوں کی طرف سے نگاہ ہٹا کر دور کی غیر حقیقی چیزوں کی طرف نگاہ جمائے رکھی ہے۔ زمین کے کاموں کو چھوڑ کر آسمانی کاموں کے انجام دینے میں سرگرداں رہے ہیں۔ ہر چند اس زمانہ میں بھی ہم نے شورشوں اور ہنگاموں میں دوسرے لوگوں سے کم حصہ نہیں لیا۔ لیکن ہمارے مقاصد ان لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ غیر دنیوی اور ہماری کوششیں نتیجہ کے لحاظ سے زیادہ بے اثر رہی ہیں۔ مثلاً ہم نے کانپور کی مسجد، بلقان اور طرابلس کی جنگ، خلافت، مسجد کے سامنے باجا بند کرانا، علی الاعلان گاؤ کشی کے حق کو قائم کرنا، علم اور تعزیوں کے لئے پیپل کی ٹہنی کاٹنا، رسول اللہ کی شان میں بے ادبی گستاخی کرنے والوں کے خلاف شورش، ان کو قتل اور جہنم واصل کرنے والے غازیوں کے مقدموں کی پیروی، ان کی شہادت کے بعد ان کے جلوس وغیرہ نکالنے، قادیانیوں اور غیر قادیانیوں کے قضیوں اور انہدام مسجد شہید گنج کے جھگڑوں میں اپنی بیشتر قوت کو صرف کیا ہے۔ لیکن ایسے تعمیری کاموں کی طرف جن سے مسلمانوں کی نئی نسل کی زندگی بن سکتی یا اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت ان کے پیرؤوں کی اعلیٰ زندگی کو دیکھ کر کفار کے دلوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جاگزیں ہو سکتی اور وہ اسلام کی طرف مائل ہو کر مشرف با سلام ہو سکتے۔ کم توجہ کی ہے۔ ہم نے عاقبت کی زندگی اور دنیوی زندگی، روحانی زندگی اور مادی زندگی، عبادت اور معاملات میں تفریق اور بیگانگی کو قائم رکھا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جس قدر ہم نے عاقبت روحانی زندگی اور عبادت کو درست کرنے کی کوشش کی ہے اتنی ہی ہماری دنیوی اور مادی زندگی کے معاملات

کس مپرسی کی حالت میں پڑ کر بگڑتے گئے ہیں اور خود غرض اور طمّاع لوگوں کو ہماری مذہبی مصروفیتوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا رہا ہے۔ جب وہ گروہ جس میں درد، ایثار اور بے غرض خدمت کا ولولہ اور رہبری اور رہنمائی کی صلاحیت تھی، مسلمانوں کی روزمرّہ کی مشکلات اور ضروریات کی طرف سے غافل ہو کر بین الاقوامی موتمروں اور قیام خلافت کی گتھیوں کو سلجھانے لگا تو عوام اپنی روزمرّہ کی اُلجھنوں کو حقیر و ذلیل سمجھ کر یا تو خود بھی ان کی طرف سے غافل ہو گئے یا ان کے رفع کرنے کے لئے دھوکہ باز رہنماؤں کے پاس جانے لگے، جنھوں نے اپنا مطلب سیدھا کرنے کے لئے انھیں ہر طرح بیوقوف بنایا اور ان کی حالت پست سے پست تر ہوتی چلی گئی۔

مسلمانوں کی گذشتہ نصف صدی کی زندگی پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو اسے دو حصوں میں تقسیم کرنا پڑتا ہے۔ پہلے حصے یعنی ابتدائی پچیس سالوں میں سرسید کی علی گڈھ تحریک نے مسلمانوں کے حقیقی اور دنیوی مسائل کے حل کرنے کے لئے ایک قابل قدر کوشش کی۔ سرسید اور ان کے رفقاء کے سامنے مسلمانوں کی نکبت اور پستی رفع کرنے کے لئے ایک خاص نصب العین تھا۔ انھوں نے یہ طے کیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں اور علمی پیشوں میں جگہیں دلائیں گے اور اس مقصد کے لئے جو کوششیں کرنا چاہئے تھیں انھوں نے انھیں خوبی کے ساتھ انجام دیا جن کا نتیجہ بھی خاصا اچھا نکلا۔ لیکن ان کی ذہنیت محدود تھی۔ انھوں نے چند آدمیوں کو سرکاری ملازمتوں اور علمی پیشوں میں جگہیں دلا کر یہ سمجھا کہ وہ کل قوم کی معاشی اور معاشرتی اصلاح کر سکیں گے لیکن ان کا یہ خیال صحیح نہ نکلا کیوں کہ جب سرکاری ملازمتوں کے لئے مقابلے شروع ہوئے اور اکثریت نے اپنی سیاسی بیداری اور علمی قابلیت سے اپنے زائد حصہ کو برقرار رکھا اور مسلمانوں کے لئے معقول ملازمتوں کی راہیں بند ہونے لگیں تو علی گڈھ کی ڈگریوں کی قیمت گرنا شروع ہوئی۔ عین اسی وقت خلافت کی تحریک شروع ہوئی جس میں مسلمان اپنی خوشی سے ملازمتوں سے مستعفی اور کنارہ کش ہونے لگے اور سرکاری ملازمت کو حرام سمجھا جانے لگا۔ سرکار سے ہر قسم کی موالات ترک کی گئی۔ تعلیم کا مقاطعہ ہوا۔ کھدّر، سودیشی، مذہبیت اور روحانیت کا

زور ہوا۔ آزادی کے خواب دیکھے جانے لگے۔ ابتدا میں آزادی کی ایک سال کے اندر اندر ملنے کی توقع کی گئی لیکن بعد میں آزادی کے انتظار میں بے سروسامانی کے ساتھ عمریں بسر ہونے لگیں آزادی کیا ہے؟ آزادی سے کسے کیا ملے گا؟ کس شخص کو آزادی کے منافع کی کس قدر توقع کرنا چاہیے؟ یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوئے۔ ترکی اور جزیرۃ العرب کی آزادی اور خلافت کے احیاء پر نگاہیں جمی ہوئی تھیں۔ جب اس طرف سے مایوسی ہوئی تو تبلیغ و تنظیم، فرقہ وارانہ فسادات، فرقہ وارانہ عدالتی مقدمات نے اپنی طرف توجہ جذب کرلی اور قومی قوت ان غیر اہم مسائل کے حل کرنے میں ضائع ہونے لگی۔ ابھی تک کوئی نہ کوئی اس قسم کا ہنگامہ خیز مسئلہ پیدا ہوتا رہا ہے اور مسلمانوں کو اپنی سیاسی اور معاشرتی اصلاح اور جدید دستور میں جو حقوق انھیں ملیں گے یا جو ذمہ داریاں ان پر عاید ہوں گی ان کی اچھائی اور برائی، ان کے فائدے اور نقصان کا جذبات سے خالی ہوکر مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملا ہے اور اس مطالعہ سے جس قسم کے عمل کا مطالبہ کیا جا سکتا تھا اور جس متحدہ راہ عمل اختیار کرنے کی ضرورت تھی وہ ابھی تک اختیار نہیں کی جا سکی۔

نئے دستور سے آبادی کے ایک کثیر حصہ کو جس میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہیں رائے کا حق ملنے والا ہے اس حق سے فایدہ اٹھانا چاہیے یا نہیں اور اگر چاہیے تو کس طرح اس مسئلہ کے بارے میں بھی عوام کو تعلیم دینے کی ضرورت ہے۔ اگر خود غرض اور دھوکہ باز اشخاص اس کے بعد بھی اپنے دام فریب میں عوام کو گرفتار رکھنے میں کامیاب ہوئے تو انھیں ووٹ کا حق مل جانے سے کیا فایدہ پہنچے گا۔ پھر جو نمایندے میونسپلٹیوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں، صوبہ کی کونسلوں میں منتخب ہوکر جائیں گے ان کی ذمہ داری بھی بہت زیادہ ہے وہ سب الگ الگ اور منتشر رہیں گے یا اپنی سیاسی جماعتیں بنائیں گے۔ یہ جماعتیں مذہبی اختلاف کی بنا پر بنیں گی یا مشترک سیاسی اور معاشی پالیسیاں ان کی تعمیر میں حصہ لیں گی۔ اکثریت رکھنے والی جماعت وزارتیں قبول کرے گی یا دستور کی جو موجودہ حالت ہے اس کو دیکھتے ہوئے وزارت کا قبول کرنا ملک کے بہترین مفاد کے لئے مضر سمجھے گی۔ یہ مسائل ہیں جو نئے دستور کے سلسلہ میں لائق توجہ ہیں۔

پھر ملک میں نئی تحریکیں، نئے خیالات اور نئے نصب العین پیدا ہو رہے ہیں۔ سب سے اول لائق ذکر کانگریس کی طرف سے ملکی آزادی کی تحریک ہے اور اس کے تعمیری اور سیاسی کام ہیں۔ ان میں مسلمانوں کو بڑی تعداد میں شریک ہونا چاہیئے یا ان سے علیحدہ رہنا چاہیئے۔ پھر ہندو مہاسبھا کی طرف سے ہندو قومیت کو ترقی دینے کی کوششیں ہیں جن میں یا تو مسلمانوں کی کھلی ہوئی مخالفت کی جاتی ہے یا انھیں بالکل نظر انداز کرکے ان کے وجود ست ہی عملاً انکار کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں کمیونل اوارڈ کا مسئلہ اور ہندی پرچار کی تحریکیں بھی آ جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ، عورتوں کی تعلیم، بے پردگی اور ان کی ترقی و آزادی کی تحریکیں اور مذہبی آزاد خیالی اور الحاد کی تحریکیں ہیں اور ان سب سے زیادہ اہم اور اپنی جاذبیت سے نگاہ کو سب سے زیادہ خیرہ کرنے والی سوشلزم کی تحریک ہے جو نظام معاشرت اور معیشت کو بالکل ایک نئی بنیاد پر قائم کرنا چاہتی ہے ان سب کے ساتھ مسلمانوں کا کیا رویہ ہونا چاہیئے۔ یہ بات فیصلہ کرنے کی ہے۔ اس سے تجاہل اور اغماض کرنا ناممکن ہوگیا ہے ہر قدم پر مسلمانوں کو ان سوالات سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے اور وہ موثر رہنمائی کے منتظر ہیں۔ چاروں طرف سے ان نئی قوتوں کا نرغہ ہے اور مسلمان ان میں سے کسی نہ کسی میں جذب ہو جانے کے لئے مجبور ہو رہے ہیں۔ پھر ان سب سے گہرا اور اپنی اہمیت کے لحاظ سے سب سے زیادہ فوری مسئلہ روزگار کی تنگی اور ماحول کی سختی کا ہے۔ روز بروز دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ مقابلہ کی قوتیں نیچے سے بھی ابھر رہی ہیں اور اوپر سے بھی نیچے کی طرف دھکیل رہی ہیں اور مسلمان دب دب کر پسے جا رہے ہیں۔ اس مسئلہ کا حل سوچنا بھی نہایت ضروری ہے۔

یہ امور ہیں جن کی طرف مسلمانوں کی تمام جمعیتوں، لیگوں، کانفرنسوں اور بورڈوں کو سب سے پہلے توجہ کرنا چاہیئے۔ ان مسائل کی اہمیت اس میں شک نہیں اتنی نمایاں اور توجہ طلب تھی کہ حال میں جو اس قسم کے جلسے ہوئے ان میں بھی کوئی جلسہ ایسا نہ تھا جس نے کسی نہ کسی شکل میں ان مسائل کی طرف توجہ نہ کی ہو اور ان میں سے بعض کے بارے میں لمبے چوڑے رزولیوشن پاس نہ کئے گئے ہوں۔ خود غرض لوگوں کے جلسوں سے تو بحث نہیں کہ انھوں نے تو اپنے انتخاب کو سہل اور یقینی کرنے کے لئے

یہ تمام ڈھونگ کھڑا کیا تھا۔ اور اس سے کسی معقول رہنمائی کی توقع کرنا ہی فضول تھی۔ لیکن ایسے جلسوں میں بھی جن میں مخلص اور دردمند رہنما شریک ہوئے تھے اور جنھوں نے صحیح رہنمائی دینے کی کوشش بھی کی، وہ جامع اور مکمل پروگرام اور ایسی عملی تحریکیں پیدا نہ ہوسکیں جن کی مسلمانوں کو اس وقت شدید ضرورت تھی۔

جامعہ کی آئندہ اشاعت میں ہمارا ارادہ ہے کہ ان مسائل کی حقیقتوں کو نظری الجھنوں سے علیحدہ کرکے چند اہم پہلوؤں کو نمایاں کیا جائے۔ ہمیں توقع ہے کہ ملک کے معتمد رہنما ان کی طرف توجہ فرمائیں گے اور ایک ایسا عملی پروگرام بنائیں گے جو وقت کے مطالبے کو قرار واقعی پورا کرسکے گا۔ (باقی)

صدائے کربلا!

آدمی کو امرِ حق پر سر جھکانا چاہیئے
سر جھکانا ہی نہیں گردن کٹانا چاہیئے

حادثاتِ دہر سے گھبرا نہ جانا چاہیئے
جو کڑی سر پر پڑے اس کو اٹھانا چاہیئے

حفظِ ناموسِ وفا میں جاں سے کیسی دریغ؟
بے خبر! اس راہ میں تو جان جانا چاہیئے

جاں جاتی ہے اگر راہِ صداقت میں تو جائے
موت آتی ہے تو آئے، اس کو آنا چاہیئے

جان جانے کے لئے ہے اس کا ایسا غم نہیں
آن رہنے کے لئے ہے، وہ نہ جانا چاہیئے

سر پہ مشکل آ پڑے کیسی ہی لیکن ہاتھ سے
ضبط و استقلال کا رشتہ نہ جانا چاہیئے

ہو نہ پیدا کھوٹ اس سونے میں غافل اس لئے
غم کی دھیمی آگ پر دل کو تپانا چاہیئے

گرچہ ہونا ہے وہی لکھا ہے جو تقدیر میں
وقت پر اپنی سی کوشش کر دکھانا چاہیئے

اضطراب و انقلاب و کشمکش ہے زندگی
اہلِ ہمت ہی کو اس میداں میں آنا چاہیئے

دامنِ مردانگی پر داغ ہے اک بزدلی
بزدلوں کو قبر کا کونا بسانا چاہیئے

دہر کی نیرنگیوں پر گر نہ کچھ قابو چلے
دہر کی نیرنگیوں پر مسکرانا چاہیئے

اور آئے وقت جب دنیا سے جانے کا خلیل
مسکراتے کھیلتے دنیا سے جانا چاہیئے

تنقید و تبصرہ

دعوت کلمہ | شائع کردہ مکتبۂ علمیہ ربانیہ گورکھپور۔ حجم ۲۴ صفحہ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶

یہ تبلیغی رسالہ دائرہ ربّانیہ کی طرف سے شائع ہوا ہے جو مولانا آزاد سبحانی کے زیر سرپرستی گورکھپور میں قائم ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں تحریک ربّانیت کا نصب العین اور نظام عمل بہت ہی مجمل طور پر سمجھایا گیا ہے اور دوسرے حصے میں کلمہ طیبہ کے اسرار و حقائق کا ذکر اشارات کے طور پر کیا گیا ہے۔ تحریک ربّانیت کا نصب العین یہ ہے کہ اسلام کا سیاسی اور عمرانی نظریہ دنیا کو سمجھائے اور جو لوگ اسے مان لیں ان کی ایک جماعت قائم کرکے اس نظریے کو عملی جامہ پہنائے۔ اس نظریے کے بنیادی اصول سات قرار دئے گئے ہیں۔

(۱) ربّیت
(۲) جمعیّت
(۳) امریّت
(۴) حرّیت
(۵) شورّیت
(۶) اخوّت
(۷) وحدت

اور ان کی نہایت مختصر الفاظ میں تعریف کی گئی ہے۔

دوسرے حصے میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ سے یہ سب اصول مستنبط ہوتے ہیں۔ سچا مسلمان وہ ہے جو کلمے کی حقیقت اور غایت کو سمجھے، اس کی عظمت کو مانے اور اس کی خدمت، جہاں تک ہوسکے کرے یعنی دنیا میں اس "ربانی" نظام زندگی کو قائم کرنے کی کوشش کرے

جس کی تعلیم کلمے کے اندر پوشیدہ ہے ۔

یہ رسالہ صرف ایک اجمالی خاکہ ہے جس کی تفصیل غالباً دائرہ ربانیہ کی آیندہ منشورات میں ہوگی جب تک یہ تفصیل نظر کے سامنے نہ ہو موجودہ رسالے کے مضامین پر کوئی تفصیلی تبصرہ نہیں ہو سکتا بحریک ربانی کی تحریک اشتراکیت کا عملی جز اسلام کی روحانی تعلیم کے ساتھ سمو کر پیش کیا جائے گا یا اسلامی تعلیم میں جو اشتراکیت کا پہلو بعض لوگوں کے نزدیک موجود ہے وہ روشن کیا جائے گا ۔ یہ مسئلہ بجائے خود نہایت اہم اور نہایت دلچسپ ہے ۔ ہمیں امید ہے کہ جو کوئی اس رسالے کو پڑھے گا اُسے سلسلۂ رسائل ربانیہ کے آیندہ رسالوں کا انتظار رہے گا ۔

زیرِ تبصرہ رسالہ دو آنہ میں ۔ دائرہ ربانیہ گورکھپور ۔ یو ۔ پی سے مل سکتا ہے ۔

تاریخ الامت ابتداء سے لیکر خلافت عثمانیہ تک اسلام کی مستند تاریخ سات جلدوں میں از مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری (مجلد ۱۲)

سیرت الرسول (عہ) خلافت راشدہ عا

خلافت بنی امیہ (عہ) عباسیہ بغداد عا

خلافت عباسیہ ۶ عباسیہ مصر عا

دولت عثمانیہ (عہ)

قواعد عربی مولانا محمد یوسف السورتی کی مشہور معروف اور مستند کتاب عربی صرف پر عا

سیرت محمد علی مولانا محمد علی کی سوانح حیات ۶۰ صفحات متعدد تصاویر - (سے)

کلام جوہر مولانا محمد علی کے جدید و قدیم کلام کا مجموعہ مع مقدمہ مولنا عبد الماجد صاحب دریابادی قیمت (۸)

تلاش حق گاندھی جی کی آپ بیتی (۷) صفحے متعدد تصاویر قیمت قسم اول عا قسم دوم عہ

قوم کی آواز مہاتما گاندھی کی گول میز کانفرنس کی تقریریں اور سفر کے حالات مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب قیمت (عہ)

ضبط نفس گاندھی جی کی ایک تصنیف کا اردو ترجمہ۔ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ حضرات کے لئے بہترین تحفہ مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ۱۲

دو خدائی خدمتگار خان عبد الغفار خاں صاحب اور ان کے بھائی ڈاکٹر خاں صاحب ایم ایل اے کے حالات زندگی مع خوشنما تصاویر - ۱۲

جمال الدین افغانی اخوت اسلامی کے پرجوش داعی سید جمال الدین افغانی کے حالات طلباء کے لئے آسان زبان میں قیمت (۸)۔

مسلمان بیبیاں چند الٰہی مسلمان خواتین کے حالات اور نیکی کا مجسمہ تھیں مسلمان بچیوں کے لئے یہ کتاب ایک نعمت ہے - (۶)

خادمات خلق یورپ اور امریکہ کی چند پاک سیرت خواتین کے حالات قیمت (۱۰)

تاج آفرینش مصر کی اہل قلم خاتون ملک حاکم کے چند نسوانی اصلاحی مقالات (۱)

کیمیا گر پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن) کے مختصر افسانوں کا نہایت دلکش مجموعہ۔ قیمت (عہ)

دلچسپ افسانے حضرت کوثر چاندپوری جیسے ادیب اور کامیاب افسانہ نگار کے (۲۵) دلگداز افسانے - قیمت عا

مشاہدات سائنس سائنس پر ۱۷ مختلف مضامین محمد عمر صاحب حسنی بی - اے - قیمت (عہ)

سیر المصنفین ادب اردو کی دلچسپ تاریخ مرتبہ مولوی محمد یحییٰ صاحب - قیمت جلد اول (عا) جلد دوم (سے)

گلستان شیخ سعدی شیرازی کی مشہور اخلاق کتاب جدید قالب میں - حسن کارانہ شرکت محدودہ اتحاد پریس کی نفیس طباعت اور کاغذ خوشنمائی - قیمت عہ

دیوانِ غالب اردو | ... مرزا غالب کا خود نوشتہ مقدمہ، ... کلیات ...
... خوبصورت ملائم جلد،
... رنگا رنگ طلائی اوراق۔ اور ...
... صاحب کی ... کی عکسی تصویر ...
... کی ... قسم اول (۴) قسم
دوم ... قسم سوم (عہ)

دیوانِ شیدا | مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب مرحوم و مغفور کے فارسی اور اردو
کلام کا مجموعہ مطبوعہ جرمنی قیمت عا

شعلۂ طور | حضرت جگر مراد آبادی کی کلیات کا مجموعہ اردو ادب میں شامل ... خوشنما
کتابت، کاغذ، طباعت، قیمت مجلد (ستے)

پرشین لٹریچر | ڈاکٹر سید ہادی حسن صاحب (مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) کی
قابل قدر کتاب زبان انگریزی۔ طلبا کے علاوہ عام
مطالعہ کے لئے بھی کارآمد ہے خوشنما طباعت۔ مجلد (ﷺ)

آسان خوشخطی | ہندوستان کے مشہور خطاط منشی علی محمد خاں صاحب کی لکھی
ہوئی خوشخطی کی کاپیاں جن پر لکھنے سے بغیر استاد
کی مدد کے بچے اپنا خط اچھا کر سکتے ہیں۔ چار حصّے۔
فی حصہ ۱۲ر مکمل سٹ ۵ر

نوٹ:۔ خرچ کی کفایت کے خیال سے ان حصّوں کی
سادی جدولیں بھی تیار کرائی گئی ہیں
برائے حصّہ اوّل و دوم ۔ ۔۔ر
برائے حصّہ سوم و چہارم ۔ ۴ر

اُردو اکادمی کے مقالے

معیاتِ مذہب	۸ر	جمال الدین افغانی	۸
روحِ تہذیب	۸	عقیدۂ اعجاز القرآن	۸ر

مسلمانوں کی آئندہ تعلیم ۸

تصانیف مولانا اسلم صاحب جیراجپوری

تعلیماتِ قرآن	عا	تاریخ ...	عہ
تاریخ القرآن	عہ	سیرۃ عمرو بن العاص	عہ
حیاتِ حافظ	۱۲ر	محجوب الارث	۳ر
الوراثۃ فی الاسلام	۸ر	خواہرِ ... (ﷺ)	۳ر

تصانیف خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی

تفسیر آلِ عمران	۱۲ر	تفسیر انفال و توبہ	عار
″ حجرات	۱۰ر	″ سورۂ یوسف	عہ
″ سورۂ نور	عہ	پارہ ۲۸	۱۲ر
″ پارہ ۳	۱۰ر	نصائح	۸ر

مشہور کتابوں کے سستے ایڈیشن

دیوانِ غالب	۸ر	دیوانِ حالی	۱۲ر
مسدس حالی	۸ر	مقدمۂ شعر و شاعری	۱۲ر

لورنگ زیب عالمگیر (۸ر)

ڈرامے

پردۂ غفلت	عہ	انجام	۱۲ر
کھیتی	۶ر	نصرت کا پیچ	۸ر
نیم شب	۸ر	نقش آخر	ار
صید زبوں	ار	گناہ کی دیوار	۸ر

بہزاد (۶ر)

بچوں کا انصاف	۴ر	اسکول کی زندگی	۴ر
وہم پرست طالب علم	۴ر	محنت	۴ر

شیر پڑکا ۴ر — دماغ ۲ر

انتخابات

انتخاب میر ۱۲ر — انتخاب سودا ۱۲ر

انتخاب حسرت ۱۲ر

میر کے سو شعر ۴ر — غالب کے سو شعر ۴ر

حسرت کے سو شعر ۴ر — جگر کے سو شعر ۴ر

جوش کے سو شعر ۴ر — اصغر کے سو شعر ۴ر

بچوں کے لئے اچھی کتابیں

تعلیمی کھیل ۴ر — ترکوں کی کہانیاں ۴ر

عجائب عالم سمندر ۱۲ر — بچوں کا تحفہ (نظمیں) ۱۲ر

بچوں کے اسمٰعیل ۶ر — حضرت مسیح ۵ر

بچوں کی رباعیاں ۱ر — حضرت زرتشت ۴ر

مرغی احمیر علی ۲ر — نیت کا پھل ۲ر

سنسدلا ۴ر — پھول باغ ۱۴ر

پھلواری ۵ر — سیر لوی گلزار ۴ر

اسکاوٹوں کی کہانیاں ۸ر — بچوں کی نظمیں ۵ر

تاریخ ہند کی کہانیاں ۳ر — اسلامی کہانیاں ۱۲ر

دنیا کے بسنے والے ۶ر — جہاز، ہوائی جہاز ۸ر

حاجی بابا اصفہانی ۱۲ر — سمندر کے عجائبات ۱۰ر

بچوں کی درسی کتابیں

آخری نبی ۲ر — سیرۃ الرسول (خورد) عمر

پیارے نبی ۳ر — خلافت راشدہ عمر

پیارے رسول ۵ر — عباسیہ بغداد ۱۲ر

نبیوں کے قصے ۵ر — اسلامی عقائد ۱ر

سرکار کا دربار ۸ر — ارکان اسلام ۱۲ر

سرکار دوعالم ۸ر — بچوں کا قاعدہ ۴ر

چار یار (طبع سوم) ۶ر — ریاضی قاعدہ ۲ر

خلفائے اربعہ ۸ر — بچوں کی کتاب ۴ر

اچھی باتیں ۴ر — مشق خوشنویسی ۲ر

درس حقی ۵ر — چالیس حدیثیں ۲ر

الورد والریحان ۱۲ر — ہمارا دین ۱۲ر

متفرق کتابیں

کلام منیر عمر — نالۂ منیر عمر

نامۂ منیر ۸ر — صلاح کار ۸ر

ادب العرب ۸ر — ضیاء الدین برنی ۴ر

ٹولسٹائے ۳ر — جہاں آرا ۸ر

میلاد النبی پروجکٹ ۶ر — ماعیانی پروجکٹ ۸ر

فردوس خیال (نظمیں) ۸ر — تحفہ (ناول) ۶ر

حسین (آل ابراہیمی) ۸ر — مالا بدمنہ ۸ر

اعجاز القرآن عربی ۸ر — نیرنگ (مضامین) عہ

اسلامی تہذیب ۴ر — قومی تعلیم ۳ر

سالنامہ جوہر ۸ر — مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ۴ر

لیلۃ القدر ۱ر — خطبہ مسیح الہند ۳ر

خطبہ مسیح الملک ۴ر — آزادی ہند ۳ر

نہرو رپورٹ ۶ر — خیالستان عہ

رباعیات امجد ۸ر — کتاب الشعر عہ

شعرستان عمر — کتاب الطلاق عمر

گلبانگ ۶ر — الفوز الکبیر ۱۲ر

فانوس خیال عمر — المدینۃ والاسلام عہ

ذکریٰ (ابوالکلام) ۸ر — تاریخ امریکہ عہ

خیالات اورنگ ۸ر — معاشقہ نپولین ۱۲ر

معیاری افسانے عہ — مصری افسانے ۸ر

دفتر "نامۂ تعلیم" ۔ پونہ

محترمی

تسلیم!

یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ ہمارے ملک کی تمام مصیبتوں کا واحد علاج ہمارے بچوں کی کامیاب ابتدائی تعلیم ہے خوش قسمتی سے ہمارا سرکاری کالج صوبہ بمبئی میں یہ خدمت اس طرح انجام دے رہا ہے کہ اس میں سے ہر سال اساتذہ کی ایک کافی تعداد فن تعلیم کی مخصوص مہارت کے بعد ابتدائی تعلیم کے اردو اسکولوں میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔ بدقسمتی سے ابھی تک اس صوبہ میں کوئی ایسا تعلیمی پرچہ نہ تھا کہ جو اس اہم مضمون سے متعلق مسائل پر موجودہ تحقیقات کی روشنی میں ہمارے مخصوص ماحول کی مناسبت سے اظہار خیال کرتا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اردو زبان کی ترویج بھی کرتا۔ ہم نے محکمۂ تعلیم صوبہ بمبئی کی زیر نگرانی اس خدمت کو بجا لانے کا ارادہ کیا ہے۔ فی الحال ہماری گوناگوں مصروفیتیں ہم کو اجازت نہیں دیتیں کہ ہم ایک ماہنامہ کا اجرا کریں اس لئے سال میں صرف دو کوششوں ہی پر اکتفا کی گئی ہے تاکہ ہم اپنی بہترین توجہ کے ساتھ ایک اعلیٰ معیار کا تعلیمی لٹریچر پیش کر سکیں کہ جو نہ صرف ہمارے ہی صوبہ کے لئے مخصوص ہو بلکہ ہمارے تمام ملک کے لئے کارآمد ہو سکے۔ اور جو اساتذہ ہی کے دائرہ میں محدود نہ ہو بلکہ عام طور سے والدین کی بھی صحیح رہنمائی کر سکے۔

ہم مذکورہ بالا نصب العین کو پیش کرتے ہوئے آپ کے دماغ اور دل دونوں سے اپیل کرتے ہیں کہ اپنے گراں قدر افکار و خیالات اور اپنی بہترین ہمدردیوں کے ساتھ ہماری ہمت افزائی فرمائیں گے۔ چونکہ اس کے ماتحت کوئی تجارتی غرض نہیں ہے اور ہماری خدمات بھی اس سلسلہ میں اعزازی ہیں۔ اس لئے ہم امید کرتے ہیں کہ ہماری آواز صدا بصحرا ثابت نہیں ہوگی۔ اسی سلسلہ میں معاصرین سے استدعا ہے کہ وہ اس اعلان کو اپنے اخبارات و رسائل میں شائع کر کے ممنون فرمائیں گے۔

مہربانی فرما کر ذیل کی یادداشتیں نوٹ کر لیجئے:۔

مضمون روانہ کرنے کی تاریخ ۔ ۔ ۔ ۲۸ فروری ۱۹۳۶ء

تاریخ اجراء رسالہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۳۱ مارچ ۱۹۳۶ء

قیمت فی پرچہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک روپیہ (عہ)

گورنمنٹ ٹریننگ کالج ۔ پونہ

مدیران
سید عبدالرؤف ۔ ایم۔ اے؛ بی۔ ٹی
ابو طاہر ملک ۔ بی۔ ایس سی؛ بی۔ ٹی

تاریخ الامت ابتدا سے لیکر خلافت عثمانیہ تک اسلام کی مستند تاریخ سات جلدوں میں
از مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری (۱۲؍)
سیرۃ الرسول (عہ) خلافت راشدہ عا؍
خلافت بنی امیہ (عہ) عباسیہ بغداد عا؍
خلافت عباسیہ ۱۲؍ عباسیہ مصر عا؍
خلافت عثمانیہ (عہ)

قواعد عربی مولانا محمد بن یوسف السورتی کی مشہور و معروف اور مستند کتاب عربی صرف پر عا؍

سیرت محمد علی مولانا محمد علیؒ کی سوانح حیات ۷۰۰ صفحات متعدد تصاویر - (سے)

کلام جوہر مولانا محمد علیؒ کے جدید و قدیم کلام کا مجموعہ مع مقدمہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی قیمت (۸ر)

تلاش حق گاندھی جی کی آپ بیتی (۷) صفحے متعدد تصاویر - قیمت قسم اول عا؍ قسم دوم عہ۔

قوم کی آواز مہاتما گاندھی کی گول میز کانفرنس کی تقریریں اور سفر کے حالات مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب قیمت (عہ)

ضبط نفس گاندھی جی کی معرکۃ الآرا تصنیف کا اردو ترجمہ۔ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ حضرات کے لئے بہترین مشیر مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ۱۲؍

دو خدائی خدمتگار خان عبدالغفار خاں صاحب اور ان کے بھائی ڈاکٹر خان صاحب ایم ایل اے کے حالات زندگی مع خوشنما تصاویر - ۱۲؍

جمال الدین افغانی اخوت اسلامی کے پرجوش داعی سید جمال الدین افغانی کے حالات۔ طلبا کے لئے آسان زبان میں قیمت (۸ر)۔

مسلمان بیبیاں چند ایسی مسلمان خواتین کے حالات جو نبی کی ہمعصر تھیں مسلمان بچیوں کے لئے یہ کتاب ایک نعمت ہے - (۶ر)

خادمات خلق یورپ اور امریکہ کی چند پاک سیرت خواتین کے حالات قیمت (۱ر)

تاج آفرینش مصر کی اہل قلم خاتون ملک حاکم کے چند نسوانی اصلاحی مقالات (۱ر)

کیمیاگر پروفیسر محمد مجیب صاحب بی۔ اے (آکسن) کے مختصر افسانوں کا نہایت دلکش مجموعہ - قیمت (عہ)

دلچسپ افسانے حضرت کوثر چاندپوری جیسے ادیب اور کامیاب فسانہ نگار کے (۲۵) دلگداز افسانے - قیمت عا؍

مشاہدات سائنس سائنس پر بارہ مختلف مضامین از محمد عمر صاحب حسنی بی۔ اے - قیمت (عہ)۔

سیر المصنفین ادب اردو کی دلچسپ تاریخ مرتبہ مولوی محمد یحییٰ صاحب - تنہا جلد اول (عا؍) جلد دوم (ہے)

گلستاں شیخ سعدی شیرازی کی شہرہ آفاق کتاب جدید قالب میں - چھاپا ہے شرکت محدودہ آفتاب پریس کی نفیس طباعت اور کاغذ خوشنمائی - قیمت عا؍۔

دیوان غالب جرمنی

جس میں مرزا غالب کا خود نوشتہ مقدمہ، غزلیات، قصائد اور رباعیات ہیں۔ پاکٹ سائز خوبصورت ملائم جلد، اس پر دلفریب نقش و نگار طلائی اوراق، اور سب سے زیادہ مرزا صاحب کی سہ رنگی عکسی تصویر جرمن ہنر مندی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ قسم اول (۱۲ر) قسم دوم (عار) قسم سوئم (عہ)

دیوان شیدا

مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب مرحوم و مغفور کے فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ مطبوعہ جرمنی قیمت عار۔

شعلۂ طور

حضرت جگر مراد آبادی کی کلیات کا مجموعہ اردو ادب میں قابل قدر اضافہ، خوشنما کتابت کاغذ طباعت، قیمت مجلد (ستے)

پرشین لٹریچر

ڈاکٹر سید ہادی حسن صاحب (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کی قابل دید کتاب زبان انگریزی۔ طلبا کے علاوہ عام مطالعہ کے لئے بھی کارآمد ہے خوشنما طباعت۔ مجلد (صہ)

آسان خوشخطی

ہندوستان کے مشہور خطاط منشی علی محمد خاں صاحب کی لکھی ہوئی خوشخطی کی کاپیاں جن پر لکھنے سے بغیر استاد کی مدد کے بچے اپنا خط اچھا کر سکتے ہیں۔ چار حصے۔ فی حصہ ۲ر مکمل سٹ ۵ر

نوٹ:۔ خرچ کی کفایت کے خیال سے ان حصوں کی سادی جلدیں بھی تیار کرائی گئی ہیں

برائے حصہ اول و دوم ۔ ۔ر

برائے حصہ سوم و چہارم ۔ ۔ر

اردو اکادمی کے مقالے

تعلیمات مذہب ۸ر — جمال الدین افغانی ۸ر

روح تہذیب ۸ر — عقیدۂ اعجاز القرآن ۸ر

مسلمانوں کی آئندہ تعلیم ۸ر

تصانیف مولانا اسلم صاحب جیراجپوری

تعلیمات قرآن ۶ر — تاریخ محمد عہ

تاریخ القرآن عہ — سیرۃ عمرو بن العاص عہ

حیات حافظ ۴ر — محجوب الارث ۴ر

الوراثۃ فی الاسلام ۸ر — جواہر طیبہ (تعلیمی) ۴ر

تصانیف خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی

تفسیر آل عمران ۱۲ر — تفسیر انفال و توبہ عار

" حجرات ۸ر — " سورۂ یوسف عہ

" سورۂ نور عہ — " پارہ ۲۹ ۱۲ر

" پارہ ۳۰ ۴ر — بصائر ۸ر

مشہور کتابوں کے سستے ایڈیشن

دیوان غالب ۸ر — دیوان حالی ۴ر

مسدس حالی ۸ر — مقدمۂ شعر و شاعری ۴ر

اورنگ زیب عالمگیر (۸ر)

ڈرامے

پردۂ غفلت عہ — انجام ۱۲ر

کھیتی ۶ر — لعنت کا پیچ ۸ر

نیم شب ۸ر — نقش آخر ۱۰ر

صید زبوں ۱۰ر — گناہ کی دیوار ۸ر

ہمراز (۶ر)

بچوں کا انصاف ۴ر — اسکول کی زندگی ۴ر

دم پرست طالب علم ۴ر — محنت ۴ر

ستسریڈکا ۴ر دامت ۲ر

انتخابات

انتخاب میر ۱۲ر انتخاب سودا ۱۲ر

انتخاب حسرت ۱۲ر

میر کے سو شعر ۴ر غالب کے سو شعر ۴ر

حسرت کے سو شعر ۴ر جگر کے سو شعر ۴ر

جوش کے سو شعر ۴ر اصغر کے سو شعر ۴ر

بچوں کے لئے اچھی کتابیں

تعلیمی کھیل ۴ر ترکوں کی کہانیاں ۴ر

عجائب خانہ سمندر ۱۲ر بچوں کا تحفہ (نظمیں) ۱۲ر

بچوں کے اسمٰعیل ۶ر حضرت مسیح ۵ر

بچوں کی رباعیاں ۱ر حضرت زرتشت ۴ر

مرحمی احمد علی ۲ر سیت کا کھیل ۲ر

ستسدگلا ۳ر بھول بانغ ۱۳ر

پھلواری ۵ر سسرلوی گلہار ۴ر

اسکاؤٹوں کی کہانیاں ۸ر بچوں کی نظمیں ۵ر

تاریخ ہند کی کہانیاں ۳ر اسلامی کہانیاں ۱۲ر

دنیا کے بسنے والے ۶ر جہاز، ہوائی جہاز ۸ر

حاجی بابا اصفہانی ۱۲ر سمندر کے عجائبات ۱ر

بچوں کی درسی کتابیں

آخری نبی ۲ر سیرۃ الرسول (خورد) عمر

ہمارے نبی ۳ر خلافت راشدہ عمر

ہمارے رسول ۵ر عباسیہ بغداد ۱۲ر

نبیوں کے قصے ۵ر اسلامی عقائد ۱ر

سرکار کا دربار ۸ر ارکان اسلام ۱۲ر

سرکار دوعالم ۸ر بچوں کا قاعدہ ۳ر

چار یار (طبع سوم) ۶ر رہنمائے قاعدہ ۲ر

خلفائے اربعہ ۸ر بچوں کی کتاب ۴ر

اچھی باتیں ۴ر مشق خوشنویسی ۲ر

درس صحتی ۵ر چالیس حدیثیں ۲ر

الورد الرجال ۲ر ہمارا دین ۱۲ر

متفرق کتابیں

کلام میر عمر نالۂ میر عمر

نامہ میر ۸ر صلاح کار ۸ر

ارض القرآن ۸ر ضیاء الدین برنی ۴ر

ٹوالسٹائے ۳ر جہاں آرا ۸ر

میلا دالنبی پروکلٹ ۶ر باغبانی پروکلٹ ۸ر

فردوس خیال (نظمیں) ۸ر تجسہ (ناول) ۶ر

تمیس (ژاں مارسیروی) ۸ر مالا بدمنہ ۸ر

اعجاز القرآن عربی ۸ر نیرنگ (مضامین) عمر

اسلامی تہذیب ۴ر قومی تعلیم ۲ر

سالنامہ جوہر ۸ر مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ۴ر

لیلۃ القدر ۱ر خطبہ مسیح الہند ۲ر

خطبہ مسیح الملک ۴ر آزادی ہند ۳ر

ہیرو رپورٹ ۶ر خیالستان عمر

رباعیات امجد ۸ر کتاب التصغیر عمر

شعرستان عمر کتاب الطلاق عمر

گلبانگ ۶ر الفوز الکبیر ۱۲ر

فانوس خیال عمر المدینۃ والاسلام عمر

ذکریٰ (ابوالکلام) ۸ر تاریخ امریکہ عمر

خیالات اورنگ ۸ر معاشقۂ پولیس ۱۲ر

معیاری افسانے عمر مصری افسانے ۸ر

بسم اللہ

جامعہ

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی　　　پروفیسر محمد عاقل، ایم اے

جلد ۲۶	اپریل سنہ ۱۹۳۶ء	نمبر ۴

فہرست مضامین

ڈاکٹر انصاری صاحب امیر جامعہ کا انتقال

(ڈاکٹر انصاری صاحب کی اچانک وفات ایسا جانکاہ سانحہ ہے جس سے ہر شخص متاثر ہے ذیل میں ہم شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب کی اس تقریر کو درج کرتے ہیں جو صاحب موصوف نے دہلی ریڈیو اسٹیشن سے ۱۰ مئی سنہ ۳۶ء کو براڈکاسٹ فرمائی تھی)

کل رات کو کوئی ایک ڈیڑھ بجے ڈاکٹر انصاری، ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری دنیا سے اچانک رخصت ہو گئے۔ ابھی پرسوں کسی کام سے مسوری تشریف لے گئے تھے، وہاں سے واپس آ رہے تھے کہ راستے میں قلب کی حرکت بند ہو گئی اور یہ اپنے بے شمار کاموں اور ان گنت قدردانوں کو، اس دیس کو جس کی خاطر انھوں نے ہر طرح کی کڑیاں جھیلیں، ان مسلمانوں کو جن کی خدمت میں ساری عمر گذار کر ان کا بُرا ہی سُنا ان ہندو مسلمانوں کو جنھیں میل ملاپ اور محبت پیدا کرنے کیلئے خون پسینہ ایک کیا، ان مریضوں کو جن کی آخری امیدوں کا سہارا ان کا مطب تھا، اس جامعہ ملیہ کو جس کے بچوں کو دیکھ دیکھ کر ان کا خون چلووں بڑھتا تھا، اور جن سے انھیں یہ امید تھی کہ ان کی زندگیوں میں وہ آرزوئیں پوری ہو سکیں گی جو اس وقت بس ارمان ہی ارمان ہیں، ہاں گھر بار کو، بال بچوں کو، عزیزوں کو دوستوں کو سب کو چھوڑ کر نہ جانے جی میں کیا آئی کہ آدھی رات گئے اس راہ پر چل پڑے جس پر چلنے والے پھر منہ موڑ کر نہیں دیکھتے۔ ان کی زندگی کا چراغ گل ہونے سے ایک ان کے اپنے گھر میں اندھیرا نہیں ہوا، اس وقت دیس کے ہر بچہ بچہ کے دل میں اس غم کی اندھیاری چھائی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی ذات فیض کا ایک چشمہ تھی اور یہ چشمہ اپنے پرائے سب کیلئے بہتا تھا۔ ان کی شخصیت ایک سہارا تھی جو وقت پڑے سب کے کام آتا تھا۔ ان کا دل ایک ٹھکانا تھا جہاں ہر دکھی دل کو پناہ ملتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے جس دم سے دنیا کے میدان عمل میں قدم رکھا۔ ان کی شخصیت نے سب کا من موہ لیا۔ اس لئے کہ وہ نیک تھے، سچے تھے، مخلص تھے، فیاض تھے، ساتھیوں کی خوشی کو اپنی خوشی اور ان کے غم کو اپنا غم جانتے تھے۔ اس سے بہت پہلے کہ ان کی سیاسی خدمات انھیں مشہور

کریں، ہزاروں آدمی انھیں اپنا سمجھنے لگے تھے، ان کی سوجھ بوجھ، تدبیر، خلوص اور ایثار نے بہتیروں
کو ان کا گرویدہ بنایا لیکن ان کی محبت اور ہمدردی نے کہیں زیادہ لوگوں پر اپنا جادو کیا۔ اس
وقت ان سب کی نظروں میں اُن کی پریم بھری آنکھیں، ان کا مسکراتا ہوا چہرہ پھر رہا ہوگا اور ان
کی محبت کی یاد سے دل میں رہ رہ کر درد اٹھتا ہوگا۔ پھر سوچئے کہ اس سانحہ سے ان لوگوں کے دلوں
پر کیسی چوٹ لگی ہوگی جو ڈاکٹر صاحب کے خاندان یا جامعہ ملیہ کے بچوں اور استادوں کی طرح
خاص ان کے سایہ میں رہتے تھے۔ موت کی گھڑی سب کے لئے آتی ہے لیکن ڈاکٹر صاحب تو ابھی
۵۶ سال کے تھے۔ ان کے لئے تو وہ زمانہ آرہا تھا کہ اپنے ہاتھ کے لگائے ہوئے پودوں کو پھلتے
پھولتے دیکھتے اور پھر جب وہ نہ ٹلنے والی گھڑی آتی تو انھیں کچھ نصیحت کچھ وصیت کرکے اطمینان
سے آنکھیں موند لیتے، پر یہ سب خدا کو منظور نہ تھا، اور ہوتا وہی ہے جو اسے منظور ہو وہ پہلے
چلدیئے اور ہمیں اکیلا چھوڑ گئے۔

ڈاکٹر صاحب کی ساری زندگی میں سچ پوچھئے تو ان کے خاندان کی روایتوں کا رنگ
جھلکتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے وطن یوسف پور کے انصار حضرت ایوب انصاری کی اولاد ہیں جن
کے گھر میں مکے سے مدینے ہجرت کرنے والے قافلے کے سردار نے جاکر قیام فرمایا تھا۔ اس وقت
جب مخالف اس کی حق کی پکار کو اپنے شور سے دبا دینا اور اس کی تعلیم کے چراغ کو اپنی پھونکوں سے
بجھا دینا چاہتے تھے پر جس کی للکار سے سوتی دنیا چونک اٹھی اور دکھیا انسانیت نے بڑی ہی
راحت پائی۔ اسی وقت سے سچائی کی مدد، مہماں نوازی، فیاضی اس کے خاندان کا حصہ رہا ہے۔
ڈاکٹر صاحب جب ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے تو ان کے خاندان کا ستارہ ذرا گردش میں تھا لیکن بچپن
ہی سے ان کی طبیعت میں بلندی کے آثار نمایاں تھے ۱۸۹۶ء سے جب انھوں نے اپنے وطن کا
مڈل اسکول چھوڑا اس وقت تک جب وہ انگلستان میں تعلیم سے فارغ ہوکر ہندوستان واپس
آئے یہ اپنی محنت اور ذہانت سے ہمیشہ تعلیمی وظیفے حاصل کرتے رہے اور ان وظیفوں سے اکثر چھپ
چھپ کر اپنے کسی عزیز کو تعلیم دلاتے رہے۔ کامیابی کے ساتھ ساتھ ان کا یہ مبارک شوق بھی بڑھتا

گیا۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں جب انھوں نے دلی میں فتحپوری پر اپنا مطب کھولا تو ان کی غیر معمولی طبی لیاقت کے ساتھ ان کی مہمان نوازی اور دریا دلی بھی مشہور ہوئی سنہ ۱۹۱۲ء میں انھوں نے ٹرکش میڈیکل مشن کی رہبری کے لئے اپنی پریکٹس چھوڑی، گھر میں جو کچھ بک سکتا تھا بیچ ڈالا اور زخمی ترکوں کی مرہم پٹی کرنے کے لئے روانہ ہوگئے۔ وہاں سے واپس ہوئے تو ہاتھ خالی۔ پھر پریکٹس شروع کی ذرا اطمینان ہو چلا تھا کہ خلافت کی تحریک شروع ہوئی اور ڈاکٹر صاحب نے پھر اپنا وقت اور روپیہ قوم پر نثار کر ڈالا سنہ ۱۹۲۰ء میں جب وہ خلافت کا ڈیپوٹیشن لے کر انگلستان گئے تو اپنا موٹر بیچ کر۔ جب واپس آئے تو ملک میں ایک تہلکہ تھا۔ اس وقت کوئی خدمت ایسی نہ تھی جسے انجام دینے میں ڈاکٹر صاحب مرحوم پیچھے ہوں۔ وہ کون سودا تھا جو اس سر میں نہ تھا۔ نہ دن چین سے گذرتے تھے نہ راتیں۔ اور ان کا حوصلہ تھا کہ بڑھتا ہی جاتا تھا اور ہمت تھی کہ پھیلتی جاتی تھی سنہ ۱۹۲۲ء کے بعد ملک میں کچھ سکون سا تھا۔ پر اس سکون میں وہ اور بھی بے چین تھے کیونکہ ہندو مسلمانوں میں میل جسے وہ جان سے عزیز رکھتے تھے۔ اس وقت فنا ہوتا نظر آتا تھا۔ اور وطن کے دونوں بیٹوں میں پریم اور محبت کا رشتہ قائم کرنے کی خاطر کم لوگ ہیں جنھوں نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کی طرح اپنی عزت اپنی شہرت، اپنے سکھ اپنے چین کو داؤں پر لگایا ہو۔ اس پاک کوشش میں انھیں جو دکھ پہنچے ان کا ذکر اس وقت کیا کروں۔ انھوں نے اس پاک طینت نیک نفس انسان کا دل چھلنی کر دیا تھا آج جب وہ ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکا ہمیں سب کو، ہندو مسلمانوں کو اس پاک کوشش میں اس کی ناکامی پر شرم سے سر اٹھانے کا موقع نہیں ہے اور اس شرم کو بس آنسوؤں کی دو بوندیں نہیں دھو سکتیں۔ اس کے لئے ساری عمر اسی کام میں سر کا پسینہ ایڑیوں تک بہانا ہوگا جب بھی شاید نہ دھلیگی۔ اسی کام کی خاطر ہاں جاننے والے جانتے ہیں کہ اسی کام کی خاطر، انھوں نے اپنی تمام پریشانیوں اور دشواریوں کو بھلا کر کانگریس کی صدارت سنہ ۱۹۲۷ء میں منظور کی۔ اسی کی خاطر سارے ملک میں مارے مارے پھرے، اسی کی خاطر اپنوں کے برے بنے۔ پر اپنی زندگی کے ہر کام سے آپس میں بھروسہ اور اعتماد، پریم اور محبت کا بیج بوتے رہے۔ اسی کی خاطر جامعہ ملیہ کے کمزور پودے کی آبیاری اپنے ذمہ لی۔ اس نے ملک

کارنگ اور ملک والوں کے ڈھنگ دیکھ کر ان کو یہ یقین ہوگیا تھا کہ نئے ہندوستان کے لئے نئے
آدمیوں کی ضرورت ہے ایسے آدمیوں کی جو اپنی اچھی چیزوں پر بھروسہ رکھیں، انھیں برتیں انھیں
ترقی دیں، تاکہ دوسروں کی اچھی باتوں کو سمجھیں اور ان کی عزت کریں، خود مضبوط ہوں اور دوسروں
کی مضبوطی سے ڈریں نہیں۔ مانگیں ہی نہیں دینے کو کچھ رکھتے ہوں اور دینے کی ہمت بھی رکھتے
ہوں۔ مسلمانوں میں ایسے آدمی پیدا کرنے کے لئے انھوں نے اپنی امیدیں اس تعلیم گاہ سے
باندھی تھیں اور اس کی ترقی کو وہ ملک کی سب سے بڑی خدمت سمجھتے تھے۔ آج سہ پہر کے وقت جامعہ
ملیہ والوں نے اپنے سرپرست کو اپنی نئی بستی کے پہلو میں جاکر دفنایا ہے۔ خدا انھیں توفیق دے
کہ وہ اس آرزو کو بھی پورا کرسکیں جو ڈاکٹر صاحب کا دکھا ہوا زخمی دل اپنے ساتھ لے گیا۔ اب اس
مدرسہ کے بچوں کے سر پر ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ نہ پھرے گا، اس کے کام کرنے والوں سے کوئی
آآکر شرما شرما کر یہ نہ کہیگا کہ میں تمہارے لئے کچھ نہیں کرسکا تم سے آنکھ ملانے کی مجھ میں ہمت
نہیں وہ اپنے لڑکپن میں اب کس سے روٹھیں گے اور کون انھیں آکر منائے گا۔ ہاں کوئی نہیں
ہم اس دکھی دل کا دکھ ہمیں یاد رہے گا۔ اور ہم میں کچھ ہے تو ہم سے کچھ کرائے گا بھی۔ ہمارا کام
بڑھے گا، پھیلے گا، ہمیں ہزار دولتیں ملیں گی۔ پر ڈاکٹر انصاری کا سا دل نہ ملے گا۔

ہندوستانی تحریک قومیت

(ذیل میں ہم جامعہ کے عزیز اور محترم ارڈ ماسے ڈاکٹر عبدالحمید صاحب ایم اے پی ایچ ڈی کا ایک مضمون درج کرتے ہیں جو صاحب موصوف نے لندن سے اشاعت کے لئے روانہ فرمایا ہے۔ قارئین کو غالباً یاد ہوگا کہ دسمبر ۱۹۳۲ء کے رسالہ جامعہ میں ایک مضمون "ہندو اور مسلم قومی تحریکیں اور ہندوستانی قومیت کی تحریک" کے عنوان سے شائع ہوا تھا جس میں ملک کے اہل الرائے حضرات کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ بھی اس موضوع پر اپنے قیمتی خیالات کا اظہار فرمائیں تاکہ ایک واضح نصب العین کے تعین میں سہولت ہو۔ ڈاکٹر حمید صاحب کا یہ مضمون اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس مضمون کے ساتھ صاحب موصوف نے ہمیں جو خط لکھا ہے اسے بھی اس مضمون کی تمہید کی حیثیت سے ہم جنسہ نقل کر رہے ہیں۔

"جامعہ کے دسمبر نمبر میں آپ کا مضمون بعنوان "ہندوستانی قومیت کی تحریک" نظر سے گذرا۔ اگر تاریخی واقعات کے متعلق کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے تو میرا خیال ہے کہ ہندوستان میں نہ مسلم قومیت کا مکمل تسلط ہو سکتا ہے اور نہ ہندو قومیت کا۔ ہندوستانی زندگی میں مذہبی روح کا اثر اس قدر ہمہ گیر ہے کہ مارکسزم جیسی مادی تحریک یہاں بغیر اپنے خدوخال تبدیل کئے ہوئے مقبول نہیں ہو سکتی۔ مغربی وضع کی سرمایہ دارانہ قومیت کا اثر ہندوستانی زندگی پر اب تک بہت رہا ہے اور اب تک ہے لیکن ہندوستانی جمہور کی غربت اور مغربی طرز کے نظام سرمایہ داری کے خلاف بغاوت کے باعث یہ تحریک اب ہندوستان میں زوال پذیر ہے۔ غالباً مستقبل ہندوستان میں صرف ایک تحریک ہمہ گیر ہو سکے گی جو ہندو اور مسلمانوں کے بہترین تمدنی سرمایہ سے مالا مال ہو اور جس پر جدید اجتماعیت کا اثر غالب ہو۔

مشترکہ ہندوستانی قومیت کی تعمیر ہندوستان میں کئی صدیوں سے ہو رہی ہے

گو کہ اس راہ میں ہزاروں مشکلیں موجود ہیں۔ مندرجہ ذیل مضمون میں اسی مشترکہ تحریک قومیت کے چند پہلوؤں پر ایک تاریخی نظر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔") ۔

---

(۱)

ہندوستانی تحریک قومیّت کے خصائص

اٹھارویں صدی عیسوی میں ہندوستان مغربی اقوام کے جذبۂ شہنشاہیت کا شکار بن گیا۔ ۱۸۵۷ء میں بالآخر اس مریض جاں بلب نے اپنی زندگی کی آخری سانس لے کر سکوت اختیار کر لیا۔ ہندو اور مسلمانوں کی ہر قسم کی قومی زندگی کا خاتمہ ہو گیا لیکن کسے خبر تھی کہ جلد ہی اس خاکستر سے چنگاریاں اٹھنے والی ہیں۔ مغرب کا وہی طوفان جس نے قومی زندگی کی شمع کو خاموش کر دیا تھا پھر انھیں چنگاریوں کو مشتعل کرنے کا باعث ہوا۔ یورپ کے استیلا اور غلبہ کو دیکھ کر ہندوستان کی قومی روح میں پھر ارتعاش پیدا ہوا۔ مغربی علوم و فنون نے بھی اپنا جادو کیے بغیر نہ چھوڑا چونکہ وہ مغربی اقوام کے جذبۂ آزادی اور قومیت کے مظہر تھے۔

ہندوستانی قومیت کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہے چونکہ یہاں ایک ہی ملک میں دو ملتیں آباد ہیں۔ ان کے تصوراتِ کائنات جداگانہ ہیں ان کا مذہب ایک دوسرے سے علیحدہ ہے۔ ایک آریا مذہب کے پیرو ہیں تو دوسرے ایک سامی مذہب کے۔ ہر ملت کی ابتدائی تاریخ بھی جداگانہ ہے مگر بعد میں ایسے خوشگوار دور بھی گذرے ہیں جن میں دونوں دوش بدوش وطن عزیز کے لئے مصروف عمل رہے ہیں۔

باوجود ان اختلافات کے دونوں میں ہم آہنگی بھی بہت کچھ ہے۔ قومیت کے چند عناصر موجود نہیں ہیں لیکن بعض موجود بھی ہیں۔ نسلی اعتبار سے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ مسلمانوں کا کثیر حصہ نسلاً ہندوستانی ہے اور وہ مسلمان بھی جو دوسرے ممالک سے یہاں آئے مثلاً عرب۔ ترک۔ مغل۔ ایرانی وغیرہ وہ یہاں آکر اس قدر مخلوط ہو گئے کہ نسلی پاکیزگی کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔

مرد تو غیر ممالک سے آئے مگر شادیاں ہندوستانی عورتوں سے کی گئیں۔

دونوں ملتوں کا معاشی مفاد بھی ایک ہے۔ اگر قحط پڑتا ہے تو دونوں اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ اگر طاعون آتا ہے تو دونوں اس سے ہلاک ہوتے ہیں۔ اگر ملک کی دولت برباد ہوتی ہے تو دونوں اس سے مفلوک الحال ہوتے ہیں۔ مشین کی تباہ کاریوں سے ہندوستان کے تمام قدیم پیشے برباد ہوگئے جس کے باعث یہاں کی آبادی کا کثیر حصہ بے روزگار ہوگیا جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ میں سیاسی اعتبار سے چاہے کسی قوم کا تسلط رہا ہو لیکن معاشی اعتبار سے دونوں قوموں کی جمہور ایک ہی سطح پر رہی۔ ملک کی دولت باہر جاکر کبھی صرف نہیں کی گئی۔ بادشاہوں نے اپنے رجحانات کے باعث چاہے کسی قدر بھی دولت فنون لطیفہ وغیرہ پر صرف کی ہو مگر وہ دولت رہی ہمیشہ ملک ہی میں۔

سیاسی اعتبار سے دونوں ملتوں کا ایک ہی مقصد ہو سکتا ہے یعنی یہ کہ اپنے ملک میں آزاد ہوں۔ غیر قوم کی غلامی دونوں ملتوں کے لئے سخت نفرت انگیز ہونا لازمی امر ہے چونکہ سیاسی غلامی کے باعث دونوں کے بہترین تمدنی روایات برباد ہو رہی ہیں۔

باوجود ان مشترکہ عناصر کے دونوں ملتوں میں اختلافات بھی بہت ہیں مثلاً مذہب اور دونوں کی ابتدائی تاریخ۔ مسلمان مذہب اور اخلاق کے لئے اسوہ رسول اللہ اور صحابہ کرام کے زمانہ کو دیکھتے ہیں۔ توسیع حکومت اور نظام کے لئے بنی امیہ اور علوم و فنون کے لئے خلفائے بنی عباس کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ ہندوؤں کی نظریں اس کے برخلاف کرشن اور رام و بدھ اور پرانوں چندر گپت اور اشوک کی حکومت کی طرف اٹھتی ہیں۔

(۲)

مسلمانوں کے عہد میں ہندوستانی قومیت کی تشکیل

باوجود ان اختلافات کے عہد متوسط میں خصوصاً مغلوں اور دکن کی اسلامی سلطنتوں کے

دور میں دونوں ملتوں نے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے ایک ہندوستانی تمدن کی تشکیل کی ہے بادشاہ مسلمان ہوتے تھے لیکن امورِ سلطنت میں ہندو برابر کے شریک تھے۔ اکبر جیسے بادشاہ کو تو چھوڑیئے جس کے متعلق کوئی متنازعہ فیہ امر نہیں ہے لیکن اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں بھی جسے متعصب مشہور کیا جاتا ہے سینکڑوں ہندو اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے رعایا کے ملکی اور ملی حقوق میں حد درجہ انصاف اور رواداری سے کام لیا جاتا تھا۔ اس مشترکہ حکومت کے باعث ہندو اور مسلمانوں نے ایک مشترکہ معاشی اور سیاسی نظام قائم کر لیا تھا جو موجودہ زمانہ کے نظامات کے معیار پر نہیں جانچا جا سکتا جو کہ برفتارِ زمانہ کی ترقی کا نتیجہ ہے۔ ان نظامات کے تحت ہندوستانی کمال راحت اور اطمینان سے زندگی گزارتے تھے اور وہ نظامات اس زمانہ کے اکثر نظامات سے زیادہ بہتر تھے۔ بدقسمتی سے ہندوستان کی تاریخ اب تک بہت غلط طریقہ پر لکھی گئی ہے خصوصاً اسلام کے اثرات ہندوستان پر جو مرتب ہوئے ہیں اس کا اب تک مطالعہ نہیں کیا گیا ہے۔ اسلام ہندوستان کی قومی زندگی کے لئے تجدید کا باعث ہوا ہے۔ جس طرح اس نے ایران، مصر اور ایشیائے کوچک میں فرسودہ تہذیبوں کی بجائے نئی اور زندہ تہذیبوں کی بنیاد رکھی اسی طرح اس کا لمسِ گرم ہندوستان میں بھی حیاتِ تازہ کا باعث ہوا ہے۔ اسلام جس وقت ہندوستان میں داخل ہوا اس وقت ہندو تہذیب کی نہایت ابتر حالت تھی۔ ہندوؤں کا عہدِ ترقی تنزل میں تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ تمام دنیا سے الگ تھلگ ایک مضمحل اور فرسودہ زندگی گزار رہے تھے۔ یہاں نہ اب وہ اعلیٰ فلسفیانہ سرگرمیاں تھیں اور نہ علمی چرچے آریاؤں کی ابتدائی سادہ زندگی کی بجائے چھوت چھات نے جگہ لے لی تھی اور مخلوقِ خدا ہزاروں قیود میں جکڑ دی گئی تھی۔ تمام ملک میں کوئی مرکزی نظامِ حکومت نہ تھا اور آئے دن مختلف راجوں کے درمیان خانہ جنگیاں ہوتی رہتی تھیں۔ اسلام سے تصادم کے باعث ہندو قوم میں ایک ذہنی بیداری شروع ہو گئی اور اس عظیم الشان قوم نے پھر مسائل کائنات پر غور کرنا شروع کر دیا۔ عقیدہ توحید کے زیرِ اثر ہندوؤں میں متعدد تحریکیں پیدا ہوئیں جس میں زمانہ متوسط میں گرونانک کبیر اور بھگتی کی تحریک اور عہدِ جدید میں سوامی دیانند راجہ رام موہن رائے۔ اور سوامی رام کرشن کے نام خاص طور پر قابل

ذریعہ ان لوگوں نے ہندو قوم کو توحید کی طرف دعوت دی اور ان کی اجتماعی خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کی بدقسمتی سے ہندوستان میں اسلام مرکزی ایشیا کی نیم متمدن اقوام کے ذریعہ داخل ہوا جو نئی نئی مسلمان ہوئی تھیں اور اسلامی روح ان میں اچھی طرح داخل نہیں ہوئی تھی اس کے فاتحانہ اقدام میں ملک گیری اور ہوس کو بہت زیادہ دخل تھا۔ ہندوؤں کے دل میں اسی لئے اسلام اور ملک گیری کا مفہوم باہم مربوط ہو گیا۔ اگر اسلام اس کے صحیح علمبرداروں کے ذریعہ ہندوستان میں داخل ہوتا تو اس کے اثرات یہاں بھی اسی قدر ہمہ گیر مرتب ہوتے جس قدر کہ ایران اور مصر وغیرہ میں مرتب ہوئے ہیں۔ سندھ میں اسلام عربوں کے ذریعہ پہنچا اس لئے وہاں اسلامی اثرات سب سے زیادہ پائدار مرتب ہوئے ہندوستان میں جو کچھ بھی اسلام پھیلا وہ بادشاہوں کے باعث نہیں بلکہ اُن بزرگان کرام کی کوششوں اور اخلاق فاضلہ کے اثر سے جو ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پہنچے اور اپنے روحانی فیض سے لوگوں کو منور کیا۔

باوجود ان تمام کوششوں کے تمام ہندوستان کا مذہبی تصور ایک نہ ہو سکا۔ اس کا بہت بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ہندو ایک بہت قدامت پرست قوم ہے اور خود بھی ایک اعلیٰ مذہبی فلسفیانہ نظام کی حامل ہے لیکن مذہب کو چھوڑ کے تمدن کے دوسرے شعبوں میں مثلاً سیاست اور معیشت میں جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں دونوں نے مل کر کام کرنا شروع کیا۔

زبان کی اہمیت ہر قوم کے تمدن میں بہت زیادہ ہے چونکہ یہ اس تمدن کی نفسی جد وجہد کی جس میں جذبات خیالات۔ تاثرات وغیرہ سب ہی کچھ ہوتے ہیں مظہر ہوتی ہے مسلمانوں کی زبان عربی اور فارسی اور ہندوؤں کی زبان بھاشا اور سنسکرت تھی۔ ان زبانوں کے اتصال سے ایک مخلوط زبان اردو عالم وجود میں آئی جسے ہندوستانی کہنا زیادہ موزوں ہے۔ یہ دونوں اقوام کے ذہنی ورثہ کی حامل ہے اور ہماری متحدہ قومیت کی زندہ ترین مظہر ہے۔

تمدن کے جمالی پہلو یعنی فنون لطیفہ میں بھی ہندو اور مسلمانوں کا مشترکہ ہاتھ کام کر رہا۔ تاج محل ہندوستانی فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں اسلامی عناصر غالب ہیں چونکہ فن تعمیر میں مسلمان ماہر

ہوئے ہیں لیکن اس کی طرزِ تعمیر نہ ایرانی ہے اور نہ عربی۔ یہ ہندی مسلمان کے دماغ کا شاہکار ہے جو
ہندوؤں کے فنِ تعمیر سے کافی متاثر ہوا ہے۔ اس کے بلند و حسین مناروں۔ اس کے فلک بوس گنبدوں
اور اس کی وسیع اور کشادہ محرابوں میں جہاں اسلامی روح کارفرما ہے وہاں اس کے نقش و نگار اس
کے مثلثوں اور مربعوں اس کی تزئین و آرائش میں ہندو ذہن کی باریک بینیاں جلوہ گر ہیں۔

موسیقی میں ہندو بہت ماہر تھے مسلمانوں نے اس کی ان سے تحصیل کی اور اس میں کمال پیدا
کیا آج موسیقی تو کم از کم ہندو اور مسلمانوں کی مشترک ہے اور دونوں ہندوستانی موسیقی کے دلدادہ ہیں
ہندو موسیقی سوز و الم اور صدمات کی گہرائی کی مظہر تھی۔ وہ لمحے جو انسانی دل کی عمیق ترین ر سے نکلتے
ہیں اس کا بہترین مظہر صرف راگ و راگنی کے ذریعہ کیا جا سکتا تھا۔ مسلمانوں نے ہندوستانی موسیقی
میں جوش و شدت۔ بیساختہ پن اور صفائی پیدا کی۔ اس کا اظہار قوالی میں ہوتا ہے جس کو حضرت امام
خسرو نے ہندوستان میں رائج کیا ہندوستان میں سیکڑوں آلاتِ موسیقی قدیم زمانہ میں رائج تھے
مگر چنگ و رباب اہلِ ایران کے ساتھ یہاں داخل ہوئے۔ پھر ہندو اور مسلمانوں کی امتزاجی موسیقی کے
باعث ایسے آلاتِ موسیقی ایجاد ہوئے جو اس موسیقی کے لئے موزوں تھے۔ مثلاً ستار اور طبلہ۔ ستار
کے بانی بھی امام خسرو ہیں۔ طبلہ عربی طبل سے ہے مگر یہ ہندوستانی ڈھولک کی ایک ترقی یافتہ شکل
ہے۔ سارنگی جو ایک نہایت ہی ترقی یافتہ آلہ موسیقی ہے اور جس سے زیادہ انسانی آواز کا کوئی ساتھ
نہیں دے سکتا بہت بعد کی ایجاد ہے اور ہندوستان کی مشترکہ موسیقی کے لئے سب سے زیادہ کارآمد ہے
اس کے علاوہ تمدن کے ہر چھوٹے سے چھوٹے شعبہ مثلاً برتن سازی پارچہ بافی۔ نجاری۔ کپڑوں کی
رنگائی۔ لکڑی کی نقاشی وغیرہ میں دونوں ملتوں کے مشترک تمدن کا اظہار ہوتا ہے۔

(۳)

عہدِ جدید میں ہندوستانی تحریکِ قومیت

زمانہ متوسط میں تمدنی عناصر کی اس یک رنگی کے باعث ہندو اور مسلمانوں کی ایک قومی زندگی

نہ ہوئی گو کہ بعض عناصر کے اختلاف کے باعث وہ ایک دوسرے سے علیحدہ بھی رہی۔ ہندوستان میں جب جدید قومیت کی لہر دوڑی تو شروع میں ہندو اور مسلمانوں کی قومی تحریکیں ایک دوسرے سے ہٹ، ہیں چونکہ جس طرح کہا جا چکا ہے ان کا ماضی مختلف ہے۔ جب انہوں نے نئی حیات نو کے لئے اپنے ماضی کو دیکھا تو اسے ایک دوسرے سے مختلف پایا۔ اسی لئے ہندوستان میں قومیت کی بعض تحریکوں کے باعث ہندو اور مسلمانوں میں اختلافات پیدا ہوگئے۔ ہندوستان کی ان جدید تحریکوں کی ہم تین قسمیں کرسکتے ہیں۔

(الف) وہ تحریکیں جن کی بنیاد ہندو اور مسلمانوں نے اپنی مختلف ملی روایات پر رکھی اور جن کا مقصد ان روایات کی کلیتاً تجدید کرنا تھا۔

(ب) وہ تحریکیں جو مغربی اثرات کے باعث پیدا ہوئیں اور جو ہندوستان میں مغربی وضع کی قومیت کا قیام چاہتی تھیں۔

(ج) وہ تحریکیں جو اپنی بنیاد اپنے ماضی پر تو رکھنا چاہتی ہیں لیکن صرف ان روایات پر جو ہندو اور مسلمانوں کی ایک مشترکہ قومیت کے قیام میں ممد ہوں یا کم از کم اس راہ میں حائل نہ ہوں۔

ہندو اور مسلمانوں کی تمام قومی تحریکیں اس تقسیم میں شامل ہیں۔ باوجود گوناگوں اختلاف کے بہت سی بنیادی باتیں ان میں مشترک ہیں۔ خصوصاً ابتدا میں مغربی خیالات کا غلبہ اور بعد میں اس کا رد عمل۔ پہلے ہم ہندو اور بعد میں مسلم قومی تحریکوں پر نظر ڈالیں گے۔

(۴)

ہندو تحریکِ قومیت کے نفسی عوامل

ہندوستان ایک عظیم الشان ملک ہے جو چاروں طرف بڑے بڑے سمندروں اور پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ ایک طرف بحر ہند اور بحر عرب موجیں مارتا ہے اور دوسری طرف کوہ ہمالہ کی برفانی چوٹیاں آسمان سے ہمسری کا دعویٰ کرتی ہیں۔ اس میں بڑے بڑے دریا اور گھنے جنگلات ہیں یہاں کے

مرعوب کن مناظر نے نفسِ انسانی پر بہت گہرا نقش کیا اور فطرت کے سامنے مجبور انسان نے حقیقت کا ابتدائی تصور ایک خوفناک ہستی کا کیا اور اس کے مظاہر آگ۔ پانی۔ بجلی سانپ وغیرہ کی پوجا شروع کر دی۔ آریاؤں سے پہلے ہندوستان کے اصل باشندے دڑاوڑ بھی فطرت کے خوفناک مظاہر کی پرستش کیا کرتے تھے اور اس کی آفات سے نجات حاصل کرنے کے لئے اس پر بھینٹ چڑھایا کرتے تھے۔ بعد میں اس قوم نے بھی فلسفیانہ فکر کا اعلیٰ ثبوت دیا مثلاً ہندو تثلیث (وشنو۔ شیو اور برہما) کا تخیل دڑاوڑی قوم کا پیدا کردہ ہے ہندو فلسفیانہ فکر کی انتہا اپنیشد اور گیتا ہے جہاں عقیدہ وحدۃ الوجود کی تعلیم دی گئی اور ہندو اس عقیدہ میں تمام دنیا کے معلم اول ہیں فطرت کی فیاضیوں نے ہندوؤں کو زندگی کی معاشی جدوجہد سے بے نیاز کر دیا تھا اس لئے وہ اپنے تفکرات زیادہ ذہنی اور مابعد الطبیعاتی مسائل کی طرف رجوع کر سکتے تھے۔

ہندو مذہب ہی کے داس سے بدھ اور جین مت کی تحریکیں پیدا ہوئیں جو مابعد الطبیعات سے زیادہ اخلاقی بنیادوں پر قائم تھیں۔ یہ تحریکات امرائیت کے خلاف جمہوری تھیں لیکن ان کا اثر ہندومت کے سامنے تقریباً مفقود ہو گیا اور جو کچھ باقی بھی رہا وہ ہندومت کا جزو ہو کر۔ غرضکہ ہندومت جس کا بنیادی تخیل وحدۃ الوجود ہے ہندو تمدن کے لئے بنیاد کا کام دیتا رہا۔ وحدۃ الوجود کا سب سے بڑا معلم شنکر اچاریہ ہے جس کا دنیا کے عظیم الشان مفکرین میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس کا فلسفہ ہندو مذہب کی جان ہے اس لئے جس وقت ہندوستان میں جدید قومیت کی تحریک پیدا ہوئی اور اس نے اسی پرانی بنیادوں کو قائم کرنا چاہا تو پھر ہندی ذہن نے گیتا اور شنکر اچاریہ کے فلسفہ کی طرف توجہ شروع کی۔

ہندو فلسفہ یونان یا عام مغربی فلسفہ کی طرح صرف عقلی غور و فکر پر نہیں بلکہ وجدان پر مبنی ہے اور یہ فلسفہ " ویدانت " کا فلسفہ کہلاتا ہے ویدانت کے معنی مقصود یا نتیجہ کے ہیں یعنی ویدانت کا فلسفہ وہ تعلیم دیتا ہے جو وید کا مقصود آخر ہے یا وہ آخری تعلیمات دیتا ہے جو وید کے معلمین کا منشا تھا۔

ہندومت کی چار متفق علیہ باتیں ہیں یعنی ۔

(۱) روح انسانی باقی رہنے والی ہے۔

(۲) ہر شخص کے اعمال بھی زندہ رہتے ہیں اور یہ اپنے مخفی اثرات رکھتے ہیں۔ اس کو "کرم" کہتے ہیں۔ اعمال اور ان کے نتائج کی بے رحمانہ تکرار کو "سنسار" کہتے ہیں۔

(۳) تناسخ۔ یعنی روح مختلف جنم اس دنیا میں لیتی رہتی ہے۔

(۴) دنیا رنج و عذاب ہے جس سے نجات پانا ضروری ہے اور اس کا ذریعہ ویدانت ہے۔

شنکر اچاریہ کے نزدیک شاہد و مشہود یعنی انسان کے نفس اور مادہ کی حقیقت ایک ہی ہے۔ ایک ہی تجربۂ انسانی کے دو پہلو ہیں۔ وہ حقیقت جو دونوں پر حاوی ہے "برہما" کہلاتی ہے۔ برہما کی حقیقت سے ہم واقف نہیں ہیں برہما "موجود" ہے۔ اس کا ذکر صرف نفی میں کیا جاسکتا ہے۔ دنیا "مایا" ہے یعنی یہ ایک نقاب ہے جو شاہد و مشہود کے درمیان حائل ہے۔ "مایا" سے نجات "موکش" ہے۔ ہندو فلسفہ کی ان اعلیٰ تعلیمات سے ان کی عظمت اور ان کی خامیوں کا پتہ چلتا ہے۔ عظمت تو یہ ہے کہ انھوں نے حقیقت کی اس قدر صحیح توضیح کی ہے جس سے بہتر توضیح آج تک انسانی دماغ نہ کرسکا۔ روح و مادہ، شاہد و مشہود کی باہمی آویزش سے دنیا کو بچایا اور دونوں کو حقیقت اعلیٰ "برہما" کے دو پہلو قرار دئے۔ اپنی ذہنی کاوش میں وہ سب سے برتر تھے مگر عملی زندگی کے لئے جو تعلیمات دی گئیں وہ یاس و حزن سے مملو تھیں۔ دنیا ان کے نزدیک رنج و عذاب ہے۔ کرم کا قاعدہ اس قدر سخت ہے کہ اس سے نجات کی کوئی صورت نہیں دکھائی دیتی۔ دنیا کے اثباتی پہلو سے زیادہ انھوں نے اس کے منفی پہلو پر زور دیا ترک تمدن زندگی کا مقصد اعلیٰ قرار پایا جس نے عملی روح کو فرسودہ کردیا اور لوگ جنگلوں میں جاکر نجات کے لئے مصروف زہد و ریاضت ہوگئے۔ ذہنی زندگی کی امرائیت کا اثر جماعت پر بھی پڑا۔ منو کے قوانین کے مطابق ہندو جماعت چھوت چھات کی سخت بندشوں میں جکڑ دی گئی اور اس کے کروڑہا اراکین بدترین غلامی میں مبتلا ہوگئے۔

ہندو فلسفہ دنیا کی بالذات کوئی حیثیت تسلیم نہیں کرتا بلکہ اس کو مایا سمجھتا ہے جو عموماً قومی جمود کا باعث ہوتا ہے اور لوگوں کے دل میں ترقی کی امنگ نہیں رہتی اور جو عمل کیا جاتا ہے وہ بھی اس لئے کہ اس سنسار سے نجات حاصل کریں۔

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ مسلمانوں کے عہد میں ہندو ذہن میں دوبارہ بیداری شروع ہوگئی اور ہندو مذہب کی تجدید و اصلاح کی تحریکیں شروع ہوگئی تھیں۔ عہد جدید میں مغربی علمانے ہندو فلسفہ کی طرف توجہ شروع کی اور اس کے مغربی زبانوں میں ترجمے کئے۔ پھر مغربی علوم و فنون سے واقفیت اور اپنی سیاسی پستی کے باعث ہندو قوم میں زندگی پیدا ہونا شروع ہوئی خالص مغربی وضع کی قومیت کے قیام کرنے والی تحریکیں سطحی تھیں اس لئے دیرپا ہو سکیں۔ ماضی کی روح سے متاثر ہو کر جو تحریکیں پیدا ہوئیں وہ پائدار ثابت ہوئیں۔ دکن میں تلک کے ذریعہ سیواجی کی روح پھر اپنا اثر دکھانے لگی۔ بنگال کے انقلابی نوجوان کالی کو بھینٹ چڑھایا کرتے تھے اور اس کے سامنے بھارت ماتا کے اوپر قربان ہو جانے کا عہد کرتے تھے دکن میں غیر برہمنوں کی تحریک جو برہمنوں کے اقتدار کے خلاف بغاوت تھی بہت زور پکڑ گئی۔ اس تحریک میں دکن کے مخصوص دیوتا لنگا کو خاص اہمیت حاصل ہوگئی اس دور کے بعد ایک اور عمیق دور آیا۔ اس دور میں شنکر اچاریہ اور گیتا کی تعلیمات کا اثر حاوی ہوگیا راجہ رام موہن رائے۔ لوکمانیہ تلک۔ داس۔ ٹیگور۔ گاندھی وغیرہ میں یہی روح کام کر رہی ہے گو کہ اس کی نوعیت ہر جگہ مختلف ہے جہاں تک گاندھی کی تعلیمات میں ہندو دھرم کی تعلیمات سے زیادہ بدھ اور جین مت کی تعلیمات کا اثر ہے۔ ان کے یہاں "اہنسا" کا خیال پیش پیش ہے جو جین مت کی تعلیمات کی جان ہے ہندو قومیت کا اصل نمائندہ حقیقتاً گاندھی سے زیادہ ٹیگور ہے جو شاہد و مشہود کے تفرقوں کو مٹا کر وحدۃ الوجود کے فلسفہ میں گم ہو جاتا ہے۔

(۵)
ہندو تحریک قومیت کے بعض مظاہر

ہندو تحریک قومیت کے نفسی عوامل کا ذکر کرنے کے بعد ہم اب اس کے بعض مظاہر پر ایک

مختصر نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔ ہندوؤں میں اس تحریک کی مظہر جو اپنی بنیاد صرف ماضی کی روایات پر رکھنا چاہتی ہے آریہ سماج کی تحریک ہے۔ اس کے بانی سوامی دیانند ہیں جو ایک باکردار اور اعلیٰ اخلاق کے انسان تھے۔ ان کی طبیعت ہندو دھرم کی تباہ حالی اور خرابی کو دیکھ کر کڑھتی تھی۔ اُنھوں نے اس کی تجدید کا بیڑا اُٹھایا اور اس کو ہر قسم کی برائیوں سے پاک کرنے کا عہد کیا۔ وہ ویدک دھرم کو اپنی اصل حالت میں زندہ کرنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں اور انگریزوں کی آمد ہندو قوم کے زوال کا باعث ہوئی چنانچہ اس تحریک کے پیروؤں کو ہر خارجی عنصر سے نفرت پیدا ہوگئی۔ مسلمانوں کو بھی وہ صحیح یا غلط ایک خارجی عنصر سمجھتے ہیں اس لئے ان میں اور مسلمانوں میں کشیدگی پیدا ہونا لازمی امر تھا۔

سوامی دیانند اپنے مذہبی خیالات میں بہت زیادہ اسلام سے متاثر ہوئے ہیں اُنھوں نے مذہب کی ایک منظم شکل کا خیال اسلام سے اخذ کیا۔ ہندومت حقیقت میں کوئی مذہب نہیں ہے بلکہ ایک اجتماعی نظام ہے جس میں ہر قسم کے خیالات کے لوگوں کے لئے گنجائش ہے چنانچہ ہندو مذہب میں ایک خدا کے ماننے والے۔ لاکھوں بتوں کی پرستش کرنے والے۔ روح کے قائل۔ مادئین اور تشکیک وغیرہ سب ہی شامل ہیں۔ آریہ سماج نے اعتقادات میں وحدت پیدا کرنے کی کوشش کی اور ایک ذاتِ ہستی پر ایمان رکھنا ضروری قرار دیا ہے اس کا مابعد الطبیعاتی تصور اسلام سے کسی قدر بھی مختلف کیوں نہو۔ اُنھوں نے قرآن کی طرح ویدوں کو بھی آخری سرچشمہ ہدایت قرار دیا اور اس کی ہر تعلیم کو ازلی اور ابدی بتایا۔ جماعتی نظام میں ان لوگوں نے چھوت چھات کی مخالفت کی اور ہندومت کا دروازہ شدھی کے لئے کھول دیا۔ جدید تہذیب و تمدن کے یہ لوگ مخالف ہیں اور شہری زندگی سے دور رہنا چاہتے ہیں۔ آریہ ورت کے پرانے نظام تعلیم کو اُنھوں نے دوبارہ زندہ کیا اور فطرت کے حسین گوشوں میں اپنی درسگاہیں (گروکل) کھول دیں۔

آریہ سماج کے باعث ہندوؤں کی ایک جماعت کو ایک مستقل عقیدہ اور ایک ازلی کتاب کا تخیل ہاتھ آگیا۔ اُنھوں نے جماعتی نظام کی خرابیوں کو بھی دور کیا جس کے باعث وہ ہندوؤں کی

ایک جماعت میں زبردست ہیجانی زندگی پیدا کر سکے۔ اس جماعت میں خارجی تسلط کے خلاف سخت نفرت پیدا ہو گئی اور اس کے پیرو جذبہ آزادی سے سرشار ہو گئے۔

اس تحریک کی بنیادیں چونکہ ہندو تہذیب پر قائم تھیں جسے مشترکہ ہندوستانی تمدن سے کوئی واسطہ نہ تھا اس لئے اس نے ہندو اور مسلمانوں کے خلیج کو اور وسیع کر دیا۔ پھر یہ زمانہ کی جدید ضروریات اور قوتوں سے ناواقف تھی اس لئے بحیثیت مجموعی ہندو قوم کی رہبری نہ کر سکی یہ لوگ زندگی میں حرارت تو پیدا کر سکے لیکن اس کی صحیح رہبری نہ کر سکے اسی باعث اس کے شعلوں نے بسا اوقات وطن ہی کے بعض حصوں کو خاکستر کر دیا۔

ہندو تحریک قومیت کا دوسرا مظہر برھمو سماج کی تحریک ہے۔ اس کے بانی راجہ رام موہن رائے ہیں۔ یہ بہت زیادہ مغرب سے متاثر ہوئے ہیں۔ انھوں نے عیسائیت۔ اسلام اور مغربی علوم و فنون کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ تعصب سے پاک اور ایک نہایت ہی برگزیدہ اور وسیع الخیال انسان تھے ان کے مذہبی خیالات پر سوامی دیانند کی طرح جذبات کا نہیں بلکہ عقل کا اثر تھا۔ وہ ایک عالمگیر انسانیت کا قیام کرنا چاہتے تھے اور ہندوستان میں ایک ایسی قومیت جو انسانیت کی خدمت کرے۔ وہ جہاں اسلام کے صاف و سادہ جمہوری نظام سے متاثر تھے وہاں عیسائیت کی عالمگیر برادری کی تعلیمات کے بھی دلدادہ تھے۔ ان کے خیالات پر یورپ کے دورِ عقلیت کے فلسفہ کا بھی کافی اثر تھا۔ اسی بنا پر وہ تمام مذاہب میں صداقت دیکھتے تھے۔ ان کے وسیع مذہبی تخیل میں ان سب لوگوں کے لئے گنجائش تھی جو انسانیت کی خدمت کریں۔ آریہ سماج کی تحریک جس طرح شمالی ہند کے پرجوش انسانوں کی طبیعت کی مظہر ہے اسی طرح برھمو سماج بنگال کے پرامن اور فلسفیانہ طبیعت کا آئینہ۔ اس نے ہندو اور مسلمانوں کو جدا نہیں کیا بلکہ باہم مربوط کرنے کی کوشش کی۔

برھمو سماج کا اثر ہندوستان کی قومیت کے ارتقا پر بہت گہرا پڑا ہے اور بنگال کی تو تمام جدید تمدنی زندگی اسی تحریک کی ممنونِ احسان ہے۔ بنگال کا دماغ جب مذہبی توہم پرستی سے آزاد ہوا اور اس کی بجائے اس نے ایک وسیع مذہبی مسلک اختیار کیا تو اس کا نتیجہ علوم و فنون اور شعر و ادب

میں ظاہر ہوا۔ ذہنی بیداری سیاسی حرکت کا باعث ہوئی اور بالآخر انڈین نیشنل کانگریس کا قیام ہوا۔
باوجود تمام خوبیوں کے برہمو سماج کی تحریک ہندو جمہور سے تعلق پیدا نہ کر سکی وہ صرف بنگال کے ذہنی طبقہ تک محدود رہی چونکہ اس کی بنیادیں عقل پر مبنی تھیں اور جذبات کا اس میں بہت کم دخل تھا
جس تحریک نے ہندو قوم کو صحیح معنوں میں بیدار کر دیا اور اس کی عمیق قومی روح میں حرارت پھونک دی وہ وہ تحریک ہے جو ہندوستان کے احیاء ماضی پر مبنی ہے لیکن ساتھ ہی جس کا نصب العین ایک عالمگیر انسانیت کی خدمت بھی ہے۔

یہ ہندو تحریک قومیت ایک ہندوستانی قومیت کا قیام چاہتی ہے جس میں ہندو اور مسلمانوں کے بہترین تمدنی سرمایہ کے لئے گنجائش ہو۔ اس کے علمبردار ذہنی دنیا میں ہندوستان کا سرمایہ ناز شاعر ٹیگور اور عملی دنیا میں ہندوستان کا قائد اعظم گاندھی ہے۔ ان دونوں شخصیتوں کا تعلق ہم سے بلاواسطہ ہے وہ اس قدر ہمہ گیر ہیں کہ ان کے لئے مستقل بحث کی ضرورت ہے۔ اس لئے ہم اپنی داستان سرائی یہیں ختم کرتے ہیں۔

نوٹ:- "مسلمانان ہند میں تحریک قومیت" کے لئے ملاحظہ ہو "سالنامہ اجمل" ۱۹۳۲ء پیسہ بلڈنگ بمبئی ص ۳۔

برطانوی مزدوروں کا طرز عمل
جنگ عظیم سے قبل

جنگ عظیم سے لے کر گذشتہ پانچ سال کا زمانہ برطانوی مزدوروں کے لئے خاموش نشو ونما کا دور تھا خاموشی کے اسباب کچھ تو مزدور پارٹی کے سیاسی طرز عمل، کچھ دادی طاقت کے فیصلے کی عائد کردہ پابندیوں اور کچھ ملک کی مجموعی سرد بازاری میں پائے جاتے ہیں۔ اس دور کے قبل ہی جو زمانہ گذر چکا تھا اس میں لبرل اور مزدور پارٹی کی متحدہ کارگذاریوں نے اپنے اراکین کو خوش حالی کے زینے پر پہونچا دیا تھا اس کا اندازہ نیچے دئے ہوئے نقشے سے کیا جا سکتا ہے۔

سال	نرخ غلہ	اجرت بشکل زر [له]	اجرت حقیقی [ٹه]	بے روزگاری کا اوسط
۱۹۰۳	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۵ فی صدی
۱۹۰۴	۱۰۲	۹۶	۹۴	۶ "
۱۹۰۵	۱۰۳	۹۶	۹۳	۵ "
۱۹۰۶	۱۰۲	۹۸	۹۶	۴ "
۱۹۰۷	۱۰۵	۱۰۲	۹۷	۴ "
۱۹۰۸	۱۰۷	۱۰۱	۹۴	۸ "
۱۹۰۹	۱۰۸	۹۹	۹۲	۸ "
۱۹۱۰	۱۰۹	۱۰۰	۹۲	۵ "

له Money wages.
ٹه Real wages

یہ نقشہ صنعتی مزدوروں کی نقدی اور اصلی اجرت کی کیفیت کا اظہار کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ غلّہ کی گرانی کے سبب سے اجرت حقیقی میں تھوڑی بہت کمی ہونا شروع ہوگئی تھی۔ لیکن اس کمی کو پورا کرنے کے لئے اجرت بشکل زر میں بقدر ضرورت اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ اور بے روزگاری کے اوسط کو نظر انداز کئے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مزدوروں کی مجموعی حالت ناقابل اطمینان نہ تھی۔

مگر پھر بھی مزدوروں کا ہر طبقہ اپنی جگہ بے چین اور پریشان تھا۔ اس پریشانی کی ابتدا تو درحقیقت واری طاف کے مقدمہ ہی سے ہو چکی تھی مگر آسبورن[۵] کے نئے مقدمہ نے ہیجان میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ یہ مقدمہ برطانیہ عظمیٰ کی ہاؤس آف لارڈز[۶] کے اس فیصلے کا نتیجہ تھا جس نے ۱۹۰۹ء میں مزدور پارٹی کے ان تمام اخراجات کو جن کی ذمہ داری ٹریڈ یونین پر تھی خلاف قانون ہونے کا اعلان کیا تھا۔ اس فیصلے کے معنی یہ تھے کہ مزدور پارٹی کے مالی ذرائع کو بند کر کے انھیں ایک عضو معطل بنا دیا جائے۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر آسبورن نے مزدور پارٹی کے خلاف عدالت عالیہ میں مقدمہ دائر کیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مزدور پارٹی کو ٹریڈ یونین کی آمدنی اپنے صرف میں لانے کا کوئی حق نہ تھا۔ یہ مقدمہ ایک عرصہ تک چلنے کے بعد آسبورن کے خلاف فیصل ہوا۔ مگر آگے چل کر ہاؤس آف لارڈز نے اس کا ساتھ دیا اور ریلوے ملازمین کی ٹریڈ یونین کے خلاف نقشات عمل میں لائے گئے۔ اس مقدمہ کے فیصلے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ٹریڈ یونین کو مزدور پارٹی کی مالی امداد سے دست بردار ہونا پڑا۔ مگر مزدور پارٹی اپنے اخراجات کے لئے بہرحال انہی مجالس کی مدد درکار تھی اور اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ اس حق کو حاصل کرنے کی جدوجہد مجلس قانون سازی میں کی جاوے۔ ظاہر ہے کہ مزدور پارٹی کی کوئی تجویز اس وقت تک کامیاب

---

۵ W V Osborne ریلوے ملازمین کی مشترکہ کمیٹی کے سکریٹری تھے۔

۶ House of Lords

نہیں ہوسکتی تھی جب تک کہ لبرل پارٹی بھی ساتھ دینے کے لئے تیار نہ ہو۔ اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ لبرل پارٹی مزدوروں کا ساتھ ہر موقع پر دے رہی تھی مگر اس معاملہ میں مدد دینے کے لئے تیار نہ تھی اس طرح دونو پارٹیوں میں اختلافات کی بنیاد پڑنے لگی۔ مگر جلد ہی مصالحت کی کوششوں نے صورت حال میں تغیر پیدا کر دیا اور ۱۹۱۳ء میں ٹریڈ یونین کے اخراجات کے متعلق ایک نیا قانون نافذ ہوا۔ اس کی رو سے ان مجلس کو سیاسی معاملات پر اخراجات عمل میں لانے کا حق عطا ہوا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ جو پابندیاں عائد کی گئیں وہ مختصر طور پر یہ تھیں:۔

(۱) سیاسی اخراجات کے لئے ایک جداگانہ مد قائم کی جائے اور اخراجات کی حد کو اس مد کی جمع شدہ رقم سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔

(۲) سیاسی اخراجات کے لئے اراکین مجلس کی اجازت بذریعہ ووٹ حاصل کی جائے۔

(۳) ٹریڈ یونین کے جو اراکین سیاسی اخراجات میں حصہ دینے کے لئے تیار نہ ہوں۔ ان کو مجلس سے بلا مستعفی ہوئے ایسا کرنے کی اجازت دی جائے۔

(۴) ٹریڈ یونین کے رجسٹرار کو وقتاً فوقتاً مجوزہ قانون میں اصولی ترمیم کرنے کا حق حاصل ہو۔

گو مصالحت کے یہ نکات آخری طور پر تسلیم کرلئے گئے مگر یہ ٹریڈ یونین اور مزدور پارٹی دونو کے لئے ناقابل اطمینان تھے اس قانون نے مجلس کی آزادی پر پابندیاں عائد کرکے مزدور پارٹی کو مالی دشواریوں میں مبتلا کیا اور جذبۂ بغاوت کی آگ نئے سرے سے بھڑکا کر مزدوروں کے طرز عمل میں ہنگامی تغیر پیدا کر دیا۔ لہٰذا اس زمانہ میں جس کی ابتدا ۱۹۱۱ء سے ہوئی تھی بے شمار ہڑتالوں اور کاروباری بغاوتوں کا پھر سے آغاز ہوا۔ اس دور کو ہم "جنگ عظیم سے قبل[1] کا زمانہ" کہیں گے۔

۱۹۱۱ء میں نئی پارلیمنٹ کی ابتدا ہوئی۔ اور ساتھ ہی ہڑتالوں کا ایک مستقل سلسلہ ظہور میں آیا جس میں سب سے پہلا نام ملاحوں کا آتا ہے۔ اس پیشے کی ٹریڈ یونین نے اپنے مطالبات

---

[1] Pre-war

کو حاصل کرنے کے لئے ایک باضابطہ قومی ہڑتال کا اعلان کیا۔ اور حسب ذیل مطالبات پیش کئے۔

(۱) ایک قومی مصالحتی بورڈ[۵۱] قائم کیا جائے جو ملاحوں اور جہاز میں کوئلہ جھونکنے والے مزدوروں کی شکایتوں کو دلچسپی کے ساتھ سنے اور ان کا خاطر خواہ فیصلہ کرنے کا اہل ہو

(۲) اجرت کی آخری حد مقرر کردی جائے تاکہ مالکان جہاز کی طرف سے قلت معاوضہ کا خطرہ باقی نہ رہے۔

(۳) ملاحوں کی تقرری کے طریقوں کو درست کیا جائے۔

مگر مالکان جہاز نہ ان مطالبات کی طرف غور کرنے کے لئے تیار تھے اور نہ تجارتی اتحاد کو مزدوروں کا جائز حق تسلیم کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قومی ہڑتال کو ہر جگہ کامیاب بنانے کی پوری کوشش کی گئی اور ان کے حامیوں کو اپنے ارادوں میں ایسی کامیابی حاصل ہوئی کہ جہازی وفاق[۵۲] کو مجبوراً ہار ماننا پڑی۔ اور مزدوروں کے اکثر مطالبات پورے کرنے پڑے۔ لیکن اس طبقے میں ابھی تک بے اطمینانی کا دور جاری تھا۔ اور بجائے مجموعی عمل کے الگ الگ ہڑتالوں کا سلسلہ قائم ہوچکا تھا۔ اس سلسلہ کی فہرست طویل ہے مگر چند وہ بندرگاہ جہاں ہڑتال کا اثر زیادہ ہوا (۱) لیورپول (۲) کیڈف (۳) مانچسٹر اور (۴) لندن تھے۔ ہڑتالوں کا سلسلہ ترقی ہی کرتا گیا اور ہمدردی یہاں تک بڑھی کہ حکومت کی مدد درکار ہوئی اور مصالحت کے شرائط سرکاری طور پر منظور کرائے جانے لگے۔ اسی سال ریلوے کے ملازمین نے بھی قومی ہڑتال کا اعلان کیا اور دھمکی دی کہ ان کے مطالبات نامنظور کئے جانے کی صورت میں وہ تمام ملک میں ہمدردانہ[۵۳] ہڑتال کرادیں گے۔ موقع کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے حکومت نے پھر مداخلت کی اور ریلوے کارپوریشن کو ملازمین کے جائز

National Conciliation Board ۵۱

Shipping Federation ۵۲

Sympathetic Strike ۵۳

مطالبات منظور کرنے کے لئے مجبور کیا۔

مگر جنوری ۱۹۱۱ء سے ہڑتالوں کا دوسرا سلسلہ جاری ہوگیا۔ اس کی ابتدا گلاسگو کے بندرگاہ میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد فروری میں مانچسٹر اور جولائی میں لیورپل میں ہڑتالوں کا زور رہا۔ اسی سال مئی میں لندن کے بندرگاہ میں ایک اہم ہڑتال کی ابتدا ہوئی۔ اس ہڑتال کا اعلان کرنے والے نئے ٹریڈ یونین کے اراکین تھے اور اس کے خلاف دوسری جانب لارڈ ڈیون پورٹ[۹] بندرگاہ لندن کے صدر تھے۔ وہ اس ہڑتال سے ناراض تھے اور اس میں شریک ہونے والے تمام مزدوروں کو سخت سے سخت سزا کا مستحق سمجھتے تھے۔ جب ٹریڈ یونین نے لارڈ ڈیون پورٹ کے ارادوں کے استحکام کا احساس کیا تو انہیں کامیابی کے لئے تمام بندرگاہوں میں ہمدردانہ ہڑتال کا اعلان کرنے کے لئے مجبور ہوئے۔ اور بعد از خرابی بسیار لارڈ ڈیون پورٹ کو شکست ماننا پڑی یہ سلسلہ اگست تک جاری رہنے کے بعد ختم ہوا۔ مگر اس کے بعد ہی متعدد غیر معروف ہڑتال ہوتے ہی رہے اور اس وقت تک ہوا کئے جب تک کہ جنگ عظیم کی ابتدا نہ ہوگئی۔

بندرگاہوں سے گذر کر ریلوے اور کانوں کے حلقوں میں داخل ہوجئے تو پھر ہڑتالوں کا وہی زور ملے گا جس کا نقشہ ہم ابھی پیش کرچکے ہیں۔ ریلوے ملازمین کی بے چینی کی ابتدا ۱۹۰۷ء میں شروع ہوگئی تھی۔ اس وقت انھوں نے مصالحتی مجلس قائم کرنے کے لئے زور دیا تھا جس کے لئے لیورپل اور مانچسٹر میں بڑی بڑی معرکہ آرائیاں ہوئیں بعد بالآخر یہ مسئلہ ایک شاہی کمیٹی کے سپرد کردیا گیا۔ لیکن اس کمیٹی کی سفارشات مالکان ریل کے خلاف ثابت ہوئیں جو بڑی جد و جہد کے بعد ترمیم شدہ صورت میں منظور کی گئیں۔ اس طرز عمل کے خلاف ملازمین ریل میں جذبات برانگیختہ ہونا شروع ہوئے اور نتیجہ ۱۹۱۱ء کا وہ قومی ہڑتال ہوا جس کا ذکر ہم اوپر کرچکے ہیں۔ اس ہڑتال کے بعد ریلوے ملازمین میں اتحاد اور یکجہتی بڑھتی گئی۔ اور مالکانِ ریل کے خلاف مزدوروں کی رائے عامہ

---

۹ Lord Devonport

طاقت پکڑنے لگی۔ لہذا ۱۹۱۲ء سے کاروباری تنازعات[۵۱] کی ابتدا ہوئی اور مطالبات کی بنا پر مالک و مزدور میں جھگڑے ہونے لگے۔ اس قسم کے چھوٹے چھوٹے جھگڑے تو ۱۹۱۰ء ہی سے شروع ہو گئے تھے مگر ۱۹۱۱ء کی جنگ جو ایک زبردست ہڑتال کی صورت میں نمودار ہوئی بہت اہم تھی۔ اس تنازع کا سبب اجرت کی زیادتی کا مطالبہ تھا اس میں تقریباً دس ہزار آدمیوں نے حصہ لیا تھا۔ ہڑتال کا یہ سلسلہ ۴ ماہ تک جاری رہا۔ مگر مزدوروں کو اس میں کوئی خاص کامیابی نہ حاصل ہو سکی اور مجبوراً اپنے اپنے کام پر واپس جانا پڑا۔ اسی طرح کانوں میں کام کرنے والوں مزدوروں نے بھی ۱۹۱۰ء میں ایک زبردست قومی ہڑتال کا اعلان کیا تھا۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ کانوں کے ملازمین کی اجرت کے لئے قومی[۵۲] حد قائم کر دی جائے۔ اس معاملہ کو حکومت نے خود اپنے ہاتھ میں لیا اور وزیر اعظم اسکوئتھ[۵۳] کو اس کے فیصلے کے لئے مامور کیا۔ مگر باوجود ان کی پوری کوشش کے مصالحت نہ ہو سکی اور مجبوراً ۱۹۱۲ء میں پھر قومی ہڑتال کی ابتدا کرنا پڑی۔ تھوڑے ہی دنوں بعد حکومت نے پھر دخل اندازی کی اور مزدوروں کے مطالبات کے متعلق مجلس قانون ساز میں ایک مسودہ پیش کیا۔ مارچ ۱۹۱۲ء میں یہ مسودہ قانون کی شکل میں پاس ہوا۔ اس کی رو سے کان کے ملازمین کی آخری حد ۵ شلنگ قرار پائی۔ اس کے بعد مزدوروں کی حالت قابل اطمینان ترقی کر رہی تھی کہ ۱۹۱۴ء میں اسکاٹ لینڈ کی کانوں سے ہفتے میں ۴ دن کام کرنے کا حق حاصل کرنے کے لئے شور برپا ہوا۔ مگر جنگ عظیم نے یکایک اس شورش کا بھی خاتمہ کر دیا۔

اس دور کے دیگر کاروباری حلقوں میں بھی بے چینی کی فضا پھیل رہی تھی۔ چنانچہ ۱۹۱۲ء میں ڈنڈی کے جوٹ کی مشینوں میں کام کرنے والے مزدوروں نے ایک زبردست ہڑتال کا اعلان کیا۔

---

۵۱ Industrial disputes

۵۲ National Minimum

۵۳ Asquith

ان کا عدم بھی معاوضوں کی کمی تھا۔ اسی طرح مشرقی و مغربی لندن کے درزیوں نے بھی اپنے مطالبات کے سلسلہ میں ہڑتال کا اعلان کیا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد انجینیروں کے ایک طبقے نے اجرت کی کمی کی بنا پر ایک زبردست ہڑتال کی بنا ڈالی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد یارک شائر کے رنگ سازوں نے اپنے حقوق حاصل کرنا چاہے اور اس سلسلہ میں بہت دنوں تک ہڑتال مناتے رہے۔

لیکن اس زمانہ کی سب سے زیادہ اہم اور دلچسپ تحریک وہ تھی جس کی ابتدا جیمس لارکن[٥١] نے کی۔ یہ تحریک آئرلینڈ سے شروع ہوئی اس کا ماحصل محکمہ آمد و رفت[٥٢] کی ٹریڈ یونین کو مستحکم کرنا اور ان کو فروغ دینا تھا۔ لارکن کی تحریک میں محکمہ آمد و رفت کے ملازمین کے علاوہ دیگر کارد بار کے مزدوروں نے بھی حصہ لیا۔ اس طرح ہم خیالوں کی ایک بڑی جماعت لارکن کے بتائے ہوئے طریقوں پر عمل کرنے کے لئے تیار ہوگئی۔ اس کا طریقہ اپنی طرز کا نرالا اور عجیب تھا۔ اور بظاہر یہ گمان ہوتا تھا شاید اس سے بہتر دوسری ترکیب نہ ہو۔ طرز عمل اس کا بھی وہی تھا جس کے عادی مالک و مزدور دونو ہو چکے تھے۔ یعنی ہڑتال۔ مگر طریقہ جداگانہ تھا۔ ان ہڑتالوں کا اعلان بلا پیشگی اطلاع کے کیا جاتا تھا۔ تاکہ مالکان کو سوچنے اور غور و خوض کرنے کا موقع ہی نہ مل سکے۔ ان کی کوششوں کی بہترین کامیابی یہی تھی کہ ہڑتال کا حربہ آفت ناگہانی کی شکل میں پیش کیا جائے۔ اور ہمدردانہ ہڑتال کے لئے ہر محکمہ کے مزدوروں کو ہمہ وقت تیار رکھا جائے۔ اور اگر ہمدردانہ ہڑتال کامیاب نہ ہو تو اس کی کوشش کی جائے کہ ساتھ نہ دینے والے مزدوروں کی تیار کردہ ساماں کا کوئی گاہک ہی نہ مل سکے۔ شروع شروع میں یہ ترکیب بڑی کامیاب ثابت ہوئی۔ مگر رفتہ رفتہ اس کا اثر کم ہوتا گیا۔ کیوں کہ ساہوکار طبقہ بھی اپنی جگہ پر کافی ہوشیار تھا اور جلد ہی اس قسم کی ناگہانی مصیبتوں سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔ اور ہمہ

---

[٥١] اسی موجد کے نام پر اس تحریک کا نام Larkinsm رکھا گیا۔

[٥٢] Transport

وقت اتفاق اور ہمدردانہ ہڑتال کے لئے تیار رہنے لگا۔ کچھ عرصہ کے بعد لارکن کی یہ حکمت عملی عام طور پر ناپسندیدہ خیال کی جانے لگی اور اخبارات اس کے خلاف رائے عامہ کا اظہار کرنے لگے نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۹۱۳ء میں لارکن کو بغاوت کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا اور قید سخت کی سزا دی گئی۔ لیکن اس خبر نے پبلک اور مزدور دونوں طبقوں میں ہیجان بپا کر دیا ہمدردیاں بہرحال لارکن کے ساتھ تھیں۔ حکومت کے اس فیصلے نے لوگوں میں ایسی شورش پیدا کر دی کہ مجبوراً نقص امن کے خوف سے اس کو رہا کرنا پڑا۔ مگر بالآخر لارکن کی جدوجہد کا کوئی خاص نتیجہ نہ نکل سکا اور اگرچہ ہڑتالی مزدوروں کی حمایت کے لئے تمام برطانیہ تیار ہو چکا تھا مگر پھر بھی ماحصل یہی رہا کہ "لڑائی برابر کی رہی"[1]

اس کیفیت نے تجارتی اتحاد کی پالیسی اور برطانیہ کی فضا پر ایک نیا اثر ڈالا۔ لوگوں کی ہمدردیاں مزدور طبقے کی طرف شامل ہونے لگیں۔ اور ساہوکاروں کی طرف سے طبقوں میں انحراف پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ یہ ایک ایسا نیا اور سنسنی خیز طرز عمل تھا جس نے ساہوکاروں اور حکومت دونوں کو معاملات پر نظر عمیق ڈالنے۔ اور موجودہ خرابیوں کو دور کرنے کی کوششیں کرنے کے لئے مجبور کیا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ گذشتہ دنوں میں اکثر و بیشتر اختلافات کی پیچیدگیوں کو سلجھانے کے لئے حکومت کی مدد درکار ہوا کی ہے۔ مگر اب یہ خیال ترقی پذیر ہو چلا تھا کہ اس طرح مداخلت کرنا حکومت کے شایان شان نہ تھا اور خوف تھا کہ آئندہ چل کر اس میں خرابیاں نہ پیدا ہو جائیں۔ اس لئے سنہ ۱۹۱۱ء میں ایک صنعتی کونسل[2] قائم کی گئی جس کے اراکین میں مالک و مزدور دونوں کے نمائندے شامل تھے اس کونسل کا مقصد آپس میں مصالحت قائم کرنا اور دوستانہ تعلقات کو ترقی دینا تھا۔ مگر یہ مجلس مصالحت پیدا کرنے میں بالکل ناکام رہی۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں اس کونسل کی

---

[1] James Connolly سے نقل ہے۔

[2] Industrial Council

طرف سے ایک تحقیقاتی کمیٹی صنعتی مصالحت کے طریقوں پر غور کرنے کے لئے بٹھلائی گئی۔ کمیٹی کے صدر سر جارج اسکوتھ تھے جو بعد میں لارڈ اسکوتھ ہوگئے۔ اس کی سفارشات کا خلاصہ یہ تھا کہ ایک جبریہ مصالحتی بورڈ[1] قائم کیا جائے جو ہڑتال سے قبل تنازعات کے وجوہ پر غور کرے اور کوئی ہڑتال اس وقت تک جائز نہ قرار دی جائے جب تک کہ یہ بورڈ اپنی تحقیقات کا فیصلہ شائع نہ کرے۔ مگر صنعتی کونسل اس قسم کا بورڈ قائم کرنے کے لئے بالکل تیار نہ تھی۔ اس لئے بالآخر یہ تجویز عملی صورت میں تبدیل نہ ہوسکی۔

لیکن مزدور طبقے کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی اور کانکن، ریلوے اور دیگر محکمات آمد و رفت میں کام کرنے والے اکثر ملازمین ۱۹۱۱ء کے ہڑتال کی بدولت بے روزگار ہو چکے تھے اس لئے اس وقت سوائے اس کے اور کوئی صورت نہ تھی کہ ان[2] تینوں جماعتوں کو یکجا کرکے ایک متحدہ طاقت وجود میں لائی جائے جو مختلف اضلاع میں بیک وقت اپنے مطالبات کو پیش کرے۔ ان کے نہ حاصل ہونے کی صورت میں ایک متفقہ رائے پر عمل کرے اور جس وقت ممکن ہو عام ہڑتال کا اعلان کردے۔ اس قسم کا اتحاد ٹریڈ یونین کے لئے قابل فخر تھا مگر افسوس ہے کہ جنگ عظیم اس کی ترقی کے لئے بھی سد باب ہوئی۔

مختصر یہ کہ جنگ عظیم سے قبل کا زمانہ مزدوروں کی بے چینی کا وہ دور تھا جس میں ہڑتال اور صنعتی تنازعات کی بدولت مالک و مزدور دونوں مصیبت میں مبتلا رہے۔ اس بحث کو فی الحال ہم ہڑتالوں کے مندرجہ ذیل نقشہ کے ساتھ ختم کریں گے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ جنگ سے قبل کی شورش میں مزدوروں کی کس قدر کثیر تعداد نے ہڑتالوں میں حصہ لیا اور ان کا کتنا مرتبہ بہا وقت مطالبات

---

[1] compulsory Conciliation

[2] کان، ریل، اور دیگر محکمات آمد و رفت کی مجالس کو ملا کر جو جماعت قائم ہوئی وہ Tripple Alliance کے نام سے مشہور ہے۔

ے حصول کی کوششوں پر قربان ہوا ۔

جنگ عظیم سے قبل کے دور میں ہڑتالوں کا نقشہ

سال	ہڑتال میں حصہ لینے والے مزدوروں کی تعداد	دنوں کی تعداد جو اس سلسلہ میں صرف ہوئے
۱۹۱۱	۹۵۲,۰۰۰	۱۰,۱۲۶,۰۰۰
۱۹۱۲	۱,۴۶۲,۰۰۰	۳۸,۲۵۵,۰۰۰
۱۹۱۳	۶۶۴.۰۰	۱,۲۳۹,۰
۱۹۱۴	۴۴۷,۰۰۰	۹,۳۶۲,۰۰

اس نقشہ کو پیش کرنے کے بعد ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ جنگ عظیم سے قبل کی صنعتی و کاروباری بے چینیوں پر مزید روشنی ڈالی جائے ۔

راج کماری ۔ جو سرکاری نوکر ہو جس کے پاس بہت سا دھن ہو ۔۔۔ روپیہ پیسہ ہو جائداد ہو ۔

کرشن ۔ تو جب بھیّے کو نوکری مل جائے گی تو وہ بھی بڑا آدمی بن جائے گا ۔ ہے نا ماں ؟

راج کماری ۔ کوئی ایک دم سے دھن تھوڑی برسیں گے ۔۔۔ دھیرے دھیرے پرماتما کی دیا ہوئی تو پیسے والا ہو ہی جائے گا ۔

کرشن ۔ تو ماں یہ کیا بات ہے کہ کسی کے پاس زیادہ روپے ہوتے ہیں اور کسی کے پاس کم ۔

راج ۔ میں کیا جانوں ۔۔۔ شاید یوں ہوتا ہے کہ جو بڑا کام کرتے ہیں انھیں زیادہ روپے ملتے ہیں اور جو چھوٹے کام کرتے ہیں انھیں کم ۔ ۔ ۔

کرشن ۔ تو ہمارا بھیّا بڑا کام کیوں نہیں کرتا ۔

راج کہاں سے کرے ۔ کام ہو تو کرے کام ہی نہیں ملتا ۔

کرشن ۔ کیوں ؟!

راج ایک جگہ خالی ہوتی ہے تو ہزار کام کرنے والے آموجود ہوتے ہیں ۔

کرشن ۔ کیسا اچھا ہوتا اگر اتنے کام کرنے والے نہ ہوتے ۔۔۔

راج ۔ (خفیف مسکراہٹ سے) ہوں ۔ مگر یہ کیسے ۔۔۔

کرشن ۔ مگر ماں ۔ ہماری ٹیچر جی تو یہ کہا کرتی ہیں کہ بھگوان نے ہر آدمی کے لئے کوئی نہ کوئی کام پیدا کیا ہے ۔

راج ۔ ہاں یہ تو ٹھیک ہے ۔

کرشن ۔ تو پھر بھیّے کے لئے کام پیدا نہیں ہوا کیا ؟

راج ۔ ضرور ہوا ہوگا ۔ پر بیٹا آج کل کی تو دنیا ہی بدل گئی ہے ۔۔۔ لے وہ آگیا جگدیش ۔

کرشن ۔۔۔ بھیّے !!

(نوجوان جگدیش خستہ تن، پژمردہ صورت، پریشان حال سر جھکائے داخل ہوتا ہے، ٹوپی تخت پر پھینک کر ایک کرسی پر نڈھال ہو کر بیٹھ جاتا ہے اداس آنکھوں سے غصہ اور نفرت کی چنگاریاں نکل رہی ہیں ۔

کرشن کماری، جلدی سے دوسرے کمرے میں جاتی ہے۔ راج کماری ترحم بھری نظروں سے جگدیش کو دیکھتی ہے۔ سینے پرونے کا کام بند کرکے، آہستہ آہستہ جگدیش کے قریب آتی ہے لیمپ کی بتی کو اور اونچا کرتی ہے۔ جگدیش زمیں میں نظریں جمائے ہوئے ہے۔ کچھ دیر خاموش رہتی ہے)۔

راج کماری۔ (نرمی سے) جگدیش !!!

جگدیش (بغیر سر اٹھائے) ہوں ؟

راج کماری —— منہ ہاتھ دھوکے۔ کھانا کھالے نا۔ صبح سے بھوکا ہوگا —— !

جگدیش۔ (اسی طرح) ہوں !!

(کرشن کماری اندر والے کمرے میں سے کچھ برتن لئے ہوئے آئی۔ راج کماری اس کے ہاتھ سے برتن لے کر تخت پر رکھتی ہے۔ کرشن کماری چپ چاپ میز کے پاس جا کھڑی ہوتی ہے۔ کچھ دیر خاموش رہتی ہے۔)

راج کماری۔ آخر کیا گذری ؟ کچھ تو بتا !

جگدیش۔ گذری کیا —— پچاس کے قریب اُمیدوار تھے —— جو سب سے زیادہ نالائق، سب سے زیادہ مکار، فریبی اور جھوٹا تھا اُس کو جگہ مل گئی اس لئے کہ اس نے ڈائرکٹر صاحب کی جیب سونے اور رُوپے سے بھر دی تھی !!

راج کماری۔ بڑی ناانصافی ہے —— !!

جگدیش۔ ناانصافی !! ظلم ہے، اندھیر ہے، کُھلّم کُھلّا لوٹ ہے اور کیا ہے —— !!

راج کماری۔ خیر —تو چنتا نہ کر —— دیکھا جائے گا —بھگوان کبھی نہ کبھی تو ہمارے دن بھی پھیریں گے۔

جگدیش۔ بھگوان !!! ——— یہ دن تو اب اپنے ہی پھیرے سے پھریں گے —— !

راج کماری۔ (جگدیش کی ٹوپی کھونٹی پر ٹانگتے ہوئے کہتی، جا بیٹے کا کھانا تو لا ——— (کرشن کماری اندر والے کمرے میں جاتی ہے)۔

جگدیش ۔ میں روٹی نہیں کھاؤں گا ——

راج کماری ۔ کیوں ؟؟

جگدیش ۔ بھوک نہیں ہے ۔

راج کماری ۔ بھوک کیوں نہیں ہے —— کیا دن کو کچھ کھایا تھا ؟

جگدیش ۔ ہاں ہیرالال کے ساتھ چاٹ پی تھی ۔

راج کماری ۔ کون ہیرالال ؟ کیا لالہ شام لال کا بیٹا ؟؟

جگدیش ۔ ہاں ، وہی ۔

راج کماری ۔ کیا کام کرتا ہے ۔ اُس کا باپ تو بڑا آدمی ہے ۔ کوئی اچھی نوکری دلوادی ہوگی ۔

جگدیش ۔ ہاں دلوادی تھی مگر اس نے چھوڑدی ۔

راج کماری ۔ لگی لگائی نوکری چھوڑدی یہ کیوں ؟

(کرشن کماری کھانا لے کر آتی ہے)

جگدیش ۔ وہ مغرور افسروں کی ٹھوکریں نہیں کھا سکا —— اور اب تو وہ دیش سیوا منڈلی کا سکرٹری ہے، پکڑا جائے گا کبھی نہ کبھی ! —— بیٹے کو دودھ لادے ، روٹی نہیں کھائے گا ۔

کرشن کماری ۔ دودھ ، اچھا !!

جگدیش ۔ کئی دفعہ پکڑا جا چکا ہے ۔ ابھی دو برس کی کاٹ کر آیا ہے ۔ اُس کی زبان میں ایسا جادو ہے کہ ہر کسی کا دل موہ لیتا ہے ۔ ملک میں بے چینی پھیلا دینے کے جرم میں پکڑا گیا تھا ۔

راج کماری ۔ تو اس نے کیوں بے چینی پھیلائی ۔ ؟

جگدیش ۔ ماں ، بے چینی تو زمین میں آسمان میں ہوا میں پھیلی ہوئی ہے آج ہندوستان کا بچہ بچہ بے چین ہے ۔ بعض ایمانداری سے دل کی بات کہہ دیتے ہیں اور بعض دل ہی دل میں کڑھتے رہتے ہیں ۔ کچھ ایسے کمینے بھی جنھوں نے اپنا ایمان جھوٹ کے ہاتھ بیچ رکھا ہے وہ ہی جیب تک راگ گائیں مگر بے چینی کو کیسے مٹا سکتے ہیں ۔

(کرشن کماری دودھ لاتی ہے)

راج کماری۔ (دودھ کا گلاس میز پر رکھتے ہوئے) لے یہ دودھ تو پی۔

جگدیش۔ آج ہم ہندوستانی اپنے دیس اور اپنی جنم بھومی میں رہ کر بھی اپنے آپ کو بدیسی سمجھتے ہیں خود اپنے ہی گھر میں فاقوں سے مرتے ہیں۔ اس بھارت ورش میں جہاں ہماری ہزاروں پیڑیاں گذر گئیں ہم ابھی تک اپنے آپ کو بیگانہ سمجھتے ہیں۔ اپنے گھر کو اپنا گھر نہیں کہہ سکتے۔ اپنے اَن کو اپنا اَن نہیں کہہ سکتے —— اور ایسے آدمی جن کو بھگوان نے اپنا گھر رہنے بسنے کے لئے دیا ہے۔ دھن دیا ہے۔ دنیا کی ساری نعمتیں دی ہیں ہمارے جھونپڑوں میں گھس آتے ہیں ہمارے ہاتھوں سے ہماری روٹی چھین کر کھا جاتے ہیں ہمارے بچے بھوک سے بلک بلک کر مر جاتے ہیں اور حکومت جیس کی بنسی بجاتی ہے کیا اس کو پرجا کی رکھوالی کہتے ہیں —— !!

راج کماری۔ جگدیش، جگدیش !!! یہ تجھے کیا ہو رہا ہے۔ یہ کیا ......

(جوش میں کھڑا ہو جاتا ہے)

جگدیش۔ پر اب حد ہو چکی ہے —— غریب بھوک کی آگ بجھانے کے لئے روٹی چراتا ہے۔ سردی، برف اور بارش سے بچنے کے لئے دوسرے کے گھر میں گھس آتا ہے تو دنیا اُسے چور کہتی ہے، اُچکا کہتی ہے بدمعاش کہتی ہے۔ امیر فریب اور دھوکے کے پھندے میں لوگوں کو پھنسا کر انھیں لوٹتا ہے دنیا اسے عقلمند سوداگر، بدھی مان مہاجن کہہ کر اپنے سر پر بٹھاتی ہے۔ غریب روٹی کی لالچ میں خون کرتا ہے، دنیا اُسے قاتل، خونی کہہ کر پھانسی پر لٹکا دیتی ہے۔ امیر بیسیوں ہتھکنڈوں سے مورکھ اور انجان آدمیوں کو موہ کے ریشمی جال میں پھنسا کر اُن کا خون تک چوس جاتا ہے۔ لوگوں کے تنوں کے کپڑے تک اُتروا لیتا ہے تاکہ وہ سردی میں ٹھٹھر کر مر جائیں دنیا اسے سیاست داں، حکومت کا مشیر خاص کہہ کر اپنی آنکھوں میں جگہ دیتی ہے ....

کرشن کماری۔ بیٹے دودھ تو پی لو۔۔۔ ۔ ۔

جگدیش۔ (نئے جوش کے ساتھ)۔۔۔۔ ۔ پر اب ہندوستان ایک نیا جنم لے گا۔ اس اجڑے دیار کے ویرانے میں نئی دنیا بسے گی۔ یہاں کی تپتی ہوئی پیاسی ریت سے نئی ہری بھری کھیتیاں لہلہائیں گی ـــــ پرجا کے دلوں کی راکھ سے، قبرستان اور شمشان کی مٹی سے ایک نئی پود جنم لے گی جو انسانیت کا جھنڈا بلند کئے ظلم کا سر کچل کر رکھ دے گی۔ دانہ دانہ کی محتاج رعایا کو اپنا خون، اپنی ہڈی اور چمڑا کھلا کر انھیں پروان چڑھائے گی ـــــ انسانیت کی سیوا کرنا اس کا دھرم ہوگا اور دنیا کی کوئی طاقت اسے اس کے ارادوں سے نہیں روک سکے گی ـــــ جلد بہت جلد اس جنت نشاں ہندوستان سے اپاپ کا بیج مٹ جائے گا۔ اونچی اونچی عمارتیں، شاندار محل جس میں غریب کی روٹی کھا جانے والے امیر آنند کی سیج پر سوتے ہیں مسمار ہو جائیں گے غریب ان عمارتوں کی اینٹ سے اینٹ بجا کر میٹھی نیند سوئے گا ـــــ نزدیک ہے وہ زمانہ جب سنسار پر انصاف، رحم اور نیکی حکومت کرے گی ـــــ ظالم کا ہاتھ تھک گیا اور مظلوم کی پیٹھ نہ تھکی ـــ آہ! مگر ـــــ دیکھو ساری دنیا اب ہندوستان کی ہمت ہندوستان کی محبت اور سیوا کے گیت گانے والی ہے آزادی کا مندر سامنے ہے ـــ پجاری! ہمت سے کام لے ۔۔۔۔۔ ۔

۔ ۔۔۔ ۔۔۔ تیری منزل آگئی ۔۔۔۔۔۔۔ ۔۔

راج کماری۔ جگدیش ـــــ جگدیش! ـــــ جگدیش!!! آہ!

(راج کماری نڈھال ہو کر تخت پر گر پڑتی ہے کرشن کماری دوڑ کر اس کے قریب آتی ہے جگدیش کا جوش ٹھنڈا ہوتا ہے۔)

کرشن کماری ـــــ ہاں، ہاں، کیا ہوا۔

راج کماری کی ہچکی بندھی ہوئی ہے۔

راج کماری۔ (بیٹھ کر) جگدیش! آہ! آج کس نے تجھے یہ سبق پڑھا دیا ـــــ آہ! کیوں تباہی کے

پیچھے دوڑتا ہے ——

جگدیش۔ ماں، —— میں — میں .... ۔ (تخت پر بیٹھ جاتا ہے)

(کچھ دیر خاموشی رہتی ہے۔ کرشن کماری، راج کماری کو پانی کا گلاس دیتی ہے اور جگدیش کو دودھ —— دونوں پیتے ہیں —— خاموشی)

جگدیش۔ ماں —— میں۔ دیش سیوک کا ممبر ہو گیا ہوں۔

راج کماری۔ تو —— دیش سیوک منڈلی کا ممبر —— ہے بھگوان! یہ کیا ہو گیا۔

جگدیش۔ ماں۔ سنو تو سہی، دیش سیوک کوئی خطرناک سبھا نہیں ہے۔ ہم بازی نہیں کرتی بلکہ صرف ہندوستان کے نوجوانوں میں عمل اور ہمت کا جوش پیدا کرتی ہے۔ آخر اس میں کیا بُرائی ہے۔

راج کماری۔ مگر آخر تجھے ایسی کیا ضرورت پیش آئی تھی۔

جگدیش۔ ضرورت کچھ نہیں ماں۔ یہ تو میرا فرض تھا۔ ہندوستان کے ہر بچے کا فرض ہے۔

راج کماری۔ میں یہ بے کار باتیں نہیں جانتی —— سُن۔ میں اپنے ماما سے کہہ کر تجھے کوئی نہ کوئی کاروبار کروا دوں گی تو ان باتوں کو چھوڑ۔ یہ سب بے کار اور ذلیل باتیں ہیں۔ آئے دن اس طرح کے فضول قصے سنتی رہتی ہوں —— یا پھر تو جانتا ہے کہ بھگوان کی دیا سے میرے پاس ابھی اتنا ہے کہ ہم تینوں مزے میں زندگی گذار سکتے ہیں۔ تو کچھ نہ کر —— میرے پاس رہ۔ میری سیوا کر۔ یہ دیش سیوک ویش سیوک سب بیکار کے جھمیلے ہیں۔

جگدیش۔ ماں، دیش سیوک بیکار کا جھمیلا نہیں ہے۔ اس نے تو ویسے کام کئے کہ کانگریس بھی نہیں کر سکی۔ اس وقت چھ سو سے زیادہ اس کے ممبر ہیں۔ دیوان امر سنگھ ہمارے سردار ہیں انھوں نے مجھے اپنا سکریٹری بنا لیا ہے۔ تنخواہ بہت معمولی ہے جو میرے گذارے کو بہت کافی ہے۔ تیس روپے میں سے آدھے تمھارے بھینٹ ہوں گے۔ آدھے میں میں گذر کروں گا۔

انھوں نے سر ہو کر مجھے ممبر بنایا ہے وہ کہتے ہیں کہ تم ہندوستان کا بہت کام کر سکتے ہو۔

راج کماری۔ بیٹا، تو یہ تو سوچ کہ تیرے باپ دادا بہت عزت دار آدمی تھے اور سب سرکاری نوکر اب تو کیسے سرکار کی بغاوت کرتا ہے۔

جگدیش۔ ماں، ہمارا کام بغاوت کرنا نہیں۔ اپنے حقوق طلب کرنا ہے اور بس —— تم گھبراؤ نہیں میں پرماتما کی دیا سے کبھی کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے باپ دادا کے نام کو بٹہ لگے —— میں مانتا ہوں کہ میرے باپ دادا نے سرکار کی خدمت میں اپنی جان تک گنوا دی مگر اب وہ وقت نہیں کہ ہم اپنی قیمتی جانیں یوں ضایع کر دیں اس وقت ہندوستان کو ہماری خدمت کی ضرورت ہے۔ برسوں کے بعد آج ایسا موقع آیا ہے کہ جب جان پر آ بنی تو بھارت ماتا اپنے لاڈلے سپوتوں کی سیوا طلب کرتی ہے۔ کیا ہمارا فرض نہیں ہے کہ ہم اُس کی خدمت کو کھڑے ہو جائیں؟ ہم کوئی ناجائز بات نہیں کرتے، صرف اپنا حق مانگتے ہیں ——

راج کماری۔ میری سمجھ میں یہ باتیں نہیں آتیں —— میری خاطر سے تجھے یہ خیال چھوڑ دینا پڑے گا۔

جگدیش۔ ماں، یہ ناممکن ہے —— میں قسم کھا چکا ہوں۔ مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ کوئی بے غیرتی یا بے عزتی کا کام نہیں کروں گا —— کل ہم لوگ احمد آباد جائیں گے جلسے میں ——

راج کماری۔ میں تجھے نہیں جانے دوں گی —— کبھی نہیں ——

جگدیش۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، ماں، مجھے ضرور جانا چاہیے مجھے تو تقریر کرنی ہے۔

راج کماری۔ اے رے —— آہ! تجھے میری قسم جو جائے ——

جگدیش۔ سوچو تو سہی یہ کیسے ——

راج کماری۔ چاہے کچھ ہی ہو میں تجھے نہیں جانے دوں گی۔

جگدیش۔ نہیں ماں، میں جاؤں گا۔ ضرور جاؤں گا۔

راج کماری —— آہ —— ! (منہ ڈھانک کر روتی ہے)

کنّی - بھیّا ! تم نہ جاؤ نا ـــــ ماں اکیلی کیسے رہےگی۔

جگدیش - کنّی ! تو جو ہوگی ماں کے پاس !

کنّی - اور میں اکیلی کیسے رہوں گی ؟

جگدیش - ماں جو ہوگی ـــــ پھر میں جلدی لوٹ آؤں گا گھبرا نہیں اور پھر تیرے لئے احمدآباد سے اچھی اچھی چیزیں لاؤں گا۔

کنّی - لال کور کی ساڑی۔

جگدیش - ہاں، ہاں، بہت سی ساڑیاں۔

کنّی - اور جوتہ

جگدیش - ہاں اور جوتہ بھی

کنّی - اور سلیٹ

جگدیش - ہاں، سلیٹ بھی !! اور کچھ ؟

کنّی - نہیں

جگدیش - اچھا، ذرا پانی تو پلاؤ ماں کو۔

(کنّی پانی لاتی ہے۔ راج کماری پانی نہیں پیتی تھوڑی دیر خاموش ـــــ)

راج کماری - جگدیش ـــــ کیا تو کسی طرح بھی اس ارادے کو نہیں بدل سکتا۔

جگدیش ماں، اب تو یہ ناممکن ہے، میں قسم کھا چکا ہوں۔

راج کماری - اچھا ـــــ تو نے کیا اس کا بھی خیال نہیں کیا کہ مجھے تجھ سے کتنی محبت ہے۔

جگدیش - میں جانتا ہوں ماں ! خوب جانتا ہوں۔

راج کماری - پھر تو کیسے سمجھتا ہے کہ میں تجھے چھوڑ دوں گی ؟

جگدیش - اس میں بات ہی کیا ہے ماں، میں تو نوکر ہوں بس، مگر تمہاری آگیا کی سخت ضرورت ہے گو یہ کام تو ایسا ہے کہ بغیر تمہاری آگیا کے بھی کیا جا سکتا ہے مگر مجھے اطمینان نہیں ہوگا جب تک

کر تم آگیا بندہ — تمہیں اجازت دینی ہی پڑے گی ماں ؟

راج کماری — ایک شرط پر —

جگدیش ۔ وہ کیا ؟

راج کماری (میز کی دراز میں سے ایک تصویر نکالتی ہے) دیکھ یہ تیرے پتا کی تصویر ہے اس کو سامنے رکھ کر قسم کھا کہ کوئی ایسا نیچ کام نہیں کروں گا جس سے تیرے باپ دادا کی عزت کو بٹہ لگے — ہمیشہ سچ بولے گا ، ہمیشہ نیکی کی راہ چلے گا اور ہمیشہ بھگوان سے ڈریگا —

جگدیش ۔ (تصویر کے سامنے ہاتھ جوڑ کر) میں قسم کھاتا ہوں کہ کبھی کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے میرے باپ دادا کے نام کو بٹہ لگے ، ہمیشہ سچ بولوں گا اور نیکی کی راہ چلوں گا — بھگوان مجھے اس عہد کو پورا کرنے کی شکتی دے —"

راج کماری جگدیش کو گلے سے لگا لیتی ہے ۔
دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں ۔

پردہ

دوسرا منظر

(پانچ سال بعد وہی کمرہ ۔ وہی سامان مگر ذرا شکستہ حالت میں ۔ دسمبر کا مہینہ رات کے دس بجے کا وقت ، کنتی عمر بارہ سال لیمپ میز پر رکھ کر کھڑکی کھولتی ہے راج کماری نحیف و نزار اندر والے کمرے میں سے آتی ہے)۔

راج کماری ۔ کنتی ۔ یہ تو نے کھڑکی کیوں کھول دی ۔ بند کر جلدی ۔
(کنتی کھڑکی بند کرتی ہے)
تجھے یاد نہیں اس نے کہا تھا کہ میری آواز آنے کے بعد کھڑکی کھولنا —

کرشن کماری ۔ مگر ہاں ـــــ آج تو بھیّے شاید ہی آسکیں ۔ باہر تو موسلا دھار بارش ہو رہی ہے اور بڑی تیز ہوا چل رہی ہے۔

راج کماری ۔ مگر اُس نے آج ہی کے دن آنے کو کہا تھا ـــــ (تخت پہ بیٹھتے ہوئے) آج بدھ وار ہے نا؟ وہ ضرور آئے گا ۔ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ وعدہ کے مطابق نہ آیا ہو ۔ چاہے کتنی ہی سردی .... ۔

کنّی ۔ یہ کیسی آواز ـــــ (خاموشی)

راج کماری ۔ یہ تو ہوا کی آواز ہے ۔

کنّی ۔ باہر اتنی تیز ہوا چل رہی ہے کہ چاہے کوئی کتنا ہی چلائے آواز آنی مشکل ہے ۔ بارش ـــ

راج کماری ۔ سن تو سہی ـــــ پھر آواز آئی (خاموشی)

(کرشن کماری دائیں طرف کا دروازہ کھولتی ہے ہوا کا تیز جھونکا اندر آتا ہے)

راج کماری ۔ دروازہ بند کر جلدی ـــــ دو میل پرے سے بھی آدمی نظر آجائے گا ۔ جب کبھی دروازہ کھولے روشنی کم کر کے کھولیو ۔ (کنّی تخت پر بیٹھ کر جلدی جلدی بنتی ہے)

راج کماری ۔ یہ کیا بُن رہی ہے اس وقت ؟

کنّی ۔ بھیّے کا سوئٹر ۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ آج آئیں گے نہیں تو میں اسکول میں پورا کرتی ـــ بس کالر لگانا باقی ہے ـــ آج ہی دے دوں گی کیونکہ پتہ نہیں وہ پھر کب آئیں ۔

راج کماری ۔ ہاں، یہ تو بتا آج تو کہہ رہی تھی کہ شہر میں بہت سے لال کوٹ والے پکڑے گئے ۔

کنّی ۔ ہاں، بارہ ٹونٹی کے قریب پولیس والے بہت سے لال کوٹ والوں کو پکڑے لئے جا رہے تھے ـــــ ذرا سننا، بھیّے کی آواز تو نہیں ہے ـــ (خاموشی) ـــــ

راج کماری ۔ نہیں ـــــ یہ تو چوکیدار کی آواز ہے ـــ

کنّی ۔ ہاں، تو میں نے بڑے غور سے دیکھا کہ کہیں بھیّے تو ان میں نہیں ہے ....

راج کماری ۔ دیکھ تو ـــــ تو نے کھانا کافی بنا لیا ہے نا ؟

کنی ۔ ہاں ہاں ——

راج کماری ۔ پچھلی دفعہ جب وہ آیا تھا جس کو آج سات دن ہو گئے تو کہہ گیا تھا کہ روٹی زیادہ پکا دینا میں اپنے ساتھیوں کے لئے بھی لے جاؤں گا ——

کنی ۔ ماں، آخر یہ حالت کب تک رہے گی۔ کب تک چوروں کی طرح رہا جا سکتا ہے ۔

راج کماری ۔ یہی تو میں بھی سوچتی ہوں ۔ ڈیڑھ سال سے پولیس ان لوگوں کی تلاش میں ہے ۔ پکڑے جائیں گے ایک نہ ایک دن ضرور ۔ جگدیش کہہ رہا تھا کہ .. سو سے زیادہ دیش سیوک جیل میں بند کئے جا چکے ہیں اور بغیر کسی قسم کا مقدمہ چلائے ۔ صرف سرغنے باقی ہیں جن کی تعداد بیس سے زیادہ نہیں —— سات تو دلّی ہی کے ہیں ۔

کنی ۔ تو ماں، بھیّے بھی کیا سردار ہو گئے ہیں (مسکراہٹ کو کم کر کے میز پر رکھتی ہے) ۔

راج کماری ۔ ارے سردار !! اس نے تین سال کے اندر ہی اندر وہ نام پیدا کیا کہ ہر اخبار اور رسالے میں اس کی لمبی چوڑی تعریفیں چھپنے لگیں ۔ کالج اور اسکول کے لڑکے اس کے نام کے گیت گا رہے ہیں —— سن ۔ آواز !!

(—— خاموشی ——) ہاں، یہ اسی کی آواز ہے، جلدی کر کھڑکی کھول ——!

(کنی جلدی سے کھڑکی کھولتی ہے اور پھر لیمپ کی بتی اتنی نیچی کر دیتی ہے کہ منظر تاریک ہو جاتا ہے دائیں طرف کے دروازے سے کوئی شخص داخل ہوتا ہے ۔)

راج کماری ۔ جگدیش !!

جگدیش ۔ (خوشی کے لہجے میں) ہاں ماں، !!

کنی ۔ بھیّے !! تم آ گئے —— !!

(جگدیش کھڑکی بند کر کے لیمپ کی بتی اونچی کرتا ہے اس کے کشادہ چہرہ پر دائمی وحشت کے آثار کے ساتھ ساتھ خوشی کی چمک پیدا ہے)

کنّی ۔ ارے بیٹے !! تمہارے تو سارے کپڑے بھیگ گئے ۔

جگدیش ۔ ہاں ! بارش بھی تو زبردست ہو رہی ہے اور پھر میں تلپ گڑھ سے پیدل چلا آرہا ہوں۔

راج کماری ۔ تلپ گڑھ سے پیدل !!!

جگدیش ۔ ہاں، ماں

راج کماری (اندر کمرے میں جاتے ہوئے) شاباش ہے بیٹا تیری ہمت کو۔

کنّی ۔ کھانا کھاؤ بیٹے ۔ لاؤں ؟

جگدیش ۔ ضرور ۔۔۔ بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے کل سے کچھ نہیں کھایا۔

کنّی جلدی سے جاتی ہے ۔ راج کماری اندر سے جگدیش کے نئے کپڑے لاتی ہے ۔

راج کماری ۔ لے، جلدی بدل لے ' میں انگیٹھی جلاتی ہوں' سینک لیجو' کہیں بخار نہ چڑھ جائے۔

(جگدیش گیلا کوٹ اتار کر کرسی کی پشت پر پھیلاتا ہے ' راج کماری انگیٹھی میں آگ روشن کرتی ہے ۔ جگدیش اندر کمرے میں کپڑے بدلنے جاتا ہے ۔ کنّی جلدی جلدی اندر سے کھانا لاکر میز پر رکھتی ہے)

راج کماری ۔ کنّی ' تو ذرا انگیٹھی سلگا ' میں دودھ گرم کرکے لاتی ہوں ۔

(راج کماری جاتی ہے ۔ جگدیش آتا ہے)

جگدیش ۔ کھانا تیار ہے کنّی ؟ جلدی کر ۔۔۔ مجھے ابھی واپس جانا ہے۔

کنّی ۔ ابھی ؟؟

جگدیش ۔ ہاں ' پرشوتم اور ہیرالال دونوں بیچارے ایک باغ میں بھوکے پڑے ہوں گے۔

کنّی ۔ باغ میں ؟ کون سے باغ میں ؟

جگدیش ۔ چیتی نرس کا باغ !!

(تخت پر بیٹھ کر کھانا شروع کرتا ہے ۔ ذرا دیر بعد زور زور سے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آتی ہے ۔ جگدیش دوڑ کر برابر والے کمرے میں جاتا ہے)۔

آواز ۔ دروازہ کھولو، جلدی

کِنّی ۔ کون ہے ؟

راج کماری ۔ (اندر سے گھبرائی ہوئی آتی ہے ۔ دودھ کا گلاس ہاتھ میں ہے) کون ہے ؟

کِنّی ۔ کون ہے ؟ ؟ ؟ ؟

آواز ۔ ہم ہیں ۔ کھولو

کِنّی ۔ (چاروناچار دروازہ کھولتی ہے ۔ ایک سب انسپکٹر مع چند سپاہیوں کے داخل ہوتا ہے)

ایک سپاہی ۔ داروغہ جی شکار تو بھاگ گیا ۔

داروغہ جی ۔ مگر کھوج چھوڑ گیا ہے ـــــ یہ دیکھو یہ کوٹ !! ہاہاہا !!!

دوسرا سپاہی ۔ اور یہ کھانا اُسی کے لئے پروسا گیا ہے ۔ ہوں !!

تیسرا سپاہی ۔ (دودھ کا گلاس چڑھاتے ہوئے) اُفّوہ ! آج کتنا پریشان ہونا پڑا ۔

راج کماری ۔ داروغہ جی، مجھ دکھیا کو آپ بار بار کیوں ستاتے ہیں ۔ میں کہتی ہوں کہ جگدیش کا مجھے کوئی پتہ نہیں ۔ وہ میرے ہاں سے عرصہ سے غائب ہے ۔

داروغہ ۔ خیر، ماتاجی، آپ پریشان نہ ہوں ۔ ہم آپ کے لاڈلے کو ابھی آپ سے ملائے دیتے ہیں ـــــ جوانو !! (آنکھ سے اندر والے کمرے کی طرف اشارہ کرتا ہے دو تین سپاہی اندر گھس جاتے ہیں) اَے لڑکی !! یہ کون ہے ؟

راج کماری ۔ (خوف زدہ لہجے میں) میری بیٹی کرشن کماری !!

داروغہ ۔ ہاہاہا ۔ خوب، خوب !! (للچائی ہوئی نظروں سے کِنّی کی طرف دیکھتا ہے) ہا ـــ !!

(سپاہی جگدیش کو رسیوں سے جکڑے ہوئے نمودار ہوتے ہیں)

داروغہ ۔ لو مسٹر جگدیش منوہر بی ۔ اے دشمن سیوکونگی منڈلی کے سردار اعظم اپنی ماتاجی سے ملئے ۔ انہیں آپ سے ملے عرصہ ہوگیا ۔ ہاہاہا ۔ ماتاجی یہ حاضر ہیں آپ کے سپوت

ـــــ ہاہاہا ـــــ !!!

(سب سپاہی قہقہہ لگاتے ہیں) (داروغہ جی کرسی پر براجمان ہوتے ہیں)

راجکماری - بیٹا ــــ !!! آہ ــــ !!!

جگدیش - ہاں، تم گھبراؤ نہیں - سب دیکھا جائے گا - انجام ٹھیک ہی ہوگا -

داروغہ - ہاں - بہت ٹھیک !! صرف کالا پانی - !!! ــــ گھبرانے کی کیا بات ہے اجی یہ تو تمھارے نیک کرموں کا پھل ہے تسلیم بھوگنا ہی پڑے گا - کیوں !!! !!!

(جگدیش خاموش رہتا ہے)

داروغہ جی - اچھا مسٹر ایک بات بتادو ہمیں - صرف ایک بات ! تمھارے دوست پرشوتم اور ہیرا لال کہاں ہیں - وہ ئے -

(جگدیش خاموش رہتا ہے)

داروغہ جی - دیکھئے جگدیش صاحب ! اگر آپ نے اس سوال کا ٹھیک جواب دیدیا تو آپ کے حق میں اچھا ہوگا -

جگدیش - خاموش رہتا ہے -

داروغہ جی - آپ نہیں جانتے ــــ کیوں

جگدیش خاموش رہتا ہے

داروغہ جی - دیکھئے یہ کھانا آپ انھی کے لئے لینے آئے تھے نا ؟ تو پھر وہ آپ سے کہاں ملیں گے - بتائیے ؟ ؟

جگدیش خاموش رہتا ہے -

داروغہ - اوہو ہو ہو ــــ صاحبزادے ! تم ہمیں چکّر دیتے ہو - تم جیسے لاکھوں چٹکی میں مسل کر پھینک دیئے - میاں حکومت سے جنگ کرنے کے لئے ہاتھ بھر کا کلیجہ چاہئے - ڈانٹ کر بولو، جواب دو !!

جگدیش خاموش رہتا ہے -

داروغہ جی ــــ ہا ہا ہا ــــ ہو مضبوط ! کیوں نہ ہو ــ اچھا آج آپ کو کسی باغ میں جانا تھا نا ــ مثلاً چٹھی نویس کے باغ میں ــــ کیوں جناب ــ نہ کہو گے ' ہا ہا ہا ــــ مُراری۔ انھیں لاؤ ــــ

مُراری سپاہی باہر کھڑے ہوئے آدمیوں کو بلاتا ہے چند سپاہی پرشوتم اور ہیرالال کو پابہ زنجیر لاتے ہیں۔ انھیں دیکھتے ہی جگدیش سٹ پٹا جاتا ہے)

پرشوتم اور ہیرالال (جگدیش کی ماں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر) ماتا جی !

راج کماری (ضبط کرتے ہوئے) جیتے رہو ــ بچو !!

داروغہ جی ۔ مسٹر جگدیش ' اپنے دوستوں سے ملئے جنھیں آپ چٹھی نویس کے باغ میں بھوک سے بیقرار چھوڑ کر یہاں اپنے حلوے مانڈے میں مصروف ہو گئے تھے۔ ناحق ان غریبوں کو دھوکا دے کر آپ نے اس مصیبت میں پھنسایا" ــــ خیر۔ اب چلئے ذرا بڑے گھر کی بھی سیر کیجئے (کھڑا ہو جاتا ہے سپاہی قیدیوں کو حلقہ کئے ہوئے ہیں) اچھا ماتا جی اب اجازت ہے ! پھر بھی حاضر ہوں گا ــــــ

جگدیش ۔ ماتا جی ' چنتا نہ کرنا ۔ میں جلدی چھوٹ کر آؤں گا ــــــ دعا کرتی رہئے گا ــــ بہن کنّی ــ رخصت ۔ ہمیں بھولنا نہیں ــــــ

راج کماری پتھر کے مجسمہ کی طرح ساکت ہے ــــ کنّی کی آنکھ سے آنسو کا سمندر رواں ہے ــــ چلّاتی ہے ۔ " ٹھہرو!" سب ٹھہر جاتے ہیں وہ اپنا بنا ہوا سوئٹر جگدیش کو دیتی ہے۔

کنّی ۔ بھیّے ۔ یہ تمھارے لئے بنا تھا ۔ اسے میرے سامنے ضرور پہن لو ــــ

(داروغہ جی کی اجازت سے جگدیش سوئٹر پہن لیتا ہے)

جگدیش ۔ کنّی انھیں سلام کرو ۔ یہ بھی تمھارے بھائی ہیں۔

(کنّی ہاتھ جوڑ کر ڈنڈوت کرتی ہے)۔

پرشوتم - سلامت رہو بہن ۔۔۔۔ پرماتما تمھیں خوش رکھے ۔

جگدیش پرشوتم اور ہیرالال ۔۔۔۔۔۔ رام رام ماتا جی

راج کماری بت بنی کھڑی ہے ۔ دروازے کے قریب پہونچکر جگدیش گانا شروع کرتا ہے ۔ پھر تینوں یک آواز زور زور سے گاتے ہوئے رات کی تاریکی میں گم ہو جاتے ہیں ؎

آ پہونچے بھئی آ پہونچے ٭ دیش کے سیوک آ پہونچے
ہاتھ میں لے کر سرخ نشان ٭ ننگے بھوکے پیر و جوان
آ پہونچے بھئی آ پہونچے
دیش کے سیوک آ پہونچے

کمّی دروازے سے لگی غور سے دیکھتی رہتی ہے اس کی بیتاب نظریں تاریکی کو چیر کر پار ہونا چاہتی ہیں ۔ گانے کی آواز بتدریج کم ہوتی جاتی ہے حتیٰ کہ بالکل معدوم ہو جاتی ہے ۔ کمّی بیدم ہو کر تخت پر گر پڑتی ہے ۔

راج کماری ۔ (کمّی کے قریب آتے ہوئے) کمّی بٹیا ! تو کیوں روتی ہے ۔ اری مورکھ یہ تو ہنسنے اور خوشی سے پھول جانے کا مقام ہے ۔ دیکھ ، کیا تیرے بھیّے کی آواز اب تیرے کانوں میں نہیں آ رہی ۔ مگر میں سن رہی ہوں ۔ اس کی آواز ۔ وہ جوشیلا نعرۂ جنگ پہاڑوں وادیوں ، صحراؤں اور جنگلوں میں گونجتا ہوا آج سنسار پر چھا رہا ہے تو ابھی بچہ اِن باتوں کو نہیں سمجھ سکتی اس لئے روتی ہے مگر یہ واقعہ میری آنکھوں میں جگدیش منوہر کی ماں کی آنکھوں کو رنج یا افسوس کے ناپاک آنسوؤں سے تر نہیں کر سکتا ۔ کل تک میں صرف ایک نادان الھڑ سے لڑکے کی ماں تھی جو چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر روٹھ جایا کرتا تھا مگر آج ۔۔۔۔ آج میں اس جواں مرد اس مغرور سردار کی ماں ہوں جس نے موہ اور لابھ کو لات مار کر اپنی جان اپنا سکھ اپنا چین عارت ماتا کے چرنوں میں تج دیا ۔

آج وہ ہندوستان کا سب سے بڑا جوان ہے اور میں اُس سب سے بڑے جوان کی ماں ہوں۔ سنسار بھر میں جگدیش منوہر کا گیت گایا جائے گا۔ لوگ اس کے نام کے افسانے لکھیں گے۔ اس کا نام تاریخ میں سنہرے الفاظ میں لکھا جائے گا۔ مائیں اپنے بچوں کو جگدیش منوہر کے قصے سنا سنا کر انھیں جوش، ہمت اور وطن کی محبت کا جذبہ پیدا کریں گی۔ جگدیش کے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آج میں کہہ سکتی ہوں کہ جگدیش نے وہ عزت، نیکنامی اور شہرت حاصل کی جو کسی کو میسر نہیں ——— دیش سیوک جگدیش منوہر کا نام صفحۂ عالم پر ہمیشہ چمکتا رہے گا اور اس کے ساتھ اس کی ماں اور اور اُس کی پیاری بہن گنگی کا بھی۔"

—(پردہ)—

افسانہ کا پلاٹ

فرض کرو ایک باغ ہے اس میں گلاب کے بے شمار درخت ہیں۔ لالہ، نرگس، سنبل، نسترن، جوہی، بیلا وغیرہ وغیرہ پھولوں کی بیلیں اور پودے بے تحاشا اُگ رہے ہیں، سبزہ ہے، اشجار ہیں۔ مگر اس میں کوئی خاص ترتیب نہیں ہے، کوئی آراستگی نہیں دکھائی دیتی۔ اس باغ کو کوئی دیکھے تو یہی کہے گا کہ چمن شاداب تو ہے مگر غیر آراستہ ہے، پودے اور پھول دار درخت سب دل لبھانے والے ہیں مگر اس کا عمومی اثر کچھ اس قسم کا ہے کہ ذوقِ نظر کی تسکین نہیں ہوتی۔ مذاقِ سلیم یہ چاہتا ہے کہ ان میں کچھ کاٹ چھانٹ کر کے آراستگی پیدا کی جائے۔

یہی حال افسانہ کا ہے۔ ایک کہانی ہو سکتا ہے کہ بہت دلچسپ ہو مگر جب تک اس میں واقعات مناسب جوڑ نہ بیٹھے وہ صحیح معنوں میں افسانہ نہیں ہو سکتی۔ اپنی آسانی کے لئے اگر ہم "واقعات کے اس جوڑ" کو "پلاٹ" کہہ لیں تو یوں کہا جائے گا کہ افسانہ ایک ایسا پلاٹ چاہتا ہے جو مناسب قطع و برید کے بعد پیش کیا گیا ہو۔ واقعات اور افراد کے میل سے افسانہ بنا دینا کوئی کمال نہیں۔ وہ ہمیشہ ایک پختہ پلاٹ سے بنتا ہے۔ اس میں یہ ضروری ہے کہ ہر واقعہ گذشتہ واقعے سے ... کا یعنی فطری تعلق رکھتا ہو۔ اور حالات ایک دوسرے میں اس طرح پیوست ہوں کہ تناسب ہاتھ سے نہ جانے پائے، مگر ہر جزو اپنے کل سے اس طرح وابستہ ہو کہ اس کی تکمیل کرتا نظر آئے۔

اسی لئے حقیقی واقعات مکمل پلاٹ نہیں ہوتے۔ سچ یہ ہے کہ تصورات کی رنگ آمیزی کے بغیر کوئی واقعہ افسانہ نہیں بن سکتا۔ آپ کوئی افسانہ پڑھیں اگر وہ صرف اصلی واقعات پر مشتمل ہے تو کبھی [illegible] افسانہ جب تک متاثر کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو داد کے قابل ہی نہیں، ایک حقیقی [illegible] پلاٹ بن تو سکتا ہے مگر بس بن ہی سکتا ہے یہ نہیں کہ اصلی واقعے کو جوں کا توں [illegible]

اس کی وجہ ؟ وجہ یہ ہے کہ حقیقی واقعات میں عمل اور پاداش عمل یعنی وجہ اور نتیجہ کا اثر پوری طرح ظاہر نہیں ہوتا یہ سچ ہے کہ وجوہات اور نتائج حقیقی واقعات میں بھی کار فرما ہوتے ہیں لیکن وہ غیر ضروری چیزوں کے ڈھیر میں چھپ جاتے ہیں۔ تصوری دنیا میں ان کا چھپ جانا ممکن نہیں۔ یہاں واقعات کا صحیح تعلق بے نقاب ہو کر ہی رہتا ہے مثلاً ایک حقیقی واقعے کی رو سے ایک ایماندار آدمی دفعتاً جواری بن سکتا ہے۔ اب یہ تو رہا واقعہ۔ اگر عقل کو اس پر حرف گیری کرنے دی جائے تو اس کا اعتراض یہ ہوگا کہ ایک ایماندار آدمی جواری نہیں بن سکتا یا تو وہ شروع ہی سے اندر ہی اندر جواری ہوگا یا اس کے کیرکٹر میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی ہوگی۔ ان دونوں ہی مفروضوں میں سے ہر ایک پر ایک افسانہ تعمیر ہو سکتا ہے۔ یہ افسانہ اصلی واقعہ سے ہو بہو مطابق تو نہ ہوگا، مگر ہاں تصوری اعتبار سے سو فی صدی ٹھیک ہوگا۔ ہوا کیا ؟ تصور نے اس خلا کو بھر دیا جو واقعہ خالی چھوڑ گیا تھا یعنی ایک پوشیدہ کڑی کو مہیا کر کے تصور نے افسانہ کو مکمل کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اصلی واقعہ ایک شخص کے ذہن کو چونکا کر اس میں یہ احساس چھوڑ دیتا ہے کہ جو کچھ ہوا وہ ادھورا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حقیقت افسانہ سے زیادہ عجیب ہوتی ہے۔ مگر اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ حقیقی واقعات اپنے اجزاء کا نفسیاتی تعلق نہیں دکھا سکتے۔ رہا افسانہ وہ اگر نفسیاتی نہ ہو تو کچھ ہے ہی نہیں۔

اب اس اعتبار سے کہ افسانے کی بناوٹ نفسیاتی اصولوں پر ہوتی ہے افسانے کا پلاٹ زیادہ سے زیادہ سادہ اور لطیف ہونا چاہئے۔ اور سچ مچ ہوتا ہے۔ چونکہ افسانہ زندگی کی کیفیات کا ترجمان ہے اس لئے پیچیدگی سے اس کو کوئی واسطہ ہی نہیں ہوتا۔ مگر اب اس کا کیا جواب ہے کہ "پلاٹ" کا تصور ہی ہر خواندہ آدمی کے ذہن میں واقعات کا ایک الجھاؤ ہوتا ہے ؟ کوئی معاملہ بڑی پیچیدگی سے وقوع پذیر ہو تو کہتے ہیں کہ پلاٹ کھیلا گیا۔ ڈراموں اور ناولوں کے پلاٹ کو دیکھئے کتنے متضاد جذبات کو ایک دوسرے کے مقابل صف آرا کر کے پلاٹ بنایا جاتا ہے۔ افسانے میں حالات کی پیچیدگی کا یہ عالم تو نہیں ہے مگر یہاں بھی کسی نہ کسی حد تک افراد، واقعات اور جذبات کو ایک الجھاؤ میں ڈالا ضرور جاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں "وحدت تاثر" کا خیال اور سب ضرورتوں پر مقدم رکھا جاتا ہے

چھوٹے افسانے کا جو پلاٹ اس طرح بنتا ہے وہ ناول یا ڈرامے کے پلاٹ سے کم درجے کا نہیں ہوتا۔ بلکہ اس سے کچھ زیادہ تابناک ہی رہتا ہے۔ افسانے کی "سادگی" ہی اس کی "طاقت" بن جاتی ہے۔ ناول اور ڈرامے میں جہاں بہت سے سلسلے ایک دوسرے میں خلط ملط کر دیئے جاتے ہیں، پڑھنے والے کا دماغ پریشان سا ہو جاتا ہے اثرات ایک لمحے کے لئے چمکتے ہیں اور پھر غائب ہو جاتے ہیں۔ قاری کا دماغ ابھی ایک راستے پر جا رہا ہے ابھی مصنف نے ایک جھٹکے کے ساتھ اسے دوسرے راستے پر گھسیٹ لیا۔ افسانے میں یہ "گھسیٹم گھساٹی" نہیں ہوتی کیونکہ اس کھینچا تانی کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔

افسانہ تو صرف "واحد تاثر" پیدا کرنے کا نام ہے اور بس، مگر ابھی ایک سوال باقی ہے پوچھا جا سکتا ہے کہ سادہ پلاٹ اچھا سہی، لیکن کیا وہ پیچیدہ پلاٹ کی بہ نسبت ذرا کم فطری نہیں؟ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ یہ کہنے والے کے نزدیک افسانہ کا سادہ پلاٹ واقعات کو بکھری ہوئی حالت میں دکھاتا ہے اور دنیا میں حالات کبھی اس طرح الگ الگ نہیں ہوتے۔ وہ تو ایک دوسرے میں خلط ملط رہتے ہیں۔ درست مگر کیا حالات کے ایک دوسرے میں خلط ملط ہونے کے باوجود بھی انسان سب حالات سے ایک ہی وقت میں گزر جاتا ہے؟ یقیناً نہیں۔ بلکہ ایک وقت میں اس پر ایک ہی حالت طاری ہوتی ہے۔ بہت سے کام وہ "ایک مقصد" کے تحت کرتا ہے اور اس مقصد کا بیج عمل کی کیاری میں بوتے وقت یہ بالکل نہیں سوچتا کہ اب سے چند یا بہت سال بعد یہ مقصد یا عمل اس کی اپنی یا دوسروں کی زندگی پر کس طرح اثر انداز ہوگا۔

ممکن ہے چند "بیدار مغز" ایسا بھی کرتے ہوں اور "پیش فکر" اعمال سے آئندہ کا اندازہ لگا کر "دوش" یا "حال" کے "آئینے" میں "فردا" کو دیکھ لیتے ہوں مگر وہ بہرحال چند ہی تو ہوئے۔ عام طور سے تو یہ نہیں ہوتا۔

اب اگر افسانہ کی پوچھتے ہو تو وہ یکھا ہی اس یقین پر جاتا ہے کہ واقعات ایک دوسرے سے پیوستہ ہونے کے باوجود بھی علیحدہ علیحدہ ہیں وہ کڑیوں کی طرح سے ہیں کہ ایک دوسرے سے ملی ہوئی بھی ہوتی ہیں اور جدا جدا بھی۔

گویا افسانہ نگار اور ناول نویس دونوں کی روش میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مگر جس طرح زمین اپنی جگہ پر ٹھیک ہے اور آسمان اپنی جگہ پر درست ہے اسی طرح افسانہ نگار اپنی روش پر حق بجانب ہے اور ناول نویس اپنے انداز پر مُصر ہے گو اتنا ضرور ہے کہ افسانہ نگار کا طرز زندگی سے زیادہ ملتا جلتا ہے کیونکہ اس میں انسانی زندگی کے نصف النہار کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔

یہی نصف النہار افسانے کے پلاٹ میں سب سے زیادہ معرکے کی چیز ہے۔ اور افراد اور عمل کی ٹکر سے پیدا ہوتا ہے۔ پلاٹ کا کمال یہ ہے کہ ان دونوں کو اس طرح ٹکرایا جائے کہ نصف النہار پیدا ہو جائے۔

کسی فرد کے راستے میں جب تک کوئی اٹکاؤ پیدا نہ ہو اس کا کیرکٹر جاذب توجہ نہیں ہوتا اور عمل جب تک کسی عورت یا کسی مرد یا بالفاظ دیگر کسی فرد سے متعلق نہ ہو دلچسپی سے محروم رہتا ہے۔ فرض کرو ایک بشر ہے وہ منطقہ جنوبی میں رہتا ہے جہاں کوئی آدم رہتا ہے نہ آدم زاد، ہمیں اس سے کیا؟ جیتا ہے جئے، مرتا ہے مرجائے۔ ہاں اگر وہ کہیں دلی کی نواح میں آن نکلے اور لگے لوگوں کو پھاڑ کھانے، تو یقیناً ہمیں اس سے دلچسپی پیدا ہو جائے گی غرض ایک افسانہ میں فرد اور عمل کو ایک دوسرے سے ٹکرانا چاہئے۔ فرد کچھ کرے یا فرد کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہو۔ افسانہ اور بالخصوص کامیاب افسانہ کسی فرد کی تصویر، یا حالات کی پیچیدگی، یا واقعات کا بیان یا کوئی سنسنی خیز حادثہ ہونے پر بس نہیں کرتا۔ کامیاب افسانہ میں یہ سب کچھ ہوتا ہے مگر ان سب پر مستزاد اس میں افراد اور اعمال کی ایک نتیجہ خیز ٹکر بھی ہوتی ہے۔

ڈرامے اور ناول میں تو یہ صورت ہوتی ہے کہ پلاٹ اپنے نصف النہار تک بلند ہوا اور پھر اس کے بعد اپنے انجام کی طرف ڈھلنے لگا لیکن افسانہ میں یہ معاملہ نہیں ہوتا یہاں نصف النہار ہی انجام ہوتا ہے اگر نصف النہار کے بعد کچھ اور کہا جائے یا چند اور نتائج افسانے کی دم سے باندھے جائیں تو افسانہ کا اثر بالکل زائل ہو جائے۔ جو ایک سادہ سی پیچیدگی افسانے میں پیدا ہوتی چلی آئی ہے وہ نصف النہار پر پہنچ کر نتائج کا مجموعی اثر بے نقاب کر دیتی ہے اور ختم ہو جاتی ہے۔

مگر یہ افسانے کا نصف النہار ہے کیا؟ اس کی مختلف صورتیں ہیں کبھی تو نصف النہار وہ واقعہ یا حادثہ ہوسکتا ہے جس کی سمت حالات دوڑتے چلے جاتے ہیں کبھی وہ "صورت حال" ہوتا ہے جس سے افسانے کی بنیاد پڑی تھی یا جس نے تصورات یا خیال کو برانگیختہ کیا تھا اور ذہن کو افسانہ تراشی کی طرف متوجہ کیا تھا مگر یہ یاد رہے کہ حادثہ ہو یا واقعہ، صورت حال ہو یا کچھ اور جس شکل میں اور جس طرح بھی ہو نصف النہار "وحدت تاثر" سے رنگین ہوتا ہے۔

بس یہی افسانہ کا نصف النہار ہے ہاں البتہ اتنا ضرور ہے کہ خواہ کسی رنگ میں ہو کہانی کی کیفیت سے ضرور مطابقت رکھتا ہے مثلاً ایک ایسے افسانہ کا نصف النہار جس میں کسی فرد کا کیرکٹر دکھایا گیا ہو یہی اور صرف یہی ہو سکتا ہے کہ کیرکٹر کو کسی نازک مرحلے پر لاکر چھوڑ دیا جائے اب یہ نازک مرحلہ کیا ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ نازک مرحلہ حالات یا واقعات کی کسی معرکتہ الآرا تبدیلی کی صورت میں نمودار ہوگا۔

برخلاف اس کے اگر افسانے میں "عمل" غالب ہے تو نصف النہار کوئی حادثہ ہوتا ہے اور اگر کہانی کا ماحول "فضائی" ہے تو نصف النہار میں یہ فضا اپنے انتہائی عروج پر پہنچ جائے گی غرض کہانی کی انتہائی بلندی کو بھی وحدت تاثر کا آئینہ دار ہونا چاہئے۔

اب یہ تو معلوم ہوگیا کہ افسانہ کا "نصف النہار" کیا ہے مگر یہ دیکھنا ابھی باقی ہے کہ نصف النہار تعمیر کس طرح کیا جاتا ہے یا بالفاظ دیگر اس نصف النہار تک کہانی کیوں کر پہنچتی ہے؟ صورت اس کی یہ ہے کہ افسانہ کے پلاٹ کے راستے میں دفعتاً کوئی روک حائل ہو جاتی ہے اور جب پلاٹ اس سے ٹکراتا ہے تو نصف النہار نمودار ہو جاتا ہے۔ مگر کسی معمولی روک سے یہ بات پیدا نہیں ہوسکتی اس کے لئے موثر سد راہ ہونی چاہئے۔ فرض کرو کہ ایک شخص موٹر پر دلّی سے اوکھلے جا رہا ہے اور اسے پوری توقع ہے کہ بس پندرہ منٹ بعد اوکھلے جا پہنچوں گا۔ اب راستے میں کھدی ہوئی ہے خندق۔ اتفاق سے کہ راستہ بند ہے کیا ہوگا؟ وہ گھر واپس آجائے گا لیکن محض ان واقعات سے کہ ایک شخص اوکھلے کے ارادے سے شہر سے چلا اور راہ کو مسدود پاکر واپس چلا آیا، محض ان واقعات سے افسانہ نہیں بن سکتا۔

ہاں اگر یہ واقعات یوں ہو جائیں کہ وہ گھر واپس ہوتا تھا کہ کچھ خیال آیا اور راستے سینما کی طرف مڑ گیا۔ وہاں ایک سڑک پر اسے اپنا ایک دوست نیم جان پڑا ملا ـــــ تو پڑھنے والے کا ذہن پورے طور پر متوجہ ہو جائے گا کہ میں دیکھیں اب کیا ہوتا ہے اگر بات یہیں تک رہتی کہ وہ کھیلے کی طرف چلا، راستہ بند تھا، واپس ہو گیا تو یہ بہت سادہ، بہت بے رنگ، بہت بے کیف اور بہت غیر دلچسپ رہتی۔ سو ماتوں کی ایک بات یہ ہے کہ ایسی کوئی چیز ہونی چاہیئے جو معمولی سے بڑھ کر ہو۔ راہ میں روڑا تو ضرور اٹکنا چاہیئے۔ یہ تو ہے پلاٹ کا موازنہ، مگر راستہ بالکل مسدود نہیں ہو جانا چاہیئے۔ یہ نہ ہو کہ سفر دو میں ختم ہو گیا۔ پلاٹ کا قدم کسی نتیجہ خیز انجام کی طرف بڑھتا رہنا چاہیئے۔ اور یہی نتیجہ خیز انجام افسانہ کا نصف النہار ہے یوں تعبیر کیا جاتا ہے نصف النہار۔

اگر وہ روک جو افسانے کے راستے میں واقع ہوئی ہے، حقیقی اور ناقابلِ جنبش ہے تو بڑا زبردست تصادم واقع ہوگا فرض کرو دو موٹر سائیکلیں مخالف سمتوں سے آ رہی ہیں اور وہ ایک موڑ پر ایک دوسرے کے مقابل آ جاتی ہیں۔ ایک زبردست ٹکر ہوگی یا نہیں؟ پھر جب ٹکر ہوگی تو یا تو دونوں میں سے ایک موٹر سائیکل چورا ہو جائے گی یا دونوں ہی کھیت رہیں گی۔ اس خاص مثال میں اس امر کا بھی امکان کھلا گیا کہ موٹر سائیکلیں ڈھیر ہو جائیں افسانے میں یہ صورت کبھی متصور نہ ہوتی، افسانے کا پڑھنے والا بھی یہ توقع نہیں کرتا کہ یہ دونوں طاقتیں (یعنی ایک تو پلاٹ اور دوسری کوئی روک) جو آپس میں ٹکرا رہی ہیں، ٹکرا کر بالکل ہی ختم ہو جائیں گی۔ وہ نہ تو یہی سمجھتا ہے کہ پلاٹ روک سے ٹکرایا اور بس ختم ہوا، اور نہ یہ مانتا ہے کہ وہ چیز، جو درمیان میں حائل ہے کچل دی جائے گی اور افسانہ فراٹے بھرتا ہوا آگے بڑھ جائے گا اور سچ مچ کبھی کبھی ایسا ہی ہو جاتا ہے کہ درمیان میں حائل ہونے والی چیز تصادم سے کامیاب نکلتی ہے اور افسانہ اپنے انجام تک اسی چوٹ کو لئے ہوئے چلا جاتا ہے جو اسے متصادم ہونے سے لگی ہے یہ بھی صورت ہے جیسے کسی چیز سے ٹکر کھانے کے بعد موٹر کا مڈگارڈ پچک جائے تو اسی حال میں موٹر شدّت تک جاتا ہے۔ یہ فراموش نہ ہو کہ حائل ہونے والی چیز یا "روک" اور "عمل تصادم" دونوں الگ الگ چیزیں ہیں روک تصادم کی بنا ہے، اصل تصادم نہیں۔

پھر ایک چیز یہ بھی ہے کہ افسانہ نگار از خود ایسے حالات پیدا کرتا ہے جو افسانے کو نصف النہار تک لے جاتے ہیں۔ پوچھو تو افسانہ ہے کیا سوائے پلاٹ کی "حرکت کے" افسانہ کی تعمیر کا ڈھنگ ایسا نہیں کہ جیسے کوئی چیلا چمن میں پھول چننے جاتا ہے کبھی یہاں کھڑا ہو گیا کبھی وہاں ٹھہر گیا، حرکت لامحالہ ہی افسانے کے پلاٹ کی جان ہوتی ہے افسانہ کا پلاٹ تعمیر کرنے والے حالات ایسے ہوتے ہیں جن سے پیدا ہونے والی پیچیدگی بالکل فطری اور نفسیاتی معلوم ہو اور نتائج بیگانہ محسوس نہ ہوں کیونکہ ایک سرسری نظر ڈالنے والا بھی ایک افسانہ میں یہی ڈھونڈتا ہے کہ اعمال اور ان کے مکافات کا نقشہ کہاں تک ٹھیک ٹھیک کھینچا گیا ہے افسانہ کی تعمیر کے وقت اس بات کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ آیا واقعات اس قدر قوی ہیں یا نہیں کہ پلاٹ کی پیچیدگی کا جواز بن سکیں ؟۔

نصف النہار کا فاصلہ طے کر لینے کے بعد افسانہ کے افراد یا کردار کا سوال سامنے آتا ہے سب سے زیادہ اہم مرکزی کردار ہوتا ہے۔ اس کا انتخاب کرتے وقت افسانہ کی فضا پر ایک نظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ اس فضا کے لئے مرد زیادہ موزوں ہوگا یا عورت زیادہ مناسب رہے گی ؟ فرض کرو مرد انتخاب میں آیا تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کی عادت و خصلت اور اس کے طور طریق کیسے ہونے چاہئیں۔ سوسائٹی کے کس طبقے سے وہ تعلق رکھتا ہو ؟ اس کی عمر کیا ہو ؟ اسے بے آب و رنگ دکھایا جائے یا اس کے کیرکٹر پر بعض خصوصیات کے رنگین چھینٹے دیئے جائیں ؟ ان سوالات کے جوابات تلاش کرنے کے لئے افسانہ نگار اپنے پلاٹ اور پلاٹ کے مقصد کو خوب ٹھونک بجا کر دیکھتا ہے کہ یہ زیادہ سے زیادہ کتنے وزنی کردار کو سنبھال سکتا ہے اگر افسانہ کوئی کرداری افسانہ ہو تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ مرکزی کردار کی عادتیں، خصلتیں اور اس کے رجحانات کس حد تک زیادہ سے زیادہ صحت کے ساتھ متعین ہو سکتے ہیں ؟ یہ بہت ضروری ہے کہ کردار کہانی کی حرکت کے ہم رکاب رہیں اور ان تمام کاموں کو ٹھیک ٹھیک طرح نبھا دیں جو ان پر ڈالے گئے ہیں۔ مثلاً یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ کسی خادمہ نے کسی بہو کرے کے کفگیر کھینچ مارا، مگر یہ بات خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتی کہ کسی تین دن کے بچے نے پستول چلا دیا۔

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ افسانہ نگار اپنے افسانہ کے افراد سے کما حقہ واقف ہو یہ نہیں کہ ذہن میں ایک خاص قماش کے آدمی کا خاکہ جما لیا اور یہ فرض کرتے ہوئے کہ میرا کردار بھی اسی قماش کا ہے، اس بچارے کو الفاظ کے سانچے میں ڈھال مارا۔ چاہئے کہ مرکزی کردار کچھ ایسی حرکتیں کرے جو اس کی مخصوص انفرادیت کی ترجمان ہوں ورنہ پڑھنے والے کو اس کی باتوں کا کبھی بھی اس طرح یقین نہیں آئے گا جس طرح روزمرہ کے چلتے پھرتے آدمیوں کی باتوں کا یقین آجاتا ہے۔ ادھوری واقفیت سے کام چلنا مشکل ہے افسانہ نگار اس پر مجبور ہے کہ اپنے کرداروں کو خوب اچھی طرح جان لے، پہچان لے، سمجھ لے۔

پلاٹ سے ماحول کا بھی بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے ماحول کو افسانہ کی فضا بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیسا ہی ہو، کچھ بھی ہو، افسانہ کسی جگہ تو واقع ہوگا ہی۔ بس وہی ماحول یا فضا ہے بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بعض ماحول اپنے کردار پیدا کر لیتے ہیں حتیٰ کہ وہ حرکات جو کرداروں سے سرزد ہوتی ہیں یا وہ چیزیں جن سے انھیں واسطہ پڑتا ہے۔ صرف ماحول میں ممکن ہو کر رہ جاتی ہیں۔

تو اس صورت میں سب سے پہلا سوال یہ وارد ہوتا ہے کہ کیا ماحول حقیقت میں ایک افسانہ کے پلاٹ پر اثر انداز ہوتا ہے اور اگر ہوتا ہے تو جگہ اور وقت کا تعین کیسے کیا جائے؟ یہ یاد رہے کہ ایک افسانہ میں فنی اعتبار سے وقت کے کوئی خاص حدود نہیں ہیں۔ ایک افسانہ کی مدت دو دن ایک دن، یا ایک گھنٹہ، چند منٹ، کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ کبھی کبھی افسانہ ایک پوری زندگی پر پھیل جاتا ہے یہی اصول جگہ کے متعلق بھی ہے ایک افسانہ کا ایک ٹکڑا، فرض کیجئے انگلستان میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ تو ہو سکتا ہے کہ دوسرا ٹکڑا ہندوستان کے کسی دور افتادہ گاؤں میں ہو۔ ذیل میں ہم ایک افسانہ کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اس افسانہ کا پلاٹ مندرجہ ذیل ہے:-

ایک نوجوان کا ایک دوست ہے —— یہ دوست اپاہج ہے —— نوجوان اس کا دل بہلانے کے لئے ایک خیالی لڑکی کے حسن کی تعریفیں اسے ایک خط میں لکھتا ہے —— خط کا جواب آتا ہے —— نوجوان دنگ رہ جاتا ہے۔

اپاہج دوست نے لکھا ہے کہ مجھے اس لڑکی سے عشق ہو گیا ہے اور میں تمہارے
پاس آرہا ہوں تاکہ اس لڑکی کو جیت سکوں۔

افسانہ بالکل سادہ ہے بالکل ہلکا پھلکا ہے۔ پلاٹ بھی کچھ زیادہ پیچیدہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ مرکزی کردار نوجوان کا اپاہج دوست ہے۔ دوسرا کردار حقیقت میں کوئی لازمی کردار نہیں۔ وہ پلاٹ کی مشینری کا ایک معمولی پرزہ ہے۔ ہر چند افسانہ اس کے بغیر نہیں چل سکتا پھر بھی اس کا کردار نسبتاً بے رنگ ہے اور اس لئے اگر مندرجہ بالا پلاٹ کے خاکے کو ایک افسانہ میں ڈھالا جائے تو اس کے (یعنی نوجوان کے) کردار کو صرف اسی حد تک روشنی میں لایا جائے گا جس حد تک افسانہ کی تعمیر میں اس سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اچھا۔ مگر عورت کی کیا رہی؟ اس فرضی حسین عورت کا کیا بنے گا جس کا ذکر خط میں کر کے نوجوان نے اپنے اپاہج دوست کے دل میں عشق کی آگ بھڑکا دی ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ کوئی زندہ کردار تو ہے نہیں وہ تو پلاٹ کی تعمیر میں ایک سہارا تھی۔ نہ تو وہ خود کچھ کرتی ہے، اور نہ ہی اس کے راستے میں کوئی روک حائل ہوتی ہے۔ وہ تو بس دماغ کی ایک تخلیق ہے۔ ایک حسین گڑیا۔ اچھا اب یہ بتائیے کہ اس افسانہ میں نصف النہار کہاں ہے؟ آیا یہ وہاں پیدا ہو جب نوجوان کا اپاہج دوست اپنی مفروضہ محبوبہ کو جیتنے کے لئے نوجوان کے پاس آئے اور وہاں آکر معلوم کرے کہ حقیقت میں کسی ایسی عورت کا وجود ہی نہیں ہے؟ یہ افسانہ کا نصف النہار ہوگا۔ یا اس کا یہ ارادہ کہ محبوبہ تک پہنچ کر اسے جیتنا ہے؟ اگر اس معیار کو سامنے رکھا جائے جو ہم نے مندرجہ بالا سطور میں قائم کیا ہے۔ اور "نصف النہار" کی اس تعریف کو دیکھا جائے جو ہم نے اوپر کی ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اپاہج کردار کا محبوبہ کو جیتنے کا عزم ہی افسانہ کا نصف النہار ہے اس موقع پر پڑھنے والے کا دل واقعی دھڑکنے لگتا ہے۔ کیونکہ شروع سے آخر تک دلچسپی اس سوال پر مرکوز ہوتی رہتی ہے کہ آیا محبت کا رشتہ قائم ہو سکے گا یا نہیں؟ اس سے پہلے کہ پڑھنے والا آگے بڑھے، اس سوال کا جواب ملنا چاہئے۔ جیتنے نہ جیتنے کا قصہ تو آئے گا بعد کو۔

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ بس افسانہ یہیں ختم ہو جائے گا۔ نصف النہار اور جیتنے اور دلچسپی کا

خاتمہ اور شے ہے۔ "نصف النہار" پر دلچسپی کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ اس وقت تک جب تک کہ پلاٹ مکمل ہوتے ہوئے خاتمہ کے آخری نقطہ تک نہیں جا پہنچا۔ پڑھنے والے کی دلچسپی برابر قائم رہتی ہے۔ متذکرہ بالا افسانے میں نصف النہار نے دلچسپی کو ختم نہیں کیا حقیقت میں تو دلچسپی ختم اسی وقت ہوگی جب "اپاہج" کو معلوم ہو جائے گا کہ اس عورت کا ایک سرے سے وجود ہی نہیں تھا۔

بعض افسانوں میں ایک کردار کو دوسرے کردار سے ٹکرایا جاتا ہے۔ ایک قوت ارادی کو دوسرے کی قوت ارادی کے مقابل صف آرا کیا جاتا ہے۔ بعض افسانوں میں مرکزی کردار کی خصوصیات نمایاں کرنے کے لئے چند اور کردار لازماً تخلیق کئے جاتے ہیں مثلاً مغربی دنیا کے مصوری کے ایک شہرہ آفاق شاہکار میں، جو مشہور عالم جادو نگار "پیرس بورڈون" کے موئے قلم کا اثر ہے یہ دکھایا گیا ہے کہ ایک نیم عریاں، اور تھر تھر کانپتا ہوا ماہی گیر قصر شاہی کی زینت و آرائش کے درمیان "دوژ" کو "سینٹ مارک" کی انگشتری پیش کر رہا ہے۔ یہ اصل تصویر کا علیہ ہے لیکن تصویر کے سیدھے رخ پر، پیچھے کی طرف، ان سیڑھیوں کے اختتام کے قریب جو تخت شاہی تک پہنچتی ہیں، ماہی گیر کا لڑکا ننگے پاؤں، ننگے سر بیٹھا، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر، حیرت سے انگشتری کی چمک دمک کا تماشا کر رہا ہے۔ فن مصوری کے تمام مسلم الثبوت استاد اس پر متفق ہیں کہ تصویر نامکمل رہتی اگر یہ لڑکا منقوش نہ کیا جاتا۔ یہ صحیح ہے کہ لڑکا صرف اس لئے کھینچا گیا ہے کہ تصویر کے اس خالی وسیع حصے کو جو سیڑھیوں کے پہلو کے نظارے کو لئے ہوئے ہے بھر دیا جائے ورنہ ایک اچھی خاصی جگہ محسوس ہوگی۔ لیکن لڑکے کے نقش کے وجود کا ایک اور جواز بھی ہے وہ ایک طرح سے مصور کے تصور کی ترجمانی کرتا ہے۔ کتنے ہی افسانے پڑھ جاؤ تم دیکھو گے کہ ان افسانوں میں جو فنی اعتبار سے ٹھیک ٹھیک ہوں مرکزی کردار کو زیادہ روشنی میں لانے کے لئے چند امدادی افراد ضرور استعمال کئے گئے ہیں۔

غرض مدعا کہنے کا یہ ہے کہ افسانے کی تعمیر بڑی احتیاط سے ہوتی ہے۔ کردار اور پلاٹ کی ساخت سے لے کر حالات اور واقعات کی ترتیب تک ہر شے میں ایک نظام اور نفسیاتی ترتیب کارفرما دکھائی دیتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ بعض افسانے مکمل ترین صورت میں خود بخود دماغ میں نمودار ہو جاتے ہیں۔ تاہم اچھا ہوتا ہے اگر غیر ضروری عناصر کو نکال کر افسانے کو حسین تر بنا دیا جائے۔

تغذیہ

گذشتہ انٹرنیشنل ہیلتھ کانفرنس میں جن ایسے مضامین کی جانب ڈائرکٹر کی رپورٹ میں اشارہ کیا گیا تھا کہ جو مستقبل قریب میں اہمیت حاصل کرنے والے ہیں اور اس لئے دقیق مطالعہ اور تحقیقات کے مستحق ہیں ایک مضمون یہ تھا کہ کافی غذا کے استعمال اور صحیح معیار زندگی کا باہمی تعلق کیا ہے یہ بات کہ جنیوا اس مضمون کے متعلق معتبر اطلاعات جمع کرنے کی ضرورت کو

پورے طور پر محسوس کر رہا ہے اس دلچسپ رپورٹ سے ثابت ہو جاتی ہے جو حال میں ڈاکٹر اکیرائیڈ اور مسٹر برنیٹ نے پیش کی ہے جو جمعیتہ الاقوام کے محکمہ حفظان صحت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس رپورٹ میں، مختلف قوموں کا معیار تغذیہ بتایا گیا ہے نیز یہ کہ یہ معیار کس حد تک ان قوموں کو حاصل ہو چکا ہے ابھی ہمارے پاس اتنا کافی مواد موجود نہیں ہے کہ اس کی بنا پر ہم مہذب قوموں کی کمترین ضروریات زندگی کی تشریح علمی اور فنی اعتبار سے کر سکیں۔ ماہرین علم افعال الحیات کا ابھی تک اس بات پر اتفاق آرا نہیں ہوا ہے کہ مختلف ممالک میں، اور مختلف قسم کے کام کرنے کی صورت میں انسانی جسم کو حرارت کی کتنی کیلوریز (حرارت کی اکائیاں) درکار ہوتی ہیں۔ اور نہ ابھی تک اسی کے متعلق اتفاق رائے کہیں نظر آتا ہے کہ تندرست اور قابل کار رہنے کے لئے انسان کو پروٹین (گوشت۔ غیرہ کے قسم کی غذا) کی اور معدنی نمکیات کی یا حیاتین (وٹیامنز) کی کس مقدار میں ضرورت ہے۔ پھر بھی تغذیہ کے علم نے گذشتہ چند سالوں میں بڑی سرعت سے ترقی کی ہے اور حاصل شدہ علم کی بدولت صحت عامہ کی حکمت عملی نئی کروٹ بدل رہی ہے۔ اب اس بات کا احساس ایک وسیع پیمانے پر ہوتا جا رہا ہے کہ صحت عامہ کے افسروں کا فرض فقط یہی نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو امراض سے محفوظ رکھنے کی تدابیر اختیار کریں بلکہ یہ کہ لوگوں کی جسمانی صحت کو بلند سے بلند درجے پر پہونچانا کہ جس کے لئے تغذیہ یقیناً اہم ترین چیز ہے، ان کا اولیں فرض ہونا چاہئے۔ آج دنیا میں غذا سے متعلق معاملات پر

حکومتوں کا اقتدار زیادہ باقاعدگی اختیار کرتا جا رہا ہے اور وقتی ضروریات کی فہرست سے ان معاملات کو نکال دیا گیا ہے کیوں کہ جب کبھی عام آبادی کی ضرورتوں کی مناسبت سے تغذیہ کم ہوجاتا ہے تو لازمی طور پر قوم کی جسمانی صحت اور قوت پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ تغذیہ کا مسئلہ اہمیت کے لحاظ سے طبی امداد اور زچاؤں کی خبر گیری کے مسائل کا ہم پلہ ہے جس کے متعلق ان تمام ممالک میں کہ جہاں صحت عامہ کو برقرار رکھنے کا نظام مرتب کیا گیا ہے، بہت کچھ کام عمل میں آچکا ہے۔ صنعت و حرفت کی کارگزاری اور قومی معیار صحت دونوں کے لئے تندرستی شرط اوّل ہے، اور اس کی حفاظت قوم کے تحفظ و بقا کے نقطۂ نظر سے حکومت کا لازمی فرض ہونا چاہیئے۔ چونکہ اس حقیقت کا احساس حرفتی ممالک میں روز افزوں ہے اس لئے باوجود اس کے کہ حکومت کے بہت سے ملکوں میں موجودہ اقتصادی نزاکت حالات کی وجہ سے فرسودگی رونما ہے پھر بھی معاشرتی بیمہ اور بیکاروں کی امداد کی تجاویز کفایت شعاری اور تخفیف کے طوفان سے محفوظ رہنے میں کامیاب ہی ہو گئیں۔ اگر امراض کا علاج اور ان کے روکنے کی تدابیر ایک قومی ضرورت ہیں تو اچھے مکان اور اچھی خوراک کا مسئلہ جو تندرست زندگی کے لئے اولین شرائط ہیں اور بھی زیادہ قومی توجہ کا مستحق ہے۔ لہذا انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن جس کا مقصد قیام ہی یہ ہے کہ مزدوروں اور کاریگروں کو مشکلات سے اور فاقہ کشی سے بچائے اور مزدوروں کو کافی مزدوریاں دلائے تاکہ وہ زندہ رہ سکیں، پورے طور پر اس بات میں حق بجانب ہے کہ تمام دنیا میں تغذیہ کا معیار علمی اور فنی اصولوں کی بنا پر رائج کرادے۔

مسئلہ خوراک کو قابل اطمینان طریق پر حل کرنے میں درحقیقت سب سے بڑی رکاوٹوں میں سے ایک افلاس ہے اگرچہ یہ ضرور ہے کہ افلاس کی وجہ سے تغذیہ کی کمی کے اثرات بہت طویل مدت کے بعد ظاہر ہوتے ہیں۔ اس لئے افلاس کے ابتدائی اسباب کا ازالہ ضروری ہے اور اس بنا پر فوراً ایک طرف تو یہ سوال پیدا ہوجاتا ہے کہ لوگوں کو کافی اجرتیں ملیں، اور دوسری طرف یہ کہ مزدور اپنی اجرت کے روپے سے کیا کیا چیزیں خریدیں۔ اس معاملہ میں مزدوروں کی نام نہاد اجرتیں نہیں، بلکہ

وہ اجرتیں کہ جو حقیقت انھیں ملتی ہیں ہمارے فیصلہ کا معیار ہونی چاہئیں، اور اگر مزدور کو جو اجرت ملتی ہے وہ اس کے لئے کافی ہے کہ وہ اپنے اور اپنے خاندان کے لئے اس سے اچھا مکان اور اچھی غذا بدرجۂ اتم حاصل کر سکے تو زندگی بسر کرنے کا ایک معقول معیار فوراً قائم ہو جاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اجرتیں خواہ کافی ہوں یا ناکافی مگر اس زمانے میں لوگوں کی بڑی بڑی جماعتوں کو یا تو پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی یا صحیح قسم کی غذا انھیں حاصل نہیں ہے۔ صنعتوں کی ترقی نے غذا کے متعلق تمام دنیا کی عادتیں بدل ڈالی ہیں۔ صنعتی علاقوں میں مکانات کی حالت ایسی ہے کہ وہاں خوش ذائقہ غذائیں تیار کرنا بڑا مشکل کام ہے، اور شہروں میں کرائے کی زیادتی نے لازمی طور پر خاندانوں کے بجٹ پر یہ اثر ڈالا ہے کہ وہ رقم جو وہ خوراک کی فراہمی پر صرف کرتے بہت کم ہو گئی ہے۔ مشینوں کے رواج نے انسانی قوت کے خرچ کی ضرورت کم کر دی ہے۔ اب صنعتی کاریگروں کا کام بڑی حد تک یہ رہ گیا ہے کہ مشینوں کو چلایا کریں۔ اس لئے اب ایسی غذا کہ جو حجم میں زیادہ ہو اور کاربوہائیڈریٹ کی نوع سے (سبزی) ہونا موزوں ہے۔ اب ایسی غذا مناسب ہے جو مقدار میں کم اور حیوانی پروٹین پر مشتمل ہو۔ یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ انیسویں صدی کے اولین نصف میں امریکہ میں قومی خوراک کا جزو اعظم گوشت تھا، لیکن اب گوشت اور غلہ کا استعمال کم ہوتا جا رہا ہے اور دودھ، مکھن، بالائی، شکر، انڈوں، پھلوں اور سبز ترکاریوں کے استعمال کو ترقی ہے۔ امریکہ میں قومی تغذیہ کے مسئلے پر ایک اور چیز کا بھی اثر پڑ رہا ہے اور وہ یہ کہ عوام الناس کو تغذیہ کے علمی اور فنی اصولوں کی تعلیم روز بروز زیادہ دی جا رہی ہے۔

ہندوستان میں غذا کے متعلق اب یہ امر مسلمہ ہے کہ یہاں قلت غذا یا ناکافی اور خراب غذا کی مصیبت عام ہے۔ سنہ ۱۹۳۳ء میں سر جان میگا نے دیہات کے ڈاکٹروں کے ذریعہ سے اعداد و شمار فراہم کئے اور ظاہر ہے کہ ان ڈاکٹروں نے غذا کا معیار مقرر کرنے میں مبالغہ سے کام ہرگز نہ لیا ہوگا۔ تمام ہندوستان کے مجموعی اعداد و شمار لے کر ان اسپتال کے ڈاکٹروں کا یہ خیال ہے کہ ۳۹ فی صدی آدمی ایسے ہیں جنھیں حسب ضرورت پوری خوراک میسر آجاتی ہے، ۴۱ فی صدی ایسے ہیں

کو جو پیٹ بھر پاتے ہیں لیکن غذا ناکافی ملتی ہے، اور ۲۰ فی صدی وہ ہیں کہ جنھیں بہت ہی کم غذا نصیب ہوتی ہے۔ بنگال کے ڈاکٹروں نے تصویر کا سب سے زیادہ المناک رخ دکھایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سو میں سے صرف بائیس آدمی ایسے ہیں جنھیں پوری غذا مل جاتی ہے، اور اکتیس فی صدی ایسے ہیں کہ جنھیں بہت ہی کم اور ناکافی غذا ملتی ہے۔ سر جان میگا کا بیان ہے کہ یہ اعداد و شمار اور بھی زیادہ ناخوشگوار ہوتے اگر پوری اور ادھوری غذا کا معیار یورپین ڈاکٹروں نے مقرر کیا ہوتا جو کہ نسبتاً زیادہ صحت بخش اور زیادہ پرورش کرنے والے معیار خوراک کے عادی ہیں۔ جو اطلاعات اب فراہم کی گئی ہیں وہ اس تحقیقات کے نتائج سے مطابقت رکھتی ہیں جو کرنل میکے آئی' ایم' ایس نے بیس سال پیشتر بنگال میں کی تھی۔ میکے اور دیگر محققین نے معلوم کیا تھا کہ ہندوستان میں اسکول جانے کی عمر کا لڑکا یورپ کے اسی عمر کے لڑکے کی بہ نسبت اپنے وزن میں بہت ہی کم ترقی کرتا ہے اور ان کے نزدیک اس کا سبب ہندوستانی غذا کی ناموزونیت ہے، بالخصوص یہ چیز کہ اس میں جسم کو نشوونما دینے والے گوشت اور انڈوں وغیرہ کی قسم کے اجزا جنھیں پروٹین کہا جاتا ہے بہت ہی کم ہوتے ہیں۔

جن گھروں کا حساب کتاب دیکھنے کو مل سکا، اسے دیکھ کر بھی اس عام اعتقاد کی تصدیق ہی ہوئی کہ ملک میں ناکافی تغذیہ بہت عام ہے۔ شولاپور کا ایک اوسط درجے کا مزدور پیشہ خاندان جس میں ۴٫۵۷ (تقریباً ساڑھے چار) آدمی ہوں اپنے کل اخراجات کا ۴۹٫۲۵ (سوا انچاس) فی صدی (یعنی ۳ پائی - ۰ آنے - ۴۹ روپے) اپنی خوراک پر صرف کیا کرتا ہے، اور احمد آباد میں جہاں ایک اوسط درجے کے مزدور گھرانے میں ۳٫۸۴ (پونے چار سے کچھ زائد) آدمی ہونے ہیں خرچ کا فی صدی اوسط ۵۷٫۹ (تقریباً اٹھاون) ہے (یعنی ۷ پائی - ۱۲ آنے - ۶۲ روپے) یہ اعداد و شمار جن کے متعلق وہیٹلے کمیشن کا خیال ہے کہ مزدور پیشہ جماعتوں کے ہیں جن کی مالی حالت دوسرے باشندوں سے مقابلتاً بہتر ہوتی ہے، سب دلچسپ ہیں کیوں کہ ان سے اخراجات کی وہ عظیم شرح معلوم ہوجاتی ہے، جو زندگی کی سب سے پہلی اور سب سے اہم ضرورت پر صرف میں آتی ہے یہ قرضہ کی مد کے

اخراجات کو چھوڑ کر جسے بد قسمتی سے ہر گھرانے کے حساب کتاب میں ایک بڑی اہمیت حاصل ہے، ان اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ خوراک، ایندھن، روشنی، پوشش، اور مکان کے کرایہ پر کل اخراجات کا ۵۲ فی صدی شولا پور میں اور ۵۰ فی صدی احمدآباد میں خرچ کیا جاتا ہے۔ وہٹلے رپورٹ رقمطراز ہے کہ " ان واقعات کو خود اپنی داستان کہنے کے لئے بغیر کسی تفصیل ہی کے چھوڑ دینا بہتر ہے، اور اس کی قطعاً ضرورت نہیں ہے کہ جس عام محتاجی اور افلاس کا وہ اظہار کرتے ہیں اس کی تشریح کی جائے۔" جنگ عظیم کے کچھ دنوں بعد بمبئی کے مزدوروں کی انجمن کے دفتر نے مختلف گھرانوں کے حساب کتاب جمع کئے تھے اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ متمول طبقے میں آمدنی کا ۵۶٫۵ (تقریباً ستاون) فی صدی اور غریبوں کے طبقے میں آمدنی کا ۶۵ فی صدی خوراک پر صرف میں آتا تھا، اور جسمانی ضروریات پر خرچ کی یہ بڑھی ہوئی شرح آمدنی کی کمی پر دلالت کر رہی ہے کیوں کہ عمرانیات کا یہ ایک مسلمہ مسئلہ ہے کہ جب کسی گھرانے کی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے تو اس آمدنی کا بہت تھوڑا فی صدی حصہ خوراک پر صرف میں آتا ہے۔ اور حفظ صحت، تفریح، تعلیم وغیرہ کے متعلق اخراجات برابر بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

" ہندوستان کا دہقان اس بات پر مجبور ہے کہ ایک ایسی خوراک پر قناعت کرکے خود کو اس کا عادی بنالے جو بہ لحاظ صفات بھی ناکافی ہو اور بسا اوقات بہ لحاظ مقدار بھی۔ دودھ بہت کم میسر آتا ہے اور دہقان شاذ و نادر ہی اس حیوانی روغن کی کافی مقدار حاصل کرسکتا ہے جو دودھ اور گھی میں ہوتا ہے۔ غلہ جو اس کی خاص غذا ہے اس کی غذائیت میں سبز ترکاریوں کے ذریعہ سے افزونی ممکن ہے لیکن یہ بھی اسے شاذ و نادر ہی کافی مقدار میں ملتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ضعف اس پر غلبہ پالیتا ہے اور مرض کی مدافعت کی قوت جسم میں بہت کم ہو جاتی ہے۔" وہٹلے کمیشن نے جو یہ نتائج اخذ کئے ہیں وہ سر جان میگا کی رائے سے مطابقت رکھتے ہیں جن کا مقولہ ہے کہ اگرچہ ہندوستان میں خوراک کے ناکافی ہونے کے متعلق بہت ہی اطلاعات موجود ہیں، لیکن غالباً خوراک کی مقدار کی بہ نسبت خوراک کی صفات میں زیادہ کمی ہے۔ حیوانی پروٹین بہت ہی کم مقدار میں

استعمال کئے جاتے ہیں، اور پھلوں اور سبز ترکاریوں کی اکثر دیہات میں بہت بڑی کمی ہے۔ دودھ کی جو مقدار استعمال کی جاتی ہے وہ حیرت انگیز حد تک کم ہوتی ہے یعنی فی بالغ آدمی روزانہ ڈھائی چھٹانک صوبہ متحدہ میں، دو چھٹانک بمبئی میں، اور پنجاب کے علاوہ باقی تمام صوبوں میں ڈیڑھ چھٹانک روزانہ یا اس سے بھی کم ہے۔" یہ ایک بیّن حقیقت ہے کہ پروٹین، روغنیات، اور بعض حیاتین (وٹامن) کی مقدار جو لوگوں کو ملتی ہے بجز چند خوش نصیب مقامات کے ہر جگہ بہت ہی کم ہے۔" سر جان میگا فرماتے ہیں کہ بحیثیت مجموعی حقیقتاً خوراک کی مقدار کی کمی کی تہائی توقعات سے کم ملیں، اور اس سلسلے میں اگر اس روزانہ خوراک کا باہم مقابلہ کیا جائے جو ایک جوان مزدور کو بمبئی شہر میں، اور قیدیوں کو جیل میں، اور قحط زدہ لوگوں کو بطور امداد ملتی ہے تو دلچسپی سے خالی ہوگا بمبئی لیبر گزٹ کی ۱۹۲۱ء کی ایک اشاعت کے مطابق ہر مزدور کو روزانہ ۱ر۲۹ (سوا پونڈ سے کچھ اوپر) پونڈ غلہ اور ۰ر۹ (تقریباً پون چھٹانک) پونڈ دال ملتی تھی، جیل میں جو رسد دی جاتی ہے اس کی مقدار ۱ر۵ (ڈیڑھ پونڈ) پونڈ غلہ اور ۲۷ر (تقریباً ۲ چھٹانک) پونڈ دال روزانہ ہے، اور قحط کے قواعد کے مطابق اُن لوگوں کو جو کھدائی کا کام کریں ۱ر۲۹ پونڈ غلہ دیا جاتا ہے درآنحالیکہ یہ کھدائی کرنے والے اس سے صرف میں چوتھائی کام کرتے ہیں جتنا کہ معمولی حالات میں ایک مزدور کرتا ہے۔

سر جان میگا نے جن دیہات میں تحقیقات کی تھی ان میں تقریباً چالیس فی صدی کے متعلق یہ خیال ہے کہ وہاں پیدا شدہ خوراک کی نسبت سے آبادی بہت زیادہ تھی۔ بہار اور اڑیسہ میں تقریباً ساٹھ فی صدی دیہات کی آبادی کو تناسب سے زیادہ بتایا گیا ہے اور بنگال اور پنجاب میں چھبیس فی صدی کو غالباً جو ڈاکٹر تحقیقات پر لگائے گئے تھے وہ اس کے لئے تیار نہ تھے کہ دیہات کے لئے آمدنی کا کم معیار قبول کرلیں، کیوں کہ درحقیقت بہت سے مقامات پر جہاں سامان خوراک کو کافی بتایا گیا تھا اس بات کی بہ کثرت شہادتیں موجود تھیں کہ حقیقتِ حال یہ نہ تھی۔ ملک میں امراض کا وقوع بتاتا ہے کہ اکثر بیماریاں جو ناکافی تغذیہ کا نتیجہ ہوتی ہیں وہی زیادہ عام ہیں۔ کمی غذا کی بیماریاں مثلاً ریکٹس (ہڈیوں کا نرم ہونا) شب کوری (رتوندھ) وغیرہ میں مجموعی طور پر ملک کی کل آبادی میں سے ساٹھ لاکھ

انسان مبتلا ہیں، اور سل یا تپ دق جو کہ زندگی کے معیار کا صحیح طور پر پتا دیتی ہے اور جو نہایت سرعت کے ساتھ انہی لوگوں میں پھیلا کرتی ہے کہ جنھیں کافی خوراک اور اچھے گھر میسر نہوں، وہ تو اب ہندوستان میں بہت ہی عام ہو گئی ہے۔

اگر غذا کا ایک زیادہ بلند اور زیادہ مختلف النوع معیار مقرر کر دیا جائے تو علاوہ اس کے کہ اس سے لوگوں کی صحت مندی میں ترقی ہوگی اور ان کی قوت مدافعت بڑھ جائے گی، اس کا ایک ضمنی نتیجہ یہ بھی نکلے گا کہ ملک کی پیداوار اور صرف دولت کے مابین بہتر تناسب قائم ہو جائے گا۔ ابھی تک پیداوار، تقسیم، اور صرف دولت کو خصوصیت کے ساتھ اقتصادی مسائل قرار دیا جاتا رہا ہے، اور صحت عامہ پر ان کا جو اثر پڑتا ہے اسے نظر انداز کر دیا گیا ہے، لیکن گذشتہ چند سال کی اقتصادی کساد بازاری نے لوگوں کی توجہ اس خلا کی جانب منعطف کی ہے جو تقریباً ہر جگہ خوراک کی ان ضروریات کے مابین کہ جو علم الحیات نے مقرر کی ہیں اور انھیں پورا کرنے کے ذرائع کے درمیان حائل ہے۔ اس لئے پرورش یا بہم رسانی خوراک کا مسئلہ فی الاصل یہ ہے کہ اقتصادی حالات اور صحت عامہ کی ترقی کو باہم متناسب کر دیا جائے۔ صرف دولت کو زیادہ کرنے کا مسئلہ اب صرف قومی مسئلہ نہیں، بلکہ بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ اگر اقتصادی توازن قائم کرنا اس طرح مقصود ہے کہ پیداوار کو نہ گھٹایا جائے بلکہ صرف دولت کو بڑھایا جائے تو پیداوار کی زیادتی کی موجودہ مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان کروڑوں انسانوں کا معیار تغذیہ بلند کیا جائے جو اس وقت ناکافی غذا پر بسر کر رہے ہیں، جنھیں ضرورت موسم کے مطابق کپڑے نہیں ملتے، اور جن کے پاس رہنے کے لئے مناسب مکان اور کافی جگہ نہیں ہے۔ انہی تمام باتوں کا لحاظ کرکے انڈین لیبر کانفرنس نے اپنے گذشتہ اجلاس میں مزدوروں کو غذا بہم پہونچانے کے متعلق ایک تجویز منظور کی تھی۔

جواہر لال نہرو

(بسلسلۂ گذشتہ)

پنجاب سے واپس آکر پنڈت جی نئے جوش اور عزم کے ساتھ صوبہ کی کانگریس کی تنظیم اور اودھ کے کسانوں کی تحریک چلانے میں مصروف ہو گئے۔ اس زمانہ میں انھیں کسانوں سے ملنے کا موقع ملا۔ اور ان کی تباہ اور سقیم حالت کو اپنی آنکھ سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ان کا دل اس مظلوم اور فاقہ زدہ طبقہ کی محبت میں ڈوب گیا۔ محلوں میں رہ کر اور عیش و آرام کی گود میں پل کر انھوں نے کبھی نہ سوچا تھا کہ ان کے ملک میں ان کے ایسے بے شمار بھائی بھی ہیں جنھیں پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا اور گرمی اور سردی میں بدن پر چیتھڑے لگائے پھرتے ہیں، دن رات محنت و مشقت کر کے تمام انسانوں کے پیٹ بھرنے والے کسان کی تباہ حالت دیکھ کر وہ بے چین ہو گئے۔ سماج، سرمایہ داروں اور موجودہ سرکار سے انھیں نفرت ہو گئی۔ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۱ء تک کسان تحریک نے اودھ میں جو ترقی پائی تھی اس میں جواہر لال جی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ سارے اودھ میں اور خاص کر پرتاب گڈھ ضلع میں رات دن دورہ کرنا، تقریریں کرنا اور کسانوں کی تنظیم کرنا آپ کا پیشہ ہو گیا۔ جو ہمیشہ محلوں میں راجاؤں کی شان و شوکت سے رہنے کے عادی تھے وہی مصیبت زدہ کسانوں کی محبت میں پاگل ہو کر غریب کسانوں کی جھونپڑیوں میں کھرے کمبلوں کے اوڑھنے بچھونے پر سوتے تھے۔ مغربی طریقہ بود و باش سے انھیں نفرت ہو گئی تھی اور دیہاتی ڈھنگ سے ہی آپ گاؤں میں جاتے تھے۔ اچھے اچھے ہوٹلوں میں کھانا کھا کر خوشی نہیں ملی تھی۔ وہ کسانوں کی موٹی روٹیوں اور ساگ پات میں ملتی تھی گھر سے باہر کبھی پیدل نہ نکلتے تھے وہی جواہر لال ادھر کے کھیتوں میں، پانی میں اور دیہات کی گلیوں میں دھوتی چڑھائے میلوں پیدل چلتے تھے۔ کتنا بڑا انقلاب تھا۔ لوگ اس انقلاب کو دیکھ کر دانتوں تلے انگلی دباتے تھے۔

سرکار کی ناراض نگاہ پنڈت جی پر پڑ چکی تھی اور وہ انھیں قانون کی زد میں لاکر سزا دینا چاہتی تھی۔

۱۹۲۰ء کی گرمیوں میں آپ اپنی والدہ بہن اور بیوی کے ساتھ منصوری میں سوائے ہوٹل میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ انہیں دنوں افغان نمائندے بھی برٹش نمائندوں سے صلح کی شرائط پر بحث کرنے کے لئے وہاں مقیم تھے۔ مقامی افسر نہرو جی کی موجودگی سے ڈرے اور انھوں نے آپ سے اس بات کا وعدہ لینا چاہا کہ آپ افغانوں سے کسی قسم کی کوئی گفتگو نہ کریں گے۔ اگرچہ آپ نے اس وقت تک افغانوں کو دور سے بھی نہیں دیکھا تھا مگر ایسے حکم کو نہایت نامناسب سمجھ کر آپ نے اس قسم کا وعدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو ۲۴ گھنٹے کے اندر منصوری چھوڑ دینے کا حکم ملا اور آپ کو ماں بیوی اور بہن کو بیماری کی حالت میں چھوڑ کر مسوری سے روانہ ہونا پڑا۔ کچھ دنوں بعد انھوں نے سرکار کو اطلاع دی کہ اجازت ہو یا نہ ہو وہ مصوری جانے سے نہ رکیں گے۔ اس پر حکم واپس لے لیا گیا اور آپ مصوری جا سکے۔

اسی زمانہ میں مہاتما گاندھی نے پنجاب کے مظالم اور خلافت کے مسائل کو لے کر عدم تعاون کا پروگرام ملک کے سامنے رکھا۔ جواہر لال جی ابتدا ہی سے پروگرام کے طرفدار ہو گئے اور کلکتہ اور ناگپور کے کانگریس کے اجلاسوں میں گاندھی جی کا ساتھ دیا۔ ناگپور کانگریس کے ختم ہوتے ہی آپ نے وکالت سے استعفٰی دے دیا اور اپنا سارا وقت اور قوت کانگریس کی خدمت میں لگا دی۔ پنڈت جواہر لال ان دنوں صوبہ کی کانگریس کے سکرٹری تھے اور صوبہ کی ساری تنظیم کا بوجھ آپ کے کندھوں پر ہی تھا۔ کانگریس کمیٹیوں کا قائم کرنا، صوبہ کے دفتر کا کام کرنا اور تمام صوبہ میں تحریک پھیلانا آپ کا روز کا کام تھا۔ صبح ۵ بجے سے لے کر رات کے گیارہ بجے تک آپ روزانہ کام کرتے تھے آپ کی نہ تھکنے والی محنت، آپ کی غیر معمولی حب الوطنی آپ کا ولولہ عمل اُمنگ اور اُمید تمام دوسرے کام کرنے والوں کے اندر زندگی اور جوش پیدا کرتی تھی۔

نہرو جی ان دنوں میں کانگریس کے روزانہ کاموں کے علاوہ انڈیپنڈنٹ اخبار کے نکالنے میں بھی بہت مدد دیتے تھے۔ مسٹر جوزف اور رنگا آئر اخبار کے ایڈیٹر تھے۔ سرکار نے آپ کو اور دونوں ایڈیٹروں کو نوٹس دیا کہ اخبار کے کچھ خلاف قانون مضامین کے لئے معافی مانگیں۔ مگر ان کے لئے

ممکن تھا بمصلحت وقت دیکھ کر سرکار نے اس وقت جواہر لال جی سے تو کچھ نہ کہا صرف مسٹر رنگا آئر کو ایک سال کی قید بامشقت کی سزا دے کر خاموش ہوگئی۔

اسی موقع پر پرنس آف ویلز ہندوستان میں آئے اور کانگریس نے ان کا بائی کاٹ کیا۔ اس بنا پر کانگریس والنٹیر کور غیر قانونی جماعت قرار دی گئی اور جواہر لال جی ۶ دسمبر کو گرفتار کرلئے گئے۔ گرفتاری کے وقت پریشان ہونا تو بڑی بات ہے معلوم ہوتا تھا کہ جیسے آنے والی تکلیفوں کی طرف آپ کا دھیان ہی نہیں ہے۔ اس وقت جو دو چار منٹ ملے اس میں آپ نے یہ مناسب سمجھا کہ کارکنوں کو ان کے خطوں کا جواب لکھ دیا۔ آپ لکھنؤ جیل کے سول وارڈ میں رکھے گئے جیل میں تین مہینے رہنے کے بعد آپ رہا کردئے گئے۔ جیل سے چھوٹتے ہی نہرو جی نے مہاتما جی سے ملنے کے لئے احمد آباد کا سفر کیا لیکن آپ کے پہنچنے کے پہلے ہی وہ گرفتار ہوگئے۔ گاندھی جی کے مقدمے کے دوران میں پنڈت جی احمد آباد ہی میں رہے۔ پھر وہاں سے مہاتما جی کی مرضی معلوم کرکے الہ آباد آئے اور بدیسی کپڑے کے بائی کاٹ کے کام میں مصروف ہوگئے۔ بائی کاٹ کی کامیابی سے چڑھ کر سرکار نے آپ کو دھمکی دینے اور زبردستی روپیہ وصول کرنے والوں کو امداد کرنے کے الزام میں دوسری بار گرفتار کرلیا اور ۱۷ مئی کو ڈیڑھ سال کی سزا دے دی۔ نہرو جی خوشی خوشی جیل گئے انھیں ان کے اپنے الفاظ میں "جیل سے باہر تنہائی اور ویرانی سی معلوم ہوتی تھی اور دل پھر وہیں جانے کی تمنا کرتا تھا۔" جنوری ۱۹۲۳ء میں صرف آٹھ مہینے کی قید کے بعد آپ بہت سے سیاسی قیدیوں کے ساتھ چھوڑ دئے گئے۔ جیل سے آکر پنڈت جی صوبہ کی کانگریس کمیٹی کے سکریٹری بنائے گئے اور سیاسی کاموں میں پوری طرح مصروف ہوگئے۔

جس وقت جواہر لال جی جیل سے چھوٹ کر آئے اس وقت کانگریس کی پالیسی میں تبدیلی چاہنے والوں اور تبدیلی کے مخالف لوگوں میں خوب ان بن تھی۔ مسٹر راج گوپال اچاریہ کی رہنمائی میں تبدیلی کے مخالف لوگوں نے گیا کانگریس میں فتح پائی تھی اور داس بابو اور پنڈت موتی لال جی اس ناکامی سے مایوس نہ ہوکر سوراج پارٹی کو مضبوط بنا رہے تھے۔ جواہر لال جی اس آپس کے اختلاف کو

دیکھ کر بہت کشمکش و پیچ میں پڑ گئے۔ آپ کے سامنے دو ہی راستے تھے یا تو ان میں سے ایک جماعت میں شریک ہو جاتے یا ان دونوں سے علیحدہ رہ کر دونوں جماعتوں میں اتفاق و محبت پیدا کرانے کی کوشش کرتے۔ پہلا راستہ اختیار کرنے میں دونوں طرف سے فایدہ تھا اگر آپ اپنے گروکی طرفداری کرکے باپ کی مخالفت کرتے تو یقینی تھا کہ پبلک آپ کو سر پر اٹھا لیتی اور آپ تبدیلی کے مخالف لوگوں کے رہنما ہو جاتے اگر آپ باپ کی طرفداری کرتے تو اسمبلی کی ڈپٹی لیڈری یا کونسل کی لیڈری آپ کو مل جاتی۔ لیکن آپ نے ان لالچوں کو ٹھکرا کر اپنے اصول کے مطابق دوسرا ہی راستہ اختیار کیا۔

۲۷ فروری کو الہ آباد میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں مولنا ابوالکلام آزاد اور آپ کی کوشش سے کچھ دنوں کے لئے آپس کی مخالفت بند ہو گئی لیکن پوری طرح میل جول نہ ہو سکا۔ اسی درمیان میں ایک ایسی درمیانی جماعت بھی بن رہی تھی جس میں دونوں جماعتیں باہمی اتفاق و محبت کے ساتھ شریک ہو سکیں۔ ۲۶ مئی کی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بمبئی والے اجلاس میں اسی درمیانی جماعت کے آدمیوں نے مندرجہ ذیل مضمون کی قرارداد پیش کی جو کثرت رائے سے پاس ہو گئی۔ "یہ پیش نظر رکھتے ہوئے کہ کانگریس کے بہت سے ماننے رہنماؤں کے خیالات کاؤنسل کے داخلہ کی حمایت میں ہیں یہ طے ہوا کہ کانگریس کے رزولیوشن کے مطابق کونسلوں کے بائی کاٹ کے لئے کوئی عملی تحریک نہ چلائی جائے۔" اس رزولیوشن کے پاس ہو جانے پر کئی تبدیلی کے مخالف کارکنوں نے مثلاً مسٹر راجگوپال اچاری، سردار ولبھ بھائی پٹیل، بابو راجندر پرشاد، بابو برج کشور پرشاد، جے۔ جی۔ ونیش پانڈے اور سیٹھ جمنالال بجاج نے استعفے دے دیئے جواہرلال جی کی تجویز پر استعفوں پر نظر ثانی کا موقع دینے کے بعد یہ استعفے اور صدر کا استعفیٰ قبول کر لیا گیا۔ اعتدال پسند جماعت کی کیبنٹ بنی جس کے ڈاکٹر انصاری صدر اور جواہرلال جی قائم مقام جیف سکریٹری بنے۔ کئی صوبوں نے مفاہمت کی اس قرارداد کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور ان صوبوں کی خواہش پر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ناگپور میں بلایا گیا۔ یہاں بھی آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ۲۶ مئی کو جو بمبئی میں قرارداد پاس ہوئی تھی اس کے صحیح اور مناسب ہونے کی قرارداد منظور کی۔ اس کے علاوہ ایک قرارداد اس مضمون کی بھی

پاس کی کہ بعض صوبائی کانگریس کمیٹیوں کی یہ کوشش کہ اس قرارداد کی خلاف ورزی کی جائے۔ قابل افسوس ہے۔ مگر اس سے مطمئن نہ ہو کر مسٹر جواہر لال جی نے یہ تجویز پیش کی کہ تامل ناڈ کانگریس کمیٹی پر حکم نہ ماننے کے الزام میں ملامت کی جائے۔ اس کی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ایک حصہ نے اس بنیاد پر مخالفت کی کہ اس قسم کی ملامت کے لئے کافی ثبوت نہیں ہے۔ کانگریس کمیٹی نے موخرالذکر رائے کو تسلیم کیا۔ اس بات پر جواہر لال جی نے اور دوسرے لوگوں نے جو ان کے ہم خیال تھے جن میں ڈاکٹر انصاری بھی شامل تھے استعفےٰ دے دیا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ان استعفوں کو قبول کر لیا اور نئی ورکنگ کمیٹی کا اسی وقت انتخاب کیا گیا۔ ستمبر کے مہینہ میں نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس دلی میں ہوا اور سوراجسٹوں کو کونسل کے داخلہ کی اجازت مل گئی۔

دلی کانگریس کے ختم ہونے پر پنڈت جی ریاست نابھا کے مصیبت زدہ اکالیوں کی حالت دیکھنے کے لئے جیتو گاؤں گئے۔ اچاریہ کرپلانی اور مسٹر کے۔ سنتانم بھی آپ کے ساتھ تھے۔ جیتو پہنچتے ہی آپ کو ریاست سے چلے جانے کا حکم دیا گیا اور انکار کرنے پر آپ گرفتار کر لئے گئے۔ نابھا میں مقدمہ ہوا اور آپ کو دو برس کی قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ لیکن جس دن سزا سنائی گئی اسی دن آپ حاکم کے حکم سے رہا کر دئے گئے۔ جب آپ نابھا ہی تھے اسی وقت آپ کو صوبائی کانگریس کے صدر منتخب ہونے کی اطلاع ملی۔ لیکن جواہر لال جی کانگریس کے موقع پر بیمار ہو گئے اور آپ کا خطبۂ صدارت آپ کی غیر حاضری میں پڑھ کر سنایا گیا۔

دسمبر ۱۹۲۳ء میں مولانا محمد علی کی صدارت میں کانگریس کا اجلاس کوکناڈا میں ہوا جواہر لال جی نے اجلاس کے سامنے والنٹیروں کی تنظیم کا رزولیوشن پیش کیا جسے کانگریس نے منظور کر لیا۔ اسی موقع پر آپ کی صدارت میں آل انڈیا والنٹیر کانگریس ہوئی۔ نہرو جی ہندوستانی سیوا دل کے آل انڈیا بورڈ کے پہلے صدر بھی بنائے گئے۔ کوکناڈا کانگریس میں تبدیلی کی مخالفت کرنے والی جماعت نے اپنی ساری طاقت کو جمع کر کے ایک بار پھر تمام ملک کو پرانے طریقوں پر قائم رکھنے کی کوشش کی لیکن انہیں کامیابی نہیں ہوئی اور کانگریس تمام تر سوراجسٹوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ نہرو جی کوکناڈا میں

پہلی بار آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری بنائے گئے۔ اور کئی سال تک درمیانی وقفوں کو چھوڑ کر اس عہدہ پر فائز رہے۔ اور یہ بلا خوف تردید کیا جا سکتا ہے کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے دفتر میں زندگی اور باقاعدگی پیدا کرنے کا سہرا بہت بڑی حد تک جواہر لال جی کے سر ہے۔ الہ آباد میں قیام کے دنوں میں ۱۱ بجے سے ۵ بجے شام تک پنڈت جی لگاتار دفتر کا کام کرتے تھے۔ سارے خطوں کا جواب خود ہاتھ سے لکھ کر دیتے تھے اور دفتر میں بیٹھے بیٹھے ساری کانگریس مشین کو چلاتے تھے۔ تمام ملک کی سیاسی زندگی میں حصہ لیتے ہوئے جس کامیابی کے ساتھ آپ نے کانگریس آفس کو سنبھالا اس کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔

یہ زمانہ جواہر لال جی کے لئے بہت مصروفیت کا تھا۔ جیل سے آنے کے کچھ دنوں بعد ہی آپ الہ آباد میونسپل بورڈ کے چیرمین منتخب ہو گئے تھے اور آپ نے جنرل سکریٹری کے عہدہ کے ساتھ ساتھ اس فرض کو بھی سلیقہ کے ساتھ انجام دیا۔ الہ آباد کے کلکٹر مسٹر الگزنڈر نے آپ کے بورڈ کے کام کی بابت لکھا تھا کہ "بورڈ قومیت کے تخیل کو پیدا کرنے کے لئے مندرجہ ذیل کام کر رہا ہے۔

(۱) اسکولوں میں کتائی کی تعلیم

(۲) اسکولوں میں سوراجتی

(۳) انگریزی کی جگہ ہندی کا استعمال

(۴) چھٹیوں کی فہرست میں تلک اور گاندھی ڈے کا اضافہ

(۵) چھٹیوں کی فہرست سے امپائر ڈے کا نکال دینا

(۶) مہاتما گاندھی اور مولانا شوکت علی کو ایڈریس دینا

(۷) مہاتما گاندھی کے جیل سے چھوٹنے پر جلسہ

(۸) وائسرائے کا استقبال کرنے سے انکار

(۹) اسکول کے بچوں کو سبھاؤں اور قومی جلسوں میں آزادی سے شریک ہونے کے لئے ترغیب دینا"

۱۹۲۶ء کی ابتدا میں کملاجی کی حالت بہت بگڑ گئی اور ڈاکٹروں نے انھیں علاج کے لئے سوئٹزرلینڈ لے جانے کا مشورہ دیا۔ اس لئے پنڈت جی نے مارچ میں یورپ کے لئے سفر کیا۔ کملاجی کا علاج جنیوا اور مونٹانا میں رہا۔ اس زمانہ میں جواہرلال جی کو غور و فکر اور مطالعہ کا اچھا موقع ملا۔ آپ کے کئی مضامین یورپ اور ہندوستان کے رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوئے۔ کملاجی کی حالت سنبھلنے پر نہروجی نے یورپ کے مختلف ملکوں کا سفر کیا۔ آپ اٹلی، فرانس، ہالینڈ، جرمنی، انگلینڈ، بلجیم اور روس گئے اور وہاں کے سیاسی لیڈروں سے ملے۔ یورپ کے ملکوں میں آپ ہندوستان سے جلاوطن کئے ہوئے کئی ہندوستانیوں سے بھی ملے۔

پنڈت جی شہنشاہیت کے خلاف برسلس کی بین الاقوامی کانفرنس میں کانگریس کے نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوئے اور اس حیثیت سے یہاں آپ کی بہت عزت ہوئی اور آپ بین الاقوامی کانگریس کے پانچ صدروں میں سے ایک کی جگہ کے لئے منتخب کئے گئے۔ سوویٹ روس کی دسویں سال گرہ میں شامل ہونے کی دعوت پاکر آپ روس گئے۔ ماسکو پہنچ کر آپ نے روس کے انقلاب عظیم کو دیکھا آپ زیادہ دن روس میں نہ رہ سکے۔ کانگریس کے اجلاس میں شامل ہونے کے لئے آپ کو جلد ہی وہاں سے روانہ ہونا پڑا۔

یورپ اور روس کے اس سفر سے آپ کے خیالات میں ایک زبردست انقلاب ہوگیا اور آپ لینن اور سوشلزم کے پجاری بن کر ہندوستان کو لوٹے۔ یورپ کے سیاسی لیڈروں کے خیالات معلوم کرنے کے بعد آپ بین الاقوامی تعلقات پیدا کرنے کی ضرورت کو بہت اہم سمجھنے لگے تھے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے نہروجی نے مدراس کانگریس میں دو معرکے کے رزولیوشن پیش کئے ایک مستقبل کی جنگ میں انگلینڈ کا ساتھ نہ دینے اور دوسرا کانگریس کا نصب العین مکمل آزادی قرار دینے سے متعلق تھا۔ ان دونوں رزولیوشنوں نے ملک کے کارکنوں کو آپ کی طرف متوجہ کیا اور آپ کل ہندوستان کے لیڈروں کی فہرست میں آگئے۔ اسی موقع پر آپ نے ریپبلکن کانگریس اور ہندوستانی سیوادل کی صدارت کو بھی قبول کرلیا۔

مدراس کانگریس کے بعد آپ کانگریس کے احکامات کو عملی جامہ پہنانے اور اپنے نئے خیالات کو پھیلانے کے کام میں مصروف ہوگئے آپ نے سوویٹ روس کے متعلق مضامین مختلف اخباروں میں لکھے جو "سوویٹ روس" نامی کتاب میں جمع کرکے شائع کر دئیے گئے ہیں آپ نے آل پارٹیز کانفرنس اور نہرو رپورٹ کی تیاری میں بھی بہت محنت سے کام کیا جس کی تعریف نہرو رپورٹ میں موجود ہے۔ سائمن کمیشن کے بائی کاٹ کرنے میں بھی آپ نے بڑی دوڑ دھوپ کی اور سارے یو۔پی۔ کے صوبہ کا اس سلسلہ میں دورا کیا۔ کمیشن کے بائی کاٹ کے موقع پر پنڈت جی کو لکھنؤ میں پولیس کے ڈنڈے بھی کھانا پڑے۔ جسے آپ نے بڑی ہمت اور بہادری سے برداشت کیا۔

اگست سنہ ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ پر غور کرنے کے لئے لکھنؤ میں آل پارٹیز کانفرنس ہوئی اس موقع پر باپ بیٹے میں جو پوشیدہ اختلاف برسوں سے پایا جا رہا تھا وہ عام مجمع میں سب پر ظاہر ہوگیا۔ جواہر لال جی نے مکمل آزادی کے حامیوں کے لیڈر کی حیثیت سے نہرو رپورٹ کی مخالفت کی۔ اور سوشلزم کی تلقین کی۔ اس پر اودھ کے ایک تعلقہ دار نے کہا "پہلے آنند بھون کو گرا دو پھر سوشلزم کی تلقین کرنا" یہ بات تیر کی طرح جواہر لال کے دل پر لگی۔ اس وقت تو وہ خاموش ہوگئے۔ لیکن اس کے بعد اس طعنہ کا عملی جواب دینے کی فکر میں لگے رہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۰ء میں ان کی صدارت کے زمانہ میں موتی لال جی نے آنند بھون کا وقف نامہ کانگریس کے نام لکھ دیا۔ بہر حال اس تقریر کے بعد مکمل آزادی کے حامیوں نے کانفرنس میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ ۳ر اور ۴ر نومبر کو دلی میں انڈیپنڈنس لیگ کی بنیاد پڑی اور جواہر لال جی اس کے سکریٹری بنائے گئے۔

کلکتہ میں کانگریس کا اجلاس ہوا۔ موتی لال جی اس کے صدر تھے۔ اس موقع پر بھی جواہر لال جی اپنے والد کے خلاف کھڑے ہوئے۔ مہاتما جی کی کوشش سے انڈیپنڈنس لیگ سمجھوتے کے رزولیشن پر راضی ہوگئی اس رزولیشن کے مطابق سرکار کو الٹی میٹم دیا گیا کہ اگر ایک سال کے اندر اندر برٹش سرکار نے نہرو کمیٹی کے طرز کا سوراج نہ دیا تو کانگریس مکمل آزادی کا اعلان کر دے گی اور عدم ادائیگی لگان اور ستیاگرہ کی تحریک شروع کردیگی اور اس وقت تک ملک کو سول نافرمانی کے لئے تیار کرے گی"

پنڈت جواہر لال جی جب سے یورپ سے آئے تھے برابر ملک کو سول نافرمانی کے لئے

تیار کر رہے تھے آپ پنجاب، دلی، کرپ اور یو۔ پی کے صوبوں کی کانفرنسوں کے صدر بنائے گئے اور صدارت کی کرسی سے انقلاب کا پیغام گھر گھر پہنچا رہے تھے۔ نوجوانوں میں زندگی اور بیداری پیدا کرنے اور ان کے ذریعہ سرمایہ داری کو ختم کرنے کی طرف آپ خاص طور پر متوجہ رہے۔ جواہر لال جی نے یوتھ لیگ کی بنیاد ڈالی اور ماسکو کے بڑے گرجے کے سامنے لکھے ہوئے اس مشہور کتبہ کو کہ "مذہب عوام کے لئے افیم ہے" اس کا اصل اصول بنایا۔ کئی سال کے سوئے ہوئے ملک کو نوجوانوں کی چیخ پکار نے جگا دیا اور عدم تعاون کے دنوں کی گرمی اور چہل پہل دوبارہ پیدا ہو گئی۔ سوشلسٹ یوتھ کانفرنس، انجمن طلبائے بنگال اور صوبہ بمبئی کے نوجوانوں کی لیگ کے اجلاسوں کے آپ صدر ہوئے۔ اور آپ کی صداقت اور خلوص کو دیکھ کر تمام ملک آپ سے محبت کرنے لگا۔ اسی سال کا آپ کا ایک بڑا کارنامہ وہ خطوط ہیں جو آپ نے اپنی بیٹی کے نام دنیا کی ابتدائی تاریخ کے موضوع پر لکھے تھے جب وہ گرمیوں میں مسوری میں قیام پذیر تھیں۔

اسی زمانہ میں ملک اور کانگریس کے سامنے یہ سوال تھا کہ اس آزمائش کے وقت میں کانگریس کا صدر کسے بنایا جائے؟ ملک کے سب رہنماؤں نے مہاتما جی سے صدارت کی درخواست کی مگر مہاتما جی نے نہرو جی کو ہی اس عہدہ کے لئے مناسب سمجھا۔ آخرکار جواہر لال جی کا صدارت کے لئے انتخاب ہوا۔

جہاریا میں دسمبر کے پہلے ہفتہ میں آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کی صدارت بھی آپ نے فرمائی۔ جہاریا ٹریڈ یونین کانگریس کے تین ہفتہ بعد آپ لاہور کانگریس کے صدر بنے اور آپ ہی کی صدارت میں مہاتما گاندھی نے یکم جنوری ۱۹۳۰ء کو رات کے بارہ بجے کے بعد مکمل آزادی کے نصب العین کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان سے جو خوشی آپ کو ہوئی وہ دیکھنے کے لائق تھی آپ کا خطبہ صدارت کسانوں اور مزدوروں کے لئے پیغام حیات اور زمینداروں اور سرمایہ داروں کے لئے آنے والے خطرہ کا پیغام تھا۔

لاہور کانگریس کے کچھ ہفتہ بعد مہاتما جی نے ویسرائے کو الٹی میٹم دیا اور ان کے پاس سے جواب آ جانے پر ورکنگ کمیٹی نے مہاتما گاندھی کو ڈکٹیٹر بنا کر جنگ کا اعلان کر دیا۔ مہاتما جی نے نمک قانون کی خلاف ورزی کا فیصلہ کیا اور اپنے اسی ساتھیوں کے ہمراہ ڈانڈی نمک اکٹھا کرنے کے لئے روانہ ہوئے۔

یو۔پی کے صوبہ میں بھی اس فیصلہ پر عملدرآمد ہوا اور ۶ اپریل کو پہلی مرتبہ جواہر لال جی کی رہنمائی میں نمک قانون کی خلاف ورزی کی گئی۔ پنڈت جی اس دن گرفتار نہیں کئے گئے لیکن دو دن بعد یکایک راستے میں ہی روک کر جیل بھیج دئے گئے اور آپ کو ۶ مہینہ کی سزا دی گئی۔ اس کے بعد ملک میں تحریک نے خوب ترقی پائی۔ اسی تحریک کے دوران میں سپرو اور جیکار کی سرکردگی میں مصالحت کی گفتگو شروع ہوئی اور جواہر لال جی یروودہ جیل لیجائے گئے۔ یروودہ سے لوٹ کر آپ نے مہاتما جی کو جو خط لکھا تھا اس سے آپ کی انتہا پسندی ظاہر ہوتی تھی۔

جواہر لال جی اپنی قید کی میعاد پوری کر کے ۱۱ اکتوبر کو چھوٹے۔ جس وقت رہا ہوئے اس وقت موتی لال جی کی حالت بگڑ چلی تھی۔ مگر آپ نے اس کا خیال نہ کر کے تحریک کو چلانے کا کام نہایت تیزی سے شروع کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہفتہ بعد آپ پھر گرفتار کر لئے گئے۔ لیکن ان سات دنوں میں ہی آپ زبردست کام کر گئے۔ عدم ادائیگی لگان کی تحریک کو آپ نے سارے ملک کی تحریک بنا دیا اور ستیاگرہ پروگرام کو اس سے بہت ترقی ہوئی۔

اس دفعہ جیل میں پہنچنے کے بعد آپ نے اپنی بیٹی کے نام وہ خطوط لکھے جن میں دنیا کی تاریخ کے کچھ نظارے دکھلائے گئے ہیں اور جسے آپ کی زندگی کا ایک بہت بڑا کارنامہ سمجھنا چاہئے۔ لیکن ابھی اس سلسلہ کے اٹھارہ خطوط ہی لکھنے پائے تھے کہ گاندھی ارون التوائے جنگ کی بنا پر آپ تین مہینہ بعد بلا کسی شرط کے تمام دوسرے سیاسی قیدیوں کے ساتھ رہا کر دئے گئے۔ جب آپ جیل سے نکلے اس وقت پنڈت موتی لال جی کی حالت بہت بگڑی ہوئی تھی اور سارے کانگریس لیڈر جیل سے چھوٹ کر ان کو درشن کے لئے آ رہے تھے۔ اس حالت میں بھی جب کانگریس کمیٹی کا اجلاس سوراج بھون میں ہوا تو آپ نے اس میں پوری طرح حصہ لیا۔ پنڈت موتی لال جی کا انتقال ۶ فروری کو ہوا۔ اس وقت بھی آپ جذبات سے بے قابو نہیں ہوئے اور ماتم میں بہت زیادہ دن نہیں لگائے بلکہ مہاتما جی کے ساتھ سمجھوتہ کی بات چیت کے لئے دہلی چلے گئے۔

دہلی میں سمجھوتہ ہو جانے کے بعد مارچ ۱۹۳۱ء میں کراچی کانگریس ہوئی۔ اس اجلاس میں

بنیادی حقوق کا رزولیوشن منظور کیا گیا۔ لوگوں کو یہ خیال ہونے لگا تھا کہ کانگریس رفتہ رفتہ نو آبادیات کے درجہ کی حکومت، برطانوی شہنشاہیت اور بورژوا رنگ کی دفتری حکومت کے نصب العین کی طرف دوبارہ کھسک جارہی ہے اور مزدوروں اور کسانوں کے مسائل اور اشتراکی خیالات سے دور ہٹتی جارہی ہے۔ اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے جواہرلال جی کے اصرار پر یہ بنیادی حقوق کا رزولیوشن پاس کیا گیا۔

دہلی کے سمجھوتہ کے بعد جواہرلال جی نے اس کا مطلب سمجھانے کے لئے یو۔پی۔ کا دورہ کیا اور سمجھوتہ کی خلاف ورزی کی طرف سختی کے ساتھ دھیان رکھا جذبات کو بہت زیادہ ضبط کرنے اور مسلسل محنت کی وجہ سے آپ کی طبیعت خراب ہوگئی اور آپ مئی کے مہینہ میں تبدیل آب وہوا کے لئے سیلون گئے۔ سیلون میں آپ کی بڑی عزت ہوئی اور وہاں جو تقریریں آپ نے کیں ان کی اخباروں میں بڑی تعریف ہوئی۔ وہاں سے لوٹ کر آنے کے بعد آپ سمجھوتے کی پابندی کی دیکھ بھال میں مصروف ہوگئے اور یو۔پی۔ میں اس کی جو خلاف ورزی کی جارہی تھی اس کو نمایاں کرنے لگے۔ ۲۹ر اگست کو مہاتما گاندھی گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے لندن چلے گئے اور ہندوستان کے کام کا بوجھ ان کی عدم موجودگی میں بڑی حد تک جواہرلال جی کو اٹھانا پڑا۔

اس زمانہ میں قیمتوں کے بہت زیادہ گر جانے کی وجہ سے یو۔پی۔ کے کسانوں کی حالت بہت خراب ہوگئی تھی۔ لیکن لگان کی وصولیابی میں کوئی کمی نہ کی گئی تھی جس سے کسان بڑی مصیبت میں مبتلا تھے۔ جب کبھی کانگریس والے ان کی ہمدردی میں کچھ کہتے تھے تو زمیندار اور تعلقہ دار انھیں باغی، قانون شکن اور دوسرے ایسے ناموں سے موسوم کرکے حکومت کی حمایت حاصل کر لیتے تھے۔ اور زمیندار اور تعلقہ دار اور حکومت کے افسران پر خوب اپنا غصہ نکالتے تھے۔ اکتوبر، نومبر اور دسمبر ۱۹۳۱ء میں اس مسئلہ پر پنڈت گوبند ولبھ پنت اور جواہرلال نے کانگریس کی طرف سے یو۔پی۔ گورنمنٹ سے بہت خط وکتابت کی اور یہ دونوں کئی مرتبہ یو۔پی۔ گورنمنٹ کے چیف سکریٹری سے بھی ملے اور دو مرتبہ انھوں نے سر مالکم ہیلی سے بھی ملنا چاہا لیکن اس کا انتظام نہ ہوسکا۔ یو۔پی۔ پراونشل کانگریس کمیٹی نے کئی ضلعوں کے کسانوں کی حالت کی تحقیقات کے لئے کمیٹیاں بھی مقرر کیں جن کی رپورٹیں ستمبر ۱۹۳۱ء میں پنت کمیٹی رپورٹ کے

نام سے یکجائی طور پر شایع کر دی گئیں۔ مہاتما گاندھی نے حکومت ہند سے لندن روانہ ہونے کے آخری وقت تک جن مسائل پر بحث کی ان میں ایک یو۔پی۔ کے کسانوں کا بھی مسئلہ تھا اور انھوں نے یہ صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ اگر شکایات کی تلافی نہ ہوئی تو مدافعت کے لئے ستیاگرہ اور سول نافرمانی ضروری ہو جائے گی۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل کانگریس کے صدر نے بھی یو۔پی۔ کے کسانوں کے بارے میں یو۔پی۔ حکومت کو لکھا۔ ان تمام کارروائیوں میں جواہر لال جی کی کوشش بہت بڑی حد تک شامل رہی جب یو۔پی کے صوبہ کی کانگریس کی تمام درخواستوں پر حکومت نے کوئی توجہ نہیں کی تو وہ مجبور ہوئے کہ کسانوں کو عدم ادائیگی لگان کا مشورہ دیں۔ حکومت نے اس کا جواب یہ دیا کہ اس نے کانگریس کے کارکنوں کو تیزی سے گرفتار کرنا شروع کیا اور آخر میں مسٹر شروانی اور جواہر لال جی کو بھی مہاتما گاندھی کے ہندوستان پہنچنے سے پانچ دن پہلے یعنی ۲۶ دسمبر ۱۹۳۱ء کو گرفتار کر لیا گیا۔

قید کے زمانہ میں جواہر لال جی نے اپنی بیٹی کے نام دنیا کی تاریخ کے متعلق خطوط کا سلسلہ شروع کیا۔ جیل کی تنہائیوں اور تکلیفوں میں ان کے دل بہلانے کا ایک ہی مشغلہ تھا۔ لیکن جس سادگی خوبی اور خوبصورتی کے ساتھ انھوں نے اپنے اس مشکل کام کو انجام دیا وہ ہر اعتبار سے تعریف کے قابل ہے۔

۳۰ اگست ۱۹۳۳ء کو جواہر لال جی رہا ہوئے۔ اس عرصہ میں انھوں نے اتنے خط لکھ ڈالے تھے جو دو ضخیم جلدوں میں شایع ہوتے ہیں۔ رہائی کے بعد انھوں نے سیاسی صورت حال کے متعلق مہاتما گاندھی سے خط و کتابت کی اور کئی زبردست تقریریں مختلف جلسوں میں کیں اور وہ معرکۃ الآرا مضامین اخباروں میں لکھے جو "ہندوستان کدھر جا رہا ہے" کے نام سے کتابی شکل میں شایع ہو چکے ہیں اور جن میں سوشلزم کی تلقین کی گئی ہے۔ اسی زمانہ میں فرقہ وارانہ مسئلہ کے متعلق بھی بنارس یونیورسٹی میں آپ نے ایک زبردست تقریر کی جس سے فرقہ پرست حلقوں میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ اس کے بعد آپ نے بنگال میں حکومت کی طرف سے جو ظلم و زیادتی ہو رہی تھی اس کی تحقیقات کرنے اور بہار کے زلزلہ کی مصیبت زدہ لوگوں کی امداد کرنے کے لئے بنگال اور بہار کا دورہ کیا۔ بنگال میں آپ کی ایک تقریر پر قانونی گرفت

دی گئی اور آپ [illegible] فروری [illegible] کو گرفتار کر لئے گئے اور کلکتہ کے چیف پریسیڈنسی مجسٹریٹ نے آپ کو دو سال کے لئے قید با مشقت کی سزا دی۔ قید کے اس زمانہ میں آپ نے اپنی آپ بیتی لکھی جو عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ قید کی مدت پوری ہونے میں جب دو تین مہینہ باقی تھے تو کملا نہرو کی نازک حالت دیکھ کر حکومت نے آپ کو رہا کر دیا اور آپ فوراً کملا نہرو سے ملنے یورپ چلے گئے۔ آپ کے یورپ کے قیام کے زمانہ میں آپ کا انتخاب کانگریس کی صدارت کے لئے کیا گیا فروری ۱۹۳۶ء میں کملا نہرو کا انتقال ہوگیا اور آپ یورپ سے ہندوستان واپس چلے آئے اور آج کل خطبہ صدارت کی تیاری اور کانگریس کے آئندہ طریقہ کار کے طے کرنے میں مصروف ہیں۔ یورپ کے اس زمانہ قیام میں آپ وہاں کے بڑے سیاسی لیڈروں سے ملے اور انگلستان میں بھی آپ نے سیاسی رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں، تقریریں کیں اور اخباروں میں مضامین لکھے۔ آپ اس مرتبہ یورپ والوں اور خصوصاً برطانیہ پر بہت اچھا اثر ڈال کر واپس آئے ہیں۔

مسلمانانِ ہند کے لئے آیندہ راہِ عمل

(بسلسلہ سابق)

(رسالہ جامعہ کی گذشتہ اشاعت میں، میں نے قارئین کو اُن مسائل کی طرف متوجہ کیا تھا جو اس وقت قوم کے سامنے ہیں اور جن کا حل ملک کے متعدد رہنماؤں کو سوچنا ہے۔ مثلاً نیا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، کانگریس کی آزادی وطن کی تحریک، مہا سبھا اور سوشلزم کی تحریکیں، عورتوں کی تعلیم اور آزادی کے مسائل، بڑھتی ہوئی بے روزگاری اور افلاس وغیرہ۔ میں نے یہ عرض کیا تھا کہ گذشتہ ربع صدی میں مسلمانانِ ہند کی توجہ ان مسائل کی طرف جتنی رہنا چاہئے تھی اتنی نہیں رہی۔ ہم نے جن مسائل کو زیادہ اہمیت دی وہ کچھ دوسرے ہی قسم کے تھے جن کا تعلق ہماری معاشی، معاشرتی، سیاسی اور حقیقی مذہبی زندگی سے کم اور خیالی اور جذباتی زندگی اور توہم پرستی سے زیادہ تھا۔ میرے بیان میں یہ بات بھی مخفی طور پر موجود تھی کہ ہمارے تمام سیاسی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی مسائل کا مطالعہ دو طرح کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو اس طرح کہ ان کے محض سطحی اور ہنگامی مظاہر اور نتائج کو سامنے رکھا جائے اور ان کی اصلاح کی عارضی تدبیریں اختیار کی جائیں اور دوسرے اس طرح کہ ان کی گہری اور مستقل بنیادوں تک پہنچنے کی کوشش کی جائے اور اپنی آیندہ پالیسی ان بنیادی حقائق کی روشنی میں متعین کی جائے ذیل کی سطروں میں میں کوشش کروں گا کہ اپنے پچھلے مضمون کے اجمال کی تفصیل زندگی کے انہی بنیادی محرکات اور واقعات کو سامنے رکھ کر کروں۔)

انسان کی زندگی احتیاجات کا ایک ایسا طویل سلسلہ ہے جس کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔ اور یہی اس کی وہ خصوصیت ہے جو اسے جانوروں سے ممتاز کرتی ہے اور جس پر اس کی تمام ترقی و

تہذیب کا دار و مدار ہے احتیاجات کے نام مختلف رکھ لئے جاتے ہیں کبھی اسے بھوک، سردی، گرمی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے کبھی جنسی خواہش کے نام سے۔ کبھی درد اور کسک کے نام سے اسے یاد کیا جاتا ہے کبھی خلش اور تپش، تمنا اور آرزو سے۔ کبھی اسے عشق مجازی کہا جاتا ہے اور کبھی عشق الٰہی۔ لیکن ان سب خواہشوں میں جو چیز مشترک ہے، وہ اشتہا، خلا، بے چینی، بے کلی ہے جسے رفع کرنے کی تدبیریں اور جستجوئیں نوعی برابر کرتا رہتا ہے۔

مہذب لوگوں کے موجودہ معیار کے مطابق افراد کی مکمل زندگی کے لئے جن چیزوں کی عموماً ضرورت ہوتی ہے اور طلب کی شدت کے اعتبار سے جس ترتیب کے ساتھ ضرورت ہوتی ہے انہیں مندرجہ ذیل طریقہ پر مدرج کیا جا سکتا ہے:۔

۱۔ تندرستی
۲۔ غذا
۳۔ کپڑا
۴۔ مکان
۵۔ گھر کی روشنی کا انتظام
۶۔ گھر کے لئے سامان
۷۔ سواری

۸۔ رشتہ ازدواج
۹۔ عبادت گاہیں، سوشل کلب اور تعلیم گاہیں۔ ادب، فنون لطیفہ اور تفریح گاہیں۔

۱۰۔ حکومت کے کاروبار میں شرکت۔ انفرادی اقتدار، اعزاز اور وقار

۱۱۔ تحقیق و انکشاف۔ تخلیقی اور تعمیری کام سیر و سیاحت

ان مختلف احتیاجات کو اگر علیحدہ علیحدہ گروہوں میں تقسیم کیا جائے اور ہر احتیاج کی تکمیل کو "آزادی" کے نام سے موسوم کیا جائے تو چار عنوانوں کے ماتحت انہیں درج کیا جا سکتا ہے۔

نمبر ایک سے نمبر سات تک جتنی احتیاجات ہیں ان کی تکمیل کو ہم مادی، جسمانی یا معاشی آزادی کہہ سکتے ہیں۔ نمبر آٹھ اور نو کو اخلاقی، ذہنی، مذہبی اور معاشرتی آزادی نمبر دس کو سیاسی آزادی اور نمبر گیارہ کو تلاش اور جستجو کی آزادی۔

ہنگامی جوش یا کسی مقناطیسی قوت کے زیر اثر، غیر معمولی اور غیر فطری جذبات سے مغلوب ہو کر جسم و ذہن کی بیماری یا طبیعت کی منافقت کی وجہ سے ممکن ہے اور یہ جو ترتیب رکھی گئی ہے اس کا ہمیشہ مشاہدہ کرنا ممکن نہ ہو بعض ایسی ضروریات کو جنھیں میں نے ثانوی اہمیت دی ہے ممکن ہے کہیں کہیں ابتدائی اہمیت دی جاتی ہو اور جنھیں اس فہرست میں مقدم رکھا گیا ہے انھیں مؤخر رکھا جاتا ہو۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ایک سیدھے سادے اوسط درجہ کی ذہنی اور جسمانی تندرستی رکھنے والے آدمی کا ذہن میں موجودہ زمانہ میں اس کی احتیاجات غالباً اسی ترتیب سے آئیں گی جس طرح میں نے بیان کی ہیں۔ اور وہ اپنی مختلف خواہشات کی تکمیل غالباً اسی ترتیب کے ساتھ کرنا چاہے گا۔ کم از کم عقل و خرد اور فطری جذبات کا تقاضا یہی ہوگا کہ وہ ان چیزوں کا مطالبہ اسی ترتیب سے کرے ورنہ اگر وہ جسم کی بھوک رفع کرنے سے پہلے ادب اور فنون لطیفہ کی لذت اور روح کی تسکین حاصل کرنے میں مصروف رہے گا اور ان ذہنی لذتوں کے حصول کے لئے دنیا کے ہنگاموں سے بے تعلق ہو کر ایک گوشہ عافیت میں اپنی دنیا الگ تعمیر کرنا چاہے گا تو وہ اپنی اس حالت بیداری کو زیادہ عرصہ تک نبھا نہ سکے گا اور جلد ہی مادی احتیاجات کی سرد اور تلخ منطق اس سے اس قسم کے متضاد اور مضحکہ خیز افعال سرزد کرائے گی جو بہت جلد لوگوں کی نگاہ میں اسے استہزاء کا سزاوار اور ناپسندیدہ بنا دیں گی اس قسم کے فریب خوردہ اور دھوکہ باز لوگوں سے ہمیں روزانہ واسطہ پڑتا رہتا ہے اور ہر شخص اپنے ذاتی تجربہ سے ایسے گندم نما اور جو فروش لوگوں کی صدہا مثالیں پیش کر سکتا ہے۔

لیکن یہاں غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے میں ایک نکتہ کو واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ میرے مندرجہ بالا بیان میں کہیں یہ فرض نہیں کیا گیا ہے کہ انسان دنیا میں اپنی انفرادی زندگی کو دوسروں سے الگ تھلگ رہ کر بسر کر سکتا ہے۔ بلکہ اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا گیا ہے کہ ہر انسان آدمیوں کے ایک

کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ اُن کے ساتھ رہ کر نشوونما پاتا اور جوان ہوتا ہے اور زندگی کے تمام فرائض اور ذمہ داریوں کو معاشرتی شکل میں ہی انجام دیتا ہے۔ اس کی جماعتی وفاداریاں اور وابستگیاں ہوتی ہیں اور جماعت کے ساتھ ہی وہ اُبھرتا اور گرتا ہے۔ اس کی غذا، لباس اور مکان کی خواہش اور اس کی تمام دوسری احتیاجات جتنی انفرادی ہوتی ہیں کم و بیش اتنی ہی جماعتی بھی ہوتی ہیں گو یہ تناسب مختلف اوقات میں اور مختلف حالات کے زیر اثر بدلتا رہتا ہے۔ جماعتی زندگی میں تقسیم عمل پیدا ہو جانے سے یہ ممکن ہے کہ جماعت کی غذا، لباس اور مکان کی فراہمی کا کام ایک گروہ کرنے لگے اور دوسرا گروہ جماعت کی صرف علمی، جمالی اور روحانی احتیاجات کی تکمیل میں مصروف ہو جائے۔ اور یہ تعاون عمل اور باہمی انحصار کا معاشرتی نظام اس وقت تک ہم آہنگ رہتا ہے جب تک اس میں جسمانی ذہنی اور روحانی ضرورتوں کا توازن قائم رکھا جاتا ہے لہٰذا انفرادی زندگی کی مجرد سادگیوں سے جب ہم اجتماعی زندگی کے پیچ در پیچ تعلقات کی طرف بڑھیں تو اس وقت بھی ہمیں زندگی کی ان بنیادی حقیقتوں کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے، کیوں کہ جماعت بہر حال افراد کا ہی ایک مجموعہ ہوتی ہے بنا بریں احتیاجات کی جو ترتیب میں نے افراد کے لئے مقرر کی ہے میرا خیال ہے کہ وہ جماعت پر بھی منطبق کی جا سکتی ہے اور ہر عقل مند اور تندرست معاشرت کے لئے اس کی پابندی ضروری ہے ورنہ افراد کی طرح جماعت بھی اپنے متضاد اور متبائن اقوال و افعال میں مضحک اور ناپسندیدہ سمجھوتے اور مفاہمتیں کرنے کے لئے مجبور ہو جائے گی۔ جماعت کی ان بیماریوں کی بھی صدہا مثالیں تاریخ سے مل سکتی ہیں۔ لیکن فی الحال میں اپنے مبحث کو پیچیدہ بنانا نہیں چاہتا اور پہلے کی طرح صرف افراد کی زندگی کو ہی اپنا موضوع فرض کئے لیتا ہوں۔

تو اوپر کے بیان سے ظاہر ہوا کہ افراد کی چند احتیاجات ہیں جن کے پورا کرنے سے ان کی زندگی مکمل ہوتی ہے پھر اس تکمیل کے بھی مختلف معیار ہیں جن میں ترقی کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے آج اگر ایک قسم کے کھانے کپڑے اور مکان سے تسکین ہو جاتی ہے تو کل بہتر معیار کے معلوم ہو جانے کے بعد اس کی طرف سے بے اطمینانی پیدا ہو جائے گی اور ہم اپنی احتیاجات کی تکمیل کے لئے اس نئے

معیار کے مطابق چیزوں کو حاصل کرنا چاہیں گے اور جب تک انسانی ذہن میں ایجاد و اختراع، تلاش و جستجو، تنوع پسندی اور جدت طرازی باقی ہے کوئی ایک عام معیار مستقل طور پر کبھی قائم نہ ہو سکے گا، بلکہ معیاروں میں ترقی کا سلسلہ برابر جاری رہے گا۔

انسانی احتیاجات کی ان بنیادی حقیقتوں کو سمجھ لینے کے بعد اب ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ ہندوستان کی آبادی کا کیا حال ہے اور یہاں کتنے ایسے گروہ ہیں جن کی احتیاجات کی تکمیل کمل طور پر ہو جاتی ہے اور کتنے ایسے ہیں جن کی احتیاجات محرومی، وقت، پریشانی اور کمی کے ساتھ پوری ہوتی ہیں۔ اس مقصد کے لئے مندرجہ ذیل فہرست میں چند عنوانوں کے ماتحت ہندوستانی آبادی کے مختلف گروہوں کو جمع کیا گیا ہے فہرست کے آغاز میں جو لوگ ہیں ان کی بیشتر احتیاجات اعلیٰ ترین معیاروں کے مطابق پوری ہو جاتی ہیں۔ جوں جوں ہم فہرست کے نیچے کے عنوانوں کی طرف اترتے ہیں اتنی ہی محرومی اور عدم تسکین ہمیں بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے۔

۱۔ ویسرائے۔ گورنر۔ جماعت عاملہ کے ارکان، وزرا، راجہ مہاراجہ، نواب، کروڑپتی، لکھ پتی۔

۲۔ (الف) حکومت کی اعلیٰ سول اور فوجی افسر

(ب) کلکٹر، ڈپٹی کلکٹر

(ج) پولیس سپرنٹنڈنٹ، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ

(د) فوج کے دوسرے بڑے افسر

(ہ) جج، سب جج

(و) ڈائرکٹر اور ڈپٹی ڈائرکٹر زراعت، صنعت، امداد باہمی، نہر کمشنر، انکم ٹیکس وغیرہ

(ز) اعلیٰ انجنیئر، ماہران سائنس، ماہران فن

(ح) اعلیٰ بیرسٹر اور وکیل

(ط) اعلیٰ ڈاکٹر اور طبیب

(ی) پروفیسر، اعلیٰ ایڈیٹر، جرنلسٹ، مصنف، شاعر، آرٹسٹ، صوفی، مولوی، پنڈت۔

(ک) مرکزی کونسل اور صوبائی کونسل کے ارکان ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل بورڈ کے چیرمین وغیرہ
(ل) بڑے زمیندار، کارخانہ دار، ساہوکار، تاجر اور بنکر
۳۔ (الف) تحصیلدار نائب تحصیلدار -
(ب) انسپکٹر تھانیدار
(ج) فوجی افسر - (د) منصف
(ہ) انسپکٹر زراعت، صنعت امداد باہمی، نہر، وغیرہ
(و) اوسط درجہ کے انجنیئر، ماہران فن
(ز) اوسط درجہ کے وکیل بیرسٹر
(ح) اوسط درجہ کے ڈاکٹر طبیب وید
(ط) اوسط درجہ کے پروفیسر ہیڈ ماسٹر ایڈیٹر مصنف مولوی پنڈت وغیرہ
(ی) آنریری مجسٹریٹ، خطاب یافتہ ممبر میونسپلٹی ڈسٹرکٹ بورڈ
(ک) اوسط درجہ کے زمیندار، کارخانہ دار، ساہوکار، تاجر اور بنکر
(ل) سینیر کلرک
۴۔ (الف) جونیر کلرک
(ب) مدرس مولوی پنڈت جونیر ٹیچر
(ج) منشی پٹواری، عرائض نویس کمپونڈر جراح
(د) ادنیٰ درجہ کے زمیندار، ساہوکار اور تاجر
(ہ) بڑے کاشتکار اور شہر کے ماہر مزدور، کاریگر
(و) پولیس کانسٹبل، فوجی سپاہی، چپراسی، ملّا، موذن، پروہت
۵۔ ادنیٰ کاشتکار، مزدور، قلی، لکڑہارا، پنہارا وغیرہ
۶۔ بھک منگے، گداگر، چور، اٹھائی گیرے، اپاہج، فاترالعقل وغیرہ

[illegible] ۔ سوسائٹی کے یہ مختلف گروہ ہیں۔ ان میں جو لوگ شامل ہیں ان کی احتیاجات کی تکمیل ان کے درجے کی پستی اور بلندی کی مناسبت سے ہوتی ہے: پہلے اور دوسرے گروہ میں وہ لوگ ہیں جنھیں حکومت کا اقتدار، حکومت کی سرپرستی یا حکومت سے وابستگی حاصل ہے یا زمین اور سرمایہ پر جن کے حقوق ملکیت کو حکومت تسلیم کرتی ہے یا جن کی مذہبی اور روایتی اجارہ داری میں حکومت مزاحم نہیں ہوتی بلکہ اسے مستحکم کرتی ہے یہ لوگ عیش و مسرت سے اپنی تمام احتیاجات نہایت فراخدلی کے ساتھ پوری کرتے ہیں۔ عالیشان محل، عالیشان ساز و سامان، زرق برق پوشاکیں، بیش قیمت سواریاں انواع و اقسام کی غذائیں تفریحیں، ذہنی اور روحانی آسودگیاں دنیا اور عاقبت دونوں جگہ کے اطمینان انھیں حاصل ہوتے ہیں۔ تیسرے گروہ میں وہ لوگ ہیں جو اس پہلے گروہ کے برابر خوش قسمت تو نہیں ہیں لیکن پھر بھی آرام و عافیت سے ہیں چوتھے گروہ کی زندگی بہت سخت ہے لیکن پھر بھی جیسے تیسے زندگی گذر ہی جاتی ہے۔ پانچواں گروہ عمل کام کرنے والوں کا ہے جو تمام دوسرے گروہوں کا کمر توڑنے والا بوجھ اپنی پیٹھ پر لادے ہوئے ہے اور جسے خود زندگی کے سکھ چین کا بہت کم حصہ ملتا ہے اور پانچواں گروہ ان بدنصیب لوگوں کا ہے جو زندگی کی تقریباً تمام لذتوں سے محروم ہیں۔

ان بنیادی حقیقتوں کو سامنے رکھ کر اب آئیے ان مختلف گروہوں میں اپنے بھائی بند یعنی ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کو تلاش کریں۔

(باقی)

دنیا کی رفتار

چین و جاپان کے تعلقات چین پر جاپان نے جو جو زیادتیاں کی ہیں ان کی وجہ سے ایک دنیا جاپان سے ناخوش ہے۔ مگر پھر بھی چینیوں جاپانیوں کے تعلقات کا مسئلہ اتنا صاف نہیں جتنا کہ لوگ خیال کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ چونکہ چین کی کمزوری سے دول یورپ بھی فائدہ اٹھانے میں کوتاہی نہیں کرتی تھیں اس لئے جاپان نے جو کچھ کیا اس کو چینی قوم کا ایک حصہ اس قدر برا نہیں سمجھتا جتنا کہ یورپ والے بتاتے ہیں۔ ان دونوں قوموں میں معاشی اور سیاسی تعاون کے امکانات کم سہی مگر مفقود نہیں ہیں۔ غرض ان کے تعلقات کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے معمولی قیاسات سے زیادہ گہری شہادتوں کی ضرورت ہے۔ ہم ذیل میں چین کے ایک مشہور فاضل ڈاکٹر شی کی ایک کھلی چٹھی کا ترجمہ شائع کرتے ہیں جس سے ان تعلقات پر مفید روشنی پڑتی ہے۔ ڈاکٹر شی چین کے نہایت ممتاز اور با اثر اہل علم میں سے ہیں اور اس سلسلہ میں ان کے خیالات بڑی اہمیت رکھتے ہیں :-

اہل جاپان کے نام :- یہ کھلی چٹھی آپ کے ایک ممتاز عالم مسٹر تکا نو لو کی اس درخواست کی تعمیل میں ہے جو کوئی تین مہینے ہوئے انھوں نے کی تھی۔ اس کے لکھنے میں دیر کچھ تو پچھلے مہینوں میں کام کی زیادتی سے ہوئی لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ مجھے شبہ تھا کہ ایسے خط سے کوئی فائدہ بھی ہوگا یا نہیں اس لئے کہ اگر میں آپ کو خوش کرنے کے لئے میٹھی میٹھی باتیں لکھ دوں تو یہ میرے ضمیر کے خلاف ہوگا اور اگر میں ٹھیک ٹھیک اپنی دل کی باتیں کہوں تو اندیشہ ہے کہ آپ انھیں سنیں گے ہی نہیں۔ پھر بھی یہ خط لکھتا ہوں اس لئے کہ حال میں چین و جاپان کے تعلقات اس قدر برے ہو گئے ہیں کہ اب مجھے اسے چھپانے کی تاب نہیں جو میرے دل میں ہے۔

پہلا پیام جو میں آپ کی خدمت میں دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ خدارا چینی جاپانی دوستی کا ذکر فرمانا چھوڑ دیجئے۔ پچھلے چار سال میں میں نے جب کبھی کسی جاپانی کی زبان سے یہ میٹھے لفظ سنے میں

تو مجھے ہمیشہ ایک دکھ سا محسوس ہوا ہے، ویسا ہی دکھ جیسا کہ جاپانی فوج پرستوں کے منہ سے "پدرانہ حکومت" کا لفظ سن کر ہوتا ہے .... ابھی گذشتہ جون میں جاپانی فوجیوں نے چینی حکومت کو مجبور کر کے وہ "اپنے ہمسایہ سے محبت کرو" والا اعلان نکلوایا تھا جس نے جاپان کے خلاف قول و فعل کو ممنوع قرار دے دیا۔ اور سچ ہے کہ اس اعلان نے ایسے قول و فعل کا سدباب بھی کیا۔ لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ کسی حکومت کا اعلان چاہے کتنا ہی سخت ہو لوگوں کے ملی جذبات و خیالات کو نہیں دبا سکتا۔ اور اب کہ ان خیالات و جذبات کو، کہ شدید نفرت کے خیالات ہیں، مناسب طریق پر اظہار کا موقع نہیں، قدرتی بات ہے کہ یہ دلوں میں اور جڑ پکڑیں اور ان کا رنگ پہلے سے زیادہ گہرا ہوتا جائے۔ یہی فطرت انسانی کا معمولی تقاضا ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ جاپانی فوجی اور شہری اس کو کیسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ لہذا میری پہلی التجا یہی ہے کہ اس 'چینی جاپانی دوستی' کا ذکر بند کیجئے، اس وقت تو کام یہ ہے کہ چینی جاپانی دشمنی کو ختم کرنے کی راہ، ڈھونڈی جائے، دوستی کو بڑھانے کا معاملہ تو ابھی ہی نہیں ہے۔ جب تک یہ باہمی نفرت ختم نہ ہوگی دوستی کا تذکرہ بس جاپانیوں کی طرف سے چینیوں کی اہانت ہے اور چینیوں کی طرف سے محض جھوٹی باتیں۔

میرا دوسرا پیغام یہ ہے کہ آپ لوگ ۴۰ کروڑ انسانوں کی نفرت کو بے اعتنائی سے نہ دیکھیں ایک بھڑ کا ڈنک بھی تو زہریلا ہوتا ہے، آپ کے لئے اس کا تصور مشکل نہ ہوگا کہ ۴۰ کروڑ آدمیوں کی نفرت سے آپ کو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے، مجھے یقین ہے کہ آپ لوگ اس میں مجھ سے متفق ہوں گے کہ گذشتہ چار سال میں چینی حکومت اور چینی قوم آپ کے بیجا مطالبات کو پورا کرنے کے لئے برابر دبتے رہے ہیں۔ اور یہ انھوں نے اس لئے کیا ہے کہ وہ آپ کی فوج اور آپ کے سپرٹ کی فضیلت کو تسلیم کرتے ہیں اور انھوں نے اسلحہ کے تصادم کے ہر امکان کو ٹالنے کی کوشش کی تاکہ اس مجبوری کی اطاعت سے انہیں اپنی منتشر قوم کی شیرازہ بندی کا موقع ہاتھ آجائے۔ لیکن آپ کے فوجیوں کی حرکتوں کو صبر سے دیکھتے دیکھتے ہمیں بالآخر اس تکلیف دہ نتیجہ پر پہنچنا پڑا ہے کہ ان فوجیوں کی طرح

کی کوئی حد نہیں ہے۔ منچوریا کافی نہیں ہے، انھیں جیہول بھی چاہئے۔ اس پر بھی بس نہیں، چہار
کے مشرقی حصہ پر حملہ بول دیا۔ اور اب ہوپائی کا وہ علاقہ بھی کافی نہیں جس سے فوجیں ہٹالی گئی
تھیں، شمالی چین کے پانچ صوبوں میں ایک ریاست درکار ہے جو ان کے اشاروں پر ناچے۔ اور
اس طرح رفتہ رفتہ یہ گھن سب جسم کو کھاتے کھاتے چین کے قلب تک پہنچ رہا ہے یہ سچ ہے کہ
ان کی حرص کی حد نہیں مگر شاید انھوں نے اس کا خیال نہیں کیا کہ چینی اطاعت شعاری اور صبر کی بھی
کوئی حد ہوگی۔ اور وہ وقت بھی آسکتا ہے کہ چینی قوم اس توہین اور نفرت سے دیوانی ہو کر ترکی بہ
ترکی جواب دینے پر مجبور ہو جائے ....

مجھے امید ہے کہ آپ اسے مان لیں گے کہ جب دو ملک ایک دوسرے سے جنگ کی ٹھان
لیں تو مضبوط جیتتا ہے اور کمزور ہارتا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہارے ہونے کے دل میں ہمیشہ
نفرت رہے۔ روسی جاپانی جنگ کو پانچ سال گذرے تھے کہ روسی جاپانی دوستی کا معاہدہ ہو گیا۔
چینی جاپانی جنگ کو دس برس نہ گذرے تھے کہ چینیوں نے روسیوں سے جنگ میں جاپانیوں کے
ساتھ ہمدردی کی۔ پرشیا سے شکست کھا کر زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا کہ آسٹریا نے اپنے سابق حریف
سے اتحاد کیا۔ جنگ میں شکست سے نفرت کا پیدا ہونا ضروری نہیں۔ ہاں جب کسی پر بے خبری میں
وار کیا جائے یا ایسی حالت میں کہ وہ مقابلہ، مدافعت کی طاقت نہ رکھتا اس پر ٹوٹ پڑا جائے تو سخت
تلخی پیدا ہوتی ہے یہ وہ پست چیز ہے جو جاپان جیسے ملک کو۔ زنی چاہئے جہاں شجاعت کی
نہایت قدیم روایات موجود ہیں۔

میرا تیسرا پیام یہ ہے کہ آپ اپنے کو اپنے ماضی کے شاندار تحصیلات سے محروم نہ کیجئے
نہ اس عظیم الشان مستقبل سے جو آپ کے سامنے ہے۔ پچھلے ساٹھ برس میں جاپان نے جو کچھ حاصل
کیا اس سے جاپانی قوم ہی کی ایک شاندار تصویر سامنے نہیں آئی بلکہ تاریخ انسانیت کا ایک
بڑا معجزہ بھی۔ جو کوئی ان ساٹھ سال کی جاپانی تاریخ پڑھے گا اس پر حیرت و ہیبت ضرور طاری
ہوگی۔ لیکن آپ کو ایک چینی ضرب المثل یاد دلاؤں جو کام اچھی طرح شروع ہو، لیکن اسی نیک نیتی سے

اسے چلایا نہ جائے تو انجام بخیر نہیں ہوتا ؟ ایک عظیم الشان ملک کے بنانے میں قوم کو بے حساب محنت کرنی پڑتی ہیں پر اسے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کو ایک لمحہ کی جلد بازی یا غفلت کافی ہے۔ میں ماضی کی بڑی سلطنتوں کی مثالیں پیش نہیں کرتا۔ ابھی کوئی دو سو سال کی بات ہے کہ اسپین کوئی نصف کرۂ ارض پر قابض تھا اور دنیا کے ہر گوشہ میں اس کی نو آبادیاں تھیں۔ مگر آج وہ عظیم الشان سلطنت کہاں ہے ؟ .... ان تاریخی مثالوں پر جتنا تدبر کیجیے اتنا ہی اس خیال کو تقویت ہوتی ہے کہ " انجام بخیر" کرنے کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

دنیا میں کسی ملک کا مستقبل اتنا امید افزا نہیں جتنا جاپان کا۔ اس کی ترقی میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ اس کی راہ میں کوئی روک ہے تو بس خود اس کی یہ خواہش کہ اپنے کو تباہ کرے!

میں اقرار کرتا ہوں کہ میں ان لوگوں میں ہوں جن کے نظر میں جاپان کی پچھلی ترقیوں کی بڑی قدر ہے، میرے ذہن میں اس عظیم الشان مستقبل کا تصور ہے جو جاپان کا حصہ ہو سکتا ہے، میری نظر میں جاپانی شہنشاہوں کا لمبا سلسلہ ہے، اس کے باشندوں کی محنت پسندی، کفایت شعاری اور وطن پرستی ہے، اس کی شجاعانہ روایات ہیں، اس کی حسن دوستی ہے، اس کی عالمانہ فضا ہے مجھے اس قوم میں جرمن اور انگریز قوموں کے بہترین صفات کا مجموعہ نظر آتا ہے، اور میری نظر میں جاپان کا مستقبل یہ ہے کہ وہ مشرق کی سب سے معزز و محترم قوم بنے۔ مگر جب جاپان کے نئے سیاسی حالات کو دیکھتا ہوں تو اس مستقبل کی طرف سے بڑے اندیشے پیدا ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھتا ہوں کہ پچھلے ساٹھ برس میں اس کے سیاسی نظام میں جو جمہوری روح ظاہر ہوتی رہی ہے اس کی جگہ دیکھتے دیکھتے چند فوجی ڈکٹیٹروں نے لے لی۔ پھر جس ملک کی ہمیشہ سے یہ شہرت تھی کہ اس میں نظم و ترتیب سیاسی بہت غیر معمولی ہے، وہاں سیاسی انتشار کا ایسا دور دورہ ہے کہ ایک اجنبی حیرت سے سوچتا ہے کہ اس ملک میں سیاسی اقتدار کس کا ہے اور فوجی اقتدار کس کا۔ تیسرے جاپان ہمیشہ سے ایک ملک تھا جس کو لوگ پسند کرتے اور جس کی لوگ عزت کرتے تھے۔ اب اس کو امن عالم کے لئے خطرہ جو نکہ ڈرتے ہیں اور وہ ہر طرف دشمنوں سے گھرا ہوا ہے۔ چوتھی بات یہ کہ جاپانی قوت

نے جو بین الاقوامی صورت حال پیدا کر دی ہے اسے برقرار رکھنے کے لئے اور زیادہ قوت درکار ہے جس کے لئے لازم ہے کہ اسلحہ کو بے حساب بڑھایا جائے۔ جاپان اسلحہ بڑھائے گا تو دوسری دول بھی اس دوڑ میں حصہ لیں گی اور شاید اس دوڑ کا نتیجہ ایک عالمی جنگ ہو کر رہے۔

جاپان کے ہاتھ میں اس قدر وسیع غصب کیا ہوا رقبہ زمیں ہے، چالیس کروڑ انسانوں کی شدید نفرت ہے، خشکی پر ایک طاقتور حریف کا سامنا ہے سمندر میں دو حریفوں کا مقابلہ ہے۔ شاید پہلے کبھی جاپان کو ایسی دانشمندی، تدبر اور دور اندیشی کی ضرورت نہ تھی جتنی کہ آج ہے۔ صراط مستقیم سے ذرا انحراف ہوا اور نہایت سخت نتائج پیدا ہونے کا احتمال ہے جو ساری قوم کو خود کشی کے گڑھے میں دھکیل دیں گے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اپنے ماضی کی قدر کریں گے اور اپنے مستقبل کا بھی پاس رکھیں گے، اور میں یہ اس لئے کہتا ہوں کہ جاپان کی بربادی سے نہ چین کو کچھ خاص فائدہ ہوگا نہ دنیا کو۔

آپ کا مخلص ہوشی

منگولیا ایشیا کا یہ دور افتادہ علاقہ جو چنگیز خاں کی عظیم الشان سلطنت کے باقیات سے ہے اب تک مقابلتہ پر امن سی جگہ تھی۔ چودھویں صدی سے جب اس کے باسیوں کا تسلط چین پر ختم ہوا، یہ ایک خانہ بدوش سا علاقہ ہے جہاں کسی قسم کی ترقی یا حرکت کا پتہ نہیں۔ روسی سلطنت کی قوت اور چین میں منچو خاندان کے اقتدار نے ہجرت کر کے دور دور پہنچنے کے امکانات کم کئے تو ان منگولوں کی خانہ بدوش زندگی میں کچھ تغیر ضرور پیدا ہوا مگر وہ بھی خفیف سا اور یہ یورپ کی نئی ایجادات اور جدید صنعت کے اثرات سے کم و بیش محفوظ ہے۔ چین اور روس سے بہت کچھ الگ تھلگ یوں رہے کہ روس کا جو علاقہ سائبیریا ان سے ملا ہوا تھا وہ آدمیوں سے خالی تھا، چین کے اور ان کے درمیان صحرائے گوبی حائل تھا۔ دنیا سے کچھ تعلق تھا تو ان تجارتی کاروانوں کے ذریعہ جن کے ہاتھوں پہلے مشرق اور مغرب کی تجارت کے فرائض سرانجام پاتے تھے۔ مگر جب سے دوسرے ملکوں کو ریل اور جہاز کی سہولتیں ملیں یہ تعلق بھی ختم ہو گیا۔

انیسویں صدی میں جب روس نے مشرق کی طرف بڑھنا شروع کیا تو منگولیا سے تجارتی تعلقات بڑھے کیونکہ روس اور چین کی باہمی تجارت بہت کچھ منگولوں کی معرفت ہونے لگی۔ عرصہ تک روس اور منگولیا کی سرحد پر کیاختا نامی مقام اس تجارت کا مرکز رہا۔ روسی تجارتی کارروانوں کی حفاظت منگولوں کے سپرد رہی اور اس طرح خاصے خوشگوار تعلقات قایم ہو گئے۔ ان تعلقات کو قانونی حیثیت اس معاہدہ میں مل گئی جو ۱۸۶۰ء میں چین اور روس میں ہوا۔ اس لئے کہ منگولیا قانوناً چین ہی کا صوبہ تھا۔ مگر چین کا تسلط کچھ ایسا کمزور تھا کہ جب کبھی منگولیا کے سردار چین کے منچو حکمرانوں سے ناخوش ہوتے تو روس سے براہ راست معاملہ کرنے میں ذرا تامل نہ کرتے۔ اسی سے بیرونی منگولیا اور اندرونی منگولیا کا وہ فرق پیدا ہوا جس سے موخرالذکر پر تو چینی تسلط پورا پورا تھا، مگر اول الذکر پر بس برائے نام۔ چنانچہ جب چین نے اپنے اقتدار کو ذرا بڑھانے کی کوشش کی تو منگولوں نے ۱۹۱۱ء میں براہ راست روس سے مدد چاہی۔ اسی سال چین میں انقلاب ہو گیا تو انھوں نے چینی جوا اتار پھینکا اور اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ نئی ریاست کو روس نے جھٹ تسلیم کر لیا اور ۱۹۱۲ء میں اس سے ایک مستقل عہد نامہ بھی کر لیا۔ منگولیا سے یہ عہد نامہ دراصل اس پرانے منصوبہ کا ایک جزو تھا جسے روسی جاپانی جنگ نے ۱۹۰۵ء میں روک دیا تھا۔

اس جنگ کی کامیابی کے بعد سے جاپان کی نظریں بھی منگولیا کی طرف ہیں۔ شروع ہی میں روس سے تصادم کا ڈر تھا اس لئے دونوں ملکوں نے ۱۹۰۷ء میں ایک معاہدہ کر کے اپنے اپنے 'حقوق' کا تعین کر لیا تھا۔ پھر ۱۹۱۰ء میں ایک اور معاہدہ ہوا تھا کہ دونوں ملک ایک دوسرے کے 'حقوق' کا احترام کریں گے۔ اس معاہدہ میں 'حقوق' منچوریا اور منگولیا (بیرونی) تک محدود تھے، جب ۱۹۱۲ء میں ایک اور معاہدہ ہوا تو اس میں اندرونی منگولیا بھی شامل کر لیا گیا اور قرار یہ پایا کہ پیکنگ کے طول البلد سے مشرق کو جو علاقہ ہے وہ جاپان کے حلقہ اثر میں ہے، مغرب والا حصہ روس کے۔

روس جب جنگ عظیم میں شریک ہوا تو چینیوں کو موقع ملا۔ انھوں نے چاہا کہ منگولیا کو پھر اپنا صوبہ بنائیں اور اگر اس کی خود مختاری کو ختم نہ کر سکیں تو کم ضرور کریں۔ اندرونی منگولیا میں تو چینی

بڑی کثرت سے جا بجا کیسے بھی مگر بیرونی میں قدم نہ جم سکے۔ جب روس میں انقلاب ہوا تو چین نے ۱۹۱۹ء میں بیرونی منگولیا کو ایک فوجی مشن بھیجا جس کا مقصد اسے پھر سے چینی صوبہ بنا لینا تھا جاپان جو اس وقت انقلابی روس کو زک دینا چاہتا تھا اس میں چینیوں کو شہ دے رہا تھا۔ چنانچہ چینی جنرل شو شنگ سے بلا کسی مزاحمت کے وہاں قدم جما لئے، ارگا میں بدھ مذہب کے سردار کو قید کر لیا اور وہ اندھیر شروع کیا کہ الامان۔ اس کا خاتمہ بیرن اسٹر نبرگ نے کیا جو روس کی انقلابی فوج سے بھاگ کر یہاں وارد ہوئے تھے۔ انھوں نے چینی جنرل کو بھی ظلم و زیادتی میں مات کر دیا اور بالآخر ان کے جور و ستم سے منگولیا کو اس وقت نجات ملی جب روس کی انقلابی فوج نے ان کا خاتمہ کر ڈالا۔

روسیوں نے یہاں ایک انقلابی حکومت قائم کی مگر آغاز کار کی دشواریوں کو دانشمندی سے خوب سمجھا۔ بدھ مذہب کے بڑے پیشوا کو رہا کر کے اس حکومت کا صدر بنایا، غربا کو حکومت کے معاملات میں حق رائے دہی بخشا اور اپنی ساری فوجیں ہٹا لیں۔ جب مذہبی پیشوا صاحب نے دنیا سے کنارہ کیا تو پھر ان کی جگہ پر نہیں کی گئی اور ۱۹۲۴ء میں ایک نئے دستور سیاسی کا اعلان ہوا جس کو منگول اپنی خود مختاری کا صداقت نامہ جانتے ہیں۔ لیکن اسی سال چین اور روس میں ایک معاہدہ ہوا جس میں درج ہے کہ روس بیرونی منگولیا کو جمہوریہ چین کا حصہ تسلیم کرتا ہے اور ہمیشہ اس پر چینی اقتدار کا احترام کرتا رہے گا! لیکن منگولیوں نے کبھی اس حیثیت کو تسلیم نہیں کیا اور عملاً ان کا نہایت گہرا علاقہ صرف روسیوں سے رہا ہے۔

اس عرصہ میں جاپان بھی خاموش نہ تھا یوں تو اس کی نظر ۱۹۰۳ء سے منگولیا پر تھی۔ مگر اسی منچوریا میں جاپانی اقتدار کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ منگولیا کا معاملہ ان کے لئے زیادہ اہم ہو گیا۔ یہاں چینیوں کو اکسا کر خونریزی کرائی گئی، پھر کام نکل گیا تو انھیں چھوڑ دیا۔ اندرونی منگولیا والوں کو اسلحہ بہم پہنچا کر چینیوں کے خلاف بغاوت کرائی اور جب یہ چینی ان کے مطالبات کو ماننے لگے تو ساتھ چھوڑ کر ان منگولوں کو پٹوا دیا (۱۹۳۶ء میں برگا قبیلہ کی بغاوت!) ادھر منچوریا میں فوجی کارروائیاں شروع ہوئیں۔

ادھر منگولیا میں اپنی علیحدہ ریاست بنانے کی تحریک جاپانی روپیہ سے شروع ہوئی۔ پھر منچوریا پر تسلط پاتے ہی اس کے اندر ایک خودمختار منگول ریاست بھی بنائی گئی تاکہ منگول جاپان کی طرف کھنچیں۔ رشوت دے دے کر ان کے سرداروں اور امیروں کو اور ان کے مذہبی پیشواؤں کو ملایا۔ انھیں اسلحہ پہنچائے۔ چین کے خلاف بھڑکانے کے لئے قومی آزادی کا انجھر چلایا۔ جب موقع ملا تو اس علاقہ کے چینی جنرلوں کو اکسا دیا۔ اور رفتہ رفتہ اندرونی منگولیا کے بڑے حصہ پر خود قابض ہو گئے۔ جو حصہ ان کے قبضہ میں نہیں آیا ہے اس کا سودا بھی شاید جلد ہو جائے گا۔ اس لئے کہ شہزادہ "تے" جنھوں نے ۱۹۳۳ء میں نانکنگ کی چینی حکومت سے اس علاقہ کے لئے ایک خودمختار سیاسی جمعیۃ کی منظوری حاصل کر لی تھی، ہوشیار آدمی ہیں۔ حال ہی میں شناان کا آنا جانا منچوریا میں بھی رہا ہے اور یہ اپنے صدر مقام کو بدل کر جاپانی اقتدار والے علاقہ کے قریب لے جانے کی فکر میں ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوا کا رخ کدھر کو ہے

امیر امرا پجاری اگر جاپان کی طرف جھک رہے ہیں تو غریب اور نادار روس کی طرف ہیں۔ ان غریبوں کو وطن فروشی کے سارے سودے میں کوئی حصہ نہیں ملا ہے۔ اس لئے وہ روس کی مدد سے جاپانی اقدام کی راہ میں حائل ہیں۔ رفتہ رفتہ معاملات یہاں تک بڑھ گئے ہیں کہ منگولیا کے مسئلہ پر روس اور جاپان میں جنگ تک کا اندیشہ بعید از قیاس نہیں رہا ہے۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ جاپان اور روس کی سیاست میں جو بے شمار تضاد ہیں جن سے کسی وقت ان میں ٹکر ہو جانے کا امکان ہے اس میں منگولیا کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اگر منگولیا جاپان کے زیر اثر آ جائے تو روس کے لئے جاپان کے مقابلہ میں لشکر کشی کی مشکلیں بہت بڑھ جائیں۔ ایک تو منگولیا میں مویشی اور اون ہوتا ہے جس کی ضرورت جاپانی صنعت کو ہے۔ اس کے علاوہ معدنی ذخائر بھی بہت ہیں۔ پھر یہ جاپانی مال کی منڈی بھی بن سکتا ہے، مگر سب سے زیادہ بڑی بات اس کی فوجی اہمیت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جاپانی فوجوں کے لئے منگولیا کی طرف سے روس پر حملہ کرنے میں زیادہ سہولت ہوگی۔ اور بعض فوجی مبصر تو یہ پیشنگوئی بھی کر رہے ہیں کہ روس اور جاپان کی فوجوں کے فیصلہ کن معرکے جھیل بیکال کے علاقہ میں ہونگے۔ اس کے علاوہ چین کی اشتراکی فوجوں کے مقابلہ کے لئے بھی منگولیا سے نہایت موثر کارروائی ممکن ہے۔ بہرحال گمان یہ ہے کہ منگولیا کی خبریں اس

بازے میں خدا زیادہ سننے میں آ رہی گی - ان کے سمجھنے کے لئے شاید اوپر بیان کی ہوئی تفصیلات سے مدد ملے۔

وسائل معاشی حبش پر اٹلی کا حملہ، چین میں جاپان کی دست درازی، یورپ میں جرمنی کی بے چینی ان سب نے دنیا میں جہاں غم و غصہ کو حرکت دی ہے وہاں غیر جذباتی لوگوں کو اس بنیادی سوال کی طرف بھی متوجہ کیا ہے جو ان کی تہ میں کارگر ہے۔ اور وہ سوال یہ ہے کہ کیا دنیا کے وسائل معاشی کی تقسیم اس طرح غیر مساوی رہ سکتی ہے یا نہیں جیسی کہ آج ہے۔ اور سمجھدار لوگ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس کا جاری رکھنا زیادہ عرصہ تک ممکن نہ ہوگا اور نو آبادیوں پر قبضہ کرکے ان کے معاشی وسائل کو کسی خاص ملک کے لئے وقف کر دینے سے کام نہ چلے گا، اب نو آبادیوں میں سیاسی اقتدار کسی کا ہو ضرورت اس کی ہے کہ معاشی وسائل کی پہلے سے زیادہ مساویانہ تقسیم ہو۔ اس تقسیم کے امکانات اور اس کی تفصیلات پر غالباً سب بڑی حکومتیں آج کل غور کر رہی ہیں اور کچھ عرصہ ہوا صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کے سابق گورنر سر ہیلی کے افریقہ میں کسی اہم کام پر جانے کی جو اطلاع شایع ہوئی تھی اس کا مطلب غالباً یہی تھا کہ انگلستان نے اپنے ایک نہایت قابل سویلین کو اس اہم مسئلہ کو تفصیلی تحقیق کے لئے مقرر کیا ہے۔ گذشتہ ستمبر میں جمعیۃ اقوام کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے سر سیموئل ہور نے بھی صاف صاف کہا تھا کہ "اگر جنگ کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنا ہے تو اس کے معاشی اسباب کو رفع کرنا ہوگا" اور اس سلسلہ میں انھوں نے اس ملک کی طرف سے جس کے ہاتھ میں دنیا کے سب سے زیادہ وسائل ہیں اور جو دنیا کی سب سے بڑی تجارتی قوت ہے یہ امید دلائی تھی کہ اگر نو آبادیوں کے وسائل کی از سر نو تقسیم کے لئے کوئی بین الاقوامی تحقیقات شروع کی جائے تو اس میں برطانیہ دل سے ساتھ دے گا۔

ابھی یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ معاشی وسائل تک سب کو مساوی دسترس کس طرح دی جا سکے گی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے تو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ امن کے زمانہ میں یہ دسترس حاصل ہی ہوتی ہے، اور بقول سر سیموئل ہور "بھلا ایسی کون نو آبادی ہے کہ کسی خریدار کے ہاتھ اپنا مال بیچنے سے انکار کرے"

بلکہ آج کل تو وقت یہ ہے کہ مال اچھی قیمت پر بک نہیں سکتا" اور جب جنگ شروع ہو جائے تو اس وقت محض نوآبادیوں کا ہاتھ میں ہونا یا معاہدوں کی رو سے کسی نوآبادی سے کوئی خام جنس حاصل کرنے کا حق ایک بے معنی سی چیز ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لئے کہ اگر اس ملک کے پاس ساری جہان کی نوآبادیاں ہوں پر ان تک پہنچنے کے وسائل نہ ہوں تو یہ سب بیکار ہونگی۔ آخر گذشتہ جنگ میں جرمنی کی نوآبادیوں کے معاشی وسائل اس کے کس کام آئے۔ اور اگر سمندر کے راستوں پر قبضہ ہو اور ہر غیر جانبدار ملک تک بے روک ٹوک پہنچنے کا موقع ہو تو پھر جنگ کے زمانہ میں بھی، کہ قیمتوں کا مسئلہ اتنا اہم نہیں رہتا، وہ ملک جو اجناس خام چاہتا ہے حاصل کر سکتا ہے۔ جیسا کہ گذشتہ جنگ کے زمانہ میں برطانیہ نے کیا۔ گویا معاشی وسائل کا مسئلہ بھی بالآخر بری، بحری، اور ہوائی قوت کا مسئلہ ہے۔

البتہ امن کے زمانہ میں یہ سمجھنا کہ کوئی نوآبادی اپنا مال بیچنے سے انکار نہ کرے گی، جیسا کہ سر سیمول ہور نے بیان فرمایا تھا ذرا صاف نہیں ہے۔ بیشک امن کے زمانہ میں نوآبادیاں سب ہی کے ہاتھ اپنا مال بیچتی ہیں اور سب کے ہاتھ کم و بیش ایک ہی دام پر بیچتی ہیں۔ مگر آج بھی تو دنیا میں منجملہ اور چیزوں کے ربڑ، تانبے اور ٹین کی پیداوار پر مصنوعی پابندیاں عاید کر کے ان کی قیمت کو بڑھایا گیا ہے۔ آپ کہیں گے کہ وہ تو سب کے لئے بڑھایا ہے۔ یہ تو نہیں کہ جرمنی کو ان چیزوں کے دام زیادہ دینے پڑتے ہوں اور برطانیہ کو کم، دام زیادہ ہیں تو سب کے لئے ہیں۔ مگر ذرا سا فرق ہے۔ وہ یہ کہ برطانیہ نے ان چیزوں کی فراہمی کے کاروبار میں بھی تو بے شمار سرمایہ لگا رکھا ہے۔ اسے اگر قیمت وہی دینی ہوتی ہے جو جرمنی کو تو قیمت کی زیادتی سے اس سرمایہ پر تو بہت زیادہ منافع ملتا ہے۔

یہی نہیں۔ برطانیہ کو ان ممالک میں جہاں ان صنعتوں میں اس کا سرمایہ لگا ہے اپنا مال بیچنے میں بھی تو سہولت ہوتی ہے۔ اس لئے یہی کافی نہیں کہ یہ نوآبادیاں بلا امتیاز سب کے ہاتھ اپنا مال بیچنے کو تیار ہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ دوسروں کو وہاں مال بیچنے کی بھی یکساں سہولتیں حاصل ہوں۔ ان کا مال خریدنے والے ان سے اس لئے مال خرید نہیں سکتے کہ ان کے ہاتھ بیچ نہیں سکتے ہیں۔

اتنا دوسرا خیال یہ ہے کہ اگر خام اجناس کے وسائل کی کوئی نئی تقسیم کی جائے گی تو اس کے ساتھ محاصل کی ان دیواروں کو بھی توڑنا پڑے گا جو مختلف ممالک نے اپنے گرد اٹھا رکھی ہیں انگلستان کے مشہور سیاسی رسالہ راؤنڈ ٹیبل نے اپنی مارچ کی اشاعت میں اس مسئلہ پر صحیح لکھا ہے کہ " ہم دیانت داری سے نوآبادیوں کے وسائل خام پر دسترس کا مسئلہ اس وقت تک نہیں اٹھا سکتے جب تک ہم اپنی سلطنت کی نوآبادیوں میں شاہی ترجیح کے مسئلہ کو چھیڑنے پر تیار نہ ہوں۔ .... وہ رجحان ذہنی جو نوآبادیوں کو " اپنی منڈی " سمجھتا ہے اسے آپ نوآبادیوں کے امین ہونے کی حیثیت سے نہیں ملا سکتے۔ نہ اس کا میل بین الاقوامی جھگڑوں کو جڑ سے مٹانے کی اس مخلصانہ کوشش سے ہو سکتا ہے جو غیر مطمئن دول کی جائز شکایات کو رفع کرنا چاہتی ہے ..... جہاں تک ماتحت علاقوں کا تعلق ہے سب کو خام وسائل پر دسترس دینے کا تقاضا تو یہ ہے کہ تجارت کا دروازہ نوآبادیوں میں سب پر یکساں کھلا ہو "

چند اعداد | اس سلسلہ میں مارچ ۳۶ء کے کرنٹ ہسٹری (نیویارک) کے ایک مضمون " جنگ اور آبادی " سے ذیل کا اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

کرہ ارض کا کل رقبہ ۱۹ کروڑ ۳۰ لاکھ مربع میل ہے۔ جس میں ۷۲ فی صدی سمندر ہے، اور ۲۸ فی صدی یعنی کوئی ۵½ کروڑ مربع میل خشکی۔ اس رقبہ میں بھی جھیل اور دریا اور ریگستان شامل ہیں یعنی آدمیوں کے بسنے کے لئے اس سے بھی کم رقبہ ہے دنیا کی آبادی کا تخمینہ ہے کوئی ۲ ارب ۷ کروڑ ۳۰ لاکھ نفوس۔ یعنی ایک مربع میل پر کوئی ۴۰ آدمی۔ مختلف براعظموں کا حال اس حیثیت سے جدا جدا ہے مثلاً یورپ سب سے گھنا آباد ہے اس میں ایک مربع میل پر حساب سے ۹۲ آدمی آتے ہیں، اس کے بعد ایشیا میں ایک مربع میل پر ۷۶ کا حساب پھیلتا۔ دوسرے براعظم اس سے پیچھے ہیں۔ شمالی امریکہ میں فی مربع میل ۱۹ — ۲۰ آدمی بستے ہیں، افریقہ اور جنوبی امریکہ میں ۱۲ آدمی فی مربع میل۔ اور آسٹریلیا اور اوشیانا میں ۳ شخص فی مربع میل۔

ملکوں کا حال ذیل کے اعداد سے ظاہر ہوگا:۔

ملک	اشخاص فی میل مربع	ملک	اشخاص فی میل مربع
بلجیم	۷۰۰	ہنگری	۲۴۱
انگلستان وویلز	۶۸۴	پولینڈ	۲۲۱
نیدرلینڈ	۶۵۹	ڈنمارک	۲۲
جاپان	۴۴۹	آسٹریا	۲۰۸
جرمنی	۳۶۳	فرانس	۱۹۶
اٹلی	۳۵۶	ہندوستان	۱۹۵
چین	۲۹۹	پرتگال	۱۹۲
چیکوسلاویا	۲۷۱	بلغاریہ	۱۵۲
سوستان	۲۵۵	یوگوسلاویہ	۱۴۵

ذیل کے نقشوں سے دنیا کی ۹ سلطنتوں کے رقبہ اور آبادی، اور حکمراں ملک کے رقبہ اور آبادی کے تناسب روشن ہو جائیں گے:۔

نقشہ ۱

سلطنتوں کا رقبہ اور آبادی

سلطنت	دنیا کے رقبہ کا فیصد	دنیا کی آبادی کا فیصد کس قدر	آبادی فی مربع میل
۱ برطانوی	۲۵ / ۲	۲۴ / ۹	۳۸ / ۱
۲۔ روس	۱۵ / ۹	۸	۲۰ / ۱
۳۔ فرانس	۸ / ۹	۵	۲۲ / ۷

۴ - امریکہ	۷٫۲	۶٫۶	۳۶٫۹
۵ - اطالوی	۱٫۹	۲٫۱	۴۵٫۳
۶ - بلجیم	۱٫۸	٫۸۵	۱۹٫۱
۷ - پرتگیزی	۱٫۶	٫۷۶	۱۸٫۵
۸ - ولندیزی	۱٫۵	۳٫۳۴	۸۶٫۵
۹ - جاپانی	۱٫۴	۶٫۲۶	۱۷۹٫۴

نقشہ ۲

حکمراں ملکوں کا رقبہ اور آبادی

کسی سلطنت پر حکمراں ملک	اس کا رقبہ دنیا کے رقبہ کا کس قدر ہے	اس کی آبادی دنیا کی آبادی کا کس قدر ہے	آبادی فی مربع میل
بلجیم	٫۰۲۳	٫۴	۷۷۰٫۵
نیوزلینڈ	٫۰۲۴	٫۴	۶۵۹٫۱
انگلستان، ویلز و اسکاٹستان	٫۱۷	۲٫۱۷	۵۰۵٫۸
جاپان	٫۲۹	۳٫۲۹	۴۶۲٫۱
اٹلی	٫۲۳	۲٫۰۵	۳۵۶
فرانس	٫۴۱	۲٫۰۲	۱۹۶٫۸
پرتگال	٫۰۶۹	٫۳۳	۱۹۳٫۳
ریاستہائے متحدہ امریکہ	۵٫۸۵	۵٫۹۲	۴۰٫۶
یورپی روس	۶٫۷۹	۶٫۴۵	۲۸٫۱

جنگ کے امکانات کو سمجھنا ہو تو ان نقشوں کا غور سے مطالعہ کیجئے۔ دنیا کی ۹ قومیں جن کی اپنی آبادی دنیا کی آبادی میں بقدر ۲۳ فیصد ہے اور جو ربع مسکوں میں ۱۴ فیصدی زمین پر بستے ہیں، یہ نو قومیں دنیا کی ساری زمین میں ۶۰ فیصد پر قابض اور دنیا کی آبادی میں ۵۰ فیصدی قسمتوں کی مالک ہیں۔ اور اس میں سے روس اور امریکہ کو چھوڑ دیجئے تو باقی ۷ قومیں جن کی آبادی دنیا کی آبادی میں صرف ۱۱ فیصد ہے اور جو دنیا کی زمین کے صرف ۱/۲ ۱ فیصد حصہ پر بستی ہیں وہ دنیا کی ۴۴ فیصد زمین اور اسی قدر انسانوں پر مسلط ہیں۔

پہلے نقشہ میں یہ بات اور دیکھنے کی ہے کہ پہلی چار سلطنتوں کے پاس ابھی دنیا کی آبادی کے مقابلہ میں دنیا کا رقبہ زیادہ ہے۔ یعنی یہ چار سلطنتیں ربع مسکوں کے ۵۰ فیصد پر قابض ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جاپان، جرمنی اور اٹلی اس لوٹ میں اپنا "حق" جتانے میں کبھی کبھی آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔

جرمن مالیات | جرمنی کی مالی دشواریوں کو قرضہ اور اعتبار کی چالاکیوں سے رفع کرنے کی جو حیرت انگیز تدبیریں ڈاکٹر شاخت نے کی ہیں ان کا خیال کر کے اگر انھیں مالیات کا بازیگر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ذیل میں ہم ایک جرمن رسالہ سے ایک چھوٹا سا لطیفہ نقل کرتے ہیں جس سے اس بازیگری پر ان جرمنوں کی رائے ظاہر ہوتی ہے جو اس وقت جلاوطن ہیں۔ جرمن رسالہ Das neue Tage - Buch سے یہ اقتباس لیا گیا ہے:-

اعلیٰ ریاضیات

پانچ جرمن وزیر، گوئرنگ، گوئبلز، بلوم برگ، دارے، اور ہس ڈاکٹر شاخت کے دفتر میں آتے ہیں۔ ان سب کو بیرونی زر مبادلہ کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر شاخت بتلاتے ہیں کہ سرکاری بنک کے پاس سب لے دے کر کل ۲۰ ملین مبادلہ خارجہ کے لئے باقی ہیں۔ مگر یہ پانچوں وزیر کہتے ہیں کہ

یعنی ہر ایک کو ۱۵ - ۱۵ میں درکار ہیں۔ جیسے بھی ہو دلوا دیجیے۔ ڈاکٹر شاخت کا غذ کا ایک پُرزہ لیتے ہیں اور اس پر لکھتے ہیں۔

۱۵ + ۱۵ + ۱۵ + ۱۵ + ۱۵

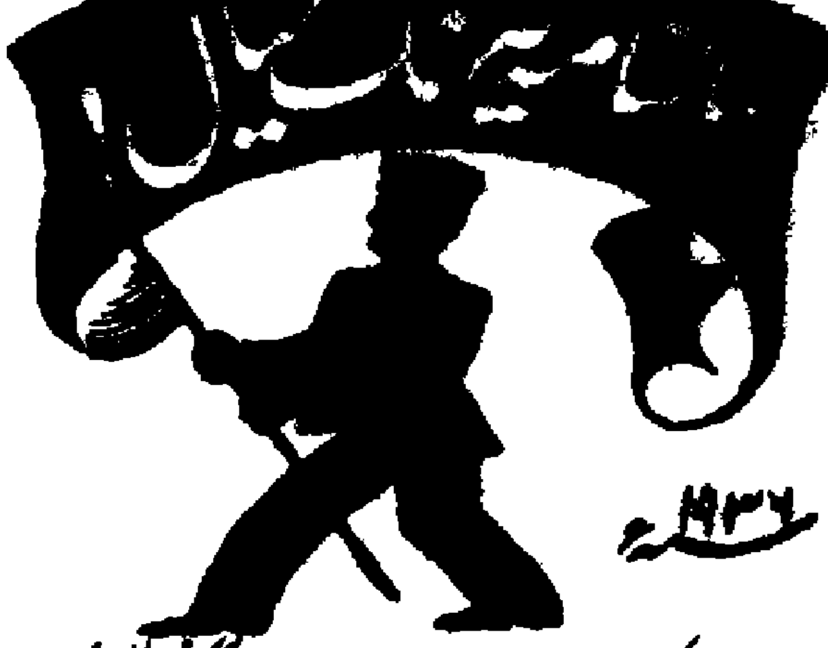
کچھ دیر سوچتے ہیں اور یکایک بول اٹھتے ہیں " بہت اچھا، بہت اچھا۔ صاحبان من بہت اچھا، ایک صورت نکل آئی۔ آپ کو، ہر ایک کو ۱۵ - ۱۵ میں مل جائیں گے۔"

" یہ تو یوں ظاہر ہے کہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ۴۰ میں ہی سب کا کام کیسے نکل جائیگا۔

تو ڈاکٹر شاخت انہیں سمجھاتے ہیں۔ فرماتے ہیں " دیکھئے۔ پہلے سیدھے ہاتھ کا ہندسہ لیجئے ۵ + ۵ + ۵ + ۵ + ۵ یہ ہوئے ۲۵ ۔ اب الٹے ہاتھ والا ہندسہ جوڑیے ۱ + ۱ + ۱ + ۱ + ۱، یہ ہوئے ۵ ۔ ۲۵ اور ۵ مل کر ہوئے ۳۰ ۔

سب وزیر تعجب سے چلّا اٹھے ۔ " مگر ڈاکٹر شاخت کہیں ایسے بھی ہندسے جوڑے جاتے ہیں۔ یوں جمع نہیں کر سکتے "

ڈاکٹر شاخت مسکرائے اور بولے " نہیں کر سکتا کی آپ نے ایک کہی۔ میں ڈھائی برس سے اسی طرح جمع کرتا ہوں ۔ بار ہا کردم ـــــ وشد !"



پبلک کی متفقہ رائے ہے کہ سالنامہ تو اس دفعہ صرف نیرنگ خیال کا شایع ہوا ہے

مضامین ۔ سائز ۔ حجم ۔ ظاہری شان ۔ تصاویر

ہر لحاظ سے بے مثل پرچہ ہے

سالنامہ نیرنگ خیال ۱۰۰۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے ۔ جس میں ہندوستان بھر کے سب سے مشہور چالیس ادیبوں کے مضامین درج ہیں ۔ ایک ہزار صفحہ کی کتابوں سے زیادہ مضامین اس میں جمع کئے گئے ہیں

۱۲ رنگین اور پچاس یک رنگ بلاکس اس کے علاوہ ہیں نیرنگ خیال کا یہ سالنامہ سالہا سال تک یاد رہے گا ۔ عہ قیمت اور ۸ محصول فیس منی آرڈر میں فی الفور خرید لیجئے

مفت

حاصل کرنے کیلئے عہ کا منی آرڈر کر دیجئے تاکہ یہی سالنامہ سے آپ کو نیرنگ خیال کا مستقل خریدار بنا لیا جائے سال بھر میں ایک ہزار صفحات اور دو سو تصویریں نیرنگ خیال میں چھپتی ہیں ہندوستان بھر کے بہترین اہل علم صرف نیرنگ خیال میں مضامین لکھتے ہیں

نیرنگ خیال ہندوستان بھر کے علمی ادبی رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے کیونکہ ہر پڑھے لکھے گھر میں نیرنگ خیال منگوایا جاتا ہے ۔ آپ بھی آج ہی جاری کرا لیجئے۔

منیجر نیرنگ خیال ۳ بیڈن روڈ لاہور

ہماری متعدد فہرستیں

مکتبہ جامعہ نے اپنے زبردست ذخیرے کی فہرستیں ایک خاص نوعیت سے علحدہ علحدہ شائع کی ہیں۔ جو حضرات جس خاص مضمون یا شعبہ سے دلچسپی رکھتے ہوں از راہ کرم مطلع فرمائیں۔ مطلوبہ فہرست فوراً حاضر کی جائے گی۔ چند فہرستوں کے نام درج ذیل ہیں:۔

(۱) مطبوعات جامعہ۔ جامعہ کی شائع کردہ اور سول ایجنسی کی کتابوں کی مکمل فہرست۔

(۲) ناشرین اُردو۔ جامعہ کے علاوہ اُردو کتابوں کے تمام ناشرین کی فہرستوں کا مجموعہ۔

(۳) مصنفین اُردو۔ مشہور مصنفین، مترجمین و مؤلفین اُردو کی کتابوں کی فہرست

(۴) بچوں کی کتابیں۔ بچوں کے لئے اُردو کی کتابوں کی بہترین فہرست

(۵) عورتوں کی کتابیں۔ عورتوں اور بچیوں کے لئے پسندیدہ کتابیں

(۶) مختصر فہرست کتب۔ اُردو کی تقریباً ایک ہزار مشہور کتابوں کی فہرست

(۷) ادبی کتابیں۔ تاریخ و تنقید ادب مقالات و انشاء، ناول، افسانہ، نظم، ڈراما، مکاتیب، ظرافت وغیرہ پر اُردو کتابوں کی مکمل فہرست۔

نوٹ

تاریخی کتابیں۔ مذہبی کتابیں اور اسی طرح کے دوسرے مضامین پر علیحدہ علیحدہ فہرستیں بھی زیر ترتیب ہیں عنقریب شائع ہونگی

جامعہ

اردو اکادمی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

کا

ماہوار رسالہ

زیر ادارت

ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ایم اے، پی ایچ ڈی

پروفیسر محمد عاقل ایم اے

قیمت سالانہ عہ   مطبع جامعہ دہلی   فی پرچہ ۸ر

اُردو اکادمی
جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

مندرجہ ذیل کتابیں حال ہی میں شائع ہوئی ہیں۔ اراکین اردو اکادمی اپنے حساب میں طلب فرما سکتے ہیں:۔

ترجمان القرآن (جلد دوم) از مولانا ابو الکلام صاحب آزاد
قیمت بلاجلد ے ۔ مجلد عہ

مختصر تاریخ ہند ۔ از سید ابو ظفر صاحب ندوی۔ شائع کردہ دارالمصنفین اعظم گڈھ
قیمت عہ

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں ۔ از مولوی ابو الحسنات صاحب ندوی مرحوم
شائع کردہ دارالمصنفین اعظم گڈھ۔
قیمت ۱۲ر

مقالاتِ شبلی جلد پنجم ۔ (تاریخی) شائع کردہ دارالمصنفین اعظم گڈھ۔
قیمت عہ

انقلاب روس ۔ از کشن پرشاد صاحب کول۔ شائع کردہ ۔ ہندوستانی اکیڈمی ۔ الہ آباد
قیمت ے

جوشِ فکر ۔ مجموعہ مضامین سید سلطان حیدر صاحب جوش
قیمت عہ

مکتبہ جامعہ دہلی

بسم اللہ

جامعہ

مدیران
ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی
پروفیسر محمد عاقل ایم اے

جلد ۲۶ | مئی سنہ ۱۹۳۶ء | نمبر ۵

فہرست مضامین

پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

ڈاکٹر انصاری اور ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان

(ڈاکٹر انصاری مرحوم ہم سے جدا ہو گئے ہیں لیکن ان کے خیالات اور کارنامے زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ۱۹۲۰ء میں دکن ہندی پرچارنی سبھا کا جو اجلاس میسور میں ہوا تھا اس کے ڈاکٹر انصاری مرحوم صدر منتخب کئے گئے تھے اپنے خطبۂ صدارت میں آپ نے ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان کے بارے میں اپنے جن خیالات کا اظہار فرمایا تھا وہ آج بھی اتنے ہی سبق آموز ہیں جتنے اس وقت تھے۔ اس خطبہ کا اصل مسودہ انگریزی زبان میں ہمیں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی عنایت سے مل گیا جس کے ضروری حصوں کا اقتباس ہم ذیل میں درج کر رہے ہیں۔)

ہندوستان کی قومی زبان کے بارے میں دو سوال ہیں جن کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کراؤں گا ——— زبان کی شکل اور رسم خط کی صورت۔ پہلے زبان کی شکل کو لیجئے۔

ہمیں اس بات کو مان لینا چاہیئے کہ عام طور پر زبان دو ہی باتوں کا اظہار کر سکتی ہے یا تو مادی ضرورتوں کی خبر دینے کے لئے خیالات کو ایک شخص سے دوسرے شخص تک پہنچاتی ہے یا نہایت گہرائیوں میں چھپے ہوئے جذبات کو غیر اختیاری طور پر ظاہر کرتی ہے۔ زبانوں کے اس افادی اور رومانی تحلیل کو تسلیم کرنے کے بعد ہمیں یہ بھی ماننا ہوگا کہ ایک مشترکہ قومی زبان کو اپنے مقصد کی نوعیت کی بنا پر الگ تھلگ اور بیگانہ نہ رہنا چاہیئے بلکہ ان تمام لوگوں کے ذخیرۂ الفاظ کو جس سے اسے واسطہ پڑتا ہے اپنانا چاہیئے اور انھیں اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنانا چاہیئے۔ اس سے یہ بات بھی نتیجہ کے طور پر از خود ماننا پڑتی ہے کہ افادی ترقی کی قربان گاہ پر زبانوں کی انفرادی خصوصیات کو کبھی بہ جبر بھینٹ نہ چڑھانا چاہیئے۔ زبان کو جہاں تک ہو سکے ہمہ گیر بنانا چاہیئے تاکہ اس کے اندر مختلف زبانوں کی انفرادی خصوصیات جذب ہو سکیں۔ اس میں شک نہیں زبانوں کے میل جول سے ان کی تمام انفرادی خصوصیات باقی نہیں رہ سکتیں

لیکن یہ بات کہ قصداً اور اراداتاً کس حد تک ان کو فنا کیا جائے اس میں اختلاف رائے کی بہت زیادہ گنجائش ہے۔

زبان کی شکل کا تعین بڑی حد تک معاشرتی میل جول کی ضرورت سے ہوتا ہے۔ چنانچہ معاشی تعلقات جس قدر بڑھتے ہیں ذخیرہ الفاظ بھی وسیع ہوتا جاتا ہے۔ کئی گاؤں کے ایک چھوٹے سے تعلقہ کی زبان میل جول کے اضافہ سے صوبہ کی زبان بنتی ہے۔ پھر یہی ترقی کرتے کرتے قومی زبان بن جاتی ہے۔ پھر یہ تفریق محض جغرافیائی ہی نہیں ہوتی بلکہ اس تفریق کے ساتھ ساتھ معاشرتی فرق یا جذب وانجذاب کا بھی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ شہری اور دیہاتی آبادی کی زبان میں فرق ہوتا ہے۔ مختلف پیشوں کی زبان میں اظہار خیال کی مختلف خصوصیات ترقی پا جاتی ہیں۔ شاعروں کی ایک رسمی زبان الگ بن جاتی ہے۔ واعظ اور مقرر اپنی ایک علیحدہ زبان بنا لیتے ہیں لیکن پھر بھی باہمی جذب و انجذاب سے ایک مشترکہ زبان اور عام طور پر تسلیم کئے ہوئے اظہار خیال کے طریقے نشو ونما پاتے ہیں اور قبول کر لئے جاتے ہیں۔ یہ سب کام زیادہ تر غیر شعوری طور پر ہوتا ہے اور ایسے فرد یا گروہ کا طریقہ اظہار جسے کوئی قیمتی بات کہنا ہوتی ہے یا جسے کسی بات کو اثر آفریں طریقہ پر کہنا معلوم ہوتا ہے، غیر محسوس طریقہ پر قبول کر لیا جاتا ہے۔ اسکول، اخبار، کتاب، تھیٹر — یہ مرکز کی طرف کھینچنے اور یکساں ٹکسالی زبان بنانے میں بہت امداد دیتے ہیں۔ لیکن اگر ان عوامل میں سے کوئی عامل قصداً یا اراداتاً بعض عناصر پر دوسرے عناصر کے مقابلہ میں زیادہ زور دینے لگے یا ایک بول چال کی زبان کو دوسرے کے مقابلہ میں، ایک طبقہ کے محاورے کو دوسرے طبقہ کے محاورے پر ترجیح دینے لگے تو اس طرح سے ایک یکساں اور معیاری زبان پیدا کرنے کی کوشش بجائے خود قومی زبان کی ترقی میں حارج ہونے لگتی ہے۔ اس بنا پر میں تمام ایسی کوششوں کو جن میں اراداتاً سنسکرت لفظوں کو زبان کی تندھی کرنے اور عربی لفظوں کو زبان کو مسلمان بنانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے خوف اور خطرہ کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ جو لوگ اپنی قوم سے گفتگو کرنا نہیں چاہتے انھیں اختیار ہے جس طرح چاہیں عربی اور سنسکرت کا استعمال فرمائیں۔ ان کے پاس کہنے کے لئے بھی کچھ بہت زیادہ نہ ہوگا لیکن بہر حال ان کا ارمان نکل جائے گا۔ مگر انھیں ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان کی ترقی کی راہ میں

رستے اٹکانے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ انھیں اپنی ان وابستگیوں کی وجہ سے جس میں دوسروں کا شریک ہونا ناممکن ہے زبان کو ایسا نہ بنانا چاہئے جس کی وجہ سے ہندو مسلمان سے، اٹک کا رہنے والا کوکن کے رہنے والے سے، راجکمار کسان سے بات چیت نہ کر سکے۔ کیونکہ اگر وہ ایسا کریں گے تو جس مقصد کے لئے یہ ہونہار بچہ پیدا ہوا ہے اسی کو فنا کر دیں گے اور یوں گویا خود اس کا گلا گھونٹ ڈالیں گے ہندوستانی عربی یا سنسکرت نہ ہے نہ ہو سکتی ہے۔ یہ صرف ہندوستانی ہے اس بڑے ملک کے تمام لوگوں کی مشترک زبان، سب کی بات چیت سمجھنے کا ایک مشترک آلہ، سب کے لئے ناز کرنے کا ایک مشترک ذریعہ جس کے بنانے میں ہر شخص کا حصہ ہے اور جس پر کسی شخص یا جماعت کا نہ اجارہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ جو لوگ اپنے ذمہ ہندوستانی زبان پھیلانے کا کام لیں ان کا سب سے پہلا یہ فرض ہے کہ وہ اس بات کا خیال رکھیں کہ کہیں بھی قصداً اور ارادۃً ایسے سنسکرت یا عربی کے لفظ نہ استعمال کئے جائیں جن سے زبان میں فرقہ پرستی کا رجحان پیدا ہو۔ عام بول چال کی زبان سب کی مشترک زبان ہونا چاہئے۔

اوپر جو کچھ کہا گیا اس سے ممکن ہے یہ سمجھا جائے کہ میں زبان کے بارے میں صرف اس کے فایدہ کے پہلو کو سامنے رکھ کر گفتگو کر رہا ہوں۔ میں اسے بات چیت کا ذریعہ، سادہ خیالات کے مبادلہ کا وسیلہ اور بازار اور کاروبار کی زبان سمجھ رہا ہوں اور اسی لئے میں اس کے سہل اور سادہ، یکساں اور عام فہم ہونے پر زور دے رہا ہوں یہ بات ایک حد تک ٹھیک ہے۔ میں زبان کو اس نگاہ سے بھی دیکھتا ہوں لیکن صرف اسی نگاہ سے نہیں۔ مثلاً میں زبان میں ان خصوصیات کو پیدا کرنے کی کوشش نہیں کروں گا جو خالص افادی زبان میں ہونا چاہئیں۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ ہندوستانی زبان کو بھی ایسی ہی ایک باقاعدہ شکل دے دینا چاہئے جیسے مونیسار کی عالمگیر زبان کو یا اسپرانٹو کو دی گئی ہے کہ اس کے تمام اسم انگریزی حرف " o " پر ختم ہوتے ہیں تمام اسم صفت " a " پر، تمام مصدر " i " پر تمام افعال " os " پر تمام امر " u " پر وغیرہ وغیرہ۔ میں زبان کے اس حق کو تسلیم کرتا ہوں کہ اسے محض افادہ کو ہی اپنے سامنے نہ رکھنا چاہئے بلکہ اسے اپنی زینت و آرائش کی بھی کوشش کرنی چاہئے

کہ [illegible] اس کے ساتھ ہی ساتھ پیدا ہوتی

[illegible]

گفتگو کی ہر جگہ اس طرح کا اظہار ہوتا ہے کہ [illegible]

کا حسن زبان کے افادہ کے ساتھ ساتھ چلتا ہے گو زبان کو ضرورت سے زیادہ حسین ضرورت سے

مستثنیٰ بنانے کا بھی امکان ہے۔ چنانچہ اپنے تبحر علمی کی جا اور بے جا نمائش کرنے والے لوگ

زبان میں ضرورت سے زیادہ تصنع پیدا کرتے ہیں۔ ایسے بزعمِ خود غلط مصنفوں کا شمار زبان کے اصول

ترک نہ چاہیے بلکہ انہیں زبان کا دشمن سمجھنا چاہیے۔ جب وہ رشتے جو حسین اور مفید کو ملاتے ہیں کمزور ہو

رہے تو زبان کی تباہی شروع ہو جاتی ہے۔ باہمی بات چیت سمجھنے کی عملی ضرورتیں ایک سادہ راستہ

چلتی ہیں اور مصنوعی حسن پیدا کرنے کی کوششیں دوسرے راستہ پر۔ عوام پہلے کا ساتھ دیتے ہیں اور

اہلِ علم دوسرے کا۔ لیکن اس سے زبان کے دونوں حصوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ کلاسیکل عہد کے بعد

لاطینی زبان کا یہی حال ہوا اور یہی حشر یونانی اور سنسکرت زبان کا بھی ہوا۔ مجھے کسی زبان کی ترقی یا زوال

کی بابت فیصلہ کرنے کے لئے، مفید اور حسین کے اس باہمی تعلق کے علاوہ اور کوئی دوسرا معیار نظر نہیں آتا۔

تعمیر کے زمانہ میں جب اہم باتیں کہنا ہوتی ہیں، تعصبات کو رفع کرنا ہوتا ہے اختلافات میں ہم

آہنگی پیدا کرنا ہوتی ہے حسن و آراستگی کو سادگی اور افادہ کے مقابلہ میں صرف ثانوی جگہ دی جاتی ہے تب

البتہ جب قوم بن جاتی ہے اور خوشحالی کی طرف قدم بڑھاتی ہے اور زندگی کا ایک ملا جلا انداز ترقی پا

لیتا ہے اور مشترک تعلقات رونما ہو جاتے ہیں اس وقت حسن و آرائش کا مرتبہ بھی بلند ہونا شروع کرتا

ہے۔ ہم ابھی تک قومی تعمیر کی منزل سے ہی گذر رہے ہیں اس لئے ہمارے واسطے تزئین و آرائش

موزوں نہیں ہو سکتی۔

مگر اس تمام سادگی کے باوجود جس کے لئے میں آپ سے التجا کر رہا ہوں میں سمجھتا ہوں ہم اپنی زبان

کو خوبصورت بھی بنا سکتے ہیں۔ لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب زبان افراد کے درمیان محض تبادلہ خیال

کا ایک مفید ذریعہ نہ ہو بلکہ جب وہ ایک طاقتور اندرونی تمنا، ایک قومی جذبہ کے اظہار کے لئے ایک وسیلہ

...سب میں اس ... طبقات کی درجہ بدرجہ تقسیم کا عکس صاف طور پر نمایاں نظر آتا ہے۔

ایک ایسے شہر میں بچوں کی ماں جو ایک دوسرے سے تقریباً بالکل مشابہ ہوتے ہیں ان دونوں ... اس قدر دلچسپی رکھتی ہے کہ ان کے دو جداگانہ نام رکھتی ہے۔ اس کے برخلاف ایسے شخص جو ... سے ممتاز اور متفرق ہوتے ہیں جب وہ کسی فوج میں بھرتی ہو جاتے ہیں تو انھیں ... تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ وسط برازیل کی ایک قدیم قوم کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ملک کے طوطوں کی مختلف قسموں کو صرف ایک سادہ لفظ "طوطے" سے ظاہر نہیں کرتی بلکہ ... قسموں نے ایک جداگانہ نام رکھا ہے۔ اسی طرح تاڑ کے درخت کی ہر قسم کی بھی ان ... ممتاز اہمیت ہے اور اس کا ایک خاص نام ہے۔ عربی زبان میں اونٹ، گھوڑے اور ... ناقابل یقین حد تک بے شمار نام ہیں۔ ہندوستان کے انگریزی پڑھے ہوئے لوگوں نے ... اپنے اور فطرت کے درمیان جو ہمارے ملک میں دوسرے تمام ملکوں کے مقابلہ میں بہت ... رنگین لباسوں میں جلوہ گر ہوتی ہے، ایک دیوار کھڑی کر لی ہے۔ وہ اپنی ہزاروں قسم کی ... چڑیوں کو محض "چڑیا" اور خوشبودار پھولوں کو محض "پھول" کہنا کافی سمجھتے ہیں۔ تمام ان لوگوں کا جو مادر وطن کی خدمت ایک مشترک زبان کو ترقی دے کر کرنا چاہتے ہیں یہ فرض ہونا چاہیئے کہ وہ قوم کی ... کے حلقے کو بھی اس طرح وسیع کریں تاکہ وہ اپنے آپ کو اپنے اعلیٰ مسکن اور اس کی زبردست روایات کا ... سکیں اور اپنے مستقبل کو ماضی کی تمام عظمت و شوکت سے بھی زیادہ باعزت اور شاندار بنا سکیں۔

... نگاہ سے ایک سنسکرت کے لفظ کو یہاں یا ایک عربی کے لفظ کو وہاں نہ بڑھاؤ بلکہ قوم کی ... اور خلاقی افق کو وسیع کرو تاکہ زبان از خود قومی اظہار نفس کی ضروریات کا ساتھ دے سکے۔ آزادی کی

میں زبان میں تناسب اور موزونیت بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ میرا یہ بھی اعتقاد ہے کہ آرٹ کے اظہار کی تمام مختلف انسانی شکلوں میں صحیح اور حقیقی حسن و آرائش کے ساتھ کوئی نہ کوئی مفید عملی تخیل بھی ہر جگہ اس طرح ملا ہوا رہتا ہے کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ زبان کا حسن زبان کے افادہ کے ساتھ ساتھ چلتا ہے گو زبان کو ضرورت سے زیادہ حسین اور حد سے زیادہ مصنوعی بنانے کا بھی امکان ہے۔ چنانچہ اپنے تبحر علمی کی جا اور بے جا نمائش کرنے والے لوگ اپنی زبان میں ضرورت سے زیادہ تصنع پیدا کرتے ہیں۔ ایسے پرخود غلط مصنفوں کا شمار زبان کے دوستوں میں نہ کرنا چاہئے بلکہ انہیں زبان کا دشمن سمجھنا چاہئے۔ جب وہ رشتے جو حسین اور مفید کو ملاتے ہیں کمزور ہو جاتے ہیں تو زبان کی تباہی شروع ہو جاتی ہے۔ عام بات چیت سمجھنے کی عملی ضرورتیں ایک سادہ راستہ پر چلتی ہیں اور مصنوعی حسن پیدا کرنے کی کوششیں دوسرے راستہ پر۔ عوام پہلے کا ساتھ دیتے ہیں اور پرجوش علما عالم دوسرے کا۔ لیکن اس سے زبان کے دونوں حصوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ کلاسیکل عہد کے بعد لیٹن زبان کا یہی حال ہوا اور یہی حشر یونانی اور سنسکرت زبان کا بھی ہوا۔ مجھے کسی زبان کی ترقی یا زوال کی بابت فیصلہ کرنے کے لئے، مفید اور حسین کے اس باہمی تعلق کے علاوہ اور کوئی دوسرا معیار نظر نہیں آتا۔ قومی تعمیر کے زمانہ میں جب اہم باتیں کہنا ہوتی ہیں، تعصبات کو رفع کرنا ہوتا ہے اختلافات میں ہم آہنگی پیدا کرنا ہوتی ہے حسن و آراستگی کو سادگی اور افادہ کے مقابلہ میں صرف ثانوی جگہ ہی دی جا سکتی ہے البتہ جب قوم بن جاتی ہے اور خوش حالی کی طرف قدم بڑھاتی ہے اور زندگی کا ایک ملا جلا انداز ترقی پانے لگتا ہے اور مشترک تعلقات رونما ہو جاتے ہیں اس وقت حسن و آرائش کا مرتبہ بھی بلند ہونا شروع کرتا ہے۔ ہم ابھی تک قومی تعمیر کی منزل سے ہی گذر رہے ہیں اس لئے ہمارے واسطے تزئین و آرائش موزوں نہیں ہو سکتی۔

مگر اس تمام سادگی کے باوجود جس کے لئے میں آپ سے التجا کر رہا ہوں میں سمجھتا ہوں ہم اپنی زبان کو خوبصورت بھی بنا سکتے ہیں لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب زبان افراد کے درمیان محض تبادلہ خیال کا ایک مفید ذریعہ نہ ہو بلکہ جب وہ ایک طاقتور اندرونی تمنا، ایک قومی جذبہ کے اظہار کے لئے ایک وسیلہ

بن جائے۔ ہندوستانی زبان کے لئے یہ جذبہ مشترکہ قومیت کا جذبہ ہی ہو سکتا ہے جس کی ہندوستانی زبان صحیح معنوں میں ایک تمدنی مظہر ہے۔ اب رہی یہ بات کہ اس جذبہ سے زبان کا حسن کس قدر بڑھے گا تو اس کا انحصار ایک طرف تو خود اس جذبہ کی شدت پر ہوگا اور دوسری طرف اس جذبہ کی وجہ سے جن لوگوں کے مفاد کو فروغ ہو رہا ہے ان کی وسعت اور ان کے جذبات کی شدت پر ہوگا۔ کیونکہ ہر زبان کے حسن و تناسب میں اس کی جماعت کے طبقات کی درجہ بدرجہ تقسیم کا عکس صاف طور پر نمایاں نظر آتا ہے

ایک ایسے جڑواں بچوں کی ماں جو ایک دوسرے سے تقریباً بالکل مشابہ ہوتے ہیں ان دونوں سے علیحدہ علیحدہ اس قدر دلچسپی رکھتی ہے کہ ان کے دو جداگانہ نام رکھتی ہے۔ اس کے برخلاف ایسے شخص جو قطعاً ایک دوسرے سے متاثر اور مستغرق ہوتے ہیں جب وہ کسی فوج میں بھرتی ہو جاتے ہیں تو انھیں ایک دوسرے سے تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ وسط برازیل کی ایک قدیم قوم کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ملک کے طوطوں کی مختلف قسموں کو صرف ایک سادہ لفظ "طوطے" سے ظاہر نہیں کرتی بلکہ ہر ایک کے لئے انھوں نے ایک جداگانہ نام رکھا ہے۔ اسی طرح تاڑ کے درخت کی ہر قسم کی بھی ان کی نگاہ میں ایک ممتاز اہمیت ہے اور اس کا ایک خاص نام ہے عربی زبان میں اونٹ، گھوڑے اور تلوار کے لئے ناقابل یقین حد تک بے شمار نام ہیں ہندوستان کے انگریزی پڑھے ہوئے لوگوں نے اپنی تعلیم کی وجہ سے اپنے اور فطرت کے درمیان جو ہمارے ملک میں دوسرے تمام ملکوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ رنگ برنگے لباسوں میں جلوہ گر ہوتی ہے، ایک دیوار کھڑی کر لی ہے۔ وہ اپنی ہزاروں قسم کی خوبصورت چڑیوں کو محض "چڑیا" اور خوشبودار پھولوں کو محض "پھول" کہنا کافی سمجھتے ہیں۔ تمام ان لوگوں کا جو مادر وطن کی خدمت ایک مشترک زبان کو ترقی دے کر کرنا چاہتے ہیں یہ فرض ہونا چاہئے کہ وہ قوم کی دلچسپیوں کے حلقے کو بھی اس طرح وسیع کریں تاکہ وہ اپنے آپ کو اپنے اعلیٰ مسکن اور اس کی زبردست روایات کا مستحق ثابت کر سکیں اور اس کے مستقبل کو ماضی کی تمام عظمت و شوکت سے بھی زیادہ باعزت اور شاندار بنا سکیں۔

تنگ فرقہ پرست نگاہ سے ایک سنسکرت کے لفظ کو یہاں یا ایک عربی کے لفظ کو وہاں نہ بڑھاؤ بلکہ قوم کی ذہنی اور اخلاقی افق کو وسیع کرو تاکہ زبان اردو قومی اظہار نفس کی ضروریات کا ساتھ دے سکے آزادی کی

تمنا کو خدمت کے جذبہ کو، نیک اور بزرگ بننے کے عزم و ارادہ کو ظاہر کرنے والے جتنے لفظ بھی مل سکیں ان سب کو استعمال کرو۔ ہندوستان نے دنیا کے خیالات اور علم کی ترقی میں جو خاص حصہ لیا ہے اس کے ظاہر کرنے والے جتنے لفظ ملیں انھیں استعمال کرو۔ مجھے اس بات کی ذرا بھی پروا نہ ہوگی کہ یہ سنسکرت کے لفظ ہیں یا عربی کے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کو آزادی حاصل کرنے خدمت کا جذبہ پیدا کرنے اور فلسفہ اور سائنس سے شغف رکھنے میں باہم مقابلہ کرنا چاہئے اور ان میں سے جو اس آزاد مقابلہ میں بازی لے جائیگا وہ اس بات کا مستحق ہوگا کہ وہ اپنے مقصد کے اظہار کے لئے اس شکل کو اختیار کرے جو اس کے خاص ماحول سے زیادہ قریب ہے۔ دوسرے بھائی کو اس بات سے کڑھنا نہ چاہئے لیکن اہم معاملات میں اس تندرست مسابقت کے بغیر ایک مشترک زبان کو محض بے معنی فرقہ پرستی کی وجہ سے خراب کرنا مفسدانہ اور شر کھڑا کرنا ہے۔ ایک لفظ یا اظہار خیال کا طریقہ اسی وقت زندہ رہتا اور عام قبولیت حاصل کرتا ہے جب اس کی حمایت کے لئے بولنے والوں کا اخلاقی اور ذہنی مفاد موجود ہوتا ہے۔ اگر یہ نہیں ہوتے تو وہ مر جاتا ہے۔ آپ غیر ضروری الفاظ کو اس وقت تک رائج نہیں کر سکتے جب تک آپ ان چیزوں اور ان خیالات کے لئے جن کی الفاظ نمایندگی کرتے ہیں زندگی میں کوئی دلچسپی نہ پیدا کر دیں۔ اسی طرح آپ الفاظ کو زبان سے اس وقت تک خارج بھی نہیں کر سکتے جب تک لوگوں کے دلوں سے آپ اس دلچسپی کو زائل کر دیں جو انھیں اس شے سے ہے جس کی وہ الفاظ نمایندگی کرتے ہیں۔

گو بظاہر یہ بات غیر متعلق سی معلوم ہوتی ہیں میں آپ کے ہندی پرچارکوں سے اپیل کروں گا کہ وہ اس بات پر دھیان رکھیں کہ لوگوں کی دلچسپی ان تمام چیزوں کے لئے بیدار ہو جو اچھی اور اعلیٰ ہیں۔ نیز یہ کہ اس ملک میں جتنی قومیں آباد ہیں ان سب میں دلی اتحاد بہت جلد پیدا ہو جائے اور اس کا عکس ایک نہایت اعلیٰ اور ارفع مشترک زبان میں بھی نظر آنے لگے۔ کیونکہ جب تک یہ بات حاصل نہ ہوگی ہم کچھ اور نئی اور تنگ زبانوں کا اضافہ اپنے ملک کی بے شمار زبانوں میں کر دیں گے اور ایک حقیقی مشترک زبان پیدا کرنے کا کام انجام دینا پھر بھی باقی رہے گا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو چاہئے کہ وہ ایک مشترک زبان کو ترقی دیں اور اسے تنگ فرقہ وارانہ مقاصد کے لئے خراب نہ کریں۔ اس بات کو یاد رکھیے کہ ایک ملک کے ادب کو ناپاک کرکے آپ

اس قوم کی روح کو ناپاک کر سکتے ہیں

اس کے بعد رسم خط کا مسئلہ رہ جاتا ہے۔ تو اس کے بارے میں مجھے یہ کہنا ہے کہ اگرچہ ذخیرہ الفاظ کے معاملہ میں تو میری یہ خواہش ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں اگر ضرورت ہو تو ایک دوسرے کی رعایت سے اپنے ثقیل اور ناقابل فہم الفاظ کو ترک کر دیں اور اپنی مشترک زبان کو اس کی مخصوص ساخت اور ترکیب کا لحاظ کرتے ہوئے جس ذریعہ سے بھی ممکن ہو ذخیرہ کریں مگر رسم خط کے معاملہ میں اپ تخی سے یہ چاہتا ہوں کہ نہ ہندو اپنے رسم خط کو ترک کریں نہ مسلمان۔ مجلس استقبالیہ کے صدر کی تقریر کے اس حصول کو میں نے دلچسپی سے سنا جس میں انھوں نے دیو ناگری رسم خط کی تائید میں عربی رسم خط کو ترک کرنے کا مشورہ دیا۔ میں ان کے خلوص و صداقت کا معترف ہوں لیکن میں اپنا ساری کے ساتھ ان سے اختلاف رائے رکھتا ہوں۔ یہ میرا پختہ یقین ہے جس کا اظہار میں انڈین نیشنل کانگریس کے صدر کی حیثیت سے بھی کر چکا ہوں کہ سیاسی اور مذہبی اختلافات جو آج ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کو خراب کر رہے ہیں وہ دراصل اس گہری کشمکش کے بیرونی مظاہر ہیں جو ہندوستان کے لئے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی یہ کشمکش دیکھی گئی ہے اور تاریخ بھی اس قسم کی مثالوں سے ناواقف نہیں ہے۔ یہ مسئلہ حقیقت میں دو ایسے مختلف تمدنوں کے میل ملاپ کا مسئلہ ہے جن میں سے ہر ایک زندگی کے بارے میں ایک جداگانہ تخیل رکھتا ہے۔ میری رائے میں اس مسئلہ کا بہترین حل جیسا کہ میں نے اس وقت بھی ظاہر کیا تھا یہ ہے کہ ہر تمدن کو زندہ رہنے کا حق دیا جائے لیکن اس کے ساتھ رواداری اور باہمی عزت کے جذبہ کی نشوونما کی جائے اور تمدنی قربتوں کو ترقی پانے کا موقع ان نصب العینوں کے مطالعہ کرنے اور سمجھنے کے ذریعہ سے فراہم کیا جائے جن پر دونوں کی تہذیب قائم ہے۔ ہندوستان کی سیاسی ترقی کے لئے ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی تمدنی نشوونما کے لئے بھی میں یہاں بھی یہی کہتا ہوں کہ ہر تمدن کے لئے جداگانہ طور پر زندہ رہنے کے حق کو ایک ناقابل انکار حق کی حیثیت سے تمام قوموں کے لئے تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ اسی طرح ان کے لئے ممکن ہوگا کہ وہ مستقبل کے ہندوستان کے عظیم ترین ہم آہنگ تمدن کی تخلیق میں اپنا امتیازی حصہ شامل کر سکیں۔ اس طریقہ پر عمل کرنے سے کامیابی دیر میں حاصل ہوگی لیکن تمدن کا مرکب جلد کے ساتھ یا ایک دن میں لو

تیار نہیں ہوسکا۔ ہم میں انتظار کرنے کی عقل ہونا چاہئے۔ مسلمانوں سے عربی رسم خط کے ترک کرنے کے لئے کہنا گویا انھیں اپنے شاندار تمدنی ترکہ سے بے تعلق کرنا ہے۔ کیونکہ اس رسم خط کے ذریعہ سے ہی وہ آسانی کے ساتھ اپنے ماضی کے عظیم الشان ذخیرہ تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس ترکہ سے انہیں محروم کرنا نہ تو خود ان کے لئے مناسب ہے نہ دنیا کے لئے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ترکوں نے عربی رسم خط کو ترک کر کے کوئی عقلمندی کا کام کیا ہے۔ لیکن غالباً انھوں نے یہ اس لئے کیا کہ وہ ماضی کی روایات سے اپنے تمام تعلقات منقطع کرنا چاہتے تھے تاکہ یورپ کا طرز زندگی اختیار کرنے میں انھیں سہولت ہو۔ اپنے مقصد کے حاصل کرنے کے لئے انھوں نے بہترین طریقہ اختیار کیا۔ لیکن مجھے ذاتی طور پر مکمل تمدنی قلم بندیوں میں کچھ زیادہ اعتقاد نہیں ہے اس لئے میرے نزدیک یہ بات عقلمندی اور مصلحت دونوں کے خلاف ہے کہ دیوناگری رسم خط کے اختیار کرنے کو ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان بننے کے لئے لازم و ملزوم قرار دیا جائے۔ ہمیں اپنی تمام توجہ ایک واقعی ہندوستانی زبان پیدا کرنے کے لیے وقف کر دینا چاہیئے اور عربی اور دیوناگری دونوں رسوم خط کے استعمال کی آزادی دینا چاہئے۔ مجھے مسلمانوں کی ایسی قومی درسگاہوں کا علم ہے جہاں عربی رسم الخط کے ساتھ ساتھ دیوناگری رسم خط بھی سکھایا جاتا ہے۔ میری یہ خواہش ہے کہ تمام قومی درسگاہیں اسی طریقہ پر عمل کریں ممکن ہے ایسا کرنے سے کچھ بے آرامی ہو لیکن اس کے فواید اس کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہیں۔ میری رائے میں دونوں رسوم خط کا علم اس قابل افسوس بیگانگی اور زبردست لاعلمی کے رفع کرنے کا ایک بہت موثر ذریعہ ثابت ہوگا جس کی وجہ سے آج کل ہندو اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کے تمدنی نصب العینوں کے سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔

ہندوستان کی مختلف زبانیں
اور
ایک مشترکہ قومی زبان

۱۹۳۱ء کی مردم شماری رپورٹ میں بیان کیا گیا ہے کہ ہندوستان میں ۲۲۵ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان زبانوں کو کئی خاندانوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں تعداد کی کثرت کے لحاظ سے دو خاندان بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور آبادی کے بیشتر حصہ پر حاوی ہیں۔ اول ہندی یورپی خاندان کی زبانیں جن کے بولنے والوں کی تعداد ۲۵ کروڑ ۵۷ لاکھ ہے اور دوسرے دراوڑی خاندان کی زبانیں جن کے بولنے والوں کی تعداد ۷ کروڑ ۱۲ لاکھ ہے۔ پھر ان خاندانوں کی مختلف شاخیں ہیں۔ پہلے ہم دراوڑی خاندان کی شاخوں کو لیتے ہیں۔ اس کی دو بڑی شاخیں دراوڑا شاخ اور اندھرا شاخ ہیں۔ دراوڑا شاخ کے بولنے والے ۴ کروڑ ساڑھے چودہ لاکھ ہیں اور اندھرا شاخ کے ۲ کروڑ ۶۳ لاکھ۔ اندھرا شاخ کی زبان تلگو ہے۔ جو زیادہ تر شمالی مدراس اور ریاست حیدرآباد میں اور کم تر میسور کے کچھ حصہ میں بولی جاتی ہے۔ دراوڑا شاخ کی کئی اور چھوٹی شاخیں ہو جاتی ہیں جن میں خاص طور پر لائق ذکر تامل، کناڑی اور ملیالم ہیں۔ تامل کے بولنے والے ۲ کروڑ ۴ لاکھ ہیں اور یہ زبان زیادہ تر جنوبی مدراس میں اور کم تر میسور کے کچھ حصہ میں بولی جاتی ہے۔ کناڑی کے بولنے والے ایک کروڑ بارہ لاکھ ہیں اور یہ زیادہ تر میسور اور کورگ میں اور کم تر بمبئی، حیدرآباد اور مدراس میں بولی جاتی ہے۔ ملیالم کے بولنے والے ۹۱ لاکھ ہیں۔ یہ زبان زیادہ تر کوچین اور ٹراونکور میں اور کم تر مدراس مالابار میں بولی جاتی ہے۔

ہندی یورپی خاندان کی خاص خاص بڑی شاخیں (۱) ایرانی شاخ (۲) داردی شاخ (۳) ہندی آریائی شاخ ہیں۔ ایرانی شاخ کے بولنے والے پونے ۲۲ لاکھ ہیں۔ اس میں پشتو، بلوچی اور

فارسی بولنے والے ہیں۔ داروی شاخ کے بولنے والے سوا پندرہ لاکھ ہیں اس میں چترالی، شینا، کاشمیری کوہستانی وغیرہ شامل ہیں۔ ہندی آریائی شاخ کے بولنے والے ۲۵ کروڑ ۴۷ لاکھ ہیں۔

پھر ہندی آریائی شاخ کی مزید تین شاخیں ہیں (۱) بیرونی شاخ (۲) درمیانی شاخ اور (۳) اندرونی شاخ۔ بیرونی شاخ کے بولنے والے ۱۳ کروڑ ۵۰ لاکھ ہیں۔ درمیانی شاخ کے بولنے والے ۸، ½ لاکھ ہیں اور اندرونی شاخ کے بولنے والے ۱۱ ½ کروڑ ہیں۔

پھر ان شاخوں کی بھی مزید شاخیں ہیں۔ بیرونی شاخ میں شمال مغربی شاخ، جنوبی شاخ اور مشرقی شاخ شامل ہیں۔ شمال مغربی شاخ کے بولنے والے ایک کروڑ ۲۵ ½ لاکھ ہیں۔ اس میں مغربی پنجابی (لہندا) اور سندھی شامل ہیں۔ جنوبی شاخ کے بولنے والے ۲ کروڑ ۱۳ ½ لاکھ ہیں اس میں زیادہ تر مرہٹی اور بہت کم کنکانی شامل ہے۔ مشرقی شاخ کے بولنے والے ۹ کروڑ ۴۷ لاکھ ہیں۔ اس کی مزید شاخیں اڑیا، بہاری، بنگالی اور آسامی ہیں اڑیا بولنے والے ۱ کروڑ ۱۲ لاکھ ہیں۔ بہاری بولنے والے ۲ کروڑ ۹۰ لاکھ۔ بنگالی بولنے والے ۵ کروڑ ۳ لاکھ اور آسامی بولنے والے ۲ کروڑ ہیں۔

درمیانی شاخ کے بولنے والے جیسا اوپر بیان کیا جا چکا ہے صرف ۸، ½ لاکھ ہیں اور اس میں مشرقی ہندی شامل ہے۔

اندرونی شاخ کی مزید شاخیں مرکزی شاخ اور پہاڑی شاخ ہیں۔ مرکزی شاخ کے بولنے والے ۱۱ کروڑ ۴۵ لاکھ ہیں اور پہاڑی شاخ کے ۷۰ لاکھ ۵۲ ہزار۔

پھر مرکزی شاخ کی بھی پانچ مزید شاخیں ہیں۔

(۱) مغربی ہندی جس کے بولنے والے ۷ کروڑ ۱۵ لاکھ ہیں۔

(۲) راجستھانی جس کے بولنے والے ۱ کروڑ ۳۹ لاکھ ہیں۔

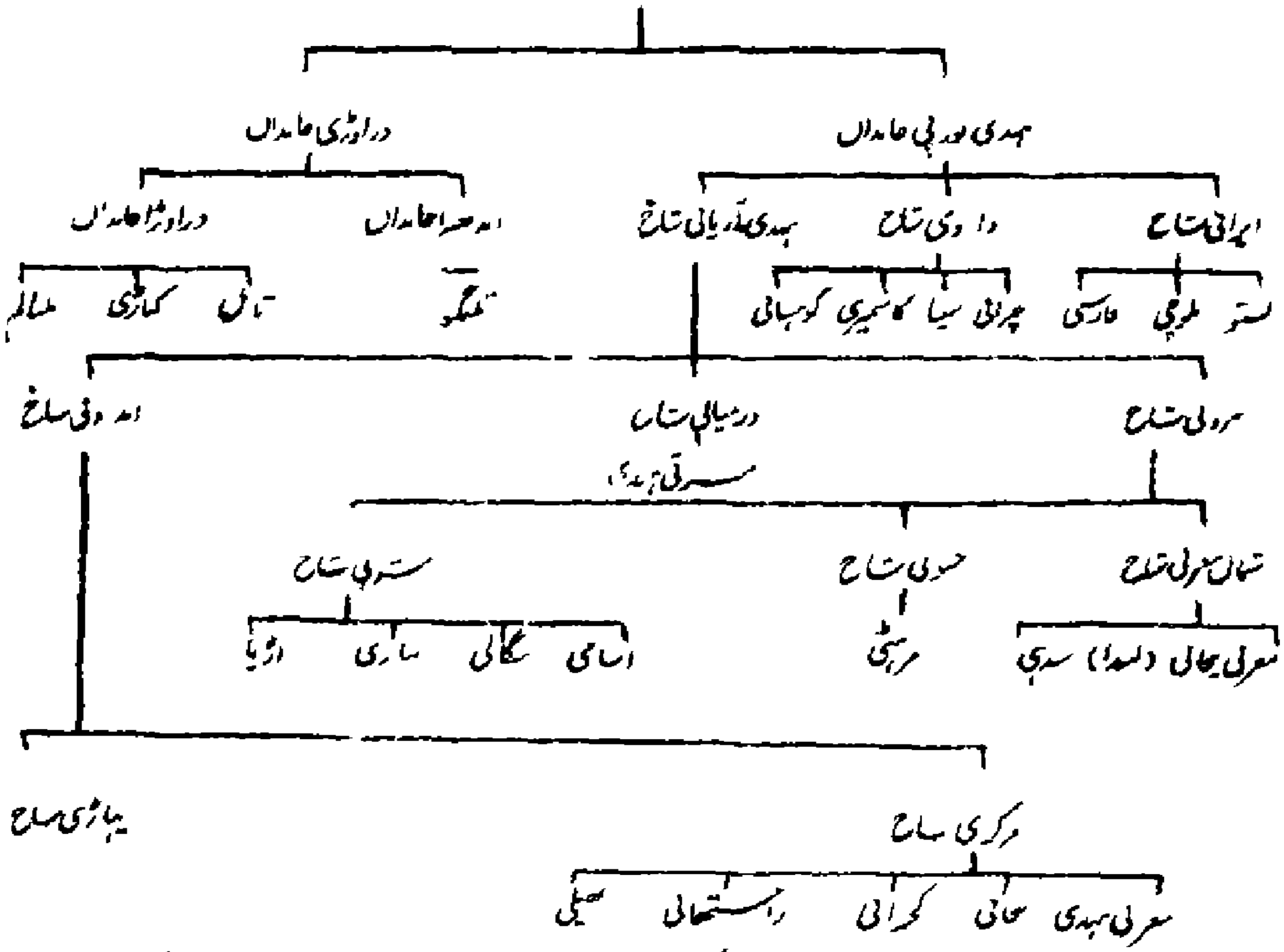
(۳) گجراتی جس کے بولنے والے ۱ کروڑ ۸ لاکھ ہیں

(۴) پنجابی جس کے بولنے والے ۱ کروڑ ۵۸ لاکھ ہیں اور

(۵) بھیلی جس کے بولنے والے صرف ۲۲ لاکھ ہیں

اوپر کے بیان کی وضاحت ذیل کے شجرہ سے زیادہ بہتر طریقہ پر ہو سکے گی :-

ہندوستان کی زبانیں



تعداد کی کثرت کے لحاظ سے زبانوں کی اہمیت کا اندازہ ذیل کے نقشہ سے کیا جا سکتا ہے :-

نام زبان	بولنے والوں کی تعداد	جن صوبوں میں زبان بولی جاتی ہے
۱ - مغربی ہندی	۷ کروڑ ۱۵ لاکھ	صوبہ متحدہ، پنجاب، صوبہ متوسط و برار، سنٹرل انڈیا ایجنسی راجپوتانہ، ریاست حیدرآباد، گوالیار اور دہلی -
۲ - بنگالی	۵ کروڑ ۳۵ لاکھ	بنگال اور آسام
۳ - بہاری	۲ کروڑ ۹۰ لاکھ	بہار، اڑیسہ
۴ - تلگو	۲ کروڑ ۳۶ لاکھ	ریاست حیدرآباد، مدراس اور میسور

سے توڑ تا مروڑتا ہے ۔ لیکن اس کی ان ادبی کاوشوں اور کارناموں کی کوئی تحریری یادداشت نہیں رکھی جاتی جس سے دوسرے لوگ فائدہ اٹھا سکیں اور آنے والی نسلوں کے لئے وہ ایک معیار بن سکے ۔

" ہندوستانی " زبان کی تحریری، ادبی، اور معیاری شکلیں دو ہیں ایک اُردو دوسرے ہندی ۔

اُردو اور ہندی میں فرق یہ ہے کہ اُردو اپنی " ہندوستانی " کو شایستہ بنانے کے لئے فارسی عربی کے الفاظ سے مدد لیتی ہے اور جب لکھنے کا موقع ہوتا ہے تو اسے عربی رسم خط میں لکھتی ہے ہندی یہی کام سنسکرت سے لیتی ہے اور سنسکرت رسم خط میں " ہندوستانی " کو پیش کرتی ہے ۔ اُردو کی یہ کوشش بالکل فطری تھی مسلمان چونکہ ہندوستان پر حکمراں تھے اور دفتری زبان فارسی تھی جس میں عربی کے بہت سے الفاظ ملے ہوئے تھے ۔ اس لئے اُردو کے لئے شایستگی کا معیار اس وقت کی راج بھاشا اور امیروں کی زبان یعنی فارسی ہی ہو سکتی تھی ۔ چنانچہ فارسی کی اصطلاحیں، محاورے، تشبیہیں، استعارے، تلمیحات، مذہبی روایات، عروض، اسالیب بیان اور سب سے بڑھ کر یہ کہ رسم خط اُردو میں آگئے ۔ دربار، امیروں اور شہری زندگی سے جو لوگ وابستہ تھے ان کی زبان میں ان اثرات کا پیدا ہونا لازمی تھا ۔ لیکن جو لوگ دربار سے دور تھے، ان کی زبان بڑی حد تک محدود اور غیر شایستہ رہی صرف جماعت کا وہ قلیل التعداد حصہ جس کے ذمہ دھرم کی حفاظت کا کام تھا یا جو قدیم زبان اور علوم سے محبت رکھتا تھا وہ اپنی قدیم مہذب زبان یعنی سنسکرت اور اس کے رسم خط کی حفاظت کے کام کو کرتا رہا ۔ جب مسلمانوں کی حکومت اور امارت کا خاتمہ ہوا اور سیاسی رہنمائی ان کے ہاتھ سے نکل کر انگریزوں کے ہاتھ میں پہنچ گئی تو ہندوستان کے بہت سے دوسرے پرانے حکمرانوں مثلاً راجپوتوں کی طرح مسلمان بھی محکوم ہو گئے ۔ سرکار کی نگاہ میں سب محکوم رہ گئے ۔ ان کی بولیاں یکساں طور پر ورناکیولر یعنی غلاموں کی زبانیں تھیں فارسی کو سرکار نے راج بھاشا کے عہدہ سے برطرف کیا ۔ اس کی جگہ انگریزی نے لی ۔ لیکن چونکہ انگریزی کو عام کرنا مشکل تھا اس لئے ورناکیولروں کو ترقی دینے کی پالیسی اختیار کی گئی ۔ سرکار مساوات کی حامی تھی ۔ اعلیٰ اور شریف نسل کے مسلمان اور وہ ہندو شرفا جو مسلمانوں کے دربار سے متعلق تھے اس کے نزدیک ایسے ہی غلام تھے جیسے وہ لوگ جن کی مسلمان بادشاہوں کے دربار تک رسائی

نہ تھی۔ ان کے نزدیک "ہندوستانی" کی وہ شکل بھی غلاموں کی زبان تھی جو فارسی کے اثر سے شایستہ ہو گئی تھی اور وہ بھی جو گاؤں میں دربار سے دور رہنے کی وجہ سے غیر شایستہ سمجھی جاتی تھی۔ سرکار انگریزی نے اپنی ضرورت کے لئے جب اُردو اور ہندی کو ترقی دینے کا ارادہ کیا تو اس وقت شاعری نے تو دونوں زبانوں میں خاصی ترقی کر لی تھی مگر ان دونوں کا کوئی تحریری نثر کا ادب نہ تھا۔ دونوں زبانیں ملی جلی بول چال میں استعمال کی جاتی تھیں۔ مسلمان دربار سے جو لوگ قریب تھے وہ اُردو بولتے تھے اور جو دور تھے وہ بھاشا بولتے تھے۔ انگریزی سرکار نے دونوں کو ترقی کا مساوی موقع دیا اور دونوں کا نثر کا ادب بننا شروع ہوا۔ اُردو میں فارسی عربی کے زیادہ الفاظ آنا شروع ہوئے اور اس کا رسم خط عربی ہو گیا اور ہندی کو شایستہ بنانے کے لئے سنسکرت سے مدد لی گئی اور تحریر کے لئے سنسکرت کا رسم خط اختیار کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بولی کی مشترک زبان کی جگہ دو تحریری زبانیں جدا جدا بن گئیں اور دونوں بول چال کی عام زبان سے بہت دور ہٹ گئیں اور صرف سنسکرت یا فارسی جاننے والے قلیل التعداد تعلیم یافتہ گروہ تک محدود ہو گئیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کس کو ہندوستان کی مشترک قومی زبان کہا جائے۔ یہاں محض "ہندوستانی" کے لفظ کو استعمال کرنے سے کام نہیں چلتا۔ شایستہ اور تربیت یافتہ اُردو اور ہندی لکھنے والوں کی تحریریں اور تقریریں اور نظم و نثر اس درجہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں کہ ایک زبان کا ادیب اور عالم دوسری زبان کے ادیب اور عالم کا مفہوم سمجھنے سے بالکل قاصر ہوتا ہے۔ جو لوگ دونوں زبانوں کے اخبار و رسائل پڑھتے ہیں، سیاسی اور مذہبی تقریریں سنتے ہیں اور مشاعروں اور کوی سمیلنوں میں شریک ہوتے ہیں وہ اس دشواری کو پوری طرح محسوس کرتے ہیں۔

جیسا اوپر بیان کیا گیا اُردو اور ہندی ابھی تک ایک تعلیم یافتہ گروہ تک محدود رہی ہیں لیکن تعلیم جس قدر وسیع اور عام ہوتی جائے گی اتنا ہی کم از کم اس علاقہ میں جہاں ہندوستانی بولی اور سمجھی جاتی ہے اُردو یا ہندی کا رواج بھی عام ہونا لازمی ہے۔ لیکن اگر ان دونوں زبانوں کا فرق قائم رہا تو جس جگہ کی زبان کو آج ہم نے "ہندوستانی" کہا ہے وہاں اس کی جگہ ہمیں دو مستقل زبانوں کا ذکر کرنا پڑے گا

کچھ عرصہ سے اردو اور ہندی کے مسئلہ نے ایک مذہبی رقابت کا رنگ اختیار کر لیا ہے لیکن پھر بھی ابھی تک اُردو کے بولنے، لکھنے اور چھاپنے والوں میں ایک بڑی تعداد مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مذہب والوں کی بھی ملتی ہے۔ اُردو کے بعض بہترین ادیب و شاعر، بہترین اخبار اور رسالے اور بہترین ناشر ہندو ہیں بعض ہندو ریاستوں میں بھی اُردو ابھی تک درباری زبان رہ چکی ہے۔ اس لئے اُردو کو ایک فرقہ کی زبان نہیں کہا جا سکتا۔ مگر ہندی کی حیثیت ایک فرقہ کی زبان کی ہے اور فرقہ پرستی کے جذبات کو اُبھار کر ہی اس کو فروغ دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ہندی کے پرانے شاعروں میں چاہے کتنے ہی مسلمان کیوں نہ رہے ہوں۔ لیکن موجودہ زمانہ میں ہندی تقریباً تمام تر ہندوؤں کی زبان ہو کر رہ گئی ہے۔ ہندی کے پھیلانے کے لئے بہت سرگرمی سے کوششیں کی جا رہی ہیں اور بہت منظم اور مستقل ادارے اس کے لئے کوشش کر رہے ہیں اور اس کام میں مذہبی تعصبات، تاریخی روایات اور قومی جذبات سب سے کام لیا جا رہا ہے ہندو مذہب، فلسفہ، علم و ادب اور قدیم تہذیب و تمدن کا گہوارہ چونکہ سنسکرت ہے اس لئے سنسکرت کے الفاظ کو زیادہ رواج دینا گویا قدیم ہندو تہذیب کے تخیلات کو زندہ کرنا ہے۔ اسی بنا پر جو ہندو اپنی قدیم تاریخ سے محبت رکھتے ہیں وہ ہندی کے اختیار کرنے کی طرف مائل ہیں۔

پھر ایک دوسرا اثر بھی ہے جو "ہندوستانی" میں سنسکرت کے لفظوں کو زیادہ داخل کرنے کا سبب ہو رہا ہے۔ کچھ دنوں سے ہندی کی ترویج و اشاعت اور مربیانہ سرپرستی کا کام ان لوگوں کے ہاتھ سے نکل کر جن کی مادری زبان فی الواقع ہندوستانی ہے ان لوگوں کے ہاتھ میں پہنچ رہا ہے جن کی مادری زبان ہندوستانی نہیں ہے بلکہ جو مذہبی عقیدت یا تہذیب و تمدن کے اشتراک اور مشترکہ قومیت کی تعمیر کے سلسلہ میں ہندی کو ترقی دینا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے یہ توقع کرنا کہ یہ مقامی محاوروں اور زبان کی لطافتوں، نزاکتوں اور سلاستوں کو سمجھ سکیں گے فضول ہے یہ لوگ سنسکرت خوب جانتے ہیں۔ انگریزی اور مغربی زبانوں کے ادب سے بھی ان کی واقفیت اچھی ہے یہ لوگ مغربی ڈھنگ کی ٹھوس اور چست زبان کے عادی ہو گئے ہیں مگر اپنی مادری زبان پر یا تو انہیں پورا عبور نہیں ہے یا اسے اپنے اظہار مطلب کے لئے

نالائق سمجھتے ہیں یا اس کے دائرہ کو تنگ اور محدود پاتے ہیں۔ بہر حال اپنی مقامی زبانوں کے علم و ادب کو ترقی دینے کے لئے یہ سنسکرت سے مدد لے رہے ہیں اور ہندی کو ترقی دینے میں بھی انہیں سہولت اس میں نظر آتی ہے کہ "ہندوستانی" کے لفظوں اور محاوروں کی جگہ اس میں قدیم سنسکرت کے لفظ اور محاورے رائج ہو جائیں۔

مرہٹی، گجراتی اور بنگالی پر مسلمانوں کے زمانہ حکومت میں فارسی عربی کا بہت اثر پڑا تھا۔ اگر ان زبانوں کو خالص بنانے کی کوششیں بعد میں نہ کی جاتیں اور بول چال کی زبان پران کے علم و ادب کی تعمیر کو جاری رکھا جاتا تو ان میں جتنے اس وقت فارسی عربی کے لفظ گھلے ملے نظر آتے ہیں اس سے بہت زیادہ مل سکتے اور اُردو سے یہ آج بہت قریب ہوتیں لیکن خالص بنانے والی تحریکوں نے ان میں سنسکرت کا عمل دخل بہت بڑھا دیا ہے۔

جنوبی ہند کی دراوڑی زبانوں نے فارسی عربی کے الفاظ کو نسبتاً کم قبول کیا ہے مگر برہمنوں کے زیر اثر جن کی طاقت جنوبی ہند میں صدیوں سے بہت مضبوط چلی آرہی ہے ان زبانوں میں سنسکرت کے الفاظ بہت شامل ہو گئے ہیں۔ اس لئے جنوبی ہند کے ہندوؤں سے میل جول بڑھانے کے لئے بھی ہندی کے حامی ہندی میں سنسکرت کے الفاظ کا زیادہ استعمال کرنا مفید سمجھتے ہیں۔

بہر حال ان تمام رجحانات کا نتیجہ ممکن ہے یہ نکلے کہ آیندہ اُردو بھی ہندی کی طرح ایک مذہبی فرقہ کی زبان بن جائے اور اُردو کے ہندو لکھنے والے جن میں اکثر ہندی کو بھی شاعری کی زبان کی حیثیت سے اچھی طرح جانتے ہیں شاید اُردو کو چھوڑ کر ہندی کو اپنی زبان بنالیں اور اُردو کے لکھنے والوں میں ہندوؤں کا اضافہ بند ہو جائے لیکن فی الحال اُردو کا حلقہ ہندی کے مقابلہ میں زیادہ وسیع معلوم ہوتا ہے۔ وہ لوگ بھی جو اپنی زبان ہندی بتلاتے ہیں بلا تکلف ان لفظوں اور اصطلاحوں کا زیادہ استعمال کرتے ہیں جو اُردو میں رائج ہیں۔ عدالت کی زبان میں اُردو کی اصطلاحیں تقریباً ہر صوبہ میں عام ہیں۔ اُردو کے اخبار رسالوں اور کتابوں کی تعداد بھی خاصی کثیر ہے۔ اُردو کے مشاعرے بھی ملک میں کثرت سے ہوتے ہیں۔ اُردو کے گانے فلم ڈرامے بھی بہت مقبول ہیں اُردو کی ایک یونیورسٹی

بھی ہے۔ تنگ نظر، متعصب اور فرقہ پرست گروہ کو جو اُردو کے تمام لفظوں سے ہندی کو پاک کرنا اپنی زندگی کا مشن بنا چکا ہے اور جو اس کوشش میں ہندی کو عوام کی زبان سے برابر دور ہٹاتا چلا جا رہا ہے، اگر نظر انداز کر دیا جائے تو باقی تمام ہندی بولنے اور لکھنے والے ایسے فارسی اور عربی لفظوں کو جو عام طور پر لوگوں کی زبان پر چڑھ گئے ہیں زبان سے خارج کرنا نہیں چاہتے۔ پھر مسلمان ہندوستان میں جہاں کہیں بھی ہیں وہ اُردو کو بولتے لکھتے اور سمجھتے ہیں اور اپنے آس پاس کے ہندوؤں کو بھی اُردو سے کم و بیش واقف کرا دیتے ہیں۔ اس لئے اگر اُردو کو اس وقت ہندوستان کی قومی زبان کہا جائے تو یہ دعوے ہندی کے اسی قسم کے دعوے کے مقابلہ میں کسی طرح غلط نہیں کہا جا سکتا۔

مگر ہمارے فیصلے کے لئے محض یہ بات کافی نہ ہونا چاہئے۔ ہماری تحریری تمام زبانیں ابھی تک ہماری کثیر آبادی کے صرف ایک بہت مختصر حصہ تک پہنچی ہیں۔ محض اس مختصر حصہ کے تناسب کو دیکھ کر ہمیں آئندہ نسل کی قومی زبان کے متعلق رائے قائم کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ تغیر پذیر زبانوں میں اور بڑھتی ہوئی تحریکوں کی موجودگی میں ہمیں موجودہ حالات سے زیادہ مستقبل کے امکانات اور رجحانات پر نظر کرنا چاہئے۔ اس وقت لوگوں میں جو شدید تمنائیں، حوصلے، سرگرم کوششیں، مستقل اور منظم ادارے، تعلیم گاہیں اور مخلص کارکنوں کی جماعتیں پائی جاتی ہیں ان کے مشاغل کی طرف ہمیں توجہ کرنا چاہئے۔ ہمیں دیکھنا چاہئے کہ نشوونما، ترقی، جذب و انجذاب، حملہ و مدافعت، مقابلہ و مسابقت کی اہلیت، زندگی اور طاقت، جذبۂ ایثار، رواداری، طاقتور سیاسی جماعتوں، امیروں اور لکھ پتیوں کی سرپرستی اور عوام کی حمایت اور ان میں مقبولیت موجودہ زبانوں میں سے کسے سب سے زیادہ حاصل ہے۔ جس زبان کو یہ چیزیں زیادہ ملی ہوئی ہیں یا جو زبان انہیں دوسروں سے پہلے حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہے وہی آئندہ کی قومی زبان ہے۔ ہمیں ان باتوں پر جذبات اور تعصبات سے خالی ہو کر اور تعمیری نصب العین کو سامنے رکھ کر غور کرنا چاہئے اور جو نتیجہ نکلے اسی کے مطابق اپنے آئندہ طرزِ عمل کی تشکیل کرنا چاہئے۔

اُردو کے جو حامی اُردو کو مسلم فرقہ کی زبان نہیں بلکہ کل ہندوستان کی قومی زبان بنانا چاہتے ہیں

اسمیں چند بنیادی تبدیلیاں اپنی پالیسی میں کرنا ہوں گی۔ ان کے سامنے لایق توجہ مسایل حسب ذیل ہیں :۔

(۱) جو ہندو اس وقت اُردو بولتے یا لکھتے ہیں وہ مذہبی تعصب کی وجہ سے اُردو کا بولنا یا لکھنا نہ چھوڑیں۔

(۲) جو "ہندوستانی" بولنے والے عوام خصوصاً دیہات کے رہنے والے تعلیم پائیں انھیں اُردو میں ایسی زبان لکھی ہوئی ملے جو ان کے بول چال کے تلفظ اور محاوروں سے قریب ہو اور جن میں ان کی مذہبی، معاشی اور معاشرتی زندگی کا عکس بھی موجود ہو۔

(۳) طاقتور اور ترقی پسند سیاسی جماعتوں کی امداد اور سرپرستی اسے حاصل ہو۔

(۴) جو ہندو "ہندوستانی" نہیں بولتے انھیں اُردو کے الفاظ بالکل اجنبی اور نامانوس نہ معلوم ہوں۔

اس غرض کے لئے اگر اُردو کے ادیب مندرجہ ذیل پالیسی اختیار کریں گے تو اُردو کی توسیع میں بہت امداد ملے گی :۔

(۱) ہندو مذہب، فلسفہ، علم و ادب اور قدیم تہذیب و تمدن کے بارے میں اُردو میں کتابیں شائع کرنا۔

(۲) بول چال کی عام "ہندوستانی" زبان کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرنا اور اس میں اگر موجودہ معیار فصاحت کو قربان کرنا پڑے تو اس سے بھی دریغ نہ کرنا۔

(۳) سنسکرت کے الفاظ کو اُردو میں زیادہ رواج دینا

(۴) ترقی پسند قومی تحریکوں خصوصاً سوشلزم کے رہنماؤں سے میل رکھنا اور ان کے مشورہ سے ان تحریکوں کے متعلق خوب لٹریچر شایع کرنا۔

(۵) عام فہم قومی نظموں، گیتوں، افسانوں، قصہ کہانیوں ناولوں ڈراموں کو لکھنا۔

(۶) جو فارسی عربی کے الفاظ گجراتی مرہٹی بنگالی اور جنوبی ہند کی دراوڑ زبانوں میں رایج ہوں ان کو اُردو میں بالکل انھیں معنوں میں رایج کرنا جو ان کے ان زبانوں میں ہوں۔

(۷) دیوناگری رسم خط میں اُردو زبان کے مقبول عام ناول ڈرامے، کہانیاں نظمیں شایع کرنا

(۸) گجراتی، مرہٹی، بنگالی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں ایسی کتابیں شایع کی جن میں اُردو کے الفاظ زیادہ آئیں۔

(۹) ہندوستان کے ہر صوبہ میں ترقی پسند تحریکوں کے ساتھ ایسے مقرر شاعر اور گانے والے بھیجنا جو اُردو زبان کے الفاظ کو مقبول کرا سکیں۔

(۱۰) زوال پذیر زمینداروں اور دیسی ریاستوں سے جہاں تک ہو سکے اپنا تعلق منقطع کرنا۔

مندرجہ بالا وہ تدبیریں ہیں جن سے اُردو زبان کی اشاعت کو بڑھایا جا سکتا ہے۔ اگر کام کرنے والوں میں خلوص، ایثار، جذبۂ مسابقت، ولولہ، ہمت، امنگ، زندگی اور طاقت ہو تو اُردو ضرور ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان بن سکتی ہے۔

ہندی ادبی سبھا

(ہندی ساہتیہ سمیلن)

(ذیل میں ہم ہندی ساہتیہ سمیلن (ہندی ادبی سبھا) کی تاریخ اور اس کے طریقہ کار کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کرتے ہیں۔ اس کے دیکھنے سے اندازہ کیا جا سکے گا کہ ہندی والے کس خلوص اور سرگرمی سے اپنی زبان کے لئے کوشش کر رہے ہیں اور اُردو والوں کو کس قدر اپنی رفتار کو تیز کرنا چاہیئے)۔

مختصر تاریخ | سمیلن کی بنیاد ۲۰ سال پہلے یعنی ۱۹۱۰ء میں پنڈت مدن موہن مالویہ جی کی صدارت میں بنارس میں رکھی گئی تھی۔ اس وقت سے اب تک سمیلن کے اجلاس ملک کے مختلف حصوں مثلاً کلکتہ، لاہور، اندور، گوالیار، پٹنہ، بھاگلپور، کانپور، بھرت پور اور دہلی وغیرہ میں ہو چکے ہیں۔ سمیلن کا مقصد ہندی کی ترقی کے لئے کوشش کرنا ہے۔ سمیلن نے اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے جن کاموں کو ہاتھ میں لے رکھا ہے ان میں خاص طور پر لائق ذکر نیچے درج کئے جاتے ہیں۔

سمیلن کے امتحانات | مدرسوں میں ہندی کی جو تعلیم رایج تھی اس کے معیار کو بلند کرنے کے لئے سمیلن نے اپنے بھاگلپور کے اجلاس (۱۹۱۳ء) کے بعد ہندی ادب کے ابتدائی، درمیانی اور اعلیٰ امتحانوں کا سلسلہ جاری کیا اور اس طرح عملی کام کا نمونہ سامنے رکھ کر، موجودہ تعلیم گاہوں کو ہندی کی تعلیم کی طرف متوجہ کیا۔ سمیلن کے امتحانوں کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ اب تک تقریباً ۵۰۲ جگہوں میں اس کے امتحانوں کے مرکز کھل چکے ہیں

قدیم ادب کی اشاعت | سمیلن نے دوسرا کام قدیم ادب کی اشاعت کا اپنے ہاتھ میں لیا۔ اُس وقت تک تلسی داس جی کی راماین کو چھوڑ کر دوسرے قدیم شاعروں کی تصانیف پر ہندی میں بہت کم کتابیں ملتی تھیں۔ مہاراجہ بڑودہ کے عطیہ سے فایدہ اٹھا کر سمیلن نے اس کام کو شروع کیا اور "سولبھ گرنتھ مالا" نکالی جس کی زیادہ تر کتابیں طالب علموں کے امتحان کے کام کی تھیں۔ سمیلن نے جب ایک دفعہ اس کام کو

شروع کر دیا تو دوسرے ناشروں نے بھی اس طرف توجہ کی اور اب یہ کام خاصا آگے بڑھ گیا ہے۔

بلند پایہ تصانیف کے لئے انعام | اس کے بعد ساہتیہ سمیلن کا دھیان نوبل پرائز کی طرح کوئی انعام مقرر کر کے ہندی میں اعلیٰ کتابوں کی تصنیف اور ہندی ادیبوں کی حوصلہ افزائی کی طرف گیا۔ شری گوکل چند نے ۴۰ ہزار روپیہ کا پرامیسری نوٹ سمیلن کو اس کام کے لئے دیا جس سے ہر سال بارہ سو روپیہ کا انعام باری باری سے ادب، تاریخ، سائنس اور فلسفہ کی بہترین کتابوں کے لئے دیا جاتا ہے۔ انعام کے فیصلہ کے لئے ملک کے مشہور عالم منتخب کئے جاتے ہیں۔

بہترین مصنفہ کو انعام | خواتین کو تصنیف و تالیف کی طرف مائل کرنے کا انتظام بھی سمیلن نے کیا ہے۔ اس کام کے لئے پانسو روپیہ پانچ برس تک دینے کا وعدہ شری سیتارام سیکسریا جی نے کیا تھا۔ اس سال اس کی مدت ختم ہونے والی تھی لیکن سیکسریا جی نے اس انعام کو جاری رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

ہندی پرچار | اس کے علاوہ سمیلن ہندی کی نشر و اشاعت کا کام بھی کرتی ہے اور اسے سمیلن نے سب سے زیادہ اہمیت دے رکھی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اونچی چوٹی کا ادب تو جماعتوں کے ذریعہ تیار کرانا ممکن نہیں ہے۔ یہ کام تو غیر معمولی قابلیت کے افراد کا ہی ہوتا ہے۔ لیکن معمولی ادب اور زبان کی نشر و اشاعت کا کام البتہ کامیابی کے ساتھ جماعتی ادارے انجام دے سکتے ہیں۔ مہاتما گاندھی ہمیشہ سے ہندی پرچار پر زور دیتے رہے ہیں۔ ایک مرتبہ پرشوتم داس جی ٹنڈن کو انھوں نے لکھا تھا کہ "میرے لئے ہندی کا سوال سوراج کا سوال ہے۔ قوم کی ترقی اور بہبود سب کچھ زبان پر منحصر ہوتی ہے ہم انگریزی زبان کے ذریعہ قومیت کا تخیل لوگوں میں پیدا نہیں کر سکتے۔" ۱۹۱۸ء کے اندور کے اجلاس کے صدر مہاتما گاندھی چنے گئے تھے۔ اس کے بعد سے ہندی پرچار کا کام مہاتما گاندھی کی نگرانی میں دن بدن بڑھتا گیا۔ ہندی سمجھنے میں سب سے زیادہ مشکل مدراس والوں کو ہوتی ہے اس لئے سب سے پہلے ۱۹۱۸ء میں وہاں کام شروع کیا گیا۔ آج مدراس میں دکن ہندی پرچارنی سبھائی کوشش سے لاکھوں آدمی ہندی سمجھنے لگے ہیں اور لاکھوں ہندی کتابوں کی کھپت وہاں ہونے لگی ہے آسام اور اڑیسہ میں بھی

ہندی پرچار کا کام مشرقی ہندی پرچار کمیٹی کی نگرانی میں ہو رہا ہے

__ہندی میوزیم__ | کانپور والے اجلاس (۱۹۲۳ء) میں بابو پرشوتم داس ٹنڈن نے سمیلن کے سامنے ہندی میوزیم کھولنے کی تجویز رکھی تھی۔ میوزیم کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی تھی کہ ہندی قدیم قلمی کتابیں دن بدن ضائع ہوتی جا رہی تھیں اس مقصد کے لئے چار لاکھ روپیہ جمع کرنے کی اپیل کی گئی تھی لیکن یہ رقم پوری جمع نہ ہو سکی۔ فی الحال ۲۶ ہزار روپیہ کی ایک عمارت الہ آباد میں تعمیر ہو گئی ہے جس کا افتتاح ابھی حال میں مہاتما گاندھی نے کیا ہے۔

__بھارتیہ ساہتیہ پریشد__ | ۱۹۳۵ء میں مہاتما گاندھی کی صدارت میں اندور میں پھر ایک اجلاس ہوا۔ جس میں دو اور نہایت اہم کاموں کو سمیلن نے اپنے ذمہ لیا ہے جن کا اثر نہ صرف ہندی زبان بلکہ ملک کے تمام تمدن و تہذیب پر پڑ سکتا ہے۔ ان میں سے ایک کام ہے دیوناگری رسم الخط کو اختیار کرنے کے لئے ہندوستان کی مختلف زبانوں کو مائل کرنا اور اس مقصد کے لئے دیوناگری رسم الخط کی بعض موجود خامیوں کی اصلاح کرنا۔ دوسرا کام ہے ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادیبوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنا اور ہندی زبان کے ذریعہ انھیں باہم ایک دوسرے کے ادب سے واقف کرانا۔ اس دوسرے مقصد کے لئے کنہیا لال منشی صاحب اور منشی پریم چند صاحب کی مشترکہ ادارت میں اکتوبر ۱۹۳۵ء سے ایک ماہوار رسالہ "ہنس" نکل رہا ہے جس میں ہندوستان کی مختلف زبانوں کا ادب پیش کیا جاتا ہے اور ناگپور میں ۲۴ اپریل ۱۹۳۶ء کو پہلا اجلاس بھارتیہ ساہتیہ پریشد (وفاق ادبیات ہند) کا ہوا ہے جس میں ہندوستان کی تقریباً تمام زبانوں کے نمائندے شریک ہوئے تھے۔

__طریقہ کار__ | سمیلن کا کام دو طرح انجام پاتا ہے۔ ایک تو خود سمیلن کی براہ راست نگرانی میں اور دوسرے ایسے آزاد اداروں کے ذریعہ جن کا سمیلن سے الحاق ہے۔ پہلے ہم سمیلن کے ان کاموں کو لیتے ہیں جنھیں سمیلن براہ راست انجام دیتی ہے۔ ان کے پورا کرنے کے لئے کاموں کو پانچ شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر شعبہ کے لئے شعبہ وار کمیٹیاں مقرر کی جاتی ہیں جو اپنے ناظم کے کام میں مدد دیتی ہیں۔ امتحان کے کام کو تو مستقل طور پر اصل میں ہندی وشو ودیالیہ پریشد چلاتی ہے۔ لیکن اس کی نگرانی کے لئے

بھی پندرہ ارکان کی ایک " امتحان کمیٹی " ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ " ادبی کمیٹی " ادب کے شعبہ کو اور " پرچار کمیٹی " ہندی کے نشر و اشاعت کے شعبہ کو چلاتی ہے " انتظامی کمیٹی " سبھا کے تمام انتظامی معاملات کی نگرانی کرتی ہے اور " مالیاتی کمیٹی " آمد و خرچ کی دیکھ بھال کرتی ہے۔

سبھا کی مالی حالت کمیٹی کی آمد و خرچ کا ششماہی حساب رکھا جاتا ہے۔ ذیل میں ہم دو ششماہیوں کی آمدنی اور خرچ کی خاص خاص مدوں کو درج کرتے ہیں۔

ماگھ سـ۱۹ـہ ب سے اساڑھ سـ۹۲ـہ ب تک

آمدنی		خرچ		
مد	رقم (روپیہ)	مد	رقم (روپیہ)	کیفیت
۱۔ پچھلی ششماہی کی بچت	۵۸،۹۸۳			
۲۔ انتظامی شعبہ	۷۵۳	۱۔ انتظامی شعبہ	۶۲۱	تنخواہیں ۲۹۷ روپیہ
۳۔ انعامات	۳۰	۲۔ انعامات	۱۳۳	
۴۔ نول پرائز کے طور کا انعام	۷۰۱	۳۔ نول پرائز کے طور کا انعام	۱،۲۴۷	
۵۔ سیکسریا انعام	۵۰۴	۴۔ سیکسریا انعام	۵۴	
۶۔ پرچار کا شعبہ	۱۳۰	۵۔ پرچار کا شعبہ	۱۵۳	
۷۔ ادبی شعبہ	۱،۱۵	۶۔ ادبی شعبہ	۲۵۷	سو۔ سا۔ مالا کے لئے ۲۰۷ روپیہ
۸۔ سبھا اخبار	۱۰۵	۷۔ سبھا اخبار	۱۰۵	
۹۔ ار۔ و۔ گرنتھ	۵۲	۸۔ امتحان کا شعبہ	۳،۵۵۹	۲،۵۰۰ روپیہ ہندی میوزیم کو دیئے گئے اور ۶۲۸ تنخواہ کے لئے
۱۰۔ امتحان کا شعبہ	۷۹۴	۹۔ کتب خانہ	۵	
۱۱۔ پراویڈنٹ فنڈ	۱۳۲			
۱۲۔ ہندی میوزیم	۷ ر۳	۱۰۔ مایورا گھوداس	۳۱	

١٣۔ ستیہ نرائن کشیر	٥٠٠	١١۔ وشمبر ناتھ زنجن	٥٦	
١٤۔ اصلاح رسم الخط	٣	١٢۔ کیلاش پرنٹنگ پریس	٨٨	
١٥۔ بابو رگھوداس	١٢	١٣۔ اصلاح رسم الخط	٣٠	
میزان کل	٩٣,٨٩١	میزان	٦,٨٦٨	
		بچت	٨٧,٠٢٣	
		میزان کل	٩٣,٨٩١	

ساون سنہ ۹۲ سے پوس سنہ ۹۲ تک

آمدنی		خرچ		
مد	رقم (روپیہ)	مد	رقم (روپیہ)	کیفیت
١۔ پچھلی چھ ماہی کی بچت	٨٧,٠٢٣			
٢۔ انعامات	٩٦			
٣۔ نوبل پرائز کے طرز کا انعام	٩٦٠	١۔ نوبل پرائز کے طرز کا انعام	٤٣	
٤۔ سیکسریا انعام	٣	٢۔ سیکسریا انعام	٣	
٥۔ ستیہ نرائن کشیر	١٢٩	٣۔ انتظامی شعبہ	٩٩٤	٢٢٤ روپیہ سیل کھاتہ میں جمع کے دئے گئے اور ٧٧٤ روپیہ تنخواہ کی حساب میں
٦۔ پراویڈنٹ فنڈ	١٠٤			
٧۔ انتظامی شعبہ	٨٩٤ روپیہ [illegible]	٤۔ امتحان کا شعبہ	٣,٩٠١	٥٧٨ را روپیہ کاغذ میں لگائے گئے اور ٦٦٥ روپیہ تنخواہ کے
٨۔ امتحان کا شعبہ	٥,٠٣١	٥۔ پرچار کا شعبہ	١٧٦	
٩۔ پرچار کا شعبہ	١,٠٤٠	٦۔ ادبی شعبہ	٥٨٧	سوبھا۔ مالا کے لئے ٤٧٦ روپیہ

۱۔ ادبی شعبہ	۱،۶۹۹	۷۔ کتب خانہ	۵	
۱۱۔ گیلاٹس پرنٹنگ پریس	۴۵	۸۔ بالوراگھوداس	۱۶	
		۹۔ اصلاح رسم الخط	۳۰	
میزان کل	۱،۰۱،۳۱۴	میزان	۵،۷۶۵	
		بچت	۹۵،۵۴۷	
		میزان کل	۱،۰۱،۳۱۴	

اوپر کے آمد و خرچ کے حساب دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی ششماہی میں ۷ ہزار ۰۹۰ روپیہ کی آمدنی اور ۶ ہزار ۸۶۸ روپیہ کا خرچ ہوا۔ دوسری ششماہی میں ۱۴ ہزار ۰۲۹ روپیہ کی آمدنی ہوئی اور ۵ ہزار ۷۶۵ روپیہ کا خرچ ہوا۔ دونوں ششماہیوں کی مجموعی آمدنی ۲۲ ہزار ۷۱۹ روپیہ اور خرچ ۱۲ ہزار ۶۳۳ روپیہ ہو جس میں سے ۹ ہزار ۴۵۵ روپیہ پس انداز کیا گیا۔ کل پس انداز کی ہوئی رقم جو سمیلن کے پاس سال کے آخیر میں تھی ۹۵ ہزار ۵۴۷ روپیہ تھی گویا تقریباً ایک لاکھ روپیہ کے سرمایہ کی تقویت سمیلن کو اس وقت حاصل ہے اور اس کا سالانہ خرچ ۱۲ ہزار روپیہ ہے جس کے لئے سالانہ آمدنی نہ صرف کافی ہوتی ہے بلکہ اتنی زاید ہوتی ہے کہ خرچ کی بیشتر رقم بچائی بھی جا سکتی ہے۔

<u>سمیلن کے امتحانات</u> | سمیلن کے امتحانات کا شعبہ بہت اہم شعبہ ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعلق زیادہ تفصیلی معلومات فراہم کی جائیں۔ <u>۱۹۳۳-۳۴ء</u> میں سمیلن کے سب امتحانوں پر مجموعی طور پر ایک ہزار ۵۳۵ امیدوار شریک ہوئے تھے۔ <u>۱۹۳۴-۳۵ء</u> میں ایک ہزار ۶۵۹ امیدواروں کی درخواستیں آئیں یعنی پہلے سال کے مقابلہ میں دوسرے سال ۹ فی صدی زیادہ امیدوار شریک ہوئے کئی سالوں سے تقریباً اسی طرح طالب علموں کی تعداد بڑھ رہی ہے جس سے سمیلن کے امتحانوں کی عام مقبولیت اور مفید ہونے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

امتحانات کے ۱۶ شعبے ہیں:۔ (۱) ہندی ادب (۲) تاریخ (۳) جغرافیہ (۴) حساب

۵) علم سیاست (۶) معاشیات (۷) سنسکرت (۸) فلسفہ (۹) انگریزی (۱۰) دھرم شاستر (۱۱) ویدک لو تشریح اعضا (۱۲) سائنس (۱۳) زراعت (۱۴) نیمی اور منشی گیری (۱۵) عرائض نویسی (۱۶) صحافت۔

مندرجہ بالا امتحانوں میں وید وشارد اور کرشی (زراعت) وشارد کے امتحانات نے نئے کھلے ہیں اس لئے ان میں شریک ہونے والے امیدواروں کی تعداد کم رہتی ہے مگر وید وشارد کے امتحان کو یو۔ پی۔ انڈین میڈیسن بورڈ نے رجسٹری کے لئے منظور کر لیا ہے۔ اس لئے اس امتحان میں کامیاب ہونے والے امیدواروں کا ۵ سال کی پریکٹس کے بعد دوسرے درجہ کے ویدوں میں شمار ہو سکتا ہے

ان امتحانوں کی تنظیم اور نگرانی کا کام ۱۴ ممبروں کی ایک امتحان کمیٹی اور ۴۰ ممبروں کی ایک وشو ودیالہ پریشد انجام دیتی ہے۔ تعلیمی کمیٹی کے ممبروں میں مہاتما گاندھی کا نام سب سے اول ہے۔ ان کے علاوہ کئی پروفیسر، ڈاکٹر اور مشہور پنڈت ہیں۔ پریشد میں بھی مہاتما گاندھی کا نام سب سے اول ہے ان کے علاوہ ڈاکٹر بھگوان داس اور بہت سے دوسرے معزز لوگوں کے نام ہیں۔

ہر شعبہ کے ممتحنوں اور ماڈریٹرس کی الگ الگ کمیٹیاں بنائی جاتی ہیں۔ ممتحنوں کی کمیٹی کے پانچ ارکان ہوتے ہیں جن میں ایک کنوینر ہوتا ہے۔ ماڈریٹرس کی کمیٹی کے تین رکن ہوتے ہیں جن میں ایک کنوینر ہوتا ہے۔ ان ممتحنوں اور ماڈریٹرس میں ہر شعبہ کے ماہروں اور اہل علم حضرات کے نام نظر آتے ہیں ان میں یونیورسٹیوں کے پروفیسر اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر اور سینئر ٹیچر، پنڈت محکمہ تعلیمات کے نگراں سب شامل ہیں یہ سب لوگ اعزازی طور پر کام کرتے ہیں۔ لیکن جس محنت، جانفشانی اور احساس فرض کے ساتھ یہ اپنے کاموں کو انجام دیتے ہیں وہ نہایت لائق تعریف ہیں۔ امتحان کا کام خاصا پیچیدہ کام ہے اس میں ممتحنوں کے علاوہ نگراں امتحان، ٹیبولیٹرس وغیرہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن سمیلن کے لئے یہ سب کام اعزازی طور پر کئے جاتے ہیں۔

سمیلن کی طرف سے اب تک ۲۵۰ مرکز کھولے جا چکے ہیں۔ اس سال سمیلن کے امتحانات ۲۰۱ مرکزوں میں ہوئے تھے ان میں سے ۱۱۸ مرکزوں کا معائنہ کرایا گیا تھا تقریباً سب ہی مرکزوں کی حالت ٹھیک تھی۔ صرف تین مرکزوں کی حالت اچھی نہیں تھی اس لئے امتحان کمیٹی کے فیصلہ سے وہ مرکز

توڑ دیے گئے۔

۱۹۴۳-۴۴ء کے مختلف امتحانوں کا نقشہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے ؛۔

نام امتحان	کتنی درخواستیں آئیں	کتنے شریک ہوئے	کتنے کامیاب ہوئے	فی صدی
ابتدائی	۷۸۶	۶۶۶	۴۴۳	۶۶
درمیانی	۶۹۱	۵۷۸	۲۵۹	۴۳
اعلیٰ	۷۴	۶۱	۴۴	۸۶
ہندی	۱۹	۱۸	۹	۵۰
عرائض نویسی	۴	۲	۲	۱۰۰
قومی زبان کی تبلیغ	۵۷	۴۳	۳۳	۷۶
ویدہ وشارد	۲۶	۲۲	۲	۹
کرشی (زراعت) وشارد	۲	۲	۲	۱۰۰
صحافت	۱	۱	۱	۱۰۰

سمیلن سے ملحقہ ادارے | ابھی تک ہم نے ان کاموں کا مطالعہ کیا ہے جنھیں سمیلن براہ راست انجام دیتی ہے۔ اب ہم ان آزاد اداروں کے کام کی طرف بھی توجہ کرتے ہیں جن کا سمیلن سے الحاق ہے۔

نام مقام	نام ادارہ	خاص کام
اندور	وسط ہند ہندی ساہتیہ کمیٹی	دس بارہ ہزار سالانہ کی آمدنی اور ایک عالیشان مکان "سرسوتی نکیتن" ۱۵ ہزار کا پریس اور عمارت اور ۵۵ ہزار کا بسنے کا مکان۔ "وینا" نامی رسالہ نکلتا ہے

		سمیلن کے امتحانوں اور پڑھائی کا بھی انتظام ہے۔ ایک تعلیم گاہ کھولنے کی اجازت بھی سمیلن نے دیدی ہے۔ بہت سی سلسلہ کی کتابیں بھی شائع کی جاتی ہیں۔
مدراس	دکن بھارت ہندی پرچار سبھا۔	اس کے کام کا مفصل حال علیحدہ بیان کیا گیا ہے۔
ابوہر (پنجاب)	ساہتیہ سدن	۴۰ ہزار روپیہ کی لاگت کا مکان۔ اس کی سرپرستی میں کئی کتب خانے اور دار المطالعے چل رہے ہیں۔ ایک دیہاتی اخبار "دیپک" نام کا نکلتا ہے۔ بیکانیر بھاولپور اور پٹیالہ میں ہندی پرچار کا کام اس کی نگرانی میں ہوتا ہے۔
اورچھا راج (بندیلکھنڈ)	شری بیرندر کیسو ساہتیہ پریشد	مہاراج کی مہربانی سے کوئی مالی دشواری نہیں ہے۔ سمیلن کے امتحان کا مرکز اور کتب خانہ ہے۔ ۲ ہزار روپیہ کا ایک انعام اچھی کتاب لکھنے والے کو دیا جاتا ہے۔ سرکاری اصطلاحوں کے لئے ایک لغت تیار ہو رہا ہے۔ "بیر بندیل" نام کا ایک اخبار نکلتا ہے۔
مین پوری	پشپ بھاون پاڑھم	مدرسہ، کتب خانہ اور مقامی امتحانوں کا مرکز۔ بہت سی اعزازی کام کرنے والے آمدنی ۴۴۰ روپیہ خرچ ۴۲۴ روپیہ سالانہ
مین پوری	شری ماتھر کتب خانہ	۱۲۰ آمدنی اور اتنا ہی خرچ۔ کتابوں کی تعداد ۲ ہزار ۹۹۷ اور پڑھنے والوں کی تعداد دس ہزار ۲۶۵
کراچی	ہندی ساہتیہ بھون	دار المطالعہ، کتب خانہ

نام مقام	نام ادارہ	ادارے کے کام
مظفرپور (بہار)	ہندی ہتے شنی سبھا لال گنج۔	دارالمطالعہ، کتب خانہ، سیلن کے امتحانوں کی تیاری کے لئے مدرسہ امتحان کا مرکز اور کلب۔
آگرہ	شری ناگری پرچارنی سبھا	کتب خانہ۔ امتحان کا مرکز، مدرسہ، جلسے
جھالرا پاٹن	شری راجپوتانہ ہندی ساہتیہ سبھا۔	مہاراجہ اور سیٹھوں کی طرف سے بہت امداد ملتی ہے۔
رنگون	برما ہندی پرچار سبھا	تین مدرسے۔ امتحان کے مرکز۔ اور اپر برما کے ہندی پرچار کی تنظیم۔
سرسی	شری بال امر کمیٹی	بچوں کی تعلیم کا پرچار کتب خانہ
الہ آباد	پریاگ مہیلا ودیاپیٹھ	عورتوں کا مدرسہ عورتوں کے امتحانات خانہ داری۔ کھانا پکانا، سینا پرونا۔ عورتوں کا ہال ہندوستان کے کئی صوبوں سے لڑکیاں پڑھنے کے لئے آتی ہیں۔
جالندھر	کنیا مہا ودیالہ	عورتوں کا مدرسہ۔ "جل ودسکھا" ایک رسالہ بھی نکلتا ہے ودوا آشرم اور یتیم خانہ بھی ہے۔
دہرہ دون	کنیا گروکل	اس میں گروکل وشوا ودیالہ کانگڑی کے امتحانوں کی پڑھائی کا انتظام ہے لڑکیوں کو سنسکرت اور ہندی خوب پڑھائی جاتی ہے۔
جوالاپور	گروکل مہا ودیالہ	یہاں برہم چاریوں کو سنسکرت کی تعلیم دی جاتی ہے۔
کانگڑی	گروکل وشو ودیالہ	اس کے تین شعبہ ہیں (۱) وید مہا ودیالہ (۲) معمولی مہا ودیالہ (۳) آیوروید مہا ودیالہ۔ اس میں جدید علوم کی تعلیم ہندی کے ذریعہ دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ آشرم، کتب خانہ وغیرہ ہیں اس کا کام ہندی والوں کے لئے مایہ ناز ہے۔

دکن بھارت ہندی پرچار سبھا اس ادارے کی ابتدا مہاتما گاندھی کی صدارت کے زمانے میں ۱۹۱۸ء میں ہوئی تھی اس نے جنوبی ہند میں ہندی پھیلانے کا بہت کام کیا ہے۔ اس کی طرف سے چار پانچ مدرسے قائم کیے جا چکے ہیں ایک اخبار نکلتا ہے۔ ایک اپنا پریس بھی ہے۔ پہلے اس سبھا کا کام سمیلن کی براہ راست نگرانی میں ہوتا تھا لیکن ۱۹۲۷ء میں جب سبھا مضبوط نظر آنے لگی تو سمیلن نے اسے آزادی سے کام کرنے کی اجازت دے دی۔ مہاتما گاندھی زندگی بھر کے لئے اس کے صدر بنا دئے گئے ہیں مدراس کے بہت سی تعلیمگاہوں نے اس سبھا کی کوشش سے ہندی کو اپنے امتحانوں میں داخل کرلیا ہے اس کی طرف سے ۴۵۰ مرکزوں میں ہندی پرچار کا کام کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی کوشش سے کئی اسکولوں میں ہندی کی کلاسیں کھل گئی ہیں۔ ہندی پڑھنے والے طالب علموں کی تعداد ۴۰ ہزار ہے۔ اس کے لئے ایک عمارت بنانے کی تجویز ہے جس کے لئے سیٹھ جمنا لال بجاج نے ایک لاکھ روپیہ کی اپیل کی ہے۔ روپیہ حسب ذیل طریقہ پر خرچ کیا جائے گا۔

زمین	دس ہزار
بڑی عمارت	پندرہ ہزار
مدرسہ اور بورڈنگ . . .	تیس ہزار
پریس . . .	دس ہزار
کتب خانہ . . .	دس ہزار
کارکنوں کے لئے مکان	دس ہزار
عبادت گاہ	پانچ ہزار
پاٹ شالا	پانچ ہزار
ودیا یام شالا	ڈھائی ہزار
رو کوئیں	ڈھائی ہزار
میزان	ایک لاکھ

اپیل کے سلسلہ میں جمنالال جی بجاج نے لکھا ہے" اگرچہ یہ پوری رقم اکیلے دینے والے بہت سے فیاض آدمی ملک میں مل سکتے ہیں لیکن سبھا کی یہ خواہش ہے کہ اس نیک کام میں زیادہ سے زیادہ لوگ شریک ہوں اور اس طرح چندہ اکٹھا کیا جائے کہ کسی کو بار نہ معلوم ہو۔ اس لئے مندرجہ ذیل چار قسم کے عطیوں سے امداد مانگی جائے گی۔

پہلی قسم . . .. ایک ہزار یا زاید دینے والے

دوسری قسم . . . . پانچ سو سے ایک ہزار تک دینے والے

تیسری قسم ... . ڈھائی سو سے پانچ سو تک دینے والے

چوتھی قسم . . . . سو سے ڈھائی سو تک دینے والے

اس طرح پہلی قسم کے بیس دوسری قسم کے پچاس تیسری کے سو اور چوتھی کے تین سو۔ معطی اگر مل سکیں تو ایک لاکھ روپیہ جمع ہو سکے گا۔ جو معطی پانسو ایک ہزار تک عطیہ دیں گے ان کے نام عمارتوں میں نمایاں جگہوں پر نصب کئے جائیں گے۔"

ہندی پرچار کا کام | گذشتہ سال کی سمیلن کا جلسہ چونکہ مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہوا تھا جنھوں نے سترہ سال ہوئے اپنی صدارت کے زمانہ میں دکن بھارت ہندی پرچار سبھا کی بنیاد رکھی تھی اس لئے اس سال بھی ان کی صدارت میں ہندی پرچار کا کام نہایت اچھی طرح کیا گیا۔ دکن بھارت ہندی پرچار سبھا کا کام تو لائق تعریف رہا ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ بمبئی بڑودہ گجرات، مہاراشٹر، سی۔ پی، بہار، اڑیسہ، بنگال، آسام، برہما، پنجاب، یو پی وغیرہ صوبوں میں بھی بہت سے مرکزوں کے ہندی کے کارکنوں نے بہت اچھا کام کیا۔ ہندی پرچار کے کاموں میں دو اور نئے اداروں کے قیام سے بھی مدد ملی ہے۔ پہلا ادارہ ہے ایک ہی رسم الخط کو جاری کرنے والی کمیٹی اور دوسرا' بھارتیہ ساہتیہ پریشد۔

سابق صدر کانگریس اور ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان

(ذیل میں ہم بابو راجندر پرشاد سابق صدر کانگریس کے اس خطبہ کے ضروری افتباسات درج کرتے ہیں جو انھوں نے ہندی ادبی کانفرنس (ہندی ساہتیہ سمیلن) منعقدہ ناگپور کے اجلاس میں ۲۴ر اپریل سنہ ۳۶ء کو کرسی صدارت سے پڑھ کر سنایا تھا۔ بابو راجندر پرشاد کے خطبہ سے یہ بات بالکل صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ موجودہ ہندی کسی صورت سے ہندوستان کی قومی زبان کہلائے جانے کی مستحق نہیں ہے ہندی کو قومی زبان بننے کے لئے اپنی بہت کچھ اصلاح کرنا پڑے گی اور زیادہ وسعت قلب اور رواداری سے کام لینا ہوگا جو باتیں بابو راجندر پرشاد نے ہندی کے ادیبوں سے کہی ہیں ان میں سے بہت سی باتوں کی طرف اُردو ادیبوں کو بھی متوجہ کیا جا سکتا ہے اگر دونوں زبانوں کے ادیب خلوص، نیک نیتی اور رواداری کے ساتھ کام کریں گے تو ہمارا خیال ہے اُردو ہندی کا اختلاف ختم ہو جائے گا اور ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان کا مسئلہ اتنا پیچیدہ نہیں رہے گا جتنا کہ اس وقت ہے اگر اُردو اور ہندی کی جگہ ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان کا نام "ہندوستانی" رکھا جائے تو اس سے ذہنیت میں وہ ضروری تبدیلی پیدا ہو سکے گی جس سے لوگ ہر قسم کے نامانوس اور غیر ضروری سنسکرت اور عربی فارسی الفاظ کے استعمال کرنے سے پرہیز کریں گے)۔

ہندی قومی زبان بننے کا دعوے کرتی ہے آج بھی اس کے بولنے والوں اور سمجھنے والوں کی تعداد چودہ پندرہ کروڑ سے کم نہیں ہے جو ہندی بولنے والے ہیں ہیں ان میں بھی ناگپور، گجرات، برار، مہاراشٹر اور بنگال جیسے صوبوں میں ہندی سمجھنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔ اگرچہ ان کی گنتی نہیں ہوئی ہے اور اس کا کرنا کٹھن بھی ہے۔ مسلمانوں میں زیادہ تر جو شمالی ہندوستان میں بستے ہیں وہ سب ہی ہندی سمجھتے اور بولتے

ہیں۔ جنوبی ہند کے مسلمان بھی سب ہندی سمجھ اور بول لیتے ہیں اور اگرچہ پنجاب میں پنجابی بولی جاتی ہے لیکن پھر بھی وہاں کے بیشتر عوام ہندی سمجھ اور بول سکتے ہیں۔ اس لئے اگر ہندی آج بھی قومی زبان ہونے کا دعویٰ کرے تو یہ مناسب ہی ہے ۔

میرے کہنے کا مطلب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں ہندی کے لفظ کا وسیع مفہوم لے رہا ہوں۔ یوں تو عالموں میں اس بات پر بھی اختلاف رہا ہے کہ ہندی اور اردو دو الگ بھاشائیں ہیں یا ایک ۔ سورگیہ پنڈت گوند نراین مصر جی جو ہندی اور پراکرت کے جید عالم تھے انھوں نے دوسری ہندی ادبی کانفرنس کے خطبہ صدارت میں اس بات پر بہت زور دیا تھا اور بہت سے ثبوت پیش کئے تھے کہ ہندی اور اردو ایک نہیں دو زبانیں ہیں۔ دوسری طرف سورگیہ بابو رادھا کرشن داس نے "ہندی کیا ہے" نام کے ایک مضمون میں لکھا ہے "ہندوستان میں رہنے والے عوام کی زبان کا نام ہندی ہے۔ ہندوستان کی اگر کوئی ایک بھاشا ہو سکتی ہے تو وہ ہندی ہے ۔ اصل میں اردو اور کچھ نہیں ہے وہ ہندی ہی ہے ۔"

آج ہندی اردو کا سوال چاہے کتنی ہی پیچیدہ شکل کیوں نہ اختیار کر رہا ہو اور مسلمان ہندی نام سے کتنے ہی کیوں نہ جھجک رہے ہوں لیکن تھوڑا پیچھے کی طرف دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ہندی نام مسلمانوں ہی کا دیا ہوا ہے اور اس مفہوم کے ساتھ اس نام کا استعمال کسی معمولی شخص نے نہیں بلکہ امیر خسرو، میر تقی، انشا اور ملک محمد جائسی جیسے عالموں نے کیا ہے۔ امیر خسرو کے بارے میں اردو کے مانے ہوئے شاعر غالب نے لکھا ہے کہ "ہندوستان کے سخنوروں میں امیر خسرو دہلوی کے سوا کوئی استاد مسلم الثبوت نہیں ہوا" اور "میں اہل زبان کا پیرو ہوں اور ہندیوں میں سوا امیر خسرو دہلوی کے سب کا منکر ہوں" اتنا ہی نہیں غالب نے اور بھی کہا ہے ۔

غالب مرے کلام میں کیوں کر مزہ نہ ہو
پیتا ہوں دھو کے خسرو شیریں سخن کے پاؤں

غالب ہی نہیں مولانا شبلی بھی امیر خسرو کے بارے میں لکھتے ہیں : ۔ " ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک اس درجہ کا جامع کمالات نہیں پیدا ہوا اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف گوناگوں اوصاف کے جامع ایران

اور روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو ہی چار پیدا کئے ہوں گے۔" وہی خسرو لکھتے ہیں۔

عربی بولے آئینہ فارسی بولے پائینہ
ہندی بولے آرسی آئے، منہ دیکھے جو اسے بتائے

جن کے بارے میں مشہور شاعر ذوق نے لکھا ہے:۔

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

اور غالب نے کہا ہے:۔

ایسا بھی یہ عقیدہ ہے بقول میر
آپ بے بہرہ ہیں جو معتقد میر نہیں

وہی اردو کے مانے ہوئے استاد ہندوستان کی زبان کے لئے "ہندی" کا لفظ استعمال کرتے ہیں:۔

کیا جانوں لوگ کہتے ہیں کس کو سرور قلب
آیا نہیں ہے لفظ یہ ہندی زباں کے بیچ

مشہور شاعر انشاء اللہ نے اپنی "رانی کیتکی کی کہانی" میں اس کتاب کی زبان کے متعلق لکھا ہے:۔
"جس میں ہندی چھٹ کسی اور بھاشا کی پٹ نہیں ہو"

ان سے بھی پہلے، پدماوت کے مشہور شاعر ملک محمد جائسی نے لکھا ہے:۔

عربی ترکی ہندوی، بھاشا جیتی آہی
جا میں مارگ پریم کا، سبے سراہیں تاہی

پر میں اس جھگڑے میں نہ پڑ کر کہ قواعد زبان اور علم زبان کے اصولوں کے مطابق ہندی اور اردو ایک ہیں یا نہیں صرف کاروباری نقطۂ نگاہ سے کہنا چاہتا ہوں کہ جتنے لوگ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اس بھاشا میں باتیں کر سکتے ہیں جس کو ہم ہندی مانتے ہیں۔ چاہے وہ اصول قواعد کے

مطابق شدہ ہندی نہ بھی ہو اور چاہے اس میں کتنے ہی لفظ ایسے ہوں جو ہندی بھاشا میں نہ ملتے ہوں، وہ سب ہی ہمارے کام کے لئے ہندی زبان کے مانے جا سکتے ہیں۔ اور ان سب کو میں نے اپنی اوپر دی ہوئی گنتی میں شامل کر لیا ہے۔ ہندی قومی زبان تب ہی ہو سکتی ہے جب ہم ان سب کو شامل کر لیں۔ اگر ایسا نہ کریں تو جو ہندی آج کتابوں میں لکھی جاتی ہے وہ بہت تھوڑے ہی لوگوں کی مادری زبان ہے اور ہندی بولنے والوں کی تعداد کتنی ہی صوبہ کی زبانیں بولنے والوں کی تعداد سے بھی کم ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر آپ بہار کو ہی لیجئے۔ وہ ہندی بولنے والا صوبہ سمجھا جاتا ہے اور ٹھیک سمجھا جاتا ہے۔ پر اس صوبہ میں کئی بولیاں بولی جاتی ہیں۔ شاہ آباد، سارن، چمپارن، اور مظفر پور کے کچھ حصوں میں بھوج پوری بولی جاتی ہے۔ دربھنگہ، اتر مونگیر، اتر بھاگلپور، پورنیا اور مظفر پور کے شمالی حصوں میں میتھلی بولی جاتی ہے۔ پٹنہ، گیا، دکھن مونگیر اور چھوٹا ناگپور میں مگھی بولی جاتی ہے۔ اور بھاگلپور، سنتھال پرگنہ اور مونگیر کے کچھ حصوں میں چھیکا چھیکی بولی جاتی ہے۔ ان میں سے میتھلی کے سوا کسی کا الگ رسم خط نہیں ہے اور نہ کسی کا کوئی لکھا ہوا ادب۔ یہ سب ہی آج کی کتابوں کی ہندی سے بہت الگ ہیں اور ان بولیوں کے بولنے والوں میں جو تعلیم یافتہ نہیں ہیں وہ کتابوں کی ہندی پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یو۔ پی۔ میں بھی کئی بولیاں بولی جاتی ہیں اور آج کی سنسکرت ہندی شاید ہی کسی ضلع میں پوری پوری شدھتا کے ساتھ گھروں میں بولی جاتی ہے۔ ہاں وہ بہار کی بولیوں کی بہ نسبت شدہ ہندی کے بہت قریب ضرور ہے۔ اگرچہ مجھے وسطی ہند کی بولیوں کا زیادہ علم نہیں ہے پر وہاں بھی یہی کیفیت ہوگی۔ راجپوتانہ بھی ہندی زبان کا صوبہ کہا جاتا ہے لیکن اس میں بھی کئی الگ الگ بولیاں ہیں۔ دلی اور پنجاب کے کچھ حصوں کو بھی ہندی زبان کے صوبے کہتے ہیں۔ لیکن وہاں بھی بولی دوسری ہے۔ اس لئے جب ہم ہندی کو قومی زبان کے روپ میں دیکھتے ہیں اور سوچتے ہیں تو ہم کو یہ ماننا ہی پڑتا ہے کہ جو کوئی بھی اس سے کام لے سکتا ہے وہ ہندی بولنے والا ہے

قومی زبان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ یہ صوبوں کے باہمی کاروبار اور روزمرہ کے بیوپار میں سب ہی صوبوں کے رہنے والوں کے ذریعہ برتی جائے اور راس کماری سے بدری نراین تک اور اٹک سے کٹک تک سبھی جگہوں میں ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرنے اور خیالات منتقل کرنے کے کام میں لائی جائے۔

طرح طرح کے اختلافات ہوتے ہوئے بھی ہندی ان شرطوں کو پورا کرتی ہے۔ تلیگو، تامل، ملیالم اور کنڑی زبانیں ہی صرف ایسی ہیں جن کا ہندی کے ساتھ کوئی سیدھا ناتا نہیں ہے اور جن کے بولنے والے نہ ہندی سمجھ سکتے ہیں اور نہ جن کو ہندی بولنے والے سمجھ سکتے ہیں۔ ان میں بھی سنسکرت لفظوں کی کثرت رہنے سے تھوڑی کوشش سے ہی کامیابی مل سکتی ہے پھر بھی اُتر اور پچھمی ہندوستان میں جہاں آریا بھاشائیں بولی جاتی ہیں ہندی کا پرچار آسان ہے اور دکن کے علاقوں میں جہاں دراوڑ بھاشائیں رائج ہیں یہ کام بلاشبہ بہت کٹھن ہے۔ قومی زبان ہونے کی زیادہ سے زیادہ اہلیت ہندی میں آنی اور لانی چاہیئے۔ اس کے پرچار کے راستے میں جو روکاوٹیں ہیں ان کو دور کرنا چاہیے۔ ہندی کی خامیوں کو دور کر کے اسے مکمل بنانا چاہیئے۔ اس لئے ہندی کی شکل پر غور کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

زبان کے دو حصے ہیں۔ الفاظ اور صرف و نحو۔ یہ بلاشبہ صحیح ہے کہ اس بات کا فیصلہ کرنا کہ ایک عبارت کس زبان کی ہے اس پر اتنا منحصر نہیں ہے کہ اس جملہ کے لفظ کس زبان سے لئے گئے ہیں یعنی ان کا رواج کہاں سے اور کیسے ہوا ہے بلکہ اس کا فیصلہ جملہ کی ترتیب حرفِ عطف اور افعال پر ہی منحصر ہے۔ مثال کے طور پر ایک چھوٹے جملہ کو لیجئے۔

"رام نے حکم دیا موٹر لاؤ"

اس چھوٹے جملہ میں رام نام ہے۔ حکم عربی لفظ ہے دیا فعل ہے۔ اس میں ہندی عربی اور انگریزی کے لفظ آئے ہیں پر انگریزی اور عربی کے لفظ رہتے ہوئے بھی یہ ہندی کا ہی جملہ ہے۔ اس لئے اگر ہندی میں ایسے لفظ آ جائیں جو کسی دوسری زبان سے لئے گئے ہیں تو وہ ہندی ہی رہے گی۔ جتنی زندہ زبانیں ہیں وہ اپنے لغات کو برابر بڑھاتی ہیں اور ان کے شاعر اور مصنف دوسری زبان کے نئے نئے لفظوں کا استعمال اپنی تصنیفوں میں کرتے ہیں۔ باہر کی بات جانے دیجئے ہندوستان کی بھی بنگلہ، مرہٹی، گجراتی وغیرہ سب ہی زبانوں میں دوسری زبانوں کے لفظوں کا استعمال دھڑلے سے ہو رہا ہے۔ اردو والے بھی اس میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ اردو کے بڑے شاعر اکبر ہندی لفظوں کو

بڑی آسانی سے لے لیا کرتے تھے۔ جیسے :۔

"سخن ان سے سنورتا ہے سخن سے میں سنورتا ہوں"

"آغوشش سے سدھارا مجھ سے یہ کہنے والا"

انھوں نے کتنی آسانی سے "سنورنا" اور "سدھارنا" لفظوں کو اپنا بنا لیا ہے۔

مرحوم مولانا حالی نے لکھا ہے :۔

"جب تک شاعر کی فکر میں اتنی بھی آنچ نہ ہو۔ جتنی ایک بیے میں گھونسلہ بنانے کی اور مکڑی میں جالا پورنے کی ہوتی ہے۔ اس کو ہرگز مناسب نہیں کہ اس خیال خیام میں اپنا وقت ضایع کرے۔ بلکہ خدا کا شکر کرنا چاہئے کہ اس کے دماغ میں خلل نہیں۔"

اس میں "آنچ" اور "پورنا" لفظ انھوں نے ہندی کی بول چال سے لے لئے ہیں۔

آج کل کے زمانہ میں جب دنیا سے علمی ترقیوں کی وجہ سے فاصلہ اور وقت کا فرق اٹھتا جارہا ہے، کوئی بھی زبان دوسری زبان کے اثر سے اپنے کو اچھوتا نہیں رکھ سکتی۔ اگر وہ ایسی کوشش کرے تو دنیا کی دوڑ میں وہ بہت پیچھے رہ جائے گی اور اس کے لئے ترقی کے دروازے بند ہو جائیں گے۔ ہندی زبان کی خوبیوں میں ایک خاص خوبی یہ ہے کہ ہندوؤں کی زبان ہوتے ہوئے بھی اس نے عربی فارسی ہی کے نہیں بلکہ ترکی پرتگالی اور انگریزی وغیرہ کے لفظوں کو بھی اچھوت نہیں سمجھا۔ اگر ایسا نہیں کیا ہوتا تو کتنے ہی لفظ جو ہمارے گھروں میں پہنچ گئے ہیں آج نہ ہوتے اور ان کے ہم معنی لفظ ہمارے پاس شاید اتنے موزوں نہ ہوتے۔ اس طرح کے لفظ انسانی زندگی کے سب ہی کاموں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے بغیر زندگی بسر کرنا مشکل ہو جاتا۔ مثلاً :۔

سوغات، غالیچہ، بہادر، چابک، قلی، قینچی، چاقو، لاش، داروغہ، توپ، چک وغیرہ ترکی سے۔

الماری، اچار، بوتل، کمرہ، آل پن، گملہ، گوبھی، گودام، چابی، مستری، میز، تمباکو، نیلام، تولیہ، پرات، بوتام، سنتری، وغیرہ پرتگالی سے۔

سمن، بج، سگریٹ، ربر، رجسٹر، لالٹین، مشین، مجسٹریٹ، بنک، بم، رپورٹ، میں، پریڈ، ڈرائیور، ٹین، ٹیبل، نمبر، ماسٹر، ل، ممبر، میم، موٹر، منٹ، بمبئی، بگل، پلیگ، پلس، مٹن، منی بیگ، رجسٹری، منی آرڈر، اسٹیشن، پلیٹ فارم، ٹرین، ماسٹر، کانگریس، کالج، کمپنی، کلنڈر، کلکٹر، کمیٹی، کاپی، کارنس، کونین، کوٹ، کونسل، گلاس، گنی، گیس وغیرہ انگریزی سے۔

حد، بالغ، حلوائی، جبر، اطلس، توشک، تکیہ، حقہ، اسباب، بخار، بحث، حلوہ، علم، جیب، دلال وغیرہ عربی سے۔

پرزہ، فلیل، اخبار، نوکر، میل، دنگل، ستار، جلیبی، رندہ، داماد، دیہات، بے باق، پلک، چشمہ، وکیل، لالہ، بمیہ، بابا، باجی، داماد، تالاب، بخیہ، طمانچہ وغیرہ فارسی سے۔

ہندی کے پرانے مشہور شاعروں کی شاعری میں بھی بہتیرے لفظ ایسے ملتے ہیں جو بدیسی زبانوں کے ہیں یا بدیسی زبانوں سے مشتق ہیں۔ مثلاً

جائسی:- شیر شاہ دلی سلطان

سورداس:- ال ہری سب پتی تن کو نایک۔
کو کری سکے برابری میری اسے مان کو لایق

تلسی داس:- گئی بہوری غریب نواز و سرل سبل صاحب رگھوراج
ہئی بخشش حاکم دینی
بنا بازار نہ جائے بکھانا
جنواسے گرنے مودت سکل سوپ سرتاج
کم ہکرن کپی فوج بڈاری
لوکپ جاکے بندی خانہ
جو کچھ جھوٹھ مسخری جانا

بیٹھے بجاج ' صراف ' بنیک ' اینک منہو کو بیرسے
می سریت گرام نرناگر
کوئی کنگورن چڑسی گئے کوٹی کوٹی رندھیر

بودھا :- ہوئے مغرور توپے ڈوبی مغروری کیجے گھوچلے دہے جو تا سوں گھوتا لوا تیے۔

پدماکر :- ایتے گج بخشے بہیپ رگھوناتھ راؤ یاہی گج دہوکے کہوں کا ہو دیے ڈارنا

بھوشن :- روم روندی ڈارسے خراساں کھوندی مارے خاک کھادروں جھاڑے ایسی ساہو کی بہار ہے کہ راجا سوراج کے لگارن کی دھاک سن کیتے بادشاہن کی چھاتی درکتی ہے۔

متی رام :- سو ہنکو موٹی دلی دل دیلیے کو جیو سو جھٹ سمرہن سوا کی اُہتی ہے
کہے متی رام تاہی رد کبے کو سنگر میں کا ہوکے نہ ہمتی ہیے میں اُلہنی ہے
سترو سال نند کے پرتاپ کی لیٹ سب گربی غنیم برگین کو دہتی ہے
تپی بادشاہ کی اِتی اُمرادن کی راکھی ریبارا و بھاؤ سنگھ کی رہتی ہے

بہاری :- لکھن بیٹھی جاکی صبحی گہی گہی گرب غروب
بھئے نہ کیتے جگت کے چتر جتیرے کور
بیچے نہ بڑی سبیل ہوں چل گھونسوا ماس

تلسی داس اور ہندی کے اور قدیم شاعروں کی تصنیفوں میں عربی فارسی کے لفظوں کا ہی نہیں اُردو میں آج کل رایج محاوروں کا بھی استعمال ملتا ہے۔ جیسے :-

" بالم باسی اودھ کا بوجھیے نہ خاکو "

مطلب :- اجودھیا کے رہنے والے خاک بھی نہیں سمجھتے

" کیو وارکہی پیے اجہوں نہ آئے باج "

مطلب :- اے سوامی ہم نے کئی بار کہا تم ابھی تک باز نہیں آئے

اس میں خاک نہیں سمجھنا اور باز نہیں آنا جو محاورے اُردو میں آج کل رایج ہیں۔ وہ ہیں

نئی سے نئی بول چال میں ہے۔

انگریزی آج دنیا کی ایک شائستہ زبان ہے۔ جس کا بہت پرچار ہے اور جو دنیا کے کونے کونے میں بڑھتی اور برتی جاتی ہے۔ اس کے الفاظ کا ذخیرہ اتنا بڑا ہے اور اتنا بڑھتا جا رہا ہے کہ آکسفورڈ ڈکشنری میں جس کے تیار ہونے اور چھپنے میں کئی برس لگ گئے۔ کتنے ایسے لفظ نہیں ملے جو اس کے ابتدائی حصوں کے چھپنے کے وقت انگریزی میں رائج نہیں ہوئے تھے۔ پر جو آخر حصہ کے چھپنے تک انگریزی زبان میں لے لئے گئے اور آج اخباروں اور کتابوں میں روزمرہ ملا کرتے ہیں۔ آج سے پچاس برس پہلے کے چھپے کسی بھی انگریزی لغت کو آج کے چھپے کسی اچھے لغت سے ملا کر دیکھا جائے تو اس کا پتہ چلے گا کہ آج کتنے نئے لفظ اس زبان میں لئے گئے ہیں اور اس کا ذخیرہ کس تیزی کے ساتھ بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ کسی کو کہنے کی ہمت نہیں ہوگی کہ انگریزی زبان ان لفظوں کے آ جانے سے خراب اور ناشائستہ ہو گئی ہے اور وہ انگریزی بھاشا نہیں رہی۔ جو نئے لفظ آئے ہیں وہ سنسار کی زبانوں سے لئے گئے ہیں۔ پرانی انگریزی میں لاطینی، یونانی، فرنچ، جرمن وغیرہ کے ہی لفظ زیادہ تر لئے جاتے تھے۔ پر اب تو ہندی سنسکرت، عربی فارسی وغیرہ کے علاوہ جنوبی ہندوستان، افریقہ اور کیا اور چین جاپان کی زبانوں کے بھی ضروری اور مطلب کو پوری طرح ادا کرنے والے لفظ لے لیے جاتے ہیں اور یورپ کی زبانوں کے لفظ تو بہت زیادہ لئے ہی جا رہے ہیں۔

یہ معمولی زبان کی بات میں کہہ رہا ہوں۔ علمی اور اصطلاحی لفظوں کا تو الگ ہی لغت اور ذخیرہ ہے اور ان کی تعداد تو دنوں دن بڑھتی جاتی ہے جو نئی چیزیں ایجاد ہوتی ہیں اور جو نئی تحقیقات اور ان کے نئے کارخانے ہوتے ہیں ان سب کے لئے نئے لفظ تو بنتے ہی جا رہے ہیں۔ یہی جیتی جاگتی زبان اور قوم کی خصوصیات ہیں۔

ہندی بھی اگر جیتی جاگتی زبان ہونا چاہتی ہے تو اسے اپنے الفاظ کے ذخیرہ کو بڑھانا پڑے گا۔ کانٹ چھانٹ کا اصول تو وہ کبھی اختیار نہیں کر سکتی اور نہ بدیسی لفظوں کو باہر رکھ کر وہ ایسی ترقی کر سکتی ہے۔ ہندی سنسکرت نہیں ہے۔ ہندوستان میں ہندو مسلمان، پارسی عیسائی بلکہ بستے ہیں لیکن پھر

بھی وہ ہندوستان ہے اسی طرح ہندی میں سب ہی زبانوں سے اچھے لفظ ہم لیں گے لیکن پھر بھی وہ ہندی رہے گی۔ اس میں ایسے لفظوں کے ہضم کرنے کی طاقت ہونی چاہیئے اور اس کے مصنفوں کو ایسے لفظوں کا علم ہونا چاہیئے۔ اس لئے میں ہندی اردو کے جھگڑے میں فائدہ نہیں دیکھتا ہوں۔ ہندی میں جتنے فارسی اور عربی کے لفظوں کی کھپت ہوسکے گی اتنی ہی وہ وسیع اور مضبوط زبان ہوسکے گی۔ ہم کو تو اس بات پر ناز ہونا چاہیئے کہ ہم صرف سنسکرت کے ہی نہیں بلکہ اور زبانوں کے لفظوں کو بھی اپنا جامہ پہنا کر اپنا لیتے ہیں اور اپنے لفظوں کے ذخیرہ کو بڑھا سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف "جاتے" "آتے" "ہیں" "تھے" وغیرہ لفظوں کو چھوڑ سب ہی عربی فارسی کے لفظوں کو اکٹھا کر دینے سے ہی ہندی کا جملہ بن جاتا ہے اس کا مطلب اتنا ہی ہے کہ جو لفظ رایج ہوگئے ہیں ان کو تو رکھنا ہی چاہیئے اور ان کے بائی کاٹ کی کوشش فضول ہے۔ میرے ایک محترم دوست نے اس بائی کاٹ کے کام کو اتنا دور تک پہنچایا تھا کہ رومال جیسے چھوٹے اور سہل لفظ کو چھوڑ کر انھوں نے اس کے بدلہ میں "مکھ مارجن وستر کھنڈ" کا استعمال مناسب سمجھا تھا۔ میں اس قسم کے بائی کاٹ کو ہندی کے ساتھ ظلم سمجھتا ہوں اتنا ہی نہیں میں تو یہ بھی چاہتا ہوں کہ ایسے لفظ جو آج رایج نہیں ہیں پر ایسے ہیں جن سے ہمارا کام ٹھیک نکل سکتا ہے ان کو ہم اپنی زبان میں داخل کریں اور رایج کر دیں۔

ہندی کے الفاظ کے ذخیرہ کی تکمیل سنسکرت سے تو ہونی ہی چاہیے۔ پر اگر سلیس اور چھوٹے لفظ جن سے ہمارا مطلب ٹھیک نکل سکتا ہو دوسری زبان کے بھی ہوں تو ان کو لے لینے میں ہچکچانا نہیں چاہیئے۔ خاص کر جب ہم ہندی کو ہندوستان کی قومی زبان مانتے ہیں تو ہم کو اس پر ضرور دھیان دینا ہوگا کہ کن لفظوں کو اختیار کرنے سے اس کا پرچار بڑھ سکے گا۔

آج سے ۹۲ برس پہلے راجہ شیو پرشاد نے ہندوستانی کی نیو ڈالی تھی۔ ان کی زبان میں زیادہ تر وہی لفظ آنے پائے ہیں جو روزمرہ کی بول چال کے ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:- "پنڈت لوگ سوچتے ہیں کہ جتنے اصلی سنسکرت شبد (چاہے وہ سمجھ میں آویں چاہے نہیں) لکھے جاویں اتنی ہی ان

کی ناموری کا سبب ہے۔ اور اسی طرح مولوی لوگ فارسی اور عربی لفظوں کے نئے سوچتے ہیں۔ غرض یہ سالے کے بدلے دونوں حلق کو گہرا اور چوڑا کرتے جا رہے ہیں" کتنے تعجب کی بات ہے کہ اسّی نوّے برس پہلے سے اپنی خرابی کو جانتے ہوئے بھی ہم ابھی تک بیچ بیچ اس خندق کو گہرا کرتے جا رہے ہیں۔

اس موضوع پر غور کرنے میں ہمیں دو باتوں پر ضرور دھیان رکھنا چاہئے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ شمالی ہندوستان کے مسلمان سب ہی ہندی جانتے اور بولتے ہیں۔ ان کی زبان میں عربی فارسی کے زیادہ الفاظ ہوتے ہیں۔ پر وہ بھی ہماری زبان معمولی طور پر سمجھ لیتے ہیں۔ آج اُردو لکھنے والوں میں ایک چال چل گئی ہے کہ فارسی اور عربی کے بڑے بڑے لفظ لا کر اپنے مضمونوں کو بھر ڈالتے ہیں اور ہندی کے لکھنے والے بھی اس مصرعے سے بچے ہوئے نہیں ہیں ان میں بھی بہتیرے سنسکرت کے بڑے بڑے لفظ اپنی تصنیفوں میں بھر دیتے ہیں۔ دونوں جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں اور دونوں دونوں کی شکایتیں کیا کرتے ہیں۔ ایسے لوگ جو سہل زبان لکھ سکتے ہیں وہ بھی جان بوجھ کر زبان کو کٹھن اور مشکل بناتے ہیں۔ اس بات کو دلیل میں ہندی اور اُردو کے ایک ... شاعر کی ایسی تصنیفوں کے نمونے سے میں اور بھی ثابت کر دینا چاہتا ہوں جو سلیس اور عام فہم زبان بھی لکھ سکتے ہیں اور سہل اور خوبصورت زبان کا استعمال کر کے عام طور پر مقبول بھی ہو چکے ہیں۔ جیسے:

"ایک دنیا سے اٹھا ہے چاہتا اور ہے اٹھتی جوانی ایک کی چاند اور سورج گگن میں گھومتے ہیں رات دن" وغیرہ کے مصنف شاعر اجودھیا سنگھ جی اپادھیا جیسے ہندی کے لئے سہل شاعر لکھتے ہیں:-

رے پودیاں پر پھیلا پر ایکا ایکا ردکے دو دیہا سا
تمو گی کلما سنی تمر سکا کر نٹ اکلا تیلی
تمو بھا واری دھی کی باسوا ... ی سی لا دیہ للا میالی
تمری راد ھا ڈر دو دھاتی مرا کی دھو ریہ نمو ررتی تھی

ہ ہ ہ

کہا دیا وستا ودنا موہ گمنا ملیا

آسنا تمی کمٹ یتی کے ابھونیتر الیتو وا

پہلے چار مصرعوں میں صرف "کی"، "سی" اور "تھی" کے استعمال کو چھوڑ کر ان میں اور سنسکرت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دوسرے دونوں مصرعوں میں اگر "تھی" اور "کے" ایک ایک بار نہ آئے تو یہ شعر سنسکرت کا اشلوک ہو جاتا۔

دوسری طرف کسی وقت "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" اور "دنیا کی محفلوں سے گھبرا گیا ہوں یارب" کے مصنف سر محمد اقبال کی نظمیں ہندوستان کے دیش بھگتوں کی زبان پر تھیں۔ بچے بچے تک ان کو گاتے تھے۔ ان کی ایک پرانی غزل ہے:

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتی میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ

داماں آسماں سے اس کا کلس ملا دیں

ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اس کے الفاظ کتنے سلیس سہل اور خوبصورت ہیں۔ لیکن جب اعلیٰ اقبال صاحب کے خیالات میں انقلاب ہوا تو اس کا عمل ہماری زبان اور شاعری کو بھی بھگتنا پڑا۔ اور وہاں بھی مشکل اور ناقابل فہم بنا دی گئی۔ اس اُلٹ پھیر کی نمائندگی کے طور پر ان کی یہ نظم تصنیف دیکھئے۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بت کہ تراشیدہ تہذیب نوی ہے
غارت گر کاشانہ دین نبوی ہے

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

نظارہ دیرینہ زمانہ کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی

رہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی

ہے ترک وطن سنت محبوب الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے

خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

* * *

ہمارا مقصد ان دونوں کے بیچ کا متوسط راستہ ہے۔ ہم نہ عربی فارسی کے لفظوں کا بائی کاٹ کریں گے اور صرف سنسکرت لفظوں کو ہی لیں گے اور نہ سنسکرت کا بائی کاٹ کر کے صرف فارسی عربی کے لفظوں کو ہی رکھیں گے۔ اس لیے جہاں ہمیں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ فارسی عربی لفظوں کے بائی کاٹ سے ہم مسلمانوں کے لئے ہندی بہت کٹھن بناتے جائیں گے وہاں یہ بھی لحاظ رکھنا ہوگا کہ صرف فارسی عربی کے لفظوں کو لے کر اور سنسکرت کا بائی کاٹ کر کے ہم گجراتی، مرہٹی، آسامی، تامل، تلیگو، ملیالم اور کناڑی زبانوں کے لئے ہندی زیادہ مشکل تو نہیں بنائے جا رہے ہیں۔ ہندو تہذیب سنسکرت کے ذریعہ ہی سارے ہندوستان میں پھیلی ہے اور آج بھی سنسکرت لفظوں کا علم بلا واسطہ اور ان صوبوں کی زبانوں کی معرفت غیر ہندی صوبوں میں پھیلا ہوا ہے۔ اس لئے ایسے سنسکرت کے لفظوں کے ہندی میں لینے سے ان صوبوں کے رہنے والوں کے لئے ہندی کو ہم سہل بنا دیتے ہیں۔

ہمارے سامنے یہ مشکل سوال ہے کہ ہم نہ تو ان صوبوں کے ہندوؤں کو چھوڑ سکتے ہیں اور نہ شمالی ہند کے مسلمانوں سے ہندی کو الگ رکھ سکتے ہیں اگر ہم ایسا کریں گے تو اس کا پھل یہ ہوگا کہ جہاں ہم ایک طرف ہندی بولنے والوں کی تعداد بڑھائیں گے اور ہندی کے پرچار کو مضبوط کریں گے دوسری طرف ان کی تعداد جہاں آج زیادہ ہے وہاں گھٹائیں گے اور اس کا پرچار دکن میں بڑھا کر آریہ ہم کم کریں گے اس لئے عقلمندی اس میں ہے کہ الفاظ کے ذخیرہ کو بڑھایا جائے۔

الفاظ بڑھانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ فارسی کی لغت نکال کر اس کے سب ہی لفظوں کو ہندی کوش میں جوڑ دیا جائے مگر جو لفظ ہندی میں رائج ہو گئے ہیں ان کا بائیکاٹ نہیں کیا جائے۔ جو عربی فارسی کے لفظ گجراتی، مرہٹی، بنگالی، پنجابی اور دکن کی زبانوں میں آ گئے ہیں اور ان کے ٹھیک ہم معنی لفظ ہندی میں نہیں ملتے ہیں ان کو بھی ہندی میں لے لیا جائے۔ ان کے علاوہ ایسے نئے لفظ جو نئے مطالب کو ادا کرتے ہیں ان کو بھی لینے میں ہچکچانا نہیں چاہئے۔ مثال کے طور پر مغل بادشاہوں کے زمانہ سے ہی کچہریوں میں محکمہ مال اور حکومت سے متعلق بہتیرے لفظ ہندوستان کی سب ہی زبانوں میں رائج ہو گئے ہیں۔ اگر ان کے ہم معنی سنسکرت لفظ ہندی میں رائج نہیں ہیں اور عام طور پر سمجھے نہیں جا سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کو نہ رکھا جائے اور ان کی جگہ پر سنسکرت کے لفظ دھرم شاستروں سے کھینچ کر نکالے جائیں ایک بہت چھوٹا لیکن پر معنی لفظ "شرط" ہے۔ کسی بھی ہندی جاننے والے کو اس کے سمجھنے میں کٹھنائی نہیں ہوتی ہے اور اس مطلب کو ادا کرنے والا دوسرا لفظ سنسکرت سے کھوج کر نکالا جائے تو وہ "کھ مارجن وسنہ کھنڈ" جیسا لمبا نہ بھی ہو تو بھی سمجھنے میں تو اتنا ہی کٹھن ہوگا ایسی کوشش میری سمجھ میں بے کار ہے۔ جو اس سے بہتر کام میں لگائی جا سکتی ہے۔ یہ پنڈتوں اور عالموں کا کام ہے کہ ایسا لغت تیار کریں جس میں اس قسم کے سب ہی لفظوں کی کھتیونی ہو جائے۔

انگریزی راج میں بہت سے انگریزی لفظ بھی رائج ہوتے جا رہے ہیں ٹرین، اسٹیشن، ٹائم، پلیٹ فارم، ٹکٹ، لالٹین وغیرہ بہتیرے لفظ جو آ چکے ہیں اور آتے ہی جا رہے ہیں ان کا

ٹکٹ گھر کی کھڑکی کی جگہ پر" لوہ پتھ گامی ودیشرام یان" اور پلیٹ فارم کی جگہ "لوہ پتھ گامی ودیشرام یان ستھان سیمل" کہنے میں وقت اور لکھنے میں وقت اور جگہ کا ہی نقصان نہیں ہے ان مشکل لفظوں کا مطلب نکالنا بھی کم کٹھن نہیں ہے۔ اس لئے ایسے رائج بدیسی لفظوں کو رکھنا اور نئے لفظوں کو لے لینا ہی مناسب ہے۔ اگر ہم ٹکٹ کی ہندی "مولیہ پترکا" نام اور اسٹیشن پر مانگیں تو وہ ملے گا بھی نہیں صوبہ کی زبانوں میں ایسے بہت سے لفظ ہیں جن کے مطلب بہت سندر اور موزوں ہیں اگر وہ آج ہندی میں رائج نہیں ہیں تو ان کو بھی اپنانا ہمارا کام ہے۔ جس طرح ہم نے "لاگو" "چالو" "مارو" وغیرہ لفظوں کو اپنا لیا ہے اسی طرح اس معاملہ میں ہماری کوشش اور زیادہ ہونی چاہئے خاص کر جب سیاسی اور علمی نئے لفظ سب ہی ہندوستان کی زبانوں میں گڑھے جاتے ہیں بہت اچھا ہو اگر سب ہی زبانوں میں نئے لفظ عام طور پر ایک ہی ہوں۔ جیسے کونسلوں کے لئے "دھارا سبھا" "ویوستھاپکا سبھا" وغیرہ کتنے ہی لفظ کام میں لائے جاتے ہیں۔ عوام کو سہولت اور ہندی پھیلانے میں آسانی ہو اگر سب ہی ہندوستان کی زبانوں میں اس قسم کے لفظ ایک ہی ہو جائیں۔ اس میں کوئی کٹھنائی بھی نہیں ہونی چاہئے۔ کیونکہ یہ سب ہی لفظ نئے ہیں اور حال میں گڑھے گئے ہیں۔ اگر ہندی اور سب ہی صوبہ کی زبانوں کے علما مل کر ایسے نئے لفظوں کی جگہ ایک ہی لفظ کو چلائیں اور سب ہی اخباران کو استعمال کرنے لگیں تو وہ جلد ہی رائج ہو جائیں گے۔

لفظوں کا ایک اور خزانہ ہے جس سے ہم ہندی کی لغت بڑھا سکتے ہیں۔ اور وہ خزانہ گاؤں کی بولی میں رائج لفظوں کا ہے۔ ان میں بہت سے ایسے لفظ ہیں جن کا مطلب سندر اور نہایت موزوں ہے اور جن کے ٹھیک ہم معنی لفظ سنسکرت ہندی میں اکثر نہیں ملتے ہیں۔ گھروں میں استعمال کی جتنی چیزیں ہوا کرتی ہیں ان سب کے لئے لفظ ہیں گاؤں میں کھیتی کے جتنے سامان ہیں، بنائی کتائی کے جتنے اوزار ہیں سب کے ایک ایک حصہ کے لئے الگ الگ نام رائج ہیں۔ ڈاکٹر گریرسن کی Bihar Peasant Life نامی کتاب میں اس طرح چرخے کے ہر ایک حصہ کا نام دیا ہوا ہے۔ ہم اگر کسی کے تیلی گھر میں جا کر دیکھیں تو ہمیں پتہ لگے گا کہ وہاں بھی گھانی کا تقریباً وہی

واقعہ ہے جو کسی بھی پارچہ باف کے گھر میں ہم دیکھتے ہیں ۔ صرف ایک کی جگہ پر بیسیوں پرزے کام کرتے ہیں اور ان کو انسان نہ چلا کر بھاپ اور بجلی چلاتی ہے ۔ ایسی حالت میں ہم ایسے پرانے لفظوں کو کیوں نہ استعمال میں لائیں ؟ انگریزی میں بہتیرے پرانے لفظ گنواروں کے لئے آج بھی استعمال میں آتے ہیں ۔

گاؤں کی زبان میں نئے لفظ گڑھنے کی بھی اچھی طاقت ہے ۔ ریل، ٹرین، پلیٹ فارم کے لئے میں نے سنسکرت ہندی کے ہم معنی لفظوں کی مثال اوپر دی تھی ۔ گاؤں کی زبان میں موٹر کار کے لئے ہوا گاڑی، بائسکل کے لئے پیر گاڑی، ماچس کے لئے دیا سلائی، ریلوے گمٹی کے لئے سکدڑ، وف کے لئے پاؤ روٹی وغیرہ کتنے ہی بہت سے اچھے لفظ بن گئے ہیں جو اب کتابوں میں بھی کام میں لائے جا رہے ہیں ۔ اتنا ہی نہیں اسم سے فعل اور فعل سے اسم بنانے کی بھی جتنی طاقت ان گاؤں کی بولیوں میں ہے اتنی ہماری کتابوں کی زبان میں آج نہیں پائی جاتی ۔ یہی سبب ہے کہ ضرورت پڑنے پر ان بولیوں میں لفظوں کی کمی نہیں رہتی ہے ۔ گاؤں کے لوگ ضرورت پڑتے ہی لفظ بنا بھی لیتے ہیں ۔ جیسے لوٹے سے لوٹاس، ٹکے سے ٹکواس، صابن سے صبونا، مٹی سے مٹیانا، پانی سے پنیانا، غصہ سے غصانا، دھکے سے دھکیانا، شرم سے شرمانا، گھس سے گھسانا وغیرہ ضرورت پڑنے پر ہماری کتابوں کی زبان میں بھی ان لفظوں کا استعمال کرنا پڑتا ہے اگرچہ ہمارے یہاں بھی کچھ استادوں نے ایسی کوشش کی ہے ۔ جیسے :-

" اور جو ناری سوامی کی نیندی ہے" (پنڈت سدل مصر ناسکے تو پاکھیان) " غرب کا اونٹ کس طرح جگالتا ہے" (پنڈت پدم سنگھ شرما پدم پراگ) " تب کت کھیتی بڑھی، ٹن جو کھو نہ کمال" (بہاری لال) ان میں سے "بیدتی"، جگالی سے "جگالتا" کمان سے کمتی لفظ بنائے گئے ہیں لیکن ایسی کوشش کم ہوتی ہے اور یہ استعمال میں اتنے کم لائے گئے ہیں کہ نہ ہونے کے برابر ہیں ۔

گاؤں کی بولیوں کی طاقت صرف فعل اور اسم بنانے تک ہی محدود نہیں ہے ۔ کہاوتوں اور محاوروں پر خیال دوڑانے سے بھی ان کی طاقت کا پتہ چلتا ہے ۔ سب سے تعجب کی بات تو یہ ہے کہ

آج ہندی میں جن کہاوتوں کا پرچار ہے ان میں زیادہ تر دیہات کی ہی ہیں اور ہماری شائستہ ہندی انگریزی یا دوسری زبانوں کی کہاوتیں یا محاوروں کے ترجمہ کو اپنانے کے علاوہ اپنی نئی کہاوتیں یا محاورے اختیار کرنے میں بہت کم کامیاب ہوئی ہیں۔ اس طرف بھی ہم لوگوں کا دھیان جانا چاہئے۔

ساتھ ہی اپنے ملک کے رہنے والوں کی روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھنے والے نئے لفظوں کے جذب کرنے یا رائج لفظوں کے اپنانے میں پوری دلچسپی نہیں دکھلانے میں بھی ہم نہ تو ہندی کو پوری طور پر قومی زبان بنا سکیں گے اور نہ خیالات کو ظاہر کرسکنے کی قدرت و استطاعت کی دوڑ میں ہی کامیاب ہوسکیں گے،

گے میں چاہتا ہوں کہ ہندی کو وسیع اور مشترکہ زبان "قومی زبان" بنانے کے لئے اس کا ذخیرہ الفاظ بڑھایا جائے اور اس میں فکر اور اندیشہ نہ کرکے جہاں سے ایسے اچھے لفظ مل سکیں جن کا سلسلہ رجار ہوسکتا ہو ہم لے لیں۔ تب ہی یہ زبان ہندوستان بھر کی قومی زبان ہونے کا دعوے ثابت کرسکے گی۔ سب ہی زندہ زبانیں اسی طرح سے ترقی کرتی ہیں اور یہی راستہ ہے جس پر چل کر ہندی اپنا نام لافانی کرسکے گی ایسا ہونے سے ہندی اُردو کا جھگڑا بھی بہت حصوں میں مٹ جائے گا اور اگر اُردو صرف فارسی عربی کی طرف ہی اپنی نظر رکھ کر دوسرے لفظوں کا بائی کاٹ کرے گی تو اس کی ترقی کا سوتہ سوکھ جائے گا اور وہ محدود زبان بن جائے گی۔ اگر ہندی نے بھی اس لغصان رساں اصول کی پیروی کی تو اس کی ترقی کا سوتہ بھی اسی طرح سوکھ جائے گا۔ اور وہ ہزار کوششوں سے بھی قومی زبان نہیں بن سکے گی۔

یہ ہم مانتے ہیں کہ زبان کی اصلاح کا کام کسی ایک آدمی یا ایک جماعت کے ذریعہ نہیں کیا جاسکتا ہے اور نہ اس کی شکل ہی بدل دی جاسکتی ہے تو بھی اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اگر کسی زبان کے سب ہی مصنف اور عالم اس میں انقلاب لانا چاہیں تو بہت حصوں میں وہ کامیاب بھی ہوسکتے ہیں۔ سب ہی زبانوں کی تاریخ میں اس قسم کے زبردست مصنف گذر چکے ہیں جنھوں نے اس زبان کے دھارے کو موڑ کر اس کا روپ بدل دیا ہے اور آج اگر کوئی ایک دو ایسے زبردست لوگ ہم میں نہ بھی ہوں تو سب ہی عالموں کی جمعیت تو اس کام کو کر ہی سکتی ہے۔ اس لئے آپ عالموں سے درخواست ہے کہ آپ اس پر غور کریں

عد اگر یہ باتیں جانچیں تو ان کے مطابق کام کرنے کی کوشش کریں۔

زبان میں لفظوں کے علاوہ قواعد زبان کا بھی بہت بڑا اثر ہوتا ہے۔ الفاظ بدل دینے پر بھی اگر گرامر اور طرز تحریر نہ بدلا جائے تو زبان کی شکل نہیں بدلتی۔ اس کی لغات میں ہیر پھیر اور اس کے وغیرہ الفاظ کی تبدیلی آسان ہے مگر گرامر بدلنا بہت کٹھن ہے۔ جو زبان بولی جاتی ہے اس کے قواعد بدلتے رہتے ہیں اور اس کی گرامر کے اصول اتنے کڑے اور اٹل نہیں ہو سکتے کہ ان کو بدلنا ممکن ہو جائے۔ آج انگریزی کے کسی بھی اچھے مصنف کی کتابیں آپ اٹھا کر پڑھیں اور گرامر میں دیئے ہوئے اصولوں کے مطابق ان کو جانچیں تو ان میں بہتیرے ایسے جملے ملیں گے جن کو گرامر کے اصول کے مطابق غیر صحیح کہنا پڑے گا۔ ایسی حالت میں سوال ہوتا ہے کہ جملہ غلط ہے یا گرامر کے اصول میں کوئی بھول ہے جب تک زبان بولی جاتی ہے اور دن بدن ترقی کر لی جاتی ہے گرامر اور زبردست مصنفوں میں اس طرح کا جھگڑا چلتا ہی رہتا ہے۔ سنسکرت میں شدہ اور استدہ جملوں کا فیصلہ آج سہل ہے کیونکہ ان کی جانچ استادوں کے اصولوں کے موافق ہی ہو سکتی ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ اگر ہندی کو جیتی جاگتی پھیلنے والی قومی زبان رکھنا اور بنانا ہے تو اس کے گرامر کے اصول بھی ناقابل تبدیلی نہیں ہو سکتے اور اگر ایسی کوشش کی جائے گی، تو زبان کی ترقی رک جائے گی اور زبان کے اصولوں سے بھی زیادہ تعداد مستثنیات کی ہو جائے گی۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی اصول ہونا ہی نہیں چاہئے۔ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اصولوں میں وقت اور مصلحت کے مطابق تبدیلی کی ضرورت ہے اور ان کو موزوں بنانا لازمی ہے۔ موزوں بنانے میں ایک بات پر دھیان رکھنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ جو ہندی نہیں جانتے ان کو تین چار اصولوں کی وجہ سے بہت مشکل پڑتی ہے۔ تذکیر و تانیث کا فرق وہ نہیں سمجھ سکتے اور سچ پوچھئے تو ہندی بولنے والے بھی نہیں سمجھ سکتے۔ جو ہندی کے پرانے لفظ ہیں اور جن کی تذکیر و تانیث مشہور ہو گئی ہے ان کی بات چھوڑ دیجئے۔ اگرچہ پرانے ادب میں بھی ایک ہی لفظ دونوں طرح سے استعمال ہوا ہے۔ اتنا ہی نہیں تو آج بھی کبھی کبھی ہندی کے زبردست لکھنے والے بھی شک میں پڑ جاتے ہیں۔ جیسے "" اور "" لفظ عام طور پر

مونث ہی مانا جاتا ہے۔ لیکن ہندی کے ایک بہت بڑے مصنف نے اپنی ایک کہانی میں لکھا ہے "گھٹنا چکر اسے دوسرے ہی اور لیجاتا ہے۔"

نئے لفظ جو لئے جا رہے ہیں ان کے لئے کوئی موزوں اصول بنانا آسان ہے۔ آج اصول نہیں رہے۔ لکھنے والے اور ان میں بھی زیادہ تر اخباروں کے ایڈیٹر جس کو چاہیں مونث اور مذکر بنا دیتے ہیں۔ کونین، لالٹین، موٹر، کانگریس اور کانفرنس کو کیوں مونث بنا دیا گیا؟ اس کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے اور اردو کا مذکر قلم اور چرچا ہندی میں پہنچتے ہی کیوں مونث ہو گئے؟ یا ہندی کی مونث قلم اور چرچا اردو میں پہنچتے ہی کیسے مذکر بن گئیں۔ اس کا بھی کوئی معقول سبب نہیں ہے۔ یہ کہنا کہ ان کے ہم معنی لفظ جیسے سبھا کمیٹی اور سمیتی وغیرہ مونث ہیں کافی نہیں ہے اور نہ سنسکرت کی سند پر ہی ان لفظوں کی تذکیر و تانیث مقرر کی جا سکتی ہے۔ اگنی، آتما اور پستک سنسکرت میں مذکر ہیں پر ہندی میں مونث میں ہی ان لفظوں کا استعمال ہوتا ہے جو بے جان چیزیں ہیں ان کی تذکیر و تانیث کے فیصلے میں بہت گڑبڑی مچی ہے اور جو ہندی زبان نہیں جانتے مشکل میں پڑ جاتے ہیں تذکیر و تانیث کے فیصلے کے لئے جو اصول ہیں وہ اتنے ہمہ گیر نہیں ہیں کہ سب ہی لفظوں پر لگ سکیں اور آج جب بہت نئے لفظ آ رہے ہیں نئے لفظوں پر ان اصولوں کو لگانا اصولوں اور لفظوں دونوں کے ساتھ ظلم کرنا ہے۔ اگر سب ہی بے جان لفظوں کے لئے کچھ ایسے موزوں اور سہل اصول بنائے جائیں جن کو جاننے کے لئے اخباروں اور مصنفوں کی سند نہ لینا پڑے تو ہندی پرچار کے راستہ سے ایک بھاری رکاوٹ اٹھ جائے۔

"نے" کے استعمال میں بھی بہت مشکل پڑتی ہے۔ پنجاب میں "نے" کا استعمال الگ ہے اور ہندی لکھنے والے اسے سمجھتے اور مانتے ہیں۔ پر اس کے علاوہ بھی بہت سی شکلیں ہیں۔ آپ حضرات کے سامنے ایک جملہ رکھتا ہوں اور جاننا چاہتا ہوں کہ یہ جملہ صحیح ہے یا نہیں۔ "پر تو اس ودیا کی جیسی اُنتی ہمارے پراتہ سمرنیا بھارتیہ ودوانوں نے اپنی پراچین کال سے ہی کی ہوئی ہے۔ اس کی تُلنا میں سنسار کی ایک بھی بھاشا نہیں دکھتی کہ جو بھارتیہ رشیوں کو پیاری سنسکرت بھاشا کی کسی انش میں

میں برابری کر سکے ؟ اگر یہ جملہ صحیح ہے تو اصولوں میں کچھ تبدیلی کی ضرورت ہے اور اگر یہ غیر صحیح ہے تو بڑے سے بڑے عالم بھی "نے" کے صحیح استعمال کو نہیں سمجھ پائے ہیں یہ ماننا ہوگا۔ ایسی حالت میں معمولی پڑھنے والوں اور نو سکھڑوں کی دقت کا اندازہ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے اور ہم سمجھ سکتے ہیں کہ کیوں ہمارے اڈیا دوست شری گوپ بندھو چودھری اور شری راما دیوی نے "نے" کا استعمال اٹھانے کی صلاح دی ہے۔

اسی طرح بہت مشکل اس بات سے بھی بلا شبہ ہوتی ہیں کہ کب فعل کی جمع کام کے مطابق ہونا چاہئے اور کب کام کرنے والے کے مطابق۔ غیر ہندی علاقوں کے رہنے والے ہی نہیں ہندی بولنے والے بھی کبھی کبھی شکل میں پڑ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس بارے میں اور بھی دقتیں ہوتی ہیں۔ جیسے پنڈت جوالا پرشاد جی شرما نے دو ھوا نامی کہانی میں لکھا ہے:۔ " انھوں نے پہلے تو ہاں ہوں کی" اس میں مونث فعل کے لئے کون سا مونث کام ہے یہ سمجھ میں نہیں آتا۔

اسم کی جمع بھی کبھی کبھی ہم کو گڑبڑی میں ڈال دیتی ہے۔ جیسے " آٹھ اونٹ آئے" اور "آٹھ اونٹوں کو وہ سامنے لایا"۔ دونوں جملوں میں اونٹ لفظ جمع میں آیا ہے لیکن ایک جگہ اونٹ کی جمع اونٹ ہی ہے اور دوسری جگہ " اونٹوں" ہے۔ اس طرح کی بہتیری مثالیں ملیں گی جن کے بارے میں اصول ہونے پر بھی وہ اصول ایسے ہیں جن کا سمجھنا اور صحیح استعمال کرنا مشکل ہوتا ہے۔

ہندی لکھنے کا طرز بھی مختلف مصنفوں کا مختلف ہے۔ ایک ہی لفظ کے ہجے کئی طرح کے ہو جاتے ہیں۔ غیر ہندی علاقوں میں ایک ہی لفظ کے دو روپ دیکھ کر لوگ اچنبھے میں پڑ جاتے ہیں اور گھبراتے ہیں کیونکہ اس کا دوسرا روپ دیکھ کر وہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ شاید یہ دوسرا ہی لفظ ہے۔ اگرچہ یہ خرابی بہت عام نہیں ہے پھر بھی اس کا دور ہونا ضروری ہے۔ جیسے लिय اور लिये - चाहिय اور चाहिये - आई اور आयी - गयी اور गई آتا ہی نہیں भूक اور भूख - सबी اور सभी - धोका اور धोरना وغیرہ۔ ان کے علاوہ کچھ اور دوسرے لفظوں کے استعمال میں بھی ان کی جگہ کے بارے میں گڑبڑی ہوتی ہے۔ جیسے " ہی" کو لے لیجئے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں "آپ ہی

کے لئے تو ہے" اور کچھ لوگ کہتے ہیں "آپ کے ہی لیے تو ہے" ان دونوں میں کون صحیح ہے۔

ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ کچھ لکھنے والے رائج لفظوں کو سنسکرت شکل دے کر سمجھتے ہیں کہ ہندی کو شدھ بنا رہے ہیں۔ اسی طرح فارسی داں فارسی لفظوں کو صحیح فارسی شکل دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ یہ خیال کرنے کے لائق بات ہے کہ ہندی میں جو لفظ آ گئے ہیں وہ ہندی ہو گئے ہیں یا یہاں بھی سنسکرت اور فارسی بنے رہتے ہیں جیسے ہندوستان میں اب بھی انگریز انگریزی بنے رہتے ہیں۔ اگر ایسا ہوگا تو ہو سکتا ہے کہ ان کی بھی وہی حالت ہو جو ان بدیسیوں کی ہوگی جو اپنا بدیسی پن نہیں چھوڑتے۔

ہندی رسم الخط کے بارے میں غور کرنے کے لئے آپ نے ایک کمیٹی بنائی ہے۔ وہ اسی مضمون پر غور کر رہی ہے اور اپنی رپورٹ آپ کے سامنے رکھے گی اس پر آپ غور کریں گے ہی۔ میں اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ رسم الخط کی اصلاح کے سلسلہ میں پوری صحت کے ساتھ لفظوں کے لکھے جانے اور لکھے ہوئے لفظوں کے ٹھیک ٹھیک تلفظ ادا ہو سکنے کے علاوہ اس پر بھی دھیان رکھنا ضروری ہے کہ تیزی کے ساتھ بھی یہ رسم الخط لکھا جا سکے اور چھاپنے ٹائپ کرنے میں کم از کم جگہ لے اور کم سے کم شکل معلوم ہو۔ مجھے یقین ہے کہ کمیٹی نے ان سب پر غور کیا ہے اور اس کے نتائج کو آپ وہ وقعت دیں گے جس کے وہ مستحق ہیں۔ ہمیں اس موضوع پر صوبہ کی زبانوں کے ادیبوں اور عالموں سے بھی امداد لینی پڑے گی۔ خاص کر مرہٹی کے ادیبوں سے کیونکہ ہندی اور مرہٹی ایک ہی رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں اور جو کچھ مشکلیں ہندی رسم الخط کے سامنے ہیں وہی مرہٹی کو بھی ستاتی ہوں گی اور جو حل ان مشکلوں کا ہم ایک کے لئے کریں گے وہ دونوں کے لئے مفید ہوگا۔

میں نے ایسے سوالوں کو آپ کے سامنے پیش کیا ہے جن پر تبلیغ کی نگاہ سے غور کرنا بہت زیادہ ضروری ہے۔ اتنے بڑے سمیلن میں اور ایک دو دن کی بیٹھک میں اتنے گہرے مسائل پر مکمل غور کرنا ناممکن ہے۔ اس لئے اچھا ہوا اگر آپ ادیبوں کی ایک ایسی کمیٹی بنا دیں جو زبان کی ویاکرن، علم زبان کے اصولوں اور ہندی پرچار پر نظر رکھتے ہوئے ان کا حل سوچیں اور اپنی رپورٹ دیں اور خاص کر ہندی بولنے والوں اور ادیبوں کے سامنے رکھیں اور ان کے مشورہ سے بعد میں اس با اختیار کمیٹی کے ذریعہ جو ترمیمیں اور تنسیخ مناسب مانی جائیں وہ قبول کر کے ہندی بولنے والوں اور ہندی سے محبت رکھنے والوں کے لئے مناسب

شکل میں پیش کی جائیں۔ اگر آپ سمجھیں کہ ایک کمیٹی سے سب کام پورا نہیں ہو سکتا تو ڈکشنری کے لئے ایک الگ کمیٹی بنا دیجئے اور قواعد زبان کے لئے دوسری کمیٹی بنائی جائے۔ میں جہاں تک دیکھ سکتا ہوں دونوں کے لئے کافی کام ہوگا۔

ڈکشنری کی کمیٹی کے لئے صوبہ کی زبانوں کی ڈکشنریاں اور گاؤں میں رائج لفظوں کا جن میں کاروبار، دیہاتی آرٹ، کھیتی وغیرہ سے تعلق رکھنے والے بے شمار لفظ شامل ہیں ایک خزانہ بھرا پڑا ہے۔ فارسی، عربی، ترکی، انگریزی وغیرہ کے ایسے لفظوں کا جو رائج ہو گئے ہیں یا ہو رہے ہیں یا جن کو رائج ہو جانا چاہئے بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ معمولی کاروبار میں تقریباً ڈھائی ہزار لفظ کام میں آتے ہیں۔ اصطلاحی اور علمی لفظوں کو چھوڑ کر روز مرہ کے کام میں اس سے زیادہ لفظ ہم استعمال نہیں کرتے ہیں۔ کیا یہ ناممکن ہے کہ ایک چھوٹا لغت ایسے لفظوں کا بنایا جائے جو ہندی اور اردو دونوں کے لفظوں پر حاوی ہو۔ ہم اس چیز کو بھول نہیں سکتے کہ ہندی اور اردو دونوں ہندوستان میں ہیں اور رہیں گی بھی۔ ایسی حالت میں ہندی جاننے والے کو معمولی اردو لفظوں کا اور اردو جاننے والوں کو ہندی لفظوں کا علم ہونا ضروری ہے اور اس علم کے بڑھانے میں اس قسم کا لغت بہت بڑا کام دینے والا ہوگا اس لئے ڈکشنری کی کمیٹی اس کام کو لے لیوے تو بہت مناسب ہو۔ اس کے علاوہ صوبہ کی زبانوں میں سے بھی اچھے لفظوں کو لے لینا اچھا ہوگا۔ انگریزی کا ایک بہت معمولی لفظ نوٹ ہے۔ ہندی میں اس کا ٹھیک ہم معنی لفظ نہیں ملتا لیکن مرہٹی، گجراتی اور کئی دوسری زبانوں میں اس کا ہم معنی لفظ "نوند" آتا ہے۔ ہم کیوں نہ اسے ہندی میں چلا لیں۔ اس طرح کے اور بہت سے لفظ ہیں۔ کمیٹی ان کی کھوج کرے اور جہاں ضروری ہو ان کو ہندی میں جگہ دے۔

گرامر والی کمیٹی زبان کی صحت کے مسائل کے علاوہ اس مسئلہ پر نظر ڈالے کہ ہندی سہل اور عام فہم زبان بنے جس سے دوسرے صوبوں میں اس کا پرچار تیزی سے ہو سکے

میں نے اس وقت تک ہندی پرچار کی نگاہ سے زبان کی خامیوں کو دور کرنے پر ہی غور کیا ہے ادب کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا ہے۔ اس کی ایک وجہ بھی ہے۔ میں ادب کے لئے سپند نہیں ہوں

پر اتنا ہی کہے بغیر بھی کہہ دینا نامناسب نہ ہوگا کہ جس وقت میں اسکول کالج میں پڑھ رہا تھا اس وقت کی اور آج کی حالت میں بہت فرق ہوگیا ہے اب ہندی کو یونیورسٹیوں کی اونچی جماعتوں میں بھی جگہ مل گئی ہے اور ہندی کے ادیب و عالم سب ہی مضامین پر کتابیں لکھ رہے ہیں۔ پر ابھی تک یہ نہیں ہوا ہے کہ عالم اور مصنف اپنے اوریجنل مضامین اور کتابوں کو ہندی میں لکھیں اور جن کو اس مضمون کا علم حاصل کرنا ہو وہ ان کے اوریجنل کتابوں کو پڑھنے کے لئے ہندی زبان کو سیکھیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مصنفوں کو ابھی تک یہ بھروسہ نہیں ہوتا ہے کہ ان کی اوریجنل تصنیفوں کے قدرداں ہندی بولنے والوں میں مل سکیں گے۔ یہ شک ایک حد تک بے بنیاد بھی نہیں ہے اس لئے ایسی گہری کتابوں کے پڑھنے کا شوق ہم کو پیدا کرنا ہے کسی بھی ریلوے اسٹیشن پر آپ جاکر دیکھیں تو ہندی کی کچھ خوبصورت جلد والی اور بہت دام والی کتابیں دیکھنے میں آئیں گی پر وہ کسی گہرے مضمون کی کتابیں نہیں ہوتیں اور نہ اعلیٰ مرتبہ کے ادب میں ہی ان کا شمار ہوسکتا ہے۔ محض ناول ہونے سے ہی ایک کتاب کا مرتبہ گر جاتا ہے' یہ میں نہیں کہتا۔ ناول کی شکل میں فرنچ' بنگلہ اور ہندی میں بھی کچھ مستند کتابوں کی اشاعت ہوئی ہے پر زیادہ تر کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو وقت اور روپیہ کو ضائع کرنے کے سوا انسانی سیرت کو بھی خراب کرنے سے باز نہیں رہتیں۔ ادیبوں کا کام ہے کہ عوام کا شوق بدلیں اس کام میں نقاد اور مبصر بڑی مدد کرسکتے ہیں ہندی ادب اتنی ترقی نہیں کر رہا ہے جتنی ہونی چاہئے۔ اس لئے ادب اور ادیب کے اصولوں سے پوری واقفیت کے علاوہ نقادوں میں یہ خوبی بھی ہونی چاہئے کہ اپنے فرض کو پہچانیں۔ نہ کسی کے ساتھ دشمنی کریں نہ کسی کی طرفداری۔ ان کا فرض ہے کہ سچے ادب کی تخلیق میں مصنفوں کی مدد کریں۔ انسانی سیرت پر ادب کا سب سے گہرا اثر پڑتا ہے اور سچا نقاد وہ پہرہ دار ہے جو انسانی سیرت کی حفاظت کرتا ہے۔ اس انسانی سیرت کی حفاظت کرتا ہے جو دولت اور انسانی زندگی سے بھی زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ کیونکہ سیرت نہ رہی تو زندگی بے کار ہے جب نقاد کا اتنا فرض پہرہ دار کی حیثیت سے ہے تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ادیب کا کتنا زیادہ فرض ہے۔ وہ دوسرے کے پیدا کی ہوئی دولت کی حفاظت نہیں کرتا وہ تو خود دولت پیدا کرتا ہے۔ خود اپنی تقریر اور تحریر سے نئی نوع انسان کی سیرت بناتا ہے اور اس کا اثر اس کے مرنے کے بعد بھی پڑتا رہتا ہے اس لئے

ادیب بننا ہر ایک ایسے عورت اور مرد کا کام نہیں ہے جو قواعد زبان کے مطابق صحیح جملہ لکھ سکتے ہوں نہ وہ ایسے لوگوں کا ہی کام ہے جو بڑے بڑے چھپے دار لفظوں کا انبار بنا کر لوگوں کو گرویدہ کریں۔ سچے ادیب کا ایک ہی پیمانہ ہے۔ چاہے اس میں رس کوئی بھی ہو پر اگر وہ بنی نوع انسان کو اوپر لے جاتا ہو تو سچا ادیب ہے اور اگر اس کا اثر اس سے الٹا پڑتا ہو تو چاہے جیسی ہی مستند اور دل لبھانے والی زبان میں کیوں نہ ہو وہ ادیب نہیں ہو سکتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ سچے ادب کے لکھنے میں وہی کامیاب ہو سکتا ہے جس نے تپسیا اور محنت سے اپنے کو اس کے لائق بنایا ہو۔ جیسے کمانے کے لئے اور کسی ناشر کے حکم پر وقت سے کاپی پہنچانے والے ایسا ادب نہیں بنا سکتے۔ اس کے لئے ایک طرح کی دیوی شکتی چاہئے جو عمل صالح اور ایک پورے جنم کی تپسیا اور ریاضت کا ہی پھل ہو سکتی ہے۔

وفاق ادبیاتِ ہند

(بھارتیہ ساہتیہ پریشد)

اپریل ۱۹۳۶ء میں مہاتما گاندھی کی صدارت میں جو ہندی ادبی کانفرنس اندور میں ہوئی تھی اس میں کنہیا لال منشی صاحب گجراتی کے مشہور ادیب اور ان کے چند ہم خیال لوگوں نے ہندوستان کے مختلف زبانوں کے ادیبوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے اور ان کے ادب سے تمام ملک کو واقف کرانے کی ایک تحریک اٹھائی تھی۔ جس کا ہندی کے ادیبوں نے خیر مقدم کیا تھا اور اس کو عملی جامہ پہنانے کا کام ایک کمیٹی کے سپرد کیا گیا تھا جس کے ایک سرگرم کارکن کنہیا لال منشی صاحب تھے۔ انھوں نے مختلف زبانوں کے معزز اشخاص اور ادبی اداروں سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع کیا اور ان کے پاس اپنی تحریک سے متعلق لٹریچر روانہ کیا اور انھیں شرکت کی دعوت دی۔ اپنے ایک پمفلٹ میں اپنی تحریک کا مطلب سمجھاتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا۔

"ادھر کچھ دنوں سے ہندوستان کے ان سب ہی صوبوں میں جن کی اپنی خاص خاص زبانیں ہیں ایک ادبی بیداری پیدا ہو رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہر زبان کی اپنی چھوٹی چھوٹی ادبی انجمنیں پیدا ہو گئی ہیں۔ اور ان سب نے اپنی اپنی زبان کے ادبی وفاقوں سے الحاق کر لیا ہے۔ مگر عموماً ملک کی مختلف زبانوں کے یہ وفاق ایک دوسرے سے الگ رہ کر کام کر رہے ہیں اور ان کی آپس کی جدائی اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ ان کے ادیبوں کو جتنا علم انگلینڈ کے جدید ادبی اور تمدنی مشاغل کا ہے اتنا اپنے پڑوس کی زبان کے بارے میں نہیں ہے۔ ہر صوبہ کے باہر ایسے بہت کم لوگ ہیں جنھیں اس صوبہ کی زبان کے نئے مصنفوں کے ادبی رجحانات اور طرز ہائے بیان کا تھوڑا سا بھی علم ہو۔ جن صوبوں میں ہندی نہیں بولی جاتی وہاں کچھ لوگ تلسی داس اور سورداس کے نام سے شاید واقف ہوں لیکن وہ ہندی کے موجودہ مصنفوں کو نہیں جانتے۔ بنگالی ادب سے ہماری جو کچھ واقفیت ہے وہ رابندر ناتھ ٹیگور کی وجہ سے ہے۔ گجراتی ادب کے بارے میں ہم جو کچھ جانتے ہیں

وہ مہاتما جی کی آپ بیتی کے انگریزی ترجمہ کے ذریعہ سے ۔ نئے گجرات نے جس رومانی ادب کو پیدا کیا ہے وہ دوسرے صوبہ والوں کے لئے ایک سربمہر کتاب ہے ۔ کرناٹک، تامل ناڈ، آندھرا کرل وغیرہ صوبوں میں جس نئے ادب کا آغاز ہو رہا ہے دریائے گوداوری کے شمال میں رہنے والوں کو اس کا علم نہیں ہے ۔

" لیکن باوجود اس دوری اور ناواقفیت کے جدید ادب پر اس وقت ہر جگہ قومیت کا رنگ چھایا ہوا ہے اور آیندہ بھی چھایا رہے گا ۔ سب ہی صوبوں کی کوششیں ایک ملکی قومیت کو پیدا کرنے کی طرف مائل ہیں ۔ اس لئے ایک ایسے ادبی وفاق کی ضرورت ہے جس کی تعمیر میں ہر صوبہ نے اپنا بہترین اور اعلیٰ ترین حصہ پیش کیا ہو تاکہ ہندوستانی قومیت کا ترقی پذیر جذبہ اپنے انتہائی عروج کمال تک پہنچ سکے ۔"

یہ خیالات تھے جن کا کنہیا لال منشی صاحب نے ہندوستان کی مختلف زبانوں کا ایک ادبی وفاق قائم کرنے کے سلسلہ میں اظہار کیا تھا ۔ تقریباً اسی قسم کے خیالات اور تاثر چونکہ قوم پرست ہندوستانیوں کے دلوں میں عام طور پر موجود تھیں اس لئے ان کے اس خیال کا ملک کے ہر حصہ میں نہایت اچھا خیر مقدم ہوا ۔ ہر صوبے کے رہنے والے اپنے دوسرے صوبوں کے ہم وطنوں کے خیالات، جذبات رسوم اور معتقدات معلوم کرنا چاہتے ہیں ۔ لیکن زبان اور رسم خط کے اختلاف کی وجہ سے نہ تو دوسرے لوگوں کا مفہوم خود سمجھ پاتے ہیں اور نہ اپنا مفہوم اور اپنے دل کی بات دوسروں تک پہنچانے میں کامیاب ہوتے ہیں ۔ اسی بنا پر اخباروں، جلسوں اور قومی کاموں میں علیحدگی اور بیگانگی پیدا ہو جاتی ہے ۔ فرقہ پرستی کے جذبات ترقی پاتے ہیں، غلط فہمیاں بڑھتی ہیں اور ایک دوسرے سے مغائرت اور دشمنی کا برتاؤ کیا جانے لگتا ہے ۔ ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے ہر محب وطن ایسی تمام کوششوں کو جن سے دوری کم ہو، آپس میں میل جول بڑھے، ایک دوسرے کو بہتر طریقہ پر سمجھنے سمجھانے کا موقع ملے اور قربت اور ہم نشینی کے امکانات پیدا ہوں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے ۔

اس مقصد کو جامعہ کے کارکن بھی اچھا سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب کنہیا لال منشی صاحب کے خطوط شیخ الجامعہ صاحب اور جامعہ کی اردو اکادمی کے پاس آئے تو انھوں نے بھی اس تخیل کا خیر مقدم کیا اور اس وفاق کے لئے اپنے نمایندے نامزد کئے۔ لیکن منشی صاحب کی اس تجویز سے کہ "اس قسم کا ادبی وفاق صرف ہندی کے ذریعہ ہی ممکن ہے اور ہندی کے لئے صوبوں کی زبانوں کو متحدہ طور پر کوشش کرنا چاہیئے" شدید اختلاف رائے کا اظہار کیا گیا۔ جامعہ سے مختلف لوگوں نے اس مسئلہ پر منشی جی کو جو خطوط لکھے ان میں یہ بات واضح طور پر بیان کی گئی کہ ہندی اس کام کو انجام دینے کے لئے کسی طرح موزوں نہیں ہے بلکہ اس کام کے لئے اگر کوئی زبان موزوں ہوسکتی ہے تو وہ "ہندوستانی" ہے۔

وفاق کی تحریک کو چلانے کے لئے کنہیا لال منشی صاحب اور منشی پریم چند صاحب کی مشترکہ ادارت میں ایک رسالہ بھی نکلنا شروع ہوا جس میں ملک کی مختلف زبانوں کا ادب ہندی میں پیش کیا جانے لگا۔ اس رسالہ کے لئے جامعہ کے لوگوں نے مضامین بھی بھیجے جن میں سے بعض "ہنس" نے بجنسہ اپنی اصل شکل میں اور بعض کو صرف چند الفاظ کے ترجمے کے ساتھ شایع کیا۔ لیکن عام طور پر جو مضامین شائع ہوئے ان کی زبان سخت ہندی ہوتی تھی جس کی بابت جامعہ کی طرف سے برابر اعتراض کا سلسلہ جاری رہا اور اس بات پر اصرار کیا گیا کہ یہ زبان ہندوستانی ادبی وفاق کے لئے ہرگز موزوں نہیں ہے۔ خط کتابت کے دوران میں کنہیا لال منشی صاحب نے بھی ہمارے خیالات کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا اور اس مسئلہ کے متعلق آخری فیصلہ کو تمام زبانوں کے ادیبوں کی اجتماع تک کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔ اس اجتماع کے لئے مختلف تاریخیں مقرر ہوئیں جو مہاتما گاندھی کی مصروفیتوں کی وجہ سے ملتوی ہوتی رہیں۔ اس میں ہندوستان کی تمام زبانوں کی انجمنوں، مشہور ادیبوں، نقادوں، پروفیسروں، یونیورسٹیوں کے نمایندوں کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ یہ دعوت نامے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد، جامعہ ملیہ دہلی اور دوسرے اُردو کے اداروں کے پاس بھی بھیجے گئے۔ آخر کار یہ اجتماع ہندی ادبی کانفرنس کے ساتھ ناگپور میں ہوا۔ اس کے مہاتما

گاندھی صدر منتخب کئے گئے۔ انجمن ترقی اُردو اور عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے شرکت کے لئے مولوی عبدالحق صاحب بھی تشریف لائے اور جامعہ ملیہ نے بھی اپنا ایک نمائندہ اس جلسہ کی کارروائی میں شریک ہونے کے لئے بھیجا۔ مجلس استقبالیہ کے صدر کے خطبہ اور مہاتما گاندھی کے خطبہ صدارت کے بعد اس "وفاق ادبیات ہند" (بھارتیہ ساہتیہ پریشد) کے اغراض ومقاصد متعین کرنے کے لئے جلسہ کیا گیا۔ اس جلسہ میں جامعہ ملیہ کی طرف سے پروفیسر محمد مجیب صاحب کا ایک خط انگریزی زبان میں پنڈت جواہر لال نہرو صاحب نے پڑھ کر سنایا جس کے ضروری اجزا ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

"کئی سال سے کانگریس اس کا پرچار کر رہی ہے کہ ہماری قوم کے سیاسی حوصلوں کو سہارا دینے کے لئے ایک قومی زبان بھی ہونی چاہئے۔ اگر زبان کے لحاظ سے دیکھئے تو اس خیال کی وجہ سے بہت سے مقرر طرح طرح کے گناہوں میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اردو کے ادبی حلقوں میں اس نے زبان کو سادہ اور گھریلو بنانے کا شوق پیدا کر دیا ہے جو پہلے نہیں تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی جیسے لکھنے والے جن کی ساری عمر عربی کتابیں پڑھتے گذری ہے اور جو ایسے مضمونوں پر لکھتے ہیں جن کی اصطلاحیں بدلنا ایک بے ادبی ہے انھوں نے بھی بڑے جوش کے ساتھ اپنی زبان کو سادہ اور ہندوستانی بنانے کی کوشش شروع کر دی۔ اس لئے کہ قومی زبان کا خیال ان کو بہت عزیز تھا۔

"کانگریسی حلقوں میں، یہ قومی زبان ہندوستانی کہلاتی تھی۔ لیکن کانگریس نے اُردو اور ہندی بولنے والوں سے اس نام کے بارے میں کوئی سمجھوتہ نہیں کیا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ سیاسی اور سماجی زندگی میں ناموں کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ کیونکہ نام کے ساتھ بہت سی باتیں یاد آ جاتی ہیں اس وجہ سے یہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے کہ ہم اپنی قومی زبان کا نام کیا رکھیں گے۔ ابھی تک اُردو ہی ایسی زبان تھی جو کسی ایک صوبہ کی یا کسی ایک مذہبی جماعت کی زبان نہیں تھی۔ ہندوستان بھر میں مسلمان اسے بولتے ہیں اور شمالی ہندوستان میں اُردو بولنے والے ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ ہے۔

اگر ہماری قومی زبان اُردو نہیں کہلا سکتی تو کم از کم اس کا نام ایسا تو ہونا چاہئے جس سے یہ ظاہر ہو کہ مسلمانوں نے بھی ایک ایسی زبان بنانے کی خاص کوشش کی جو قریب قریب قومی زبان کہی جا سکتی ہے۔ ہندوستانی سے یہ مطلب پورا ہو سکتا ہے ہندی سے نہیں ہو سکتا۔ اگلے زمانہ میں مسلمان ہندی سیکھتے تھے اسے ایک ادبی زبان کی حیثیت دینے میں انھوں نے اپنے ہندو بھائیوں سے زیادہ نہیں تو ان کے برابر تو کوشش کی ہی ہے۔ لیکن ادبی حیثیت کے علاوہ ہندی کی ایک مذہبی اور تہذیبی حیثیت ہے جسے مسلمانوں کی پوری جماعت اپنا نہیں سکتی۔ اس کے علاوہ اب اس نے بہت سے الفاظ اپنے اندر شامل کر لئے ہیں جو بالکل اسی کے ہیں اور وہ لوگ جو صرف اردو جانتے ہیں انھیں عام طور پر سمجھ نہیں سکتے۔

"اس بات پر زور دینا بجا ہوتا اگر اس وقت ہندی اور ہندوستانی کو ایک مگر اردو اور ہندوستانی کو الگ زبانیں ٹھیرانے کی طرف ایک خاص میلان نہ ہوتا۔ پچھلے سال آپ نے اندور میں جو تقریر کی تھی اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ آپ ہندی اور ہندوستانی کو ایک سمجھتے ہیں اور "ہنس" کے پہلے نمبر کے لئے آپ نے جو پیغام لکھا تھا اس میں دونوں زبانوں کو ایک بتایا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہندی سے آپ کا مطلب عام لوگوں کی زبان ہے۔ وہ زبان جو وہ بولتے ہیں اور جو ان کی تعلیم کا سب سے اچھا ذریعہ بن سکتی ہے۔ لیکن بہت سے لوگ جو ہندی کا پرچار کر رہے ہیں ان کو اس زبان سے کچھ مطلب نہیں۔ وہ جب ہندوستانی کی جگہ ہندی کہتے ہیں تو بس ایک نام کی جگہ دوسرا نام ہی نہیں لے لیتے بلکہ ایک پوری لغت ہی مذاق اور سیاسی اور مذہبی خیالات کی جگہ گھڑ دیتے ہیں۔ میں آپ کی عدالت میں اس میلان کے خلاف فریاد کرنے آیا ہوں اس لئے کہ مجھے جان پڑتا ہے کہ "بھارتیہ ساہتیہ پریشد" بھی اسی میلان کا شکار ہوئی ہے۔

"میں ان لوگوں میں سے ہوں جنھیں پریشد کے قائم ہونے پر بڑی خوشی ہوئی۔ اس لئے کہ میں سمجھتا تھا کہ اب ہماری قومی زبان کی بنیاد بہت مضبوط ہو جائے گی۔ "ہنس" شائع ہوا تب بھی میں بہت خوش ہوا۔ مجھے پریشد کے اور کاموں پر اعتراض نہیں کرنا ہے لیکن اگر ہنس کے پرچے

سے اس کے رویے کا کوئی اندازہ ہو سکتا ہے تو میں کہوں گا کہ مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ منشی پریم چند صاحب
آج کل ہماری ادبی دنیا کے شاید سب سے بڑے آدمی ہیں - وہ ان نایاب لوگوں میں ہیں جن کے لئے
ادب اور زبان اپنے دل کی بات کہنے اور دیس کی سیوا کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ وہ اردو اور ہندی
دونوں کے استاد ہیں اور ان میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے بہترین ادبی حوصلے ملتے ہیں -
ہنس کو اس زبان میں ہونا چاہئے تھا جو یہ لکھتے ہیں اور ان باتوں کو نمونہ بنانا چاہئے تھا جو ہمیں ان
میں دکھائی دیتی ہیں۔ ایسا نہیں ہوا ہے اور اسی کی مجھے شکایت ہے۔ ہنس پڑھنے سے یہ خیال
ہوتا ہے کہ یہ ایک کسی خاص مذہبی سماج کا رسالہ ہے۔ اس کی زبان میں دوسرے ہندی رسالوں
سے زیادہ سنسکرت کے الفاظ ملتے ہیں اور اس زبان کو ہندوستانی کہنا ویسا ہی ہوگا جیسے اس کو
انگریزی کہنا۔ اس کے نقطہ نظر میں اور اس کے مضمونوں میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جس سے
پتہ چلے کہ ہندوستانی قوم ایک سماج ہے جو بہت سے سماجوں سے بنی ہے یا یہ کہ ہندوستان
میں ایک تہذیب کے علاوہ کوئی اور تہذیب بھی ہے۔ یہ لو میل نہ ہوا حکومت ہوئی۔
" ایک ذرا سی بات میرا مطلب ظاہر کر دے گی۔ ساہتیہ پریشد" بھارتیہ" کہلاتا ہے
ہندوستانی نہیں۔ ایسا کیوں ہے ؟ اگر بھارت کے کوئی معنی ہیں تو آریوں کا ہندوستان ہیں
جن میں ایک مسلمانوں اور ان کی خدمات کے لئے ہی نہیں بلکہ صدیوں کی ترقی اور تبدیلی کے لئے کوئی جگہ
نہیں - کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اس پریشد میں غیروں کی ضرورت نہیں ہے اور اسے آج
کل کے زمانہ سے مطلب نہیں بلکہ وہ ایک بہت پرانے زمانے کو دوبارہ واپس بلانا چاہتا ہے ؟
پھر آپ دیکھئے کہ ہندی میں جو گشتی چٹھیاں ہم کو بھیجی گئی ہیں ان میں بول چال کی زبان کے لفظ دو تین
سے زیادہ نہیں ہیں اور معمولی " نیچے لکھے ہوئے کی جگہ" خالص سنسکرت لفظ " نمن لکھت " استعمال
کیا گیا ہے۔ میں ناگری خط اچھی طرح سے پڑھ لیتا ہوں لیکن یہ گشتی چٹھیاں میری سمجھ میں نہیں آئیں
" یہ بات تو کھلی ہوئی ہے کہ سنسکرت اور عربی دونوں میں اصطلاحوں کا بڑا خزانہ ہے لیکن ہندوستان
کی قومی زبان یہ نہیں کر سکتی کہ ایک کو کام میں لائے اور دوسرے کو چھوڑ دے اس لئے کہ اگر عربی ایک

بدیسی زبان ہے تو سنسکرت کبھی بول چال کی زبان نہیں تھی ۔ اور جو بول چال کی ہندی کے لفظوں کو غور سے دیکھے گا تو اسے معلوم ہوگا کہ ان میں سے جو سنسکرت لفظ ہیں وہ زمانہ کے ساتھ بہت کچھ بدل گئے ہیں۔ کیونکہ انہیں زبان سے بولنے میں دشواری ہوتی ہے، ایک مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ آپ لوگوں کو بھی۔ آپ دیکھیں گے کہ "گرام" اور "ورش" جیسے چھوٹے چھوٹے لفظ بھی بدل کر "گاؤں" اور "برس" ہو گئے ہیں۔ ہندی کے بہت سے پرچارک ان باتوں کو بھول جاتے ہیں۔ انھوں نے ہندی کے ان شبدوں کی جگہ اصل سنسکرت لفظوں کو لکھنا شروع کیا ہے۔ معلوم نہیں اپنی قابلیت دکھانے کے لئے یا ان جانی یا اس تعصب کے سبب سے کہ سنسکرت کے جو لفظ بول چال میں لئے ہیں ان سب کو اردو نے اپنے میں شامل کر لیا۔ لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ ہمارے یہ دوست ہندی بول چال کی زبان کو پھیلانا نہیں چاہتے بلکہ ان کی نیت ہندوستانی زندگی پر پرانی آریائی رنگ چڑھانا ہے۔ ہمارے ہندو بھائی اپنے کو سدھارنے کی کوشش کریں یا کسی پرانے زمانہ کو دوبارہ زندہ کرنے کی تو اس میں مسلمانوں کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ لیکن یہ تو ایمانداری کی بات ہے کہ ایسی تحریکیں زبان کے مسئلہ سے بالکل الگ رکھی جائیں۔

"میرے ایک دوست عاقل صاحب کے خط کے جواب میں شری یت کے۔ ایم۔ منشی لکھتے ہیں کہ گجراتیوں، مرہٹوں، بنگالیوں اور کیرل والوں نے ادبی قاعدے اور رسمیں بنائی ہیں جن میں خالص اردو کا قریب قریب کوئی اثر نہیں۔ اگر ہم ہندی بولیں گے تو یہ ایک قدرتی بات ہے کہ یہ ہندی سنسکرت کے رنگ میں ڈوبی ہوگی" اول تو مجھے ٹھیک معلوم ہے کہ گجراتی، مرہٹی اور بنگالی میں بہت سے فارسی لفظ ہیں اور میں یہ ماننے پر تیار نہیں ہوں کہ گجراتیوں اور بنگالیوں کو ایک دوسرے سے اور مسلمانوں سے میل ملاپ کرنے کے لئے اپنی زبان پر سنسکرت کا رنگ چڑھانا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں تو یہاں خالص اردو سے مطلب نہیں بلکہ شمالی ہندوستان کی بول چال کی زبان اور اس کے محاوروں سے ہے۔ اگر یہ زندہ بول چال کی زبان ہماری قومی زبان کی بنیاد ٹھہرائی جائے تو مسلمانوں کا اس کوشش میں شریک ہونا کارآمد ہو سکتا ہے

سنسکرت کی طرف واپس جانے سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ انھوں نے ہندی، گجراتی اور بنگالی کے لئے جو کچھ کیا ہے وہ بھلا دیا جائے گا۔ ایسی صورت میں ہم سے یہ کہنا کہ اس کام میں تم ہمارے ساتھ شریک ہو گے یا یہ کہنا ہے کہ اپنی خودکشی میں شریک ہو۔

"بابو پرشوتم داس ٹنڈن نے "ہندی میوزیم" کے پہلے جلسہ میں جو تقریر کی تھی اسے پڑھ کر مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ اُردو ہندی کا سوال ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فساد پیدا کرنے والا ہے۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ "چینی کے بعد ہندی ایشیا کی وہ زبان ہے جس کے بولنے والے تعداد میں سب سے زیادہ ہیں" دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہیں قومی زبان کا مسئلہ طے ہو گیا۔ یہ زبان ہندی ہوگی اس لئے کہ ہندوستان میں ہندی بولنے والے زیادہ ہیں۔ ہندوستانی کے لئے جو لوگ شور مچا رہے ہیں وہ اتنے تھوڑے ہیں کہ ہم ان کو دبا لیں گے۔ اس لیے ان کا خیال کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن سروں کا گننا ویسا ہی غلط علاج ہے جیسے سروں کا پھوڑنا۔ ٹنڈن صاحب کا مطلب کچھ بھی ہو مجھے جان پڑتا ہے کہ ہم اسی ہی کوئی بے عزتی کے لئے زمیں تیار کر رہے ہیں جیسا کہ یہ "کمیونل اوارڈ" تھی۔ اس وقت بس آپ کی شہرت اور آپ کا ملک میں جو اعتبار ہے وہی ہم کو بچا سکتا ہے میں نیچے چند باتیں لکھتا ہوں جو میری ناچیز رائے میں سمجھ کے خلاف نہیں ہیں اور ایک قومی نوبان کی مضبوط بنیاد بن سکتی ہیں۔ اگر آپ ان پر غور کریں اور انھیں کسی لائق سمجھیں۔ ایک اپنے ہی خیال میں نہیں بلکہ اس بڑے کام کو دیکھتے ہوئے جس میں مدد کرنا ان کا مقصد ہے تو آپ انھیں دوسروں تک بھی پہنچا سکتے ہیں۔ جس چیز کا میں اس وقت خواب دیکھ رہا ہوں وہ تو یہ ہے کہ آپ انھیں کی بنا پر ایک اعلان اپنی طرف سے شائع کریں۔ وہ باتیں یہ ہیں۔

(۱) ہماری قومی زبان ہندی نہیں کہلائے گی بلکہ ہندوستانی۔

(۲) ہندوستانی کا کسی ایک مذہبی سماج کے ورثہ سے تعلق نہ ہوگا۔

(۳) اس زبان کے لفظوں میں یہ نہ دیکھا جائے گا کہ کون دیسی ہیں کون بدیسی بلکہ یہ دیکھا

جائے گا کہ کس کا رواج ہے کس کا نہیں۔

(۴) اُردو کے ہندو لکھنے والوں اور ہندی کے مسلمان لکھنے والوں نے جو لفظ استعمال کئے ہیں وہ سب رایج مانے جائیں گے۔ لیکن اردو اور ہندی کی جو مذہبی حیثیت ہے اس پر اس قاعدہ کا کوئی اثر نہ پڑے گا۔

(۵) اصطلاحیں اور خاص طور پر سیاسی اصطلاحیں تجویز کرتے وقت سنسکرت کے لفظ اس لئے نہ پسند کئے جائیں گے کہ وہ سنسکرت ہیں بلکہ اُردو ہندی اور سنسکرت کے لفظوں میں سے لوگوں کو چننے اور پسند کرنے کا پورا موقع دیا جائے گا۔

(۶) دیوناگری اور عربی خط دونوں رائج اور سرکاری سمجھے جائیں گے اور ان تمام اداروں میں جن کا رویہ ہندوستانی کے پرچارکوں کے اثر میں ہے دونوں خط سیکھنے کا انتظام ہوگا۔

بہت سے دوست ہوں گے جن کو یہ تجویزیں مسلمانوں کا مطالبہ معلوم ہوں گی۔ ایسا نہیں ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ اگر آپ کی اور پریشد کی طرف سے ایسی اطمینان دلانے والی باتیں نہ ہوئیں تو مسلمانوں کی ادبی کوششیں قومی زبان بنانے کے لئے کام نہ آئیں گی اسی خیال سے میں نے یہ تجویزیں آپ کی خدمت میں پیش کی ہے اگر یہ بے جا ہیں تو میں جانتا ہوں کہ آپ میری خطا معاف کر دیں گے اور اگر وہ ایسی ہیں کہ مجھے انھیں پیش کرنے کا حق نہیں تھا تو آپ ناراض نہ ہوں گے۔ میری تو خواہش بس یہ تھی کہ اپنا فرض ادا کروں اور آپ کے سامنے یہ مسئلہ پیش کر کے دکھاؤں کہ مجھے آپ کی رائے پر کتنا بھروسہ ہے اور آپ کی انصاف پسندی اور رواداری پر کتنا اعتبار رہے۔"

اس خط کو سن کر مہاتما جی نے جلسہ میں مجیب صاحب کی رواداری اور وسعت قلب کی تعریف کی اور حاضرین کو یقین دلایا کہ مجیب صاحب نے جو لکھا ہے اسے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ انھوں نے فرقہ پرستی سے لکھا ہے بلکہ اسے ایک آزاد خیال آدمی کی رائے سمجھنا چاہئے۔ اس کے بعد سبجکٹس کمیٹی میں رزولیوشن پیش ہوئے۔ لیکن چونکہ رزولیوشن جس زبان میں لکھے گئے تھے وہ بہت مشکل تھی اس لئے جامعہ ملیہ کے نمایندے کو اس رزولیوشن کی کارروائی میں حصہ لینے سے احتجاج کے طور پر

انکار کرنا پڑا۔ مولوی عبدالحق صاحب نے "ہندی یعنی ہندوستانی" کی مخالفت اور ہندوستانی کی تائید کرتے ہوئے مہاتما جی کو کانگریس کا وہ رزولیوشن یاد دلایا جس میں ہندوستانی کو ملک کی قومی زبان قرار دیا گیا تھا اور جس کی ہر شخص کو اپنی سہولت کے مطابق عربی یا دیوناگری رسم الخط میں لکھنے کی اجازت دی گئی تھی۔ مہاتما جی نے اس پر فرمایا کہ وہ رزولیوشن بھی میں نے ہی پیش کیا تھا اور آج کا رزولیوشن بھی میں ہی پیش کر رہا ہوں۔ میرے نزدیک "ہندی یعنی ہندوستانی" ہی ملک کی قومی زبان بن سکتی ہے محض "ہندوستانی" کے معنی اردو کے ہیں جو مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ اسی طرح خالی ہندی کے معنی ایسی ہندی کے ہیں جس سے فارسی عربی کے لفظ خارج کر دئے گئے ہوں "ہندی یعنی ہندوستانی" سے میرا مطلب ایسی ہندی ہے جس میں فارسی عربی کے لفظوں کا بائی کاٹ نہ کیا جائے اس لئے "ہندی یعنی ہندوستانی" کو ہی پریشد کے اظہار خیال کا مشترک ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ اس پر مولوی عبدالحق صاحب کی طرف سے جواب دیا گیا کہ "ہندوستانی" اور "اردو" کو ہم معنی سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ "ہندوستانی" ایسی اردو یا ایسی ہندی کا نام ہے جو ایک طرف فارسی عربی اور دوسری طرف سنسکرت اور بھاشا کے غیر مانوس اور مشکل لفظوں سے پاک ہو۔ "ہندوستانی" کے لفظ کو اختیار کرنے سے ہی ہم اردو اور ہندی کو ایک دوسرے سے قریب لاسکیں گے۔ لیکن مہاتما جی نے اس کو تسلیم نہیں کیا۔ رائے شماری ہوئی جس میں جامعہ کے نمایندے نے اس احتجاج کے ساتھ کہ رزولیوشن کی زبان ناقابل فہم ہے رائے شماری میں شریک ہونے سے انکار کر دیا تین شخصوں کی مخالفت، کئی لوگوں کی عدم شرکت اور کثرت رائے کی تائید سے سبجکٹ کمیٹی میں پریشد کے اغراض و مقاصد کا رزولیوشن پاس ہو گیا۔ اس کے بعد مہاتما جی نے رزولیوشن کو عام فہم زبان میں لکھنے کی ہدایت فرمائی۔ چنانچہ اختر حسین رائے پوری صاحب نے جہاں تک ہو سکا اس رزولیوشن کی زبان کو سہل کر دیا۔ دوسرے دن مکمل اجلاس میں وہ رزولیوشن دوبارہ پیش کیا گیا۔ رزولیوشن حسب ذیل تھا:-

۱۔ بھارتیہ ساہتیہ پریشد کا یہ اجلاس طے کرتا ہے کہ ہندوستان کے سب صوبوں کی زبانوں کے ادیبوں کی تنظیم کے لئے اس قسم کے پریشد کی بڑی ضرورت ہے لہذا اس پریشد میں جو لوگ

شریک ہونے ہیں اور اس کے مقاصد کو مانتے ہیں انھیں سے اس پریشد کا کام شروع کیا جائے۔
اس پریشد کے مقاصد یہ ہوں گے:۔

۱۔ (الف) ہندوستان کے سب صوبوں کی زبانوں کے ادیبوں اور ادیبوں میں آپس میں میل کرانا اور اس طرح ہندوستان کے ادبوں کی ترقی اور پھیلاؤ میں مددگار ہونا

(ب) اس پریشد کا کام "ہندی یعنی ہندوستانی" میں ہوگا

۲۔ (الف) جو ادب زندگی کے اعلیٰ نصب العین کا مخالف ہو، اخلاق کو بگاڑتا ہو اور فرقہ وارانہ اتحاد میں رکاوٹ ڈالتا ہو ایسے پریشد کی یہ ادب ہرگز حوصلہ افزائی نہ کرے گا

(ب) عوام کی زندگی کے زندہ اور پیچیدہ مسائل کو حل کرنے والے ادب کے رواج کی یہ پریشد حوصلہ افزائی کرے گا۔

مولوی عبدالحق صاحب نے رزولیوشن ۱ میں یہ ترمیم پیش کی کہ "ہندی یعنی ہندوستانی" ایک غیر واضح لفظ ہے۔ لہٰذا اس کی جگہ یا تو صرف "ہندی" کا لفظ لکھا جائے یا صرف "ہندوستانی" کا۔ اس ترمیم کی موافقت میں گیارہ رائیں آئیں کچھ لوگ غیر جانبدار رہے اور باقی سب لوگوں نے مخالفت کی۔ پھر اس کے بعد اسی رزولیوشن میں دوسری ترمیم اختر رائے پوری صاحب نے پیش کی کہ "ہندی یعنی ہندوستانی" کی جگہ صرف "ہندوستانی" لفظ لکھا جائے اس کی تائید میں منشی پریم چند صاحب نے بھی تقریر فرمائی۔ جب رائے شماری ہوئی تو ترمیم کی تائید میں پانچ رائیں آئیں جن میں ایک منشی پریم چند صاحب کی بھی رائے تھی کچھ لوگ غیر جانبدار رہے اور بقیہ نے مخالفت کی۔ پھر اغراض و مقاصد کا پورا رزولیوشن پیش کیا گیا جو تین آدمیوں یعنی مولوی عبدالحق صاحب، اختر حسین رائے پوری صاحب اور جامعہ کے نمائندہ کی مخالفت کے بعد کثرت رائے سے منظور ہوا۔ اس اجتماع سے فائدہ اٹھا کر غیر رسمی گفتگو کے دوران میں مولوی عبدالحق صاحب نے انجمن ترقی اردو کی طرف سے جو مختلف لغات شائع ہو رہے ہیں ان کا تذکرہ کیا اور بتلایا کہ وہ کس طرح ہندی اور اردو دونوں کے لئے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ سنسکرت کی اصطلاحیں رائج کر کے آپ ہندی کو عوام کی بول چال سے علیحدہ ہٹا

رہے میں آپ نے یہ بھی دعوے کیا کہ اُردو میں عام بول چال کی ہندی کے جتنے الفاظ ہیں اتنے خود تحریری مدتا یشتہ ہندی میں نہیں ملتے مدرسوں اور اخباروں رسالوں کی ہندی ہندی نہیں رہی ہے بلکہ سنسکرت بن گئی ہے ۔

جلسے میں کچھ لوگ ایسے تھے جو ہندی میں سنسکرت کے الفاظ کے اضافہ کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے ۔ ان کا کہنا تھا کہ اس طرح ہندی بولنے والے، گجراتی، مرہٹی، بنگالی اور آسامی بولنے والوں سے قریب ہو جاتے ہیں اور ہندی کو ان لوگوں میں مقبول ہونے کا موقع ملتا ہے لیکن ایسے لوگوں کی تعداد کثیر نہ تھی زیادہ تر لوگ ہندی سے عربی اور فارسی کے لفظوں کو ترک کرانا چاہتے تھے ۔ اس سلسلہ میں پریشد کے صدر مہاتما گاندھی اور استقبالیہ کمیٹی کے صدر کاکا کالیلکر صاحب کے خیالات بھی لائق توجہ سمجھ کر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :-

مہاتما گاندھی نے اپنا چھپا ہوا خطبہ پڑھ کر نہیں سنایا تھا بلکہ خطبہ تقسیم کرا کے ایک تقریر کی تھی تقریر کے ایک حصہ میں آپ نے فرمایا :-

" آج جس کام کے لئے اکٹھا ہوئے ہیں وہ بڑا کام ہے ۔ اس کے لئے جتنے ادبی خدمت کرنے والوں کے جمع ہونے کی ضرورت تھی اتنے یہاں نہیں آ سکے ہیں ۔ اگرچہ تعداد کی طاقت کو میں بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتا لیکن پھر بھی اس کام کا بوجھ کون اٹھائے گا یہ بات تو آپ کو سوچنا ہی ہو گی ... بارے میں آپ کو رات دن سوچنا پڑے گا کیونکہ مختلف صوبوں کے ادیبوں کی تنظیم ... اتنا ہی مشکل کام ہے جتنا مہابھارت کا کام تھا ۔

پریشد کے خیال کی ابتدا کی تاریخ کو کاکا صاحب نے ابھی آپ کے سامنے بیان کیا ہے ... اس کی ابتدا گذشتہ سال اندور کے ہندی ساہتیہ سمیلن میں ہوئی تھی ۔ ہمیں اب یہ بات سوچنا ہے کہ ساہتیہ سمیلن اور بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے کام میں کچھ اختلاف ہے یا نہیں ۔ ساہتیہ سمیلن کا مقصد دوسرے ادیبوں کی تنظیم کرنا نہیں ہے ۔ اس کا مقصد تو ہندی زبان کی خدمت کرنا ہے ہندی کی ملک میں اشاعت کرنا ہے ۔ دوسری طرف اس پریشد کا مقصد ہندی زبان کی خدمت

کرنا نہیں ہے۔ میں مانتا ہوں کہ دونوں انجمنوں کے کاموں میں اختلاف کا کوئی خوف نہیں ہے۔ لیکن پرلیشد کا مقصد تو دوسرے ادیبوں کے جواہرات اکٹھے کرکے اس ملک کے عوام کے سامنے رکھنا ہے۔

" ہندی اور اُردو ایک ہی زبان ہے اسے الگ بنانے والے وہ ہندو اور مسلمان ہیں جو آج ایک دوسرے کے دشمن بن بیٹھے ہیں۔ دونوں زبانوں کا صرف و نحو ایک ہے۔ شبلی صاحب کی سیرت میں بھی ہندی کے معمولی لفظ مل جاتے ہیں کیوں کر ان سب لفظوں کو چھوڑنا ناممکن ہے ایسے ہی عربی فارسی کے لفظ بھی ہم نہیں چھوڑ سکتے ہیں۔ خود تلسی داس جی نے اپنے "مانس" (رام چرتر مانس) میں کافی فارسی کے لفظ لئے ہیں۔ یہ بات پنڈت رام نرنش جی تریپاٹھی نے اپنی مانس ٹیکا میں بتلائی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تلسی داس کے دل میں فارسی سے نفرت نہ تھی اور ان کے زمانہ میں فارسی عربی کا بائی کاٹ نہیں کیا جاتا تھا۔

" ادبی خدمت میں بائی کاٹ جیسی کوئی چیز نہ ہونا چاہیئے۔ جو اس میدان میں بائی کاٹ شروع ہوگا تو آٹھ کروڑ مسلمانوں کے ساتھ میل کیسے ہوگا؟ اس لئے ہندی نہ اردو کا بائی کاٹ کرے نہ اُردو ہندی کا۔ بنگال کے مسلمان اور دکن کے مسلمان اُردو نہیں جانتے۔ ان مسلمانوں کے لئے بھی ایسی زبان کی جسے میں نے " ہندی یعنی ہندوستانی" کہا ہے ضرورت ہے۔"

اسی موضوع پر کاکا کالیلکر صاحب صدر مجلس استقبالیہ نے ہندی والوں سے جو اپیل کی ہے وہ بھی لائق توجہ ہے۔

" دکن کی زبانوں کی طرف سے اور دکن کے قوم پرست دوستوں کی طرف سے مجھے ہندی والوں سے ایک درخواست کرنا ہے۔ ہم عربی یا فارسی لفظوں کے بائی کاٹ کے حامی نہیں ہیں ہندی میں بڑے بڑے سنسکرت لفظ ٹھوس کر اسے پنڈتاؤ ہندی بنانے کے طرفداروں میں بھی ہم نہیں ہیں۔ لیکن پھر بھی آپ کی ہندی —— دلی اور لکھنؤ کی طرف کی ہندی —— ہم بڑی مشکل سے سمجھتے ہیں۔ اتنا آپ کو دھیان میں رکھنا چاہیئے۔ پنڈت جواہر لال جی جو عمدہ ہندی بولتے ہیں وہ آپ لوگوں کے لئے عام فہم ہندی ہوگی ہمارے لئے تو وہ بہت سخت ہندی ہے۔ ہم مشکل سے ہندی سیکھ

پاتے ہیں۔ ہماری دکنی زبان میں عربی اور فارسی لفظ ہیں انھیں تو ہم رکھنا ہی چاہتے ہیں جو لفظ ہماری زبان میں آگئے ہیں وہ ہمارے ہی ہوگئے ہیں لیکن جب سے الفاظ ایک دم زیادہ تعداد میں آ گھستے ہیں تب ہمارے لئے قومی زبان بھی ایک غیر اور ناقابل فہم زبان بن جاتی ہے۔ ہم اپنے مسلمان بھائیوں سے برادرانہ تعلقات بڑھانا چاہتے ہیں۔ لیکن جب وہ بڑے بڑے عربی اور فارسی الفاظ ہی استعمال کرنے کی ضد کرتے ہیں تب ہم پریشان ہوجاتے ہیں۔ دل ان کے نزدیک جانا چاہتا ہے لیکن وہ اپنی مشکل زبان سے ہمیں دور رکھتے ہیں۔ شمال کے ہندو اور مسلمان دونوں یہ کہیں گے کہ دلی اور لکھنؤ کے بازار میں گنوار لوگ بھی اس زبان کو سمجھ سکتے ہیں وہ بلا شبہ آسان ہندی ہے اور ہمیں اسے ہی آسان ہندی سمجھنا چاہیے۔ گو یہ چاہے ہمارا گناہ ہو لیکن ہم نہایت صاف الفاظ میں اقرار کرتے ہیں کہ ہم اس زبان کے بہت کم الفاظ سمجھ پاتے ہیں۔ ہم جیسے جیسے آپ کے ساتھ تعارف بڑھائیں گے ویسے ہی آپ کے الفاظ بھی سیکھ لیں گے۔ تب تک آپ ہم پر رحم کیجئے اور ہمارے لئے مہربانی کرکے ایسے آسان لفظوں کا استعمال کیجئے جنھیں ہم سمجھ سکیں۔ ہم بہت دور تک آپ سے ملنے کے لئے بڑھیں گے آپ بھی ہمارے لئے کچھ دو قدم آگے بڑھ کر ہماری طرف آئیے نہیں تو جیسی آج ہمیں انگریزی زبان سیکھنی پڑی ہے ایسی ہی حالت آپ کی زبان کی بھی ہوگی۔ کانگریس میں جو ہندی میں تقریریں ہوتی ہیں ان میں فارسی لفظوں کی اتنی بھرمار ہوتی ہے کہ یہاں سے آنے والے ڈیلیگیٹس کے واسطے انگریزی اور ہندی دونوں زبانیں ایک سی ناقابل فہم معلوم ہوتی ہیں۔ قومی محبت کی وجہ سے ہم یہ سب برداشت کرلیں گے۔ لیکن کم از کم اپنی مشکل تو آپ کے سامنے پیش کریں گے اور کہیں گے کہ آپ کی زبان ہم سمجھ لیتے ہیں اب اگر آپ کا خیال ہے تو یہ صحیح نہیں ہے۔

" اور پھر یہ تو ساہتیہ پریشد ٹھیری۔ اس میں تو آپ خوب ہی بامحاورہ اور عالمانہ ہندی لفظ استعمال کریں۔ مگر۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ اگر اس تنظیم کو کامیاب بنانا ہے تو آپ مہربانی فرماکر اپنی ہندی یا ہندوستانی ہمارے لئے جس طرح ہوسکے آسان کیجئے ہم سنسکرت

کے طرفدار نہیں بلکہ "ہندی یعنی ہندوستانی" کی ناکامی دور کرنا چاہتے ہیں۔

" میں نے دیکھا ہے کہ ڈاکٹر خان صاحب ہماری اس مشکل کو محسوس کرتے ہیں اور ایسے آسان الفاظ ہی استعمال کرتے ہیں جو ہماری سمجھ میں آنے والے ہوتے ہیں۔ اتنے دور رہتے ہوئی بھی رحم کی وجہ سے وہ ہماری مشکل سمجھتے ہیں اور اسے دور کرنے کی بس بھر کوشش کرتے ہیں۔"

کاکا کالیلکر صاحب نے جو باتیں اوپر کہی ہیں بالکل یہی باتیں اردو جاننے والے بھی کہنا چاہتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جہاں جہاں اوپر کی عبارت میں فارسی اور عربی کے الفاظ لکھے گئے ہیں وہاں وہ اس کی جگہ بھاشا اور سنسکرت کے الفاظ درج کرنا چاہیں گے۔ میں نے کاکا کالیلکر صاحب کا خطبہ استقبالیہ ناگپور میں سنا تھا۔ ان کے خطبہ کا صرف وہ حصہ جس کا اقتباس میں نے اوپر درج کیا ہے ایسا تھا جس کے سمجھنے میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی ورنہ ان کا باقی تمام خطبہ میرے لئے ناقابل فہم تھا حالانکہ میں نہ صرف ہندی رسم خط جانتا ہوں بلکہ موجودہ ہندی کے اتنے الفاظ کا بھی مجھے علم ہے جن سے میں ہندی کے بہت سے مضمونوں کو سمجھ لیتا ہوں جب میرا یہ حال ہے تو ہندوستانی جاننے والے قوم پرستوں کو عام طور پر جو الجھن اور پریشانی ہوتی ہے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ قومی جلسوں کی تقریریں، قومی اخباروں اور رسالوں کے مضامین چند گنتی کے لوگوں کو چھوڑکر باقی تمام ایسے لوگوں کے لئے جن کا شمار ہندی جاننے والوں میں کیا جاتا ہے بے نتیجہ اور بے اثر رہتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر دونوں طرف سے شکایت یکساں ہے تو اصل قصور کس کا ہے اور شکایت کی تلافی کی کوشش کسے زیادہ کرنا چاہئے۔

کاکا کالیلکر کے اوپر کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ دکن کے رہنے والے اس زبان کو بھی جسے دہلی اور لکھنؤ کے عوام آسانی سے سمجھ سکتے ہیں سمجھنے سے قاصر ہیں اور ان کا مطالبہ ہے کہ دکن کے رہنے والے جس زبان کو سمجھ سکیں اسی زبان میں لکھنا اور تقریر کرنا چاہئے۔ اگر اس دعوے کو تسلیم کرلیا جائے تو پھر تو بڑی مجبوری ہو جائے گی۔ کیونکہ دکن کے رہنے والوں کا جب ہم نام لیں تو اس وقت ہمیں صرف سنسکرت کے پنڈتوں کو اپنے سامنے نہ رکھنا چاہئے بلکہ جیسے ہم نے دہلی اور لکھنؤ میں خواص اور

عوام دونوں کو اپنے سامنے رکھا ہے یہاں بھی ہمیں دونوں کا خیال رکھنا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ دکن کے عوام میں بھی ہندوستان کے تمام دوسرے علاقوں کے عوام کی طرح ان سنسکرت کے لفظوں کو سمجھنے والے لوگ جن کا آج کل کی جدید ہندی میں کثرت سے استعمال ہوتا ہے بڑی تلاش کے بعد دس بیس ہزار میں ایک دو ہی مل سکیں گے۔ اگر صورت یہ ہے تو کیا پھر ہمیں ایک قومی زبان کا خیال ہی ترک کر دینا چاہئے؟ اگر ہم واقعی ایک قومی زبان کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو کسی ایسی زبان کو ہی ہمیں سب لوگوں کی زبان بنانا پڑے گا جسے عوام اور خواص دونوں بہت آسانی سے سمجھ لیتے ہوں اور کئی پیڑھیوں سے سمجھتے چلے آرہے ہوں۔ یہ زبان شمالی ہند کے لئے تو ہندوستانی کے علاوہ اور کوئی دوسری زبان ہو ہی نہیں سکتی۔ رہا جنوبی اور مشرقی ہندوستان تو ریل کے سفر کی ترقی اور فیکٹریوں اور ملوں کے قائم ہونے کی وجہ سے اس زبان کے سمجھنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ صرف طبقہ متوسط کے سنسکرت پڑھے ہوئے کچھ لوگ ایسے ہیں جنھوں نے اپنے والدین اور مدرسہ کے پنڈتوں کی تعلیم کے اثر سے ہندوستانی کو اشدھ سمجھ کر اپنے آپ کو اس سے دور ہٹا لیا ہے۔ یہ لوگ اگر سنجیدگی کے ساتھ ذرا سی بھی توجہ کریں تو بہت جلد ہندوستانی زبان میں مہارت پیدا کر سکتے ہیں۔ اگر کاکا کالیلکر صاحب نے اپنا تمام خطبہ اس ہندی میں لکھا ہوتا جس میں انھوں نے وہ حصہ لکھا جس کا اقتباس اوپر درج کیا گیا ہے تو انھوں نے ہندوستانی کی بڑی خدمت کی ہوتی لیکن افسوس ہے کہ سوائے اس ٹکڑے کے ان کے خطبہ استقبالیہ کے باقی تمام حصے بہت ادق ہندی میں لکھے گئے تھے۔ اچھی ہندوستانی زبان لکھنا جانتے ہوئے بھی جب وہ قصداً ایسی ہندی لکھتے ہیں جسے سوائے ہندی ساہتیہ سمیلن کے وشاردوں، ودوانوں، اسکالروں اور پنڈتوں کے اور کوئی نہیں سمجھ سکتا تو اس میں قصور کس کا ہے؟

ہم نے شروع سے ہندوستان کے صوبوں کی زبانوں کے ادبی وفاق کی تحریک کا خیر مقدم کیا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ ہندوستانی قومیت کی ترقی میں یہ چیز بہت معاون ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے لئے ایسی "ہندی یعنی ہندوستانی" کو ذریعہ بنانا جس کے کاکا کالیلکر صاحب حامی ہیں

کبھی مفید ثابت نہیں ہو سکتا یہ کام صرف " ہندوستانی " کے ذریعہ ہی کامیاب ہو سکتا ہے۔

" ہندوستانی " کو اس کے صحیح اور اعلیٰ مرتبہ تک پہنچانے کے لئے ہمیں ہندی کے کارکنوں سے اپیل کرنے کی ضرورت نہیں ہے نہ ان سے ہمیں کوئی شکایت ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ جس چیز کو ہم ہندوستان کے لئے صحیح اور مناسب سمجھتے ہیں اس کے لئے اپنے ہم خیال لوگوں کی ایک جماعت بنائیں اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے جان توڑ کوشش کریں۔ اگر جس چیز کو ہم اچھا سمجھ رہے ہیں وہ واقعی اچھی ہے اور ہم ایمانداری کے ساتھ اس کے پھیلانے کی کوشش کریں گے تو ضرور عوام میں وہ زیادہ مقبول ہوگی اور دوسروں کی کوششوں کا وہی حشر ہوگا جس کی وہ مستحق ہیں اور اگر اس کے برعکس ہماری کوششیں لغو اور فضول ہیں تو ہمیں اپنی ناکامی پر افسوس نہ ہوگا۔

مہاتما گاندھی کی "ہندی یعنی ہندوستانی"

(ذیل میں ہم مہاتما گاندھی کا وہ خطبہ درج کرتے ہیں جو آپ نے بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے صدر کی حیثیت سے ۲۴ اپریل ۱۹۳۶ء کو ناگپور میں تقسیم کرایا تھا)۔

اس سبھا کا سبھا پتیتو مجھے دینے کے کارن جب میں ڈھونڈھتا ہوں تو دو ہی پرتیت ہوتے ہیں ایک میرا ساہتیہ کار نہ ہونا اور اس لئے کم سے کم ودیش کا کارن ہونا تھا دوسرا میرا ہندوستان کی سب بھاشاؤں کا پریم۔ جو کچھ ہو میں آشا کرتا ہوں کہ ہم کچھ نہ کچھ سیوا کریں گے اور بھوشیہ میں ایسا سیوا کشیتر بڑھاویں گے۔

یدی ہم کشمیری نگر سے لے کر کنیا کماری تک اور کراچی سے لے کر ڈبروگڑھ تک جو پردیش ہیں اسے ایک مانتے ہیں اور اس کے لوگوں کو ایک پرجا سمجھتے ہیں تو اس پردیش کے پرتیک بھاگ کے ساہتیہ کار، بھاشا شاستری اتیادی آپس میں کیوں نہ ملیں اور بھن بھن بھاشاؤں دوارا ہندوستان کی یتھا یوگیہ سیوا کیوں نہ کریں؟

گجراتی اپنے پڑوسی مہاراشٹری کی بھاشا جاننے کا کبھی یتن کرتے دیکھنے میں نہیں آتے ہیں۔ ہندی جاننے والے بھی اردو لپی سیکھنے کا کشٹ کم اٹھاتے ہیں۔ اردو جاننے والے مسلمان کو چیت ہی دیوناگری لپی پڑھنے کا اتھوا ہندی میں پرچلت سنسکرت شبدوں کے ارتھ جاننے کا کشٹ اٹھاتے ہیں۔ کہیں بھی دیکھیں وستو ستھیتی ایسی دیاجنک ہے۔ کسی کے دوش نکالنے کا یہ ستھان نہیں ہے۔ دوش درشن میں ہمیں کچھ لابھ ہو سکتا نہیں۔ وستھیتی جان کر اسے یتھا سمبھو مٹانے کے لئے ہی ہم اکٹھے ہوئے ہیں۔

دو وان لوگ ایک دوسرے کے ساہتیہ کا کچھ گیان پاویں۔ اتنے ہی سے ہمیں سنتوش ہونے کا نہیں ہے ہمیں تو دیہاتی ساہتیہ کی بھی درکار ہے اور دیہاتیوں میں آدھونک ساہتیہ کے

پرچارکی ۔ شرم کی بات ہے کہ چیتنیا کی پرساوی بھارت ورش کے سارے بھاشا بھاشیوں کو اپراپیہ ہے
تر ۔ ویلوور کا نام تک شاید ہم سب نہیں جانتے ہوں گے ۔ اتر بھارت کی جنتا تو اس سنت کا نام جانتی
ہی نہیں ۔ اس نے تھوڑے شبدوں میں جیسا گیان دیا ہے ویسا بہت کم سنت لوگ کر سکے ہیں ۔ اس
بارے میں اس وقت تو تو کارام کا ہی دوسرا نام میرے خیال میں آتا ہے

اگر ہم سارے ہندوستان کے ساہتیہ کے وشال کشیتر میں پرویش کریں تو کیا اس کی کچھ
سیما مریادا ہونی چاہئے ۔ میری درشٹی میں تو اوشیہ ہونی چاہئے مجھے پستکوں کی سنکھیا بڑھانے
کا موہ کبھی نہیں رہا ہے ۔ پرتیک پرانت کی بھاشا میں لکھی اور چھپی پرتیک پستک کا پہنچے دوسری
سب بھاشاؤں میں ہونا میں آوشیک نہیں مانتا ہوں ۔ ایسا پرین یدی سمبھو بھی ہو تو اسے میں ہانی کار
سمجھتا ہوں ۔ جو ساہتیہ ایکتا کا ، نیتی کا ، شوریادی گنوں کا ، وگیان کا پوشک ہے اس کا پرچار
پرتیک پرانت میں ہونا آوشیک اور لابھ دایک ہے ۔

آج کل شرنگاریکت اشلیل ساہتیہ کی باڑھ سب پرانتوں میں آ رہی ہے ۔ کوئی تو یہاں
تک کہتے ہیں کہ ایک شرنگار کو چھوڑ کر اور کوئی رس ہے ہی نہیں شرنگار رس کو بڑھانے کے کارن
ایسے سجن دوسروں کو " تیاگی " کہ کر ان کی اپیکشا اور اپہاس کرتے ہیں ۔ جو سب چیزوں کا تیاگ
کر بیٹھتے ہیں وے بھی رس کا تو تیاگ نہیں کر پاتے کسی نہ کسی پرکار کے رس سے ہم سب بھرے ہیں ۔
دادا بھائی ناروجی نے دیش کے لئے سب کچھ چھوڑا تھا ۔ وے تو بڑے رسک تھے ۔ دیش سیوا ہی انہوں
نے اپنا رس بنا رکھا تھا ۔ اسی میں انہیں پرسنتا ملتی تھی ۔ چیتنیا کو رس ہین کہنا رس کو ہی نہیں جاننا
ہے ۔ نرسنگھ مہتا نے اپنے کو بھوگی بتایا ہے ۔ یدیاپی وے گجرات کے بھگت شرومنی تھے آپ کو نہ
اکھرے تو میں تو یہاں تک کہوں گا کہ میں شرنگار رس کو تچھ رس سمجھتا ہوں جب اس میں اشلیلتا
آتی ہے تب اسے سروتھا تیاجیا مانتا ہوں ۔ یدی میری چلے تو میں اس سنستھا میں ایسے رس
کو تیاجیہ منوا دوں ۔ اسی طرح قومی بھیدوں کو دھرم اندھتا کو تتھا پرجا میں اتھوا ویکتیوں میں وے
منسیہ کو جو ساہتیہ بڑھاتا ہے اس کا بھی تیاگ ہونا آوشیک ہے ۔

پر کار یہ کیسے کیا جائے ؟ منشی جی اور کاکا صاحب نے ہمارا مارگ ایک حد تک صاف کر رکھا ہے۔ ویاپک ساہتیہ کا پرچار ویاپک بھاشا میں ہی ہو سکتا ہے۔ ایسی بھاشا اپنہ بھاشا کی ایکتا ہندی ہندوستانی ہی ہے۔ ہندی کو ہندوستانی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس بھاشا میں فارسی محاورے کے شبدوں کا تیاگ نہ کیا جائے۔

انگریزی بھاشا کبھی سب پرانتوں کے لئے واہن (یا مادھیم) نہیں ہو سکتی یدی ہم سچ مچ ہندوستان کے ساہتیہ کی ورِدھی چاہتے ہیں بھن بھن بھاشاؤں میں جو رتن چھپے پڑے ہیں ان کا پرچار بھارت ورش کے کروڑوں منشیوں میں کرنا چاہتے ہیں تو ہم ہندوستانی کی معرفت ہی کر سکتے ہیں۔ اسی درشٹی سے منشی جی نے پرسدھ لیکھک پریم چند جی کی سہائتا سے ماسک "ہنس" نکالا ہے اسے سمردھ بنانے کی آوشیکتا ہے۔

میں نے تو تھوڑا ہی سمے نکال کر اپنا ابھی پرایہ سنکشیپ میں بتایا ہے۔ سچا ابھی پرایہ تو یہاں جو ساہتیہ اچاریہ آئے ہیں۔ ان کا ہی ہو سکتا ہے۔ یدی آج کی سبھا کو ایک استھائی سنستھا نیا یری نت ہونا ہے تو ساہتیہ اچاریوں کے دوارا ہی ہو سکتی ہے۔

دو رسالے اور ہندی اُردو کا جھگڑا

(ذیل میں ہم اُردو اور ہندی کے جھگڑے پر رسالہ "ہندوستانی" اور رسالہ "ہمایوں" کے دو مضمونوں کے اقتباسات درج کر رہے ہیں۔ رسالہ ہندوستانی سے مسٹر کشن پرشاد صاحب کول کے اس مضمون کے اقتباسات لئے گئے ہیں جو "اُردو ہندی اور ہندوستانی" کے عنوان سے اپریل سنہء میں شائع ہوا ہے اور رسالہ "ہمایوں" بابت مئی سے میاں بشیر احمد کی اس تقریر کے اقتباسات جو انھوں نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسہ میں سنائی تھی۔

اس سلسلہ میں قارئین کو اُردو کے سچے بہی خواہ اور محسن مولوی عبدالحق صاحب، آنریری سکریٹری انجمن ترقی اُردو کی اس تقریر کی طرف بھی متوجہ کیا جاتا ہے جو صاحب موصوف نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسہ میں فرمائی تھی اور جو مئی کے ہمایوں میں شائع ہوئی ہے۔ نیز "بھارتیہ ساہتیہ پریشد کی اصل حقیقت" کے عنوان سے جو مفصل مضمون آپ نے اُردو کے اخباروں اور رسالوں میں شائع کیا ہے وہ بھی پوری توجہ کا مستحق ہے)۔

اُردو ہندی اور ہندوستانی

اب عملی ضرورت کے پہلو سے غور کیجئے۔ اتنا بڑا ملک، مختلف نسلوں اور مذہبوں کے مختلف زبانیں بولنے والے لوگ، مختلف صوبوں میں بستے ہیں، اگر سارے ملک کی کوئی زبان نہو، تو تجارت اور کاروبار، عدالتوں کا کام، کاونسلوں، کانفرنسوں اور جلسوں کی کارروائیاں اور تبادلۂ خیالات آخر کس طرح ہو۔ یا دوسرے ملکوں سے ربط و ضبط کس طرح بڑھے۔ کام کاج کس طرح چلے۔ اس کے لئے سارے ملک کی ایک زبان ہونا لازمی ہے سو اس کا بھی فیصلہ سو برس ہوئے ہیں کہ غیروں کے قلم

سے ہوگیا اور فیصلہ بھی ایسا کہ جو ممتاز طبقہ مقدر ہے کہ آپ مٹا نہیں سکتے۔ ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ کی زبان انگریزی قرار پاگئی اور ہم میں سے ہر ایک باول خواستہ یا ناخواستہ اُسے سارے ملک کی زبان تسلیم کرتا ہے۔ ہماری تمام سیاسی اور سوشل زندگی کا دار و مدار اس پر ہے۔ یہ ہماری تمام ضرورتوں کو پورا کرتی ہے اور جب تک ہندوستان میں انگریزی زبان کے کالج اور یونیورسٹیاں قائم ہیں اور میرے خیال میں خود مختاری اور آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی یہ قائم رہیں گے اُس وقت تک انگریزی زبان ہی سارے ملک کی زبان رہے گی۔ اُردو یا ہندی اس کی جگہ نہیں لے سکتی محض اس وجہ سے کہ جن ضرورتوں کو جس خوبی اور آسانی کے ساتھ انگریزی زبان پورا کرتی ہے اُس کی اہلیت نہ ہندی میں ہے نہ اُردو میں اگر اُردو اور ہندی انگریزی کی جگہ لے سکتیں تو کیا ممکن ہے کہ یہ دونوں یا ان میں سے ایک بنگالی، گجراتی، مرہٹی، تامل یا تیلگو کی جگہ لے سکے۔ ظاہرا تو سمجھ میں نہیں آتا۔ بنگالی زبان اور لٹریچر کا مرتبہ تو آج اُردو اور ہندی دونوں سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ گجراتی بھی ان دونوں میں سے کسی سے کم نہیں مرہٹی تامل اور تیلگو بھی اس مرتبہ پر پہنچ گئی ہیں کہ ان کو ہندی اور اردو سے کوئی خاص فیض نہیں پہونچے گا۔ اور جب کہ ان کی تمام سیاسی، سوشل اور کاروباری زندگی کی ضروریات ملکی، انگریزی کے ذریعہ سے پوری ہورہی ہیں تو بنگال بمبئی اور مدراس کے لوگ اپنی اپنی زبانیں چھوڑ کر ہندی اور اُردو کیوں سیکھنے لگے۔ آپ کو کون سی ضرورت ان زبانوں کے قبول کرنے پر مجبور کرے گی؟

مختصر یہ کہ جو بحث یہاں پیش کی گئی ہے اگر یک لخت رد کردینے کے قابل نہیں تو اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ سارے ملک کو نہ اردو کی ضرورت ہے نہ ہندی کی۔ نہ صرف یہی بلکہ اردو اور ہندی کے لئے سارے ملک میں کوئی گنجائش نہیں۔ ان کو سارے ملک کی زبان بنانے کی کوشش خواہ مخواہ کی زبردستی ہے اور کچھ زمانہ بعد یہ کوشش ختم ہو کے رہ جائے گی۔ اردو اور ہندی کا مسئلہ صرف شمالی ہند تک محدود ہے اور محدود رہنا چاہیئے۔ ان کی عملداری صوبہ سرحدی سے لے کر صوبہ بہار تک ہے۔ بہتر ہوتا کہ شمالی ہند میں بھی بجائے دو زبانوں کے ایک ہی زبان ہوتی۔ لیکن ایسا نہیں ہونا تھا نہیں ہوا۔ پچھلے سو برس میں اُردو اور ہندی کا جس طرح علیحدہ علیحدہ نشو و نما ہوا ہے اس کو حرف غلط کی طرح مٹایا نہیں جاسکتا۔

ایک زبان قرار دینے کی کوشش نہ صرف دونوں زبانوں کو اپنی اپنی جگہ زیادہ مستحکم اور ایک دوسرے سے علیحدہ کرتی جاتی ہے بلکہ قومی تعصب کے برافروختہ ہونے سے ہندو اور مسلمانوں کے اتحاد میں بھی فرق پڑتا جاتا ہے چنانچہ ایک مرئی نتیجہ اس کا یہ نکلا ہے کہ پہلے جو ہندو بہ تعداد کثیر اُردو کی جانب مائل تھے وہ اب ہندی پڑھتے ہیں۔ اس کے علاوہ سوال یہ ہے کہ اگر شمالی ہند میں اردو اور ہندی دونوں برابر سے فروغ پاتی رہیں تو حرج کیا ہے اور محض ایک ہی زبان رائج کرنے کی غرض کیا ہے؟ - اگر ایک زبان رائج کرنے کی غرض صرف یہ ہے کہ ہندو اور مسلمانوں میں ربط و یگانگت بڑھے دونوں قومیں ایک دوسرے سے قریب آجائیں، ان میں معاشرتی میل جول پیدا ہو ان کے ادب اور تہذیب میں فرق باقی نہ رہے تو موجودہ فضا کو دیکھتے ہوئے اور اس ذہنیت کا لحاظ رکھتے ہوئے جو بدقسمتی سے اس وقت دونوں فریقوں میں نمایاں معلوم ہوتی ہے یہ غرض ایک زبان رائج کرنے کے اصرار سے بجائے پورے ہونے کے فوت ہوتی نظر آتی ہے۔ کم از کم پچھلے تیس سال کا تجربہ تو یہی ثابت کرتا ہے۔ اس بحث کے سلسلے میں جو مضامین اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں ان میں ایک ہی معقول تجویز اس مسئلے کے حل کے متعلق پیش ہوتی ہے کہ جس سے وہ غرض جو ظاہرا ایک زبان رائج کرنے کی بتائی جاتی ہے بخوبی پوری ہوتی ہے لیکن اس تجویز پر افسوس ہے کہ ایسی توجہ نہیں کی گئی کہ جس کی وہ مستحق تھی۔ تجویز یہ ہے کہ ہمارے مدرسوں میں شروع ہی سے اردو اور ہندی دونوں زبانوں کی پڑھائی لازمی کی جائے۔ میں اس تجویز کی پوری تائید کرتا ہوں۔ اگر کوئی طریقہ ممکن العمل ایسا ہے کہ جس سے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی زبان۔ لٹریچر۔ روایات۔ حسیات و جذبات سے واقف ہو سکیں اور ان میں ایک دوسرے کے طرز معاشرت سے یگانگت پیدا ہو۔ ایک دوسرے کی روایات و جذبات کا احترام اور رواداری مدنظر ہے تو وہ یہی طریقہ ہے۔ اسی کو ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد سمجھنا چاہئے۔ اس طرح ذہنیت کے بدلنے سے دونوں قوموں میں سیاسی و اقتصادی اغراض کی یکسانیت کا احساس بآسانی پیدا ہوسکیگا۔ یہی ایک تجویز ایسی ہے کہ جس پر عمل کرنے میں ہندو اور مسلمانوں کو کوئی اعتراض نہ ہونا چاہئے رہیں نصاب تعلیم کی ترمیم کی دقتیں تو یہ ایسی نہیں کہ جو حل نہ ہوسکیں۔ کم از کم یہ ان دشواریوں کے مقابلے

میں کچھ بھی نہیں کہ جو اس وقت ایک زبان رائج کرنے کی کوشش میں پیش آرہی ہیں اور جن کا کوئی حل سمجھ میں نہیں آتا۔ میں تو ایک زبان رائج کرنے کی ضرورت یا اس کے ممکن العمل ہونے کا قائل نہیں تاہم اگر ہمارے سامنے اس معیار کا رکھنا مناسب ہے۔ اگر یہ کسی طرح ممکن العمل ہو سکتا ہے۔ اگر تاریخ کا ورق پلٹا جا سکتا ہے اور کبھی کسی زمانہ میں جس کا اندازہ ابھی ہم نہیں کر سکتے شمالی ہند میں بجائے اردو اور ہندی کے ایک زبان رائج ہو سکتی ہے تو اس کی داغ بیل اسی طرح ڈالی جا سکتی ہے کہ اردو اور ہندی دونوں ہمارے مدرسوں میں لازمی قرار دی جائیں۔

ہندی اور اردو کی بحث سے قطع نظر کر کے اب ہندوستانی زبان کے مسئلہ کو لیجئے کہا جاتا ہے کہ اگر اردو میں سے فارسی اور عربی لفظ نکال دئے جائیں اور ہندی میں سے سنسکرت لفظ تو ہندوستانی زبان بن کر رائج ہو جائے گی۔ اس کے ثبوت میں یہ دلیل بھی پیش کی جاتی ہے کہ اب ہندوستان کے بڑے حصے میں ہندوستانی زبان بولی جاتی ہے اور تقریباً تمام ہندوستان میں ہندوستانی سمجھی جاتی ہے۔ یہ بیان ایک حد تک صحیح ہے لیکن صرف ایک حد تک یعنی ٹوٹی پھوٹی اردو اور بگڑی ہوئی ہندی، پنجاب میں پنجابی لب و لہجہ میں اور بہار میں بہاری تلفظ کے ساتھ بولی جاتی ہے ہمارے صوبہ میں پوربی ضلعوں میں ایک قسم کی ہندی اور پچھمی ضلعوں میں ایک قسم کی اردو بولی جاتی ہے اسی طرح دیہات میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ ہندی سے ملتی جلتی ہے اور شہروں میں جس زبان کا استعمال ہے وہ اردو سے ملتی جلتی ہوتی ہے، تاہم جہاں تک بولی کا تعلق ہے آپ اس کو ہندوستانی بولی کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح صاحب لوگ اور خانساماؤں اور بیراؤں کی بولی بھی ہندوستانی ہوتی ہے، اس ٹوٹی پھوٹی زبان کو بھی جو بمبئی یا کلکتہ وغیرہ کے اطراف میں مسافر اپنا مطلب نکالنے کے لئے بازاروں میں بولتے ہیں وہ بھی ہندوستانی کہلاتی ہے۔ اور اس معنی میں یہ کہنا کہ ہندوستان کے بہت بڑے حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے ٹھیک ہے لیکن بولی ایک چیز ہے اور ادبی اور مجلسی زبان بالکل دوسری چیز۔ جس وقت آپ یہ کوشش کریں گے کہ یہ ہندوستانی زبان ادبی اور مجلسی زبان قرار دی جائے لابدی طور پر وہ یا تو ہندی کی شکل اختیار کرے گی یا اردو کی۔ کیونکہ اس ہندوستانی بولی کی جس کو نام

ملک کی زبان قرار دینے کا خیال بے حیثیت اور مرتبہ ہی زبان کا نہیں اور نہ اس میں زبان بننے کی اہلیت ہے۔ پچھلے پچاس برس میں اردو اور ہندی نے جس فضا میں نشو ونما پائی جس تہذیب معاشرت اور تمدن کی وکالت کے لئے انھوں نے زبان کھولی اس نے انھیں مجبور کیا کہ نئے نئے خیالات اور نازک ترین حسیات و جذبات کے اظہار کے لئے نئے نئے علوم و فنون کی ترجمانی کی غرض سے اردو فارسی اور عربی سے اور ہندی سنسکرت کی مدد سے نئی نئی اصطلاحات، نئی نئی ترکیبیں اور محاورے گڑھے اور انھیں رائج کرے انگریزی سے بھی مدد لی۔ اس طرح سے دونوں زبانوں میں ارتقا ہوا۔ اور ان کا خزانہ ایک حد تک مالا مال ہوا۔ اب آپ کی کوشش یہ ہے کہ فارسی اور سنسکرت کی یہ اصطلاحیں، ترکیبیں اور محاورے جو دونوں زبانوں میں رائج ہو گئے ہیں ان کو خارج کیا جائے۔ تو کام کس طرح چلے گا۔ آپ زبان کو بجائے مالا مال کرنے کے اور کنگال بنائیں گے۔ اس سے زبان کی ترقی ہو گی یا تنزل؟ کہا جاتا ہے کہ بجائے فارسی اور سنسکرت کے ہندوستانی زبان میں انگریزی اصطلاحات اور محاوروں سے کام لیا جائے۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ اردو کا فارسی اور عربی سے اور ہندی کا سنسکرت سے تو کچھ واسطہ اور رشتہ بھی ہے، لیکن ہندوستانی زبان سے انگریزی کا کیا رشتہ ہے اور اس طرح جو زبان بنے گی اس کی صحت، لطافت اور پاکیزگی کا کیا حشر ہوگا۔ دنیا کی مستند زبانوں کی مجلس میں اس کی کونسی اور کہاں جگہ ہوگی۔ جو احباب "ہندوستانی" کی حمایت میں مضامین لکھتے ہیں وہ بھی ہندی یا اردو سے تجاوز کرکے ابھی تک "ہندوستانی" زبان کا کوئی نمونہ پیش نہیں کر سکے۔

اب تک اس کے متعلق جو کچھ کہا گیا اُس سے غرض یہ تھی کہ اردو یا ہندی کی جگہ "ہندوستانی" زبان رائج کرنے کا خیال زبان کی ترقی اور نشوونما کے لحاظ سے مناسب نہیں۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ ایسا کرنا یا ایسا ہونا ممکن العمل بھی ہے؟ کیا ہندوؤں کی کثیر تعداد ہندی کو چھوڑنے اور مسلمانوں کی کثیر جماعت اردو کو الوداع کہنے کے لئے تیار ہے؟ پچھلے چالیس سال میں ایک زبان رائج کرنے کی تحریک نے کس قدر کامیابی حاصل کی ہے؟ کیا اس تحریک کا یہ اثر نہیں ہوا کہ ہر ایک فریق اپنی ہی زبان رائج کرنے اور اس کو ترقی اور اشاعت دینے پر زیادہ تل گیا تو اب کس طرح امید کی جاتی ہے کہ "ہندوستانی" کے رائج کرنے

کا خیال نقارخانہ میں طوطی کی آواز سے زیادہ اہمیت رکھے گا۔ بالفرض مان بھی لیا جائے کہ "ہندوستانی" رائج کرنے پر ایک کثیر جماعت راضی ہو جائے گی تو اس کے لئے رسم خط کون سا تجویز کیا جاتا ہے۔ فارسی یا ناگری۔ کیا اردو والے فارسی رسم خط کو چھوڑ کر ناگری کے اختیار کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے یا ہندی والے فارسی پر۔ اگر نہیں تو کیا رومن یا لاطینی رسم خط کیا جائے گا۔ کیا یہ مناسب یا ممکن ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ حال میں ترکی میں مصطفیٰ کمال نے حکومت اور قانون کے زور سے پوشاک میں ہیٹ، اور رسم خط لاطینی لازمی قرار دے کر رائج کر دیا ہے۔ اول تو معلوم نہیں کہ اس انقلاب کا آگے چل کر کیا حشر ہوگا اس کے علاوہ اس محکوم قوم میں کسی مصطفیٰ کمال کا نمودار ہونا بھی گمان غالب نہیں۔ جہاں تک میری عاجز رائے کام کرتی ہے میرے خیال میں تو اس ملک میں نہ ایک زبان کی ضرورت ہے، نہ ہندی اور اردو کی جگہ 'ہندوستانی' کا رائج کرنا مناسب ہے۔ نہ ان تینوں میں سے کسی ایک کا بھی سارے ملک کی زبان قرار پانا موجودہ فضا میں ممکن العمل ہے۔

ہماری قومی زبان

اردو ہندوستان کی قومی زبان ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر ہمارے ملک کی کوئی زبان ہے یا ہو سکتی ہے تو وہ اردو ہے۔ مدتوں سے واقعات کا گویا فطری طور پر یہ میلان رہا کہ اردو اس ملک کی قومی زبان بنے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ کچھ مدت سے یہ بحث چھیڑ دی گئی ہے کہ ملک کی قومی زبان کونسی ہو اور واقعات کو گویا مصنوعی طور پر اس طرح ڈھالا جا رہا ہے کہ اردو سے اس کا رتبہ چھین کر کسی دوسری زبان کو دے دیا جائے بلکہ ہو سکے تو بتدریج اردو کو مٹانے اور ملیامیٹ کرنے کی تدبیریں عمل میں لائی جائیں۔ ہندوستان کی جماعتوں میں جو قسم قسم کے اختلافات ہیں معلوم ہوتا ہے وہ کافی نہ تھے کہ وہاں یہ ایک اور نیا فساد کھڑا کر دیا گیا ہے تاکہ قومی اتحاد اگر ممکن تھا بھی تو اسے ناممکن بنانے کی ایک اور صورت پیدا ہو جائے

جو ہندو اس ملک کو آریہ ورت بنانا چاہتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی موجودگی سے "پوتر" نہیں رہا جو صرف بھیم اور ارجن اور کورو اور پانڈو کے قصے سنسکرت اور سنسکرت نما ہندی بھاشا میں

بنانا چاہتے ہیں اور جو مسلمان اس ملک کو عربستان کی محض ایک زرخیز وادی تصور کرتے ہیں اور جو صرف متنبی اور ابوالعتاہیہ اور نظامی اور نظیری کے عربی اور فارسی اشعار ہی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں وہ نہ صرف ہندوستان کا بھلا نہیں چاہتے بلکہ وہ آپ اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہے ہیں۔ اردو صحیح ہندو مسلم مفاہمت کی ایک بولتی چالتی تصویر ہے جسے دونوں فریق اپنے دل میں رکھ سکتے ہیں کہ "جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی" اکبر مرحوم کی آواز ہر ایک بیت ہندو مسلمان کے کانوں میں آج تک گونج رہی ہے کہ

اردو میں جو سب شریک ہونے کے نہیں
اس ملک کے کام ٹھیک ہونے کے نہیں
ممکن نہیں شیخ امرء القیس بنیں
پنڈت جی والمیک ہونے کے نہیں

اردو کوئی مسلمانوں کی زبان نہیں۔ مسلمان جب پہلے پہل ہندوستان میں آئے تو ان کی مذہبی زبان عربی اور تمدنی زبان فارسی تھی۔ رفتہ رفتہ جب ہندو مسلمانوں کا میل جول شروع ہوا تو ملک کے مختلف حصوں میں مختلف زبانوں میں، عربی فارسی کے الفاظ داخل ہونے شروع ہوئے اور اس سلسلے میں اردو وجود میں آئی۔ جہاں جہاں مسلمان گئے انھوں نے بالعموم فارسی کو درباری اور دفتری زبان قرار دیا لیکن جوں جوں یہاں کے باشندوں سے ان کے تعلقات بڑھے انھوں نے روزمرہ کے استعمال کے لئے ایک ایسی زبان اختیار کی جس کی بنیاد ہندوانی اور جس کی باقی ساخت کچھ ہندوانی اور کچھ مسلمانی تھی، اس زبان کا رسم خط فارسی تھا لیکن اس کی قواعد اور اس کے لفظوں کا بیشتر ذخیرہ ہندوستان کی پیداوار تھی۔ سلیم مرحوم کے لفظوں میں گویا یہ نہ ہندو زبان تھی نہ مسلمان زبان بلکہ ایک ہندلمان یعنی ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان تھی اور ہندلمانیت کا سب سے بڑا مظاہرا۔ اردو مسلمان حکمرانوں کی رواداری کی ایک روشن مثال ہے اور اردو ہی ہے جس کی فطری بنیاد پر ہندو مسلم اتحاد کی شاندار عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے لیکن افسوس ہے کہ ہمارے اکثر ملکی بھائی اس حقیقت سے روز بروز دور ہوتے جا رہے ہیں اور اس زبان سے جس سے انھیں اور ہمیں فطری طور پر لگاؤ ہونا چاہئے مصنوعی طور پر بیگانگی برت رہے ہیں۔ ہر سچے محب وطن کے لئے یہ امر انتہائی تاسف اور رنج کا باعث ہے۔

ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد اردو چھوڑ کر جوق در جوق ہندی بھاشا کے حلقے میں داخل ہو رہی ہے

مسلمان اس کے جواب میں یہ کر سکتے تھے کہ وہ پھر اپنی تمدنی زبان فارسی کی طرف منہ پھیر لیتے لیکن ایسا کرنا ایک خلاف فطرت مصنوعی فعل ہوتا۔ وہ بدستور اُردو کے حامی رہے اور رہیں گے۔ اگر بعض ہندوؤں کو اس سے انکار ہے کہ اُردو ہندوستان کی قومی زبان ہے تو مسلمان ایک طرف اس بات پر اصرار کریں گے کہ اُردو کم از کم ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی زبان ضرور ہے اور دوسری طرف اس زبان کے دروازے ہمیشہ کھلے رکھیں گے تاکہ جب ہندو چاہیں بلا اجازت بخوشی پھر اس کے حلقے میں آ شامل ہوں اور مدت کے بچھڑے ہوئے پھر مل جائیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندو مسلمانوں کے اتحاد سے ہندوستانیوں کی ایک مضبوط اور منظم قوم پیدا ہو۔ اس قومیت میں ہندوؤں کی تہذیب اور مسلمانوں کی تہذیب کے اجزا شامل ہوں بلکہ حال کی مغربی تہذیب کا بھی ایک جزو ضروری حد تک اس میں موجود ہو۔ لیکن اگر ہمارے ملکی بھائی ہمیں ہمارا مناسب حصہ دینے پر راضی نہ ہوں یا ان کی اکثریت ہماری تہذیب کی روایات کو محض اجنبی سمجھ کر ملک بدر کرنا چاہے تو بدقسمتی سے ہمیں اپنے آپ کو ایک جداگانہ قوم تصور کرنا پڑے گا جس کا مذہب جدا بعض روایات جدا اور زبان بھی ایک حد تک جدا ہوگی۔ خدا کرے یہ جدائی تھوڑے عرصے کے لئے ہو۔ خدا کرے جلد ہی ہم اور وہ سمجھ لیں کہ ہم اور وہ ایک دوسرے کے پڑوسی اور بھائی بھائی ہیں ہم ایک ہی سرزمین کے رہنے والے اور ایک ہی میٹھی سی بولی بولنے والے ہیں۔

تیس چالیس سال ہوئے اُردو کے مقابل میں ہندی کا نام بہت کم سننے میں آتا تھا بنگالی گجراتی، سندھی کی طرح ایک زبان یہ بھی تھی کہ ایک مخصوص گروہ کی زبان تھی۔ مالوی جی نے ایک منصوبہ تیار کیا جس کے ماتحت ان ہندوؤں کو جو اُردو لکھتے پڑھتے تھے اُردو کو چھوڑ کر ہندی لکھنے پڑھنے کی ترغیب دی۔ انھیں بتایا کہ وہ ہندو ہیں تو انھیں صرف ہندوستان کی 'اپنی' دیسی چیزوں کو اختیار کرنا چاہئے، قدیم ہندوانی تہذیب ہندی زبان' ہندی رسم خط کہ یہی صحیح ہندویت اور یہی صحیح حب الوطنی ہے۔ یہ وہ بھول گئے کہ قدیم ہند کی طرف رجوع کرنے میں وہ پورے ایک ہزار سال اور کم از کم آٹھ دس کروڑ مسلمانوں، عیسائیوں، پارسیوں وغیرہ سے گویا بیگانہ رہے ہیں، سمجھ رہے ہیں کہ یہ لوگ کسی یہاں

آئے ہی نہ تھے۔ اس آریائی کوتاہ اندیشی کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ سیدھے سادے لفظوں میں یہ ہے کہ ہندو قوم ایک اعلیٰ درجے کی قدیم تہذیب کی مالک تھی حالات ایسے ہوئے کہ مسلمان اس ملک پر حملہ آور ہوئے اور صدیوں تک یہاں حکومت کرتے رہے یہاں تک کہ ان میں زوال کی علامتیں ظاہر ہوئیں اور ایک اور اجنبی قوم سات سمندر پار سے آکر ہندو مسلمانوں پر مسلط ہوگئی۔ ہندو کچھ دیر کے بعد ابھرے مسلمانوں پر ابھی غفلت طاری تھی۔ خیالی جمہوریت کی آوازیں سنائی دینے لگیں معلوم ہوا کہ اب کثرت کی حکومت آنے والی ہے ہندوؤں کی کثرت تھی، اُن کے پاس روپیہ تھا، وہ نئی تعلیم پارہے تھے، ایک مشترک قابل حصول نصب العین کا احساس کرتے ہوئے وہ منظم بھی ہو رہے تھے، اس کے مقابل میں مسلمان ابھی خوابِ خرگوش میں تھے اس حال میں قدرتی بات تھی کہ ہندوؤں کی اکثریت کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ یہ ہمارا ملک ہے، صدیوں ہم اجنبیوں کے زیر اثر رہے، اب ہم زیادہ قابل اور زیادہ ہوشیار ہیں اور اس لئے ہم ہی خوشحالی اور ترقی اور حکومت اور آزادی کا زیادہ استحقاق رکھتے ہیں۔ یہ مان لیا کہ ایسا محسوس کرنا ایک قدرتی بات تھی لیکن غور کرو تو واضح ہو جائے گا کہ یہ عقلمندی نہ تھی، دور اندیشی نہ تھی، اس میں ہندوستان کی بلکہ بالآخر خود ہندوؤں کی بہتری نہ تھی۔ آٹھ کروڑ انسانوں کی طرف سے آنکھ کان بند نہیں کئے جا سکتے خواہ وہ کاہل یا نادار ہی کیوں نہ ہوں۔ دنیا کا مستقبل قومیت کے ہاتھوں میں نہیں، بین الاقوامیت اور انسانیت کے ہاتھوں میں ہے۔ ہندوستان کو یہ زریں موقع حاصل ہے کہ یہاں ایک نہیں کئی قومیں پہلو بہ پہلو آباد ہیں کئی تہذیبیں ہیں، کئی زبانیں ہیں ان حالات میں رواداری اور بلند نظری برتنی چاہیئے تاکہ یہ ملک قومیت کی خطرناک منزل کو پھاند کر صحیح انسانیت کی راہ پر لگ جائے۔ یہاں کی تہذیب اور یہاں کی زندگی میں اسلامی اور ہندوانی اور مغربی تہذیب کا ایک شاندار ملاپ ہو جسے دنیا رشک کی نظروں سے دیکھے!

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ فی الحال (خدا کرے عارضی طور پر) صورتِ حالات کچھ اور ہے، فی الحال ہمارے ملکی بھائیوں کی اکثریت بلکہ سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک مخصوص جماعت بھی ایک ایسی مفاہمت کے لئے تیار نہیں ہے۔ ہندی والے اُردو کے دائرے میں برسوں سے اپنی نشر و اشاعت کے سلسلے

یں چھاپے مار رہے ہیں اور اپنے حلقے کو وسیع کئے چلے جاتے ہیں۔ وہ ایک حد تک کامیاب ہو رہے ہیں کیونکہ وہ منظم ہیں اور ایک خاص جذبے کے ماتحت کام کر رہے ہیں۔ ہماری حالت بری نہیں بعض باتوں میں ہم ان سے آگے ہیں پیچھے نہیں لیکن صرف بعض میں، بعض اور باتوں میں وہ ہم سے آگے ہیں اور آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں، سو اگر کچھ عرصہ ہم اسی طرح سوئے رہے الگ الگ رہے، منظم نہ ہوئے تو ہم بلاشبہ سخت خطرے میں پڑ جائیں گے۔

مجھے رنج ہوتا ہے کہ ایک مجھ سے غیر سیاسی شخص کو اس قسم کی سیاسی باتیں کہنی پڑتی ہیں بہ حیثیت ایک اُردو رسالے کے مدیر کے میں نے کبھی ملی اختلافات سے کوئی واسطہ نہیں رکھا، کیونکہ اُردو کے باب عالی پر اُردو حروف میں صرف بسم اللہ اور اوم لکھا ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ نہیں لکھا، یہ لفظ ہر ایک مسلمان کے دل میں منقوش ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ ایک ادب سے تعلق رکھنے والے شخص کو اس طرح کی سیاسی گفتگو کرنی پڑی؟ اس کی وجہ محض یہی ہے کہ یہ اُردو کی زندگی اور موت کا سوال ہے اور بہ حیثیت اُردو کے ایک شیدائی کے میرا فرض ہے کہ میں تمام مسلمانوں سے اور اُن انصاف پسند اور محب وطن لاکھوں ہندوؤں سے بھی جو ابھی اردو کے حلقے میں داخل ہیں درخواست کروں کہ اُردو ہندی کے اس فتنے کو روک دیں اور اس کو ملی سیاسیات کے میدان سے نکال کر پھر قومی ادبیات کی چوٹیوں پر پہنچا دیجئے۔ اس ضمن میں رام نریش ترپاٹھی (ہندی مندر پریاگ ۱۹۲۶ء صفحہ ۵) کا یہ قول دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ "ہر ہندو کو اردو سیکھنی چاہیئے اور ہر مسلمان کو ہندی۔ میرا تو راسخ عقیدہ ہے کہ بغیر اردو جانے کوئی شخص بھی ہندی کا اچھا انشا پرداز نہیں ہو سکتا۔" دلوی داس گاندھی نے ۱۹۳۲ء میں ہندی پرچار سبھا کے سالانہ جلسے میں کہا کہ "ہر ہندو کا فرض ہے کہ وہ اُردو سیکھے اور ہر مسلمان کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ہندی کی استعداد بڑھائے" بلکہ سنسکرت اور فارسی کی طرف بھی دونوں قوموں کو توجہ کرنی چاہیئے۔ شکر ہے کہ ہمارے بھائیوں میں ابھی ایسے آدمی موجود ہیں جو دل سے ایک پائدار مفاہمت کے خواہشمند ہیں۔ یہ مفاہمت اسی طرح ممکن ہے کہ ہم ایک دوسرے کی چیزوں کی قدر کریں تاکہ رواداری سے محبت اور محبت سے نہ حل ہونے والے سوالوں کا حل مل جائے۔

مسلمانانِ ہند کے لئے آیندہ راہِ عمل

(بسلسلۂ سابق)

ہندوستان کے پیشوں کی جو طویل فہرست ہم نے اوپر دی ہے اس میں مسلمان دوسرے فرقوں کے دوش بدوش تقریباً ہر پیشہ میں موجود ہیں لیکن ان کی نمایندگی بڑھنے کی جگہ برابر کم ہوتی جارہی ہے۔ ہر جگہ ان کے پاؤں جمے ہوئے نہیں بلکہ اکھڑے ہوئے نظر آتے ہیں ان کی گرفت مضبوط نہیں بلکہ ڈھیلی ہورہی ہے۔ یہ حملہ نہیں بلکہ مدافعت کر رہے ہیں۔ یہ اپنے پیشروؤں کی جگہ لینے آگے نہیں بڑھتے، ایک سیڑھی اور اونچا نہیں اٹھتے بلکہ اپنی سیڑھی پر قائم رہنا چاہتے ہیں یا دھکا کھا کر نیچے گرنے کی طرف مائل ہیں۔ نیچے گرنے کے بعد بھی یہ اپنا پاؤں جما نہیں پاتے بلکہ یہاں بھی اکھڑے ہوئے پاؤں کے ساتھ مقابلہ شروع کرتے ہیں اور بلند مقام کی صاف فضا کے مقابلہ میں یہاں کی فضا میں ان کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ یہاں دماغی مقابلہ کم اور جسمانی مقابلہ زیادہ ہونے لگتا ہے۔ لوگوں کے دھکوں سے جوڑ جوڑ ہلنے لگتا ہے اور بدن پکے پھوڑے کی طرح دکھنے لگتا ہے لیکن مقابلہ اور مسابقت کی بے رحم قوتیں اپنا عمل جاری رکھتی ہیں۔ یہاں تک کہ بھک منگوں، لولوں، اپاہجوں، دائم المریضوں کے گروہ میں شامل ہونے کے لئے لوگ مجبور ہوجاتے رہیں اور یوں اپنی ناکارہ زندگی کو سسک سسک کر ختم کرتے ہیں اور اپنے سے زیادہ نکمی اولاد چھوڑ کر سوسائٹی کی تندرستی کو زہر آلود کرتے ہیں

لکھنؤ اور دہلی اور دوسرے قدیم مسلم شہروں کے شاہی خاندانوں، نوابوں، امیروں، سپہ سالاروں، صوبہ داروں، فوجداروں، عالموں، محدثوں، فقیہوں، قاضیوں، مفتیوں، طبیبوں، مورخوں، مصنفوں اور صوفیوں کی اولاد کو چھوڑیے وہ تو کبھی کی تباہ ہو چکی اور ان کا مرثیہ و ماتم کرنے والے بھی خاک کا پیوند بن چکے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہندوستان کے کونہ کونہ میں اعلیٰ اور ممتاز

عہدوں پر مسلمان ہی مسلمان نظر آتے تھے۔ دنیا کے سب عیش و آرام، حکومت و اقتدار صرف انھیں کو حاصل تھے۔ وہ راجاؤں کے راجہ، غاصبوں کے غاصب جابروں کے جابر اور ظالموں کے ظالم تھے۔ جدھر نکل جاتے تھے سب کے سر ان کے سامنے خم ہو جاتے تھے۔ سب کے زر و مال اور اندوختے ان کی خدمت کے لئے وقف ہو جاتے تھے۔ ان کا عیش سب کے عیش پر مقدم تھا وہ زمانے تو مدت ہوئی دفن ہو چکے اور اچھا ہوا کہ دفن ہو چکے۔ حکومت و سلطنت اور مطلق العنان استبداد کے زمانہ کا ذکر نہیں سوال تو زمانہ محکومیت کا ہے۔ سر سید کی تحریک کے بعد کے زمانہ کا ہے اس زمانہ کا جس نے مسلمانوں میں ضعیف سے بیداری پیدا کر کے انھیں ظلم پر نہیں بلکہ اپنے جائز حقوق کے مطالبہ پر آمادہ کیا تھا اور جس کی وجہ سے کہیں کہیں مسلمان ججوں، کلکٹروں، ڈپٹی کلکٹروں، بیرسٹروں، وکیلوں، ڈاکٹروں، انجنیروں، پروفیسروں، ایڈیٹروں اور مصنفوں کی صورت میں نظر آنے لگی تھیں ملوں کے مالکوں بڑے بڑے تاجروں اور ٹھیکیداروں میں بھی مسلمان نظر آئے تھے۔ اور جس کی وجہ سے مسلمانوں کو پبلک لائف میں ایک خاص وقعت اور اہمیت حاصل ہو گئی تھی اور بر ادران وطن ان کے اشتراک عمل کے لئے کانگریس لیگ اور خلافت کی حمایت جیسے سمجھوتوں پر منت و خوشامد کے ساتھ تیار رہتے تھے۔ سوال تو اس قریبی زمانہ بلکہ آج کا ہے یعنی آج جو پرانی نسل کے اول درجہ کے مسلمان اپنی عمر طبعی پوری کر کے موت کے آغوش میں جا جا کر سو رہے ہیں ان کی جگہ لینے والے کون پیدا ہو رہے ہیں؟ زمانہ ایسے سائنس دانوں صنعتی ماہروں اور ہر قسم کے انجنیروں کو پکار کر بلا رہا ہے جو قوم کی معاشی زندگی میں انقلاب پیدا کر سکیں۔ کتنے مسلمان اس آواز پر لبیک کہنے کے لئے بڑھ رہے ہیں؟ زمانہ سرمایہ کی موت و اقتدار اور اس کی عالمگیر حکومت کا ہے کتنے مسلمان اس نئی شہنشاہیت میں شریک ہونے کا دعوے کر سکتے ہیں؟ یا یہ نہیں تو زمانہ مزدور کی فتح و نصرت اور عروج و کامرانی کا ہے کتنے مسلمان مزدور اپنی نقابیہ کی ان سداریوں کے خیر مقدم کرنے کا عزم و حوصلہ رکھتے ہیں؟

"آپ اپنے محلہ اور قصبہ میں غور سے نگاہ ڈالئے۔ آپ کے علم میں کوئی کوتوال انسپکٹر تھانہ دار

ڈپٹی کلکٹر، تحصیلدار، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ، منصف، صدراعلیٰ، جج، مختار، وکیل، بیرسٹر، آنریری مجسٹریٹ رہتا ہو۔ تو ملاحظہ کیجئے کہ اس کی اولاد، بیٹے پوتے نواسے اپنے بزرگوں کے مرتبہ کو پہنچے ہیں کہ نہیں محلے شہر قصبہ میں ہر طرف غور سے نگاہ دوڑائیے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے اکثر کی اولادیں تباہ حال ہیں۔ ان کے بیٹے آٹھویں درجہ سے آگے پڑھے ہوئے نہیں ملیں گے حالانکہ قدرت نے انہیں بیرسٹر اور انجنیئر بننے کا موقع دیا تھا۔ کوتوال کے بیٹے اور پوتے چھلائی کرتے ملیں گے۔ نینی تال کے مشہور آنریری مجسٹریٹ کے صاحبزادے گھڑیاں صاف کرتے ہوئے ملیں گے۔ ریاست رامپور کے مشہور ہیڈ ماسٹر کے صاحبزادے کسی دفتر میں کاغذ گھسیٹتے ملیں گے۔ مرادآباد کے ایک مسلمان سب جج کے بیٹے پوتے کچہری میں اس انتظار میں کھڑے ہوئے ملیں گے کہ کوئی شخص چار آنے پیسے دے کر ان کی جھوٹی گواہی کرالے یا محکمہ رجسٹری میں شناخت کرالے۔ مرادآباد کے سب سے بڑے اور سب سے مشہور نواب کا پوتا کچہری میں بیٹھے والوں سے عرضی نویسی کرتا ملے گا یا مرادآباد کے کانجی ہوس کا محرر ملے گا۔"

اس کے برعکس دوسری طرف، ہندو پٹواریوں کے لڑکے مالوگو نائب تحصیلدار، مختار، وکیل، پیشکار ہیں ہندو مالیوں کے لڑکے بی۔ اے ایل ایل بی وکیل ہائی کورٹ ہیں۔ چار روپے کے نیچے ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ ہندو چاٹ بیچنے والوں کے لڑکے منصف، سب جج اور آنریری مجسٹریٹ ہیں ہندو چپراسیوں کے لڑکے سو روپیہ پانے والے بابو ہیں۔ غرض ہر ہندو بھائی کا لڑکا ترقی کی دھن میں اپنے ماں باپ سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہندو تحصیلدار کا لڑکا ڈپٹی تو ہو سکتا ہے لیکن نائب تحصیلدار نہیں ہو سکتا۔ ہندو پاری امکریہ جانی کی آنکھیں آسمان پر لگی ہوئی ہیں۔ اسٹیشن پر ایک دن ماتا دین قلی نے مجھ سے کہا کہ میرا بچہ بنارس یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہے اور وہیں مرادآباد کے مشہور سب انسپکٹر ساکن تیدی سرائے نے فرمایا کہ میرا بچہ بس پڑھتا مجبور ہو کر میونسپلٹی کے اسکول صنعت و حرفت میں ڈال دیا ہے۔ قلی کا بچہ بی۔ اے ہوگا اور سب انسپکٹر کا بچہ مرادآبادی برتن مزدوری پر بنائے گا۔" "ہندوستان کے تمام سرکاری محکمے ہندو بھائیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان میں صرف قلی چپراسی، خانساماں

چوکیدار تو مسلمان ہی باقی سب ہندو بھائی ہیں۔" "ہر تعلیم یافتہ ہندو بھائی گورنر بننے کی کوشش میں ہے ہر بے پڑھا ہندو بھائی تجارت کرکے کروڑپتی بننے کی تاک میں ہے۔ مسلمان پھاوڑہ کلہاڑی اور شیلہ بنوانے کی فکر میں ہے۔ انجام یہ ہو رہا ہے کہ ہندو بھائی گورنر اور کروڑپتی بن رہے ہیں اور مسلمان تانگہ والے، بہشتی، بھانڈ، گوشت، تیلی جولاہے ہیں اور ابدالآباد تک یہی رہنے کا فیصلہ کرچکے ہیں۔ میر صاحب شیخ جی خانصاحب پیوند لگے، میلے گندے کپڑے پہنے کئی وقت کے فاقہ سے مارے مارے پھرتے ہیں یہاں حقہ کا دم لگاتے ہیں وہاں قرض ادھار مانگتے پھرتے ہیں۔"

"ایک ایک ضلع میں مسلمانوں پر اسی اسی لاکھ روپیہ قرض ہے اور دس لاکھ روپیہ سالانہ مسلمان بنیوں کو سود میں دیتے ہیں۔" "پندرہ سولہ لاکھ روپیہ سالانہ کی جائدادوں کا نیلام میری آنکھوں کے سامنے ہر ۲۰ تاریخ کو ہوتا رہتا ہے۔ بنئے اسے خریدتے رہتے ہیں اور میں دیکھا کرتا ہوں۔ لاکھوں روپے کی ڈگریوں میں مسلمانوں کے جو برتن اور پلنگ بستر اور کپڑے ہر سال نیلام ہوجاتے ہیں وہ علیحدہ ہیں۔" "میں نے اکثر موقعوں پہ دیکھا ہے کہ بعض مسلمان زمیندار یا حاکم کو بھی اپنی مرضی کے خلاف کام کرنا پڑتے ہیں کیونکہ بنیا اپنے قرضے کے دباؤ سے مسلمان قرضدار زمیندار مجسٹریٹ سے جو چاہتا ہے کرالیتا ہے۔ اپنے موافق فیصلہ کرالیتا ہے۔ سفارش کراتا ہے تو مانی پڑتی ہے جھوٹی گواہی دلاتا ہے تو دینی پڑتی ہے سچی گواہی دینے کو منع کرتا ہے تو مجبور ہونا پڑتا ہے۔

"ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل بورڈ کے مسلمان قرضدار ممبر اور چیئرمین اپنی مرضی اور انصاف کے خلاف ووٹ دینے پر مجبور ہوجاتے ہیں سارے ہندوستان میں آپ کو مرغ باز سب کے سب بلا کسی استثنا کے مسلمان ملیں گے۔ بٹیر باز سب مسلمان ہیں اسی اسی برس کے بوڑھے سفید داڑھی والے ملنگ اس مرض میں مبتلا ہیں۔ پتنگ باز، تیتر باز، شرابی، افیون کی گولی کھانے والے، جواری، زانی رنڈی باز ایسے چودھری اور پنچ جو تصفیہ کا نصف روپیہ خود لیتے ہیں۔ اگر تصفیہ نہیں ہوتا تو عدالت میں مقدمہ لڑوا دیتے ہیں وکیلوں کا اور اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں۔ ممبری کے انتخاب کے موقع پر سرمایہ سے روپیہ لے کر غریبوں سے زبردستی ووٹ دلاتے ہیں۔ یہ سب لوگ مسلمانوں ہی میں ملتے ہیں۔"

"مسلمانوں کی ہمتیں بہت ہی پست ہوگئی ہیں۔ اولو العزمی عالی حوصلگی، بہادری جرأت مٹ گئی ہیں۔ بلند خیالی اور ترقی کا حوصلہ جاتا رہا ہے۔ ہر غریب مسلمان بھائی یہ سمجھے ہوئے ہے کہ وہ صرف ٹھیلہ کھینچنے اور ٹوکری اٹھانے زمین کھودنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ وہ اور اس کی اولاد صرف مزدور ہوسکتی ہے اور کچھ نہیں ہوسکتی۔"

"آپ کسی ہندو اسکول کے سامنے کھڑے ہو جائیے اور جو ہندو لڑکا آپ کے سامنے سے گذرے اس سے دریافت فرمائیے کہ تعلیم پاکر کیا کروگے تو آپ کو فوراً جواب ملے گا کہ ڈاکٹر بنوں گا کوئی کہے گا کہ انجنیئر بنوں گا۔ کوئی تو یہی کہے گا کہ جج کلکٹر وزیر بننے کی کوشش کروں گا۔ لیکن مسلمان طلباء سے اگر آپ پوچھیں تو اکثر تو جواب ہی نہ دیں گے۔ سوچیں گے کہ کیا جواب دیں کیونکہ منزل مقصود نہ تو مسلم لڑکوں کے سامنے ہے نہ ان کے والدین کے سامنے ہے۔ اسکول میں ڈال دیا ہے جب تک ان کی ڈنڈا سلامت ہے دل لگ رہا ہے۔ تعلیم پا رہے ہیں۔ جس دن دل اچاٹ ہو جائے گا اسکول چھوڑ دیں گے ڈنڈے بجاتے پھریں گے۔ نوکری تلاش کریں گے۔ لیکن نہ ملے گی۔ اگر کوئی لڑکا جواب بھی دے گا تو یہ دے گا کہ کچہری میں بارلی پر بابو ہو جاؤں گا۔"[1]

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ لاہور کی طرف سے ۱۹۳۲ء میں مسلمانان ہند کے مسئلہ افلاس کے حل کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی اس نے لکھا ہے: کہ مسلمان برادران وطن کے مقابلہ میں ہر میدان میں بہت پیچھے ہیں۔ نوعیت تعلیم اور مقدار تعلیم دونوں کے اعتبار سے برادران وطن ان سے بہت آگے ہیں اور بوجہ روز افزوں افلاس اور کمزوری کے مسلمان ان تک نہیں پہنچ سکتے بالخصوص یونیورسٹیوں کی سنڈیکیٹ نصاب تعلیم اور امتحانات کے بورڈوں اور کمیٹیوں پر دیگر اقوام کے اصحاب قابض ہیں اور باوجود مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں سال بہ سال احتجاجات ہونے کی کوئی رعد [illegible]

---

[1] اوپر کے تمام اقتباسات جناب اشفاق حسین صاحب ملک پراسی کیو ٹر مرادآباد کی تصنیف "چوں کے آنسو" سے لئے گئے ہیں

ہو سکتی۔ اب یو۔پی گورنمنٹ کی سرپرستی سو حکام گورنمنٹ ملازمتوں میں ان کے مناسب حق کو تسلیم کر کے احکام جاری کرتے ہیں۔ مگر غالب جماعت کی قوت اور اس کے حاوی ہونے کی وجہ سے ایسے احکام پر عملدرآمد نہیں ہو سکتا جو مسلمانوں کے مفید مطلب ہیں اور اگر کچھ ہوتا ہے اور چند مسلمانوں کو برادران وطن کی مرضی کے خلاف سرکاری محکمہ جات اور دفاتر میں کچھ جگہیں مل جاتی ہیں تو فرقہ وارانہ بدمزگیوں کی وجہ سے مسلمانوں کی محدود تعداد نرغہ میں پڑ جاتی ہے اور ان کی زندگیاں تلخ ہو جاتی ہیں۔ ان کی ترقیاں مسدود ہو جاتی ہیں۔ ذرا ذرا سی لغزشوں پر جوابات طلب ہوتے ہیں مقدمات قائم ہو جاتے ہیں اور بہت سوں کو بیک بینی و دو گوش گھر کی راہ لینی پڑتی ہے اور لطف یہ ہے کہ مسلمان ملازموں کی بے کسی کی یہ حالت اقلیت کے صوبوں میں ہی نہیں بلکہ ان صوبوں میں بھی ہے جہاں ان کی تعداد برادران وطن سے زیادہ ہے۔"

صنعت و تجارت کی حالت بیان کرتے ہوئے کمیٹی نے کہا کہ صوبہ متحدہ میں مسلمانوں کی مردم شماری پندرہ فی صدی ہے مگر وہاں مسلمان کاریگر چوالیس فی صدی ہیں۔ اسی طرح ہر صوبے میں مسلمان کاریگروں کی تعداد ان کی مردم شماری کی نسبت سے زیادہ ہے۔ اس لئے ہندوستان کی صنعت لوٹنے سے سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو پہنچا۔ پھر سود کے جدید قانون سے جو ۱۸۵۵ء میں جاری ہوا سود پر سے تمام قیود اٹھا دی گئیں گراں شرح سود اور سود در سود سے مدیون برباد ہو گئے۔ ہر قسم کی تباہی کے بعد اب بھی ملک میں جو صنعت بہتر سے بہتر ہے اس میں مسلمانوں کا حصہ نمایاں ہے۔ کشمیر میں شال، لکڑی اور چینی کا کام ہوتا ہے جس کی شہرت یورپ تک ہے وہ سب مسلمانوں کا ہے۔ مگر کیفیت یہ ہے کہ وہاں مسلمان کاریگر تیل کو لہو کے بیل کے کام کر کے سدا مفلس اور قلاش رہتے ہیں اور ان کی محنت شاقہ اور عرق ریزی کے پھل دیگر اقوام کے سرمایہ دار اور ہنود کا مدار کہاتے ہیں۔ یہی حال بنارس، دہلی، علی گڑھ مراد آباد بلکہ تمام ہندوستان کے مسلمان کاریگروں کا ہے۔ ۱۹۲۱ء میں مسلمان پارچہ بافوں کی تعداد آبادی کے تناسب سے دوگنی تھی مگر بزازوں کی تعداد دیگر اقوام سے نصف تھی۔ مسلمان لوہار جو ہتھوڑا چلانے میں جان کھپاتے ہیں اپنے تناسب سے دوگنے مگر لوہے کی دکان کر کے اس سے نفع اٹھانے والے

اپنے تناسب سے آٹھویں حصہ سے بھی کم تھے مسلمان تھی اپنے تناسب سے اٹھارہ گنے کم تھی کی تجارت کرنے والے ایک ثلث سے بھی کم تھے۔ پنجاب میں بالعموم کھتریوں کی قوم سرمایہ دار ہے چنانچہ ۲۲۹ کھتریوں کے مقابلہ میں صرف ۸۹ مسلمان شیخ بڑے کارخانہ دار نظر آتے ہیں درآنحالیکہ شیخ کاریگروں کی تعداد کھتریوں سے دوگنی ہے۔ پنجاب میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعداد تقریباً مساوی ہے مگر روپئے کے کاروبار میں مسلمان نادارد ہیں۔ البتہ دلالی اور روپیہ کے ادنیٰ کاروبار میں ان کی تعداد تیرہ ہزار کے قریب تھی۔ اس کے مقابلہ میں ہندو ساہوکاروں کی تعداد ڈیڑھ لاکھ کے قریب تھی جو مسلمانوں سے ۱۲ گونہ ہے۔

زمینداری اور کاشتکاری کے عام انحطاط کے متعلق بیان کرتے ہوئے کمیٹی نے بتلایا کہ کس طرح مسلمان زمیندار ساہوکاروں کے شکنجے میں گرفتار ہیں اور سرکاری محاصل اور مقدموں کی پیروی کے خرچ اخراجات ان کا خون چوسے ڈال رہے ہیں۔ پھر انڈیا ۱۹۳۱ء کے حوالہ سے لکھا ہے کہ دیہاتی آبادی کی بہت بڑی اکثریت ہمیشہ اس حالت میں رہتی ہے کہ اسے محض قوت لایموت مل سکتا ہے اور زراعتی مزدوروں کی حالت تو غالباً سب سے زیادہ بدبختی کی ہے۔ کمیٹی تحقیقات بینک نے ۱۹۲۲ء کے اعداد کی بنیاد پر لکھا تھا کہ ہندوستانیوں کی زیادہ سے زیادہ آمدنی فی کس آٹھ پونڈ اور کاشتکار کی تین پونڈ یا ۴۴ روپیہ سالانہ ہے۔ اسی کے ساتھ کمیٹی مذکور نے کاشتکاروں کے مجموعی سودی قرضہ کی مقدار نو ارب بتائی ہے جو روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔

مندرجہ بالا بیانات اگر صحیح صورت حال کو ظاہر کرتے ہیں تو مسلمانوں کی معاشی محرومیاں اور بدنصیبیاں سب سے اول لائق توجہ ہیں۔ ان محرومیوں میں کچھ ایسی ہیں جن میں مسلمان اپنے دوسرے ہم وطنوں کے ساتھ برابر کے شریک ہیں اور کچھ ایسی ہیں جو خاص طور پر مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہیں اور ان میں مسلمانوں کی تاریخی روایات، رسم و رواج عادات و اطوار اور تمدن و معاشرت کو بڑا دخل ہے۔ اس لئے جو تجاویز تمام ہندوستان کے لئے بنائی جائیں ان کا مسلمانوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہونا لازمی نہیں ہے۔ ان کے مخصوص حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے لئے چند ایسی تدبیریں اختیار کرنا ہوں گی جو صرف انہیں کے لئے مخصوص ہوں گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان کے لئے ملک کے تمام دوسرے فرقوں سے علیحدہ ایک راہ عمل دریافت کرنے کی جستجو کر رہے ہیں۔ (باقی)

[illegible]

اپریل-۱۹۴۲

جامعہ

اردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

کا

ماہوار رسالہ

زیر ادارت

ڈاکٹر سید عابد حسین - ایم اے، پی ایچ ڈی

پروفیسر محمد عاقل ایم اے

قیمت سالانہ صر

مطبع جامعہ دہلی

فی پرچہ ۸ر

بسم اللہ

جامعہ

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۲۶ | جون ۱۹۳۶ء | نمبر ۶

فہرست مضامین

پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا .

اس سال کا خوبصورت تحفہ

سال گرہ نمبر ۱۹۳۶ء

پیامِ تعلیم کے سال گرہ نمبر کی تیاری ابھی سے شروع ہو گئی ہے جن بچوں نے پچھلے سالوں کے تاسیس نمبر دیکھے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ خاص نمبر ہم کس اہتمام سے نکالتے ہیں پچھلے تاسیس نمبر ۳۵ء کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہمیں بادل ناخواستہ بچوں کی بے شمار درخواستیں واپس اور اخباروں کے ایجنٹوں کی بہت سی فرمائشیں منسوخ کرنا پڑیں۔ اس سال ہمارا تاسیس نمبر اللہ نے چاہا پچھلے سال کے خاص نمبروں سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر ہوگا۔ اس مرتبہ ہم نے اس کی قیمت ۱۲ر رکھی ہے لیکن خریداروں سے اس کی زائد قیمت نہیں لی جائے گی تم یہ نمبر حاصل کرنا چاہتے ہو۔ تو ابھی سے رسالے کے خریدار ہو جاؤ یا (عہ ر) کے ٹکٹ بھیج دو۔
اس خاص نمبر میں اشتہار بھی چھپ سکتے ہیں لیکن صرف وہی جو بچوں کی دلچسپی اور فائدے سے تعلق رکھتے ہوں۔ ایجنٹ حضرات کو ابھی سے باخبر رہنا چاہئے۔

مکتبہ جامعہ دہلی

"ماتمِ انصاری"

یہ جوشِ نالۂ غم یہ نوائے گریہ و زاری ٭ رہے گی چشمِ ملت حشر تک وقفِ گہرباری
قیامت تک وطن کو خون کے آنسو رلائے گی ٭ پئے یارانِ ہمدم آپ کی یہ گرم رفتاری
ضرورت تھی کہ "انصاری" بھی اس محفل میں جا پہنچیں ٭ جہاں تھے بزمِ "آما خلد" میں "یارانِ انصاری"
کہیں ہیں کارفرما اجمل و جوہر کہیں شبلی ٭ وہاں بھی ہے "امیرِ وفد" کے مقدم کی طیاری
ہیں فرشِ راہ آنکھیں آج ان ترکی شہیدوں کی ٭ کہ جن کی نزع کے عالم میں کی تھی تم نے دلداری
یتیموں اور بیواؤں کے غمخوارانِ رفتہ سے ٭ مگر لینے گئے ہیں آپ دادِ سعیِ غمخواری
سکوں ناآشنا دل درد سے ہر دم تڑپتا تھا ٭ کہ تھے تم آشنائے لذتِ دردِ دل افگاری
مریضِ قوم کے حق میں دکھاتی تھی مسیحائی ٭ دمِ عیسیٰ سے بڑھ کر آپ کی وہ نرم گفتاری
گوارا تھا نہ تم کو اس غلام آباد میں جینا ٭ وطن کی اس فضا سے تھی تمہیں ازبسکہ بیزاری
بالآخر ہو گئے آزاد تم زندانِ ہستی سے ٭ زمانہ کو دکھا دی مر کے تم نے شانِ خودداری
وداعِ روح تک تڑپا کیا دل دردِ ملت سے ٭ وطن کے غم میں وہ آنکھیں رہا کیں وقفِ خونباری
جہادِ حریت کے آپ وہ تنہا مجاہد تھے ٭ صفِ اعدا کو اب تک یاد ہے جس کی جگرداری
وہ پھونکی روح تم نے قالبِ بے روحِ ملت میں ٭ کہ دوڑی ذرہ ذرہ کی رگوں میں برقِ بیداری
جسے دیکھا مے حبِ وطن سے چور کر ڈالا ٭ مرے ساقی کی چشمِ مست کی اللہ رے سرشاری
ابھی کل تک امیرِ عسکرِ احرارِ ملت تھے ٭ مبارک اب شہیدانِ وطن کی تم کو سرداری
ترے ہی دم سے قائم تھا وقارِ مجلسِ ملی ٭ ترا ہی فیض تھیں خاکِ وطن کی عظمتیں ساری
ابھی جنسِ گراں کی تھی طلب بیحد زمانہ کو ٭ تجھی سے تھی متاعِ حریت کی گرم بازاری
قیادت کی قبا بس تیرے قد پر راست آتی تھی ٭ ترے ہی سر پہ زیبا تھی کلاہِ فخرِ مختاری۔

رہے گی بارِ احساں سے ترے خم گردنِ ملت ؎ نہ لائے گی کبھی یہ ناتواں تابِ گرانباری
رہے گی جامعہ اب عمر بھر صدمے میں تیرے ؎ رہے گی سوگوار ماتم حبِ لکھو انصاری
ودیعت ہے ترے آغوش میں اے خاکِ ملیہ[1] ؎ شبستانِ وطن کا آفتابِ صبحِ بیداری
نہ پھر چمکے گا یہ لیکن وطن کے ذرہ ذرہ میں ؎ رہیں گی اس کی کرنیں حشر تک گرمِ ضیاباری
پیامِ آخریں! اے سرفروشِ مشہدِ ملت ؎ سلامِ آخریں! اے سرفرازِ رحمتِ باری
وداع اے ساکنِ "دارالسلام" اے عازمِ جنت ؎ فراق اے طالعِ ہندوستان عہدِ بیداری

تھیں اس دور میں سب چارہ سازِ درد ملت تھے
تھیں اس عہد میں نازِ وطن تھے، فخرِ امت تھے

[1] جامعہ ملیہ۔

شمالی ہندوستان کے دیہات کی زبان

کچھ عرصے سے ہندوستان کا کوئی اخبار یا رسالہ، دفتر یا دکان، کالج یا مدرسہ ایسا نہیں جہاں یہ گفتگو نہ ہو " ہماری اصلی زبان تو ہندی ہے اور مسلمانوں نے ناحق اُردو اُردو کا شور مچا رکھا ہے " یا یہ کہ " ہندوستان " کی زبان سوائے اُردو کے دوسری نہیں ہو سکتی کیونکہ صرف اسی میں مشترکہ زبان (لنگا فرینکا) کہلانے کی تمام خصوصیتیں اور صلاحیتیں موجود ہیں " وغیرہ وغیرہ جب سے گائے کی قربانی اور مسجدوں کے سامنے باجے بجنے کے سوالات مدہم ہوئے ہیں۔ ہمارے ملک کے سارے نوجوان پہلوانوں اور سیاسی لڑنت کے چالاک استادوں نے اپنا اکھاڑہ اس نئے میدان میں لا جمایا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اس نئے اکھاڑے میں وہ داؤں گیر بھی خم ٹھونک کر اترنا شروع ہو گئے ہیں۔ جو پہلے دنگلوں میں صرف آنکھ کے اشاروں سے کام لیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے ان کی بھگتی قابلِ مثال تھی، بات بات پر وہ اتحاد، اتحاد، کے نعرے لگاتے تھے، اور فرقہ دارانہ ذہنیت رکھنے والوں پر آوازے کستے تھے ــــ جب اُردو ہندی کا سوال پیدا ہوا، تو ابتداً اس کو کوئی سیاسی سوال نہیں سمجھا گیا تھا۔ ہر شخص اس کو ایک ضروری لسانی مسئلے سے زیادہ اہمیت نہ دیتا تھا۔ گر اندر ہی اندر چھریاں چل رہی تھیں مگر کسی نے اس کو وہ نہیں سمجھا جو آج ہر شخص سمجھ رہا ہے، اور اس کے وجوہ بھی ہیں، کہ اس کو وہی سمجھا جائے۔

دعویٰ یہ کیا جاتا ہے کہ ہندی ملکی زبان ہے۔ درست۔ مگر جب یہ سوال کیا جاتا ہے، کہ وہ زبان جو ہندو ادیب اختیار کرتے جا رہے ہیں، کس حصہ ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے ؟ تو جواب ملتا ہے کہ صوبہ آگرہ اور صوبہ متوسط کے ایک حصے اور جنوبی پنجاب میں۔ بہت خوب، چلئے یوں ہی سہی۔ لیکن اگر یہ سوال کر لیا جائے، کہ کیوں صاحب اُردو ہندوستان کے کس صوبہ میں نہیں سمجھی جاتی ؟، کتنے مدراسی، بنگالی، بہاری، گجراتی، مرہٹے، پنجابی اور سرحدی ہیں، جو اپنی مقامی زبان کے علاوہ اُردو سمجھتے ہیں اور بولتے ہیں، اور اسی طرح کتنے ہیں جو ہندی سمجھتے اور بولتے ہیں ؟ تو اس سوال کے جواب

میں یا تو جانبدارانہ کج بحثی کی جائے گی، یا دانش مندی سے گفتگو کا رُخ ہی بدل دیا جائے گا۔ اسی طرح اگر یہی سوال کیا جائے۔ کہ صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ، جنوبی پنجاب اور صوبہ متوسط کے ذکر شدہ حصے میں جتنے ہندی زبان کے ادیب ہیں، جب وہ بات کرتے ہیں، تو کس زبان میں کرتے ہیں؟ اور گھر بیٹھے ہیں تو وہ زبان کونسی ہوتی ہے؟ تو اس کے جواب میں بھی آپ کو پچھلا تجربہ دوہرانا پڑے گا کیونکہ اُردو کا تو نام لینا ہی مہا پاپ ہے۔

اُردو زبان کو مٹانے کا جذبہ جن اصحاب کے دلوں میں موجزن ہے۔ اُن کو اقسام ذیل میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

۱۔ وہ سیاسی متعصب ہندو، جو کھلے بندوں اُردو کو اسلامی زبان سمجھ کر اس کو ہندوستان سے خارج کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس "خدمت" کو وہ اس لئے مستحسن سمجھتے ہیں۔ کہ اُن کے خیال میں اُردو کی جگہ "ہندی" زبان کے اختیار کرنے سے مسلمان، ہندو تہذیب و معاشرت، اور آخر کار مذہب اختیار کر کے ان میں مدغم ہو جائیں گے۔

۲۔ وہ، جو مسلمانوں کی نام نہاد "بین الاقوامی" حیثیت سے خوفزدہ ہیں۔ اور چاہتے ہیں۔ کہ اُن کا تمدنی اور مذہبی تعلق اسلامی دنیا سے قطع ہو جائے جس سے وہ مجبور ہو کر بقول اُن کے "خالص ہندوستانی" بن جائیں۔ یہ گروہ اُردو زبان کی متعصبانہ مذمت تو نہیں کرتا۔ مگر اردو رسم الخط کی خامیوں اور عربی و فارسی الفاظ اور ترکیبوں کے استعمال کو قابلِ اعتراض قرار دیتا ہے۔ اُردو ادیبوں کے ساتھ مل کر ایک طرف تو مصلحین کے گروہ کے قائم کرنے کا پرچار کرتا ہے۔ اور دوسری طرف کھلے بندوں ہندی سمیلن قائم کرتا ہے۔ اگر کسی صوبے میں فارسی زبان کی تعلیم ابتدائی بالکل نصاب تعلیم سے خارج کر دی جائے، تو اسے جائز قرار دے سکتا ہے۔ اور اُردو کے خارج کئے جانے کی کوششوں کو بھی غیر مستحسن قرار نہیں دیتا۔ ہاں اگر صوبہ سرحد میں (جہاں ہندی یا گورمکھی کا نام و نشان نہیں ہے) ہندی یا گورمکھی کے رواج دیئے جانے کو روکا جائے، تو اس کے خلاف شدت سے آواز بلند کرتا ہے۔ مسلمانوں کو وہ مشورہ دیتا ہے، کہ "میاں تم مکے و مدینے کا ذکر اپنے مضامین میں کیوں کرتے ہو، ترکی و شام

کے مناظر کی طرف کیوں نظر اٹھا کر دیکھتے ہو۔ گنگا جمنا کے کناروں اور کشمیر کی وادیوں کے دلفریب نظارے کیا تمہارے لئے کافی نہیں ؟"۔ تم اپنے استعاروں، تشبیہوں اور تمثیلوں میں موسیٰؑ عیسیٰؑ، علیؓ وحسینؓ قیس و لیلیٰ، شیریں و فرہاد، جیسے غیر ہندی کرداروں کو کیوں پیش کرتے ہو۔ جبکہ رام، لکشمن، سیتا، کرشن، اور بھرت جیسے کردار موجود ہیں" یہ سب باتیں وہ لوگ کہتے ہیں۔ جو یہ بھی جانتے ہیں، کہ اُردو ادیب خالص ہندو کرداروں سے بھی بے پرواہی نہیں برتا کرتے ہیں۔

غرض یہ "احمقانہ" یا "حکیمانہ" فضا ہندوستان پر آج کل طاری ہے، جس میں سے ہم خوشی یا ناخوشی سے گزر رہے ہیں زبان کے متعلق یہ جرح و قدح چونکہ نیک نیتی اور انصاف پسندی پر مبنی نہیں ہے اس لئے کتنی ہی معقول دلیلیں کیوں نہ پیش کی جائیں وہ سب بے اثر رہیں گی۔ لیکن پھر بھی جھوٹے کو اس کے گھر تک پہنچا دینے کے لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحقیقات کی جائے کہ ہندی جس زبان کو کہا جارہا ہے وہ کہاں بولی جاتی ہے یقیناً ہمارے اس دعویٰ پر ہندی زبان کے کسی ایماندار وکیل کو اعتراض نہ ہوگا کہ صوبہ جات آگرہ و اودھ، جنوبی پنجاب اور صوبہ متوسط کے ایک حصہ کے شہروں میں جو زبان بے تکلفی کے ساتھ بولی اور لکھی جاتی ہے اسے آج کل کی ادق کتابی ہندی سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ وہ صاف اور آسان اُردو یا ہندوستانی ہے۔ اس لئے شہروں کی زبان پر بحث کرنے کی بجائے یہ دیکھنا چاہئے کہ اس علاقے کے دیہات کی زبان کیا ہے اور یہ کہ دیہات اور قصبات کے لوگ جو زبان بولتے ہیں۔ اس زبان میں اور شہری لوگوں کی بول چال، تقریر و تحریر میں وہ کون سے الفاظ، استعارے اور تشبیہیں ہیں جن سے دیہاتی زبان بالکل جداگانہ زبان بن کر اُردو کی بجائے ہندی کہلا سکتی ہے۔

جب یہ تحقیق مقصود ہے کہ مذکورہ حصص ملک کے دیہات میں کیا زبان بولی جاتی ہے۔ تو ہم لامحالہ ملک کے ان حصوں کے گیتوں، منظوم قصوں اور شعرا کے کلام کو تلاش کریں گے کیونکہ اس کے سوائے دوسرا کوئی طریقہ زبان کے متعلق جانچ کا نہیں ہو سکتا۔

ان صوبجات میں متعدد منظوم قصے ساگوں اور گیتوں کی صورت میں مروج ہیں۔ جن میں سے حسب

ذیل بہت مشہور ہیں، اور ان ہی کا بیان تذکرہ فی الحال کیا جاتا ہے۔

آلہا۔ پورن بھگت۔ ڈھولا دھاڑی۔ چھیل بھٹیاری۔ ہیر رانجھا۔ بھگت پہلاد۔ نل دمنتی۔ لیلیٰ مجنوں۔ نوٹنکی وغیرہ۔

مذکورہ بالا منظوم قصص عموماً سو سال کے اندر کے ہیں۔ اور اگر ان میں سے کوئی نظم پرانی بھی ہے۔ تو وہ بھی بعد کے زمانے کے گویّوں کے روزمرہ کے اثرات سے بدل کر بالکل آج کل کی زبان میں ڈھل چکی ہے ـــــ ان قصص کی زبان میں صرف تلفظ کا فرق غور کرنے سے معلوم ہوگا۔ گو بظاہر لفظ کچھ اور ہی معلوم ہوتا ہے لیکن وہ کوئی دوسرا لفظ نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک جگہ "پانی" بولا جاتا ہے اور دوسرے علاقے میں "پونی" بولا جا رہا ہے۔ اسی طرح "ہے" کو "ہے" بولتے ہیں مگر یہ صرف تلفظ کا فرق ہے۔ اس لئے ان اقتباسات کے مطالعہ کے وقت جو آگے ناظرین ملاحظہ فرمائیں گے اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

مذکورہ قصص آگرہ و دہلی، کے درمیانی علاقے، اور راجپوتانے و ہریانے و میوات میں رائج ہیں جن میں برج کا علاقہ بھی شامل ہے، جس کو ہندی زبان کا مولد قرار دیا جاتا ہے۔

آلہ یا آلہا

آلہا میں پرتھی راج کے زمانے کے بعض واقعات کو نظم کیا گیا۔ مسٹر ولال کو اس کا مصنف قرار دیا جاتا ہے۔ یہ مشہور پاکیزہ دیہاتی نظم اس قدر دیہات میں پسند کی جاتی ہے۔ کہ جب وہ کسی گاؤں میں گائی جاتی ہے تو آس پاس کے تمام دیہات کے بوڑھے، جوان، بچے تک اس کے سننے کے شوق میں کشاں کشاں چلے آتے ہیں۔ یہ نظم راجپوتانہ، صوبہ آگرہ و اودھ، و صوبہ متوسط، اور جنوبی پنجاب میں عام طور پر سنی جاتی ہے مندرجۂ ذیل اقتباس بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں:-

جسراج اور بچھراج کا حال

اب تم "ذکر" سنو ماہل کا جس نے "ظلم" دئیے کروائے

"دِل" میں پھول رہا آسدن سے چلی "معاف" لئی کروائے
"قلعے" بنائے چندیلے نے جس میں سب کو دیا بسلائے
"خبر" پہنچ گئی جب ماہل کو وہ محلے میں پہنچا آئے
دیکھ سجاوٹ گڑھ محلے کی ماہل کال برن ہو جائے
"اگر"[1] "قلعے" بنے محلے میں چندیلے نے لئے بنائے
"شعلہ" بھڑک اٹھا ماہل کے آگ لگی "بدن" میں جائے
"غصہ" کھا کر چلا وہاں سے اور محل میں پہنچا آئے

کڑیا کا محلے پر چل کر آنا

نیلی گھوڑی کو سجوا کر اس پر چڑھا ہٹیلا رائے
کری "تیاری" گڑھ اور محل سے مانڈو کو دیا کوچ کرائے
ایک رات "دن" کی "منزل" میں "داخل" ہوا وہاں پر جائے
لگی کچہری جہاں راجہ کی واں پر ماہل پہنچ آئے
سنگاسن پر جا بیٹھا راجہ گڑھ مانڈو کا رائے
سامنے بیٹھا ہے "کری" پر جس کا نام کڑنگا رائے
اک گدی پر سورج بیٹھا لوہڑ اور انوپی رائے
چاروں بیٹے ہیں جچنے کے جو دھا ایک سے ایک سوائے
جہاں سنگاسن تھا راجہ کا "داخل" ہوا ہٹیلا رائے
کری بندگی جب ماہل نے راجے گیا سیس چڑھائے

---

[1] اژدر

"نظر" گھوم گئی جب کڑیا کی سامنے ماہل پڑا دکھائے
آؤ چودھری اور سبھی والے کہنے لگا کڑنگا رائے
"کرسی" ڈالدی مہلیا کو بیڑا دیا پان کا لائے
بولا کڑیا جب للکارا اب تم سن لو مہلیا رائے
بہت "دنوں" میں تم آئے ہو ہم کو "حال" دیو بتلائے
کہو "حقیقت" "گڑھ مجنے" کی کیسے رہے چندیلا رائے
تم نے کہدیا تھا گنگا پر ہم مجنے میں پہنچے جائے
بہت "سپاہی" مرے ہمارے اور وہاں ہار لاکھیں لائے
بڑے لڑیا وہ پانچوں تھے چھتری گھوڑوں کے "اسوار"[۵۱]
جو نا ہوتے مہا نک پر چھوڑتا نہیں نولکھا ہار
لوٹ کرالیا مجنے کی اور راجہ کو دیتا مار
جتن بتادو اب "جلدی" سے کیسے ملے نولکھا ہار
اس پر "جواب" دیا ماہل نے راجہ مانڈو کے "سردار"
جو تم چاہو ہار نولکھا "لشکر" "جلدی" "کرو" تیار"
کرو "تیاری" "تم" "جلدی" سے اپنا "لشکر" لیو سجوائے
ایسا جتن تمہیں بتلاؤں سارا "کام" "فتح" ہو جائے
بہت دنوں کا "عرصہ" ہو گیا بوڑھے ہوئے بناپھل رائے
"قلعے" بنا کر چندیلے نے سب کو مارا دیا بسائے
ایسا "وکت"[۵۲] نہیں ملنے کا کڑیا اس کو کان لگائے

---

۵۱ سوار　　۵۲ وقت

آدھی رات کو چھاپہ مارو "قلعہ" جھپاو ٹ گھیر و جائے

اس اقتباس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس نہایت مقبول اور مشہور نظم کی زبان کیا ہے۔ ظلم
دل۔ قلعہ خبر۔ شعلہ۔ ازور۔ عصہ بدن۔ تیار۔ مرل۔ داخل۔ نظر۔ کرسی۔ حال حقیقت سپاہی
سوار۔ جواب۔ جلدی۔ لشکر فتح۔ وقت۔ ۲۱ الفاظ فارسی و عربی کے ۱۰ اشعار میں آئے ہیں۔ اور ان
میں سے بعض الفاظ کئی کئی دفعہ آئے ہیں۔ ان کے علاوہ اور سینکڑوں خالص عربی فارسی کے الفاظ
ملتے ہیں۔ اور بعض جگہ مصرعے کے مصرعے اور پورے اشعار تک انہی لفظوں سے بنائے گئے ہیں مثلاً

"حکم سنایا سرداروں کو لشکر جلد کر دو تیار"

"جو کچھ ہاتھ لگا کر ڈیا کے لاد لیا سارا سامان
یمسدی، گلاس، مادلے، کمخواب، اور ریشمی تھان

"بس عمر رسے زندگانی کا جنے نکل جائے کب جاں"

"حکم دیا سرداروں کو لشکر جلدی لو سجوائے
توپ، سدوق، رفل، رہکلا سٹرکوں پر دوڑ جھولائے"

"امرا سر چڑھے ہاتھی پر اور گھوڑوں پر چڑھے سوار"

"گمٹ بندھ گیا رہیوتوں کا کا وہ دیتے پھرس سوار
پیدل پلٹن اور رسالے آگے چلے جیسے ٹڈی بردار"

"ہاتھی بندھ گئے، گھوڑے بندھ گئے، سب نے کھول دھرے ہتھیار
چاروں طرف کو لشکر پڑ گیا، پیدل، پلٹن اور سوار"

مذکورہ بالا اقتباس مثال کے طور پر آلہا کی صرف ایک داستان کے ۵۰ ابتدائی اشعار میں سے دیے گئے ہیں۔ ساری نظم اسی انداز اور اسی زبان میں ہے۔ ذرا تلاش تو کیجئے کہ ان اشعار میں کتنے لفظ ہیں جن کو اُردو ادیب استعمال نہیں کرتے ہیں۔

ست ساگر

یعنی

پورن بھگت کے قصے کا پہلا حصہ

ست ساگر نامی سانگ میں پورن بھگت کے قصے کو بیان کیا گیا ہے۔ پورن بھگت نہایت مشہور ہندو کردار ہے۔ اس سانگ کو برج کے علاقے اور اس کے متصل علاقے کے دیہات میں ہر چھوٹا بڑا بہت اشتیاق سے دیکھتا ہے۔ جب سانگیوں کی ٹولی ایک گاؤں سے دوسرے دور و دراز فاصلے کے گاؤں میں جاتی ہے، تو بہت سے شوقین مکرر سانگ دیکھنے کے شوق میں اس طویل فاصلے کو طے کرنے کے لئے سانگیوں کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہیں، مصنف چھدا لال ساکن موضع بروبی ہے۔ جسے "برج باسی" کہنا ہی زیادہ موزوں ہے۔ سانگوں میں مصنفین غزلیں بھی لکھتے ہیں جن کے لئے وہ "بحرِ طویل" اور "قوالی" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں "قوالی" سے مراد چھوٹی بحر کی غزل سے ہوتی ہے۔ اور "بحر طویل" سے ہر وہ بحر مراد لی گئی ہے۔ جو ذرا بھی چھوٹی سے بڑھ جائے۔ الفاظ "قوالی" و "بحر طویل" دونوں قابل غور ہیں۔ تمام سانگ سوال جواب میں ہی ہوتا ہے کہیں کہیں مصنف

رای کے بیان کو "رنگا جایا کا جواب" لکھتا ہے۔ ناظرین کے ملاحظے کے لئے "رت ساگر" کے جستہ جستہ اقتباس پیش کئے جاتے ہیں :۔

قصے کو شروع کرتے وقت سرخی دی گئی ہے " آغاز داستان " اور پھر نظم یوں شروع ہوتی ہے :۔

دوہا

سخن جن یہ " داستان " نیت دھرم سے " پور "[۱]
بست ملک پنجاب اک " دنیا " میں " مشہور "

چوبولہ[۲]

" دنیا " میں " مشہور " " حسن " کی جہاں " یکتائی " ہے ۔ دیکھ " نور " " شرمندہ " " حوروں " نے " قسم " کھائی ہے
ہیں پانچ " دریاؤ "[۳] کیا الیشور کی پربھوتائی ہے ۔ سیالکوٹ کی چھوٹی سی راجدھانی جہاں کھائی ہے

قوالی

شنک بیت هند میں " ظاہر " بیان اس کا سناتا ہوں ۔ پریم " استاد " اپنے کو " دمبدم " " سر " جھکاتا ہوں
حتی بر ہم چری ' پورنل زیت کے ایک لڑکا تھا ۔ نیت دھرم میں پورت جین کا نیک لڑکا تھا
ایک دن کسم نگری سے بیر آیا سوسر کا ۔ حلیں کا " قصد " زیت کینا " ہرص "[۴] چھایا سوبر کا

دوڑ

ستن ۔ بھوش ' بھرے تن ' شنک بیت خوش ہو من میں ' زیت " محل " میں آئے
دکھ سحا وٹ رالی استاد کو ی یوں سنائے

---

۱ پُر
۲ چوبولہ یعنی چار " بول " چار مصرع
۳ دریا
۴ حرص

قصے کی ابتدا یوں کی گئی ہے۔ کہ ایک ملک تھا پنجاب جہاں کی راجدھانی سیالکوٹ تھی جس کے باشندوں کا "حسن" "حوروں" کو "شرمندہ" کرتا تھا۔ راجہ کا نام نریت تھا اور رانی کا اسپا دیوی راجہ صاحب کو خاصی عمر کے تھے، ان کے ایک کنوارا، نیک لڑکا پورن بھی تھا۔ مگر تھے ہوس پرست، کسم نگری سے خط آیا کہ وہاں کی راجکماری کا سوئمبر ہے۔ راجہ صاحب بن سنور کر "محل" میں آئے۔ آگے چل کر شاعر کہتا ہے۔ کہ رانی نے کہا "مہاراج کدھر چلے" "نوشہ" بن کر "نوجوان" بن کر "جہاں پناہ" "عجب" "ادا" سے آپ سجے بنے ہیں۔ کیا ارادہ ہے "خاکسار" رانی سے "مہربانی" سے دل کا "حال فرماؤ"۔ راجہ صاحب نے کہا کہ رانی پھولندے کا سوئمبر ہے جس سے دل کو "بے قراری" ہے، چھتری کئی شادیاں کر سکتے ہیں، اسی لئے اس سوئمبر میں جانے کی "تیاری" ہے۔
اب رانی سمجھاتی ہے کہ مہاراج آپ کی عمر شادی کے قابل اب نہیں ہے۔ اور راجہ صاحب رانی کا مشورہ قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں۔

جواب راجہ کا

دوہا

سن لی تیری کہانی لس چپ رکھ "زبان" - لائیں رانی دوسری "دل" میں ٹھانی ٹھان

چوبولہ

دل میں ٹھانی ٹھان رنگ تو اپنا لگی جمانے - کا کرتا کی آج "نصیحت" ہم کو لگی سنانے
باتیں لگی بنانے مجھے کیوں "غصہ" لگی دلانے - چل ہٹ "بیوی" مو کو تو بوڑھا لگی بتانے

دوڑ

بجاوے کیوں گالن کو، نہ مانو تیرے بچن کو، سنی ہے تیری بانی، "شاہوں" کا "سرتاج" بنوں بیاہوں پھولندے رانی۔

جواب رانی کا

بالو بالو پان پت، نج پیاری کی کہن - پھر پچھتاؤ گے، ملے نہ پل بھر چین

تمہیں لازم سوچ سمجھ کر جانا پیا ۔

آپ کی "عمر" کیا ہے "خیال" تو بستر پر کرو ۔ رہی تمھارے دو جا پیاہ بہ نہ کار کرو

کلیجہ کشادہ رہ گئی "جان پناہ" بچا کر کرو ۔ "معصیت" ہو گئی سسار میں "اعتبار" کرو

ذرا سوچو پڑا ہے "زمانہ" پیا ۔ تمہیں لازم سوچ سمجھ کر جانا پیا

"جاہ" کرتے ہو کسی سیاہ کی تو تاب نہیں ۔ "وصل" کی "لذتیں" تو ہم میں بے خطا نہیں

"خوبی" ڈھل گئی تن میں رہی کچھ تاب نہیں ۔ "ستم" "افسوس" ہے ہر چند یہ بتاؤں میں

بھول جاؤ گے "عشرت" اڑایا پیا ۔ تمہیں لازم سوچ سمجھ کر جانا پیا

چھوڑو "خام خیالی" "مستی" یہ "سطو" کرو ۔ محو سری رام کو سدیچ سمجھی دور کرو

"مہربانی" "خدا" کی "غور" تو "حضور" کرو ۔ بنی ہے بات "طور" "آپ" دور کرو

"خیال" چاہیے بڑھاپے کا لانا پیا ۔ تمہیں لازم سوچ سمجھ کر جانا پیا

ایک "فرزند" مثل "چندر کما" "درکار" رہی ۔ لے دس "کوک کی" "بجراب" تمھاری رہی

"خدا" کو دھیان رہے نہ کچھ "سنسار" رہی ۔ "جاگی" "عمر" کی ہیں پیا بڑھوار رہی

بھاری "رنج و غم" ہو گا اٹھانا پیا ۔ تمہیں لازم سوچ سمجھ کر جانا پیا

دوڑ

پیادہ "جوان" آوے ۔ سینگ پر تمھیں کھلا دے ۔ "شان" "ریتی" گھٹ جاوے

"خاندان" "سلطانی" "یتیم" خاک میں ملا دے

آگے رنگا چار (راوی) بیان کرتا ہے کہ رانی نے "ہر چند" سمجھایا۔ مگر راجہ صاحب نہ مانے اور سوئمبر جانا "پسند" کرکے مع "لشکر" روانہ ہوگئے۔ اور سیالکوٹ کے "سلطان" سوئمبر پہنچ گئے راجہ پھول چکر نے خوب "خاطرداری" کی۔ سوئمبر میں فیصلہ راجہ سیالکوٹ کے حق میں ہوا۔ اور وہ مع رانی پھولندے اپنی راجدھانی میں آئے۔ جس وقت نئی رانی کی ڈولی "محل" کے دروازے پر پہنچی۔ تو نئی رانی نے راجہ سے جھنجلا کر کہا۔

جواب پھولندے کا

دوہا

"جلد" نکالو سوت کو "محلوں" سے بھرتار
بے جائے دو جے "محل" ذرا نہ کرے اتار[1]

چوبولہ

ذرا نہ کرے اتار، "قدم" "محلن" میں کبھی دھرونگی۔ ڈولی سے جبھی اتروں جو کہیں کرا سب لوں گی
دیکھ سوت کو جلے "بدن" کیسے "دل" "صبر" کرونگی۔ سدا کرے گی راڑ سوت میں کہاں تک یہی دوں گی

دوڑ

"گذر" نا ہوے سری۔ کروں "حسن[2]" کی ڈھیری۔ سوت ہر "وقت" ستادے
رہنا پاس سوت کے میری سمجھ نہ آوے

رنگا چار کہتا ہے۔ کہ اس پر راجہ نے اپنی بڑی رانی سے کہا، کہ جو کچھ تم نے کہا تھا وہی آگے آیا، دوسرا "محل" کھلوا کر جا رہو "دیر" مت کرو۔ اس نے جواب دیا اے پران ناتھ جو کچھ آپ "حکم" دیں گے وہی میں "منظور" کروں گی۔ میرا کیا "مقدور" کہ "محل" خالی نہ کروں۔ چنانچہ اماد یوی نے فوراً وہ

---

[1] اتار۔ تاخیر
[2] بخت۔ نصیب

محل خالی کر دیا ۔ اور پھولندے رانی محل میں آباد ہوئی پھولندے شباب سے مست ہو رہی تھی راجہ صاحب کی "جوانی" ڈھل چکی تھی ۔ راجہ صاحب امورِ سلطنت میں مصروف رہتے، اور جوبن میں چور رانی اپنے دل سے یہ باتیں کیا کرتی ۔

پھولندے کا بچپار کرنا

دوہا

موتن ۔ جوبن، چور ہے پریتم کا یہ "حال" ۔ "طاقت" "بے باقی" ہوئی کو رکھ ٹھن گوپال

ٹھمری

مرنا بوڑھے جو بنا میں آئی "بہار" ۔ رات ٹھسش ' دل' موکو کرے کام" بیدار"
سیاں کو دیکھو، دشا، تو ہلتی نار جی ۔ بھر تار بوڑھے جو بنا میں آئی بہار

"مرف" ہنسلی" باقی" بیٹھ گئے" رجھار" ۔ حسن گلستاں" ادھر پھول رہی پھلوار جی
بھرتا بوڑھے جو بنا میں آئی بہار
اس ڈگرا کے بھوگ مٹے نہ" ولی عیار" ۔ ملے" مہ جبیں" "ناہرہ" "قطعدار" "دلدار" جی
بھرتا بوڑھے جو بنا میں آئی بہار
"رنج" جب ہی" غم" ہو ملے" سار" بیں ساز" ۔ مروں کنواری کھا کے گل" ہے" زندگانی خوار" جی
بھرتا بوڑھے جو بنا میں آئی بہار

دوہڑ

کروں کیسے کت جاؤں' کوں بدھ میں سمجھاؤں' "تمنّا" ہوئی نہ " حاصل"
کنتھ ہمارے ڈھیلے ڈھالے لدنے ہی کے "قابل"

---

۵ ماریا ناڑ ۔ گردن ۲ ڈگر ۔ راستہ

اب راوی ایک رات کا واقعہ اس طرح بیان کرتا ہے

جواب رنگا چمار کا

دوہا

رانی کو "سشٹش[ل] پنچ" یہ بگڑے ہوئے "حضور" - پھولندے ات ہوری مدن "جوش" میں چور

چولولہ

مدن "ہوش" میں چور "رانی" ہتی رہی نہ "قراری" - ایک دن پھولندے تمہاری اپنی حیتر ساری
پورن ل کی جائے رہی "گلشن" کو "سواری" - دیکھ ہوئی "مشتاق" "عشق" کی کھائی "جگر" "کٹاری"

کڑا

پیارے جی جوبن حل کے مچھری سیکل سیدم - جورانی کی وشا ہوئی کہی نہ جاتی
یہ کہی حالت جو ہوگیا "حال" پھولندے رانی کا - عجب "دار" "حسن" ہے "لاجواب" دیکھا نہیں اسکی "ثانی" کا

دوڑ

"نور" سانچے میں ڈھالا "عشق" کا کھایا بھالا "حسن" لاکھوں میں "اعلیٰ" - "قد" رانی کا "بلند بالا"
"بدن" "گا ہوش" ھلایا - دیکھ وشا پھولندے کی باندی نے ایسا سخن سنایا

جواب باندی کا پھولندے سے

"نظر" اٹھاکر کدھر دیکھ رہیں "سرکار" - کیوں دنیا "س بدن" کا "ہوش" "حواس" لسار

چولولہ

"ہوش حواس" بسار "کیفیت" "دل" کی کہئے ساری - کس "غم" میں "مبتلا" "جان" میں سہو "مصیبت" "بھاری"
لگی ٹکٹکی کھڑی "مثال بت" کس لو میں پیاری - ہوتی ہو "مضطرب" "مہرباں" کیوں ماہوے "قراری"

دوڑ

"فکر" تم کو "کمال" ہے ناجاؤں کیا "حال" ہے سستی بتلانا چاہئیے
"خدمت گار" "خادمہ" سے تو نہیں چھپانا چاہئیے

[ل] سشٹش وپنچ

ذرا اس سانگ کی زبان، طرز ادا، بندش، فارسی ترکیبیں ملاحظہ کیجئے یہ وہ زبان ہے جس کو برج اور دوسرے علاقوں میں بولا، لکھا اور سمجھا جاتا ہے۔ میں نے اقتباس بہت اختصار سے دیا ہے ورنہ سارا سانگ اس زبان میں لکھا گیا ہے۔

ایک اور شخص رام لال ہے جو نواح دہلی کے دیہات کا آدمی ہے۔ پورن بھگت کا سانگ لکھا ہے۔ ذرا اس کا نمونہ بھی ملاحظہ کیجئے، مگر یہ خیال رہنا چاہیئے، کہ یہ شاعر برج کا رہنے والا نہیں ہے۔ اور اس کی زبان پر حصار و رہتک کے زبان کا اثر ہے۔ قسم وار نمونے نقل کئے جاتے ہیں۔

(نمونہ) چھند

سخال جی کا ہو "بلا شک" "دوستی" "ناداں" کی ۔ "کم عقل" اوچھی "نسل" میری بھی "عقل" "حیران" کی
صحبت" "ترلفوں" کی سی" دانستور" سا کچھ دکھلائیگا ۔ "لیکن" "تم تاثیر" "اور" "واقی" "اثر" کہاں جائیگا
مک بک ہو کر بس بیٹھ جا، جب ٹھانی تحت ٹھانوں میں، جاؤنگا میں جاؤنگا میں جاؤں گا مانو نہیں

(نمونہ) بحر طویل

اری رانی یہ راجہ نے ادھرم کیا۔ چڑھایا جو سولی پہ ایسا پسر
لے پوتی سے میں پھر سپوتی کروں، میں جلادوں آگ کیوں کرے دکھ فکر
جاکے چہرے پہ کرکے نظر لاش کو ڈال جھکی عصمت کی گرد کو سر
کہیں، زندہ کنور کیا، زندہ لیلے گودی میں رانی ہوا یہ امر

(نمونہ) راگنی

سیرالیورل کس نے مارا، ترا جلا کرے بھگوان ۔ ہاتھ پیر کٹوا دیئے، وہ پڑا کوئیں میں آن
پتر عیسو یا "دغا" کری، کیا ئیں "دلیں" ٹھان ۔ میرے "دل" کو سوگ ہوا، میں نے آندلیشا جان

(نمونہ) دوہا چبولہ

دوشش برا کچھ نا، کیا تو ہوئی مست ہیں
ست بادی پتر میرا، آتا نہیں "یقین"

آتا نہیں "یقین" تُو تو پاپن کہلاتی - نہیں تجھ سی "بے حیا" میری تُو تو پھونکے چھاتی
جا ڈوب کیوں نا مری، کیوں مُنہ دکھلالی - مجھ سے تے "دغا" کرے تیں ٹری "جلائی"

دولا دھاڑی

ایک سانگ دولا ڈاکو کا دیہات و قصبات میں اکثر کیا جاتا ہے۔ مصنف اس کے گھنشام داس ہودیو پرشاد سانسی کے رہنے والے ہیں۔ جو علاقہ رج میں واقع ہے۔

قصہ میں یہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ دلیپ سنگھ نامی جس نے دولا نام اختیار کر لیا تھا شاہ نورنگ کا (جو غالباً شاہ جہانی عہد کا کوئی پنجابی صوبے دار قصے سے معلوم ہوتا ہے) اس لئے دشمن ہو گیا تھا کہ نورنگ نے اس کے باپ کو جو ڈاکو تھا قتل کرا دیا تھا۔ رنگا چار اس قصے کو یوں بیان کرتا ہے:۔

جواب رنگا چار کا

دوہا

"کل" "ادنیٰ" اور "اعلیٰ" سنو یہ "مضمون" "جناب" - "دنیا" میں ہے "ظاہرہ" "ملک" اک پنجاب

چوبولہ

"ملک" ایک پنجاب کہوں وہاں کی ایک کہانی - "پیدا" ہوا "نر شیر" "دلاور" سیر بھٹ مانی
انہی دنوں "شاہ" نورنگ کی تھی "سلطانی" - اسی "ملک" میں ہی گڈھ صندل جھوٹی راجدھانی

قوالی

وہ دولا دھاڑوی وہاں پہ بیر بانکا تھا - "سپاہ" کچھ سنگ میں رہی لڑکا وہ "ادا" کا تھا
اور دہا نو گاؤں کی "باقی" نہ دیتا شاہ نورنگ کو - سدا "بے خوف" تھا "ڈر" "شاہ جہاں" کا تھا
"دعا" سے اسکے "والد" کو شاہ نے کر "فنا" دینا - سنی جب سے ہوا "دل" پہ "بہادر" کے سنا کا تھا
سونچتا تھا سدا اک کب بدلہ لیلوں والد کا - اسی "تشویش" میں ہر دم "دست حجر" "فنا" کا تھا

دوڑ

ولّی دل کا "حیال" تھا۔ بڑا بھاری "ملال" تھا۔ "شوک[1]" "والد" کا "جاری"
سنگھ دلیپ نے ماتا سے "عرج گذاری[2]"

جواب دھاڑی کا ماتا سے

دوہا

"عرج[3]" "برخوردار" کی سن میاں دھر دھیان ۔ "شہر" میں "در در" جائے کرنا ایک "بیان"

چوبولہ

سنا ایک "بیان" "جس" سے "جگر" جلاتا ہے ۔ ہر دم آوے "یاد" "یہ" "دل" "غم" "میں" "غوطہ" کھاتا ہے
اس "رنج" مجھے نہ کھانا پانی بھاتا ہے ۔ "والد" کے مرنا کا "حیال" جبھی مجھے آتا ہے

دوڑ

میرا "دل" بڑا گھبراتا ہے ۔ چڑھا "غم" کا "غبار" ہے۔ حال سب "معلوم" تجھکو
کا بدھ مارے گئے تات جبھی بتلا دے مجھکو

جواب ماتا کا دلیپ سنگھ سے

دوہا

میٹا تھو ہونا لاڈلے متی سنے "ناداں" ۔ بہکایا کس نے کنور میرے دل پران

چوبولہ

میرے جیول پران تجھے کیا "خواب" "نظر" آیا ۔ یا کوئی "دشمن" نے بیٹا تجھ کو بہکایا
ہوا کیوں "تنگیں" میرے کیوں من چل جاتا یا ۔ سوچ کر کیا نہیں "کام" وہی نرجھیا یا

---

[1] شوق
[2] عرض گزاری
[3] عرض

دوڑ

"خیال" حوتما یہ تیرا ، مان ست کہنا میرا۔ امر جگ میں کوئی نا ہے ۔
مرتے جیتے سدا سب ہی۔ ست سوچ تیرا برتھا ہے

لاونی بھی نمونہ دیکھنے کے قابل ہے

جواب رنگا چار

دوہا

لاتس پاس وہیں سکس بہو سنلائے ۔ کچھ "خیال" کر پدم سنگھ لیانوں کو ساتھ

لاونی

لیانوں کو ساتھ چلا " عرصہ " نہیں ذرا لگایا ہے
پدم سنگھ نے " شاہ " کو جھک کر" آداب بجایا ہے"
کھڑا سامنے کیا نوں کو پدم سنگھ بڑا " ہوشیار"
شاہ نورنگ سے عرض کرنے لگا " تیرا ہی گھر بار"
سمجھا بجھا" بادشاہ" کے " قدموں " پر دیا بھتیجا ڈال
یہ گت دیکھ " شاہ " نے لیانوں سنگھ کو پچکار
گودی بٹھال " شاہ" نے اسے دھیرج بندھایا ہے
پدم سنگھ نے شاہ کو جھک کر" آداب بجایا" ہے
پہنچہ وصرا سیس پر چھاتی سے لگا کر" پیار" کیا
" شاہ " سب " رنج و غم " " دل " کے " بیسار" کیا
کر"معاف" " قصور" اسے صندل گڑھ کا " سردار " کیا
دئی " اجارت" لاتس پہنکوا سب جھگڑا پار کیا

بھگت پہلاد

پہلاد بھگت کے قصے پر بھی بہت سے دیہاتی شاعروں نے سانگ لکھے ہیں ۔ ان میں سب سے زیادہ مقبول عام بھاکا سادا ہوا سانگ ہے ۔ جو ہاتھرس کے قریب کا رہنے والا ہے اس لئے اُسے " برج باشی " ہی کہنا چاہئے ۔ اس سانگ کا خاص انداز یہ ہے کہ کتھا کے " رنگا چار " (راوی) کا کام خود اپنے ذمّے لے لیا ہے ۔ جیسے وہ " جواب کب کا " لکھتا ہے " کب " " کوئی " یا " کویت " اور " کبیت " کا اختصار سمجھنا چاہئے ۔ چنانچہ پرمیشور کی حمد و ثنا کے بعد قصہ اس طرح شروع کرتا ہے ۔

جواب کب کا

دوہا

بسے " ملک " پنجاب میں " شہر " ایک ملتان ۔ یہیں ہرن کشیپ ریت ہوا بڑا بلوان

پھر آگے کہتا ہے کہ اس کا ایک بہت " ظالم " بھائی تھا جس کو انسانی روپ اختیار کرکے رام نے مار ڈالا ۔ جس کا اس کو بڑا صدمہ ہوا ۔ مگر اس نے بہت ریاضت کی ۔ جس پر خوش ہوکر شنکر جی آئے ۔ اور کہا کہ مانگ کیا مانگتا ہے ؟ اس پر اس نے کہا کہ مجھے وہ قوت عطا ہو ۔ کہ نہ کوئی " انسان " مجھے مار سکے ، اور نہ کوئی " جانور " ۔ اور نہ میں رات میں مروں اور نہ دن میں نہ زمیں میں نہ " آسمان " میں ۔ اور نہ کوئی ہتھیار مجھ پر اثر کر سکے ۔ آپ اپنا وعدہ " دل شاد " ہوکر پورا کیجئے اس کی مراد پوری ہوگئی ۔ اور جو مانگا وہ اُسے دیا گیا ۔ اس پر بہت " خوش " ہوکر اس نے " حکم " جاری کردیا کہ کوئی رام کا نام نہ لینے پائے ۔ جس سے سب کو " خوف " پیدا ہوگیا ۔ چنانچہ لوگوں نے " بالکل " رام کا نام لینا چھوڑ دیا ۔ اور جس نے حکم کی خلاف ورزی کی " فوراً " سولی پر چڑھا دیا گیا ۔ ایسی " سزا " سے سب پر " دہشت " چھا گئی ۔

ہر فرعونے راموسیٰ کے مصداق ، اس کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام پہلاد تھا ۔

ایک دن وہ لڑکا "شہر" میں گھومتا گھامتا ایک کمہاری کے آوے کے پاس جانکلا، جو رام کا نام بیچ رہی تھی۔ جس پر پہلاد کو "غصہ" آیا۔ تو اس نے کہا:-

جواب پہلاد کا

دوہا

کبوں ری پاگل کمہاری لے تو کس کا "نام"
"حر، یتا کو کریں ہو تیرا" کام تمام"

قوالی

بے خوف "ہو کے بس میں کس کو مار رہی ہے ۔ لے جان تیرے "سر پر اب "موت" بھاری ہے
"خاموش" "جلد" ہو جا اب جو "زندگانی" ۔ "والد" نے جا کہوں گا رس مجھ کو آ رہی ہے

ایک غزل بھی لکھی ہے جس کے چند شعر بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

"تا بہ حشر" بھولوں نہیں ماتا ترے" احسان" کو
"دانا" بنا دیا تنے بچپن میں مجھ ناداں کو
"بے خوف" رہ، ہر" طور" سے مت کرے کچھ بھی" فکر"
"طاقت" ہے یہ اب کون کی، جو لیلے تیری "جان" کو
اب رام پر" دل" "جان" سے" قربان" ماتا میں ہوا
دیدوں گا اپنی" جان" تک، چھوڑونگا نہیں اس ٹھان کو

اس شاعر نے مُقفّیٰ عبارت بھی لکھی ہے۔ جو" وارتا" کہلاتی ہے جس کو مثالاً درج کیا جاتا ہے:-

جواب ہرن کشیب کا

وارتا

گروجی کنور پہلاد کو کسی نے ایسا بہکایا ہے۔ کہ کچھ ٹھکانا نہیں۔ بالکل" باولہ بنایا ہے۔ تمن" کا" نام" لیتا ہے۔ سمجھانے پر ذرا دھیان نہیں دیتا ہے۔

جواب گرو کا

وارتا

اچھا راجن ابھی کنور کو لئے جاتا ہوں۔ آپ نہ گھبرائیے۔ "تسلی" لائیے بہت اچھی "طرح" کھائے اُسے سیدھے راستے پر لاتا ہوں۔

اس شاعر نے تھیٹر کی وضع کی بھی اپنے سانگ میں نقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے زمانے میں تھیٹروں کی مقبولیت نے اسے یہ رنگ اختیار کرنے کے لئے غالباً آمادہ کیا ہے۔

جواب گرو کا

تھیٹر ...... (یعنی بطرز تھیٹر)

پاجی "بے ایمان" "بدکار"، دونگا ابھی بہت میں مار، مجھکو مستی کرے "بے زار" ماں ماں ماں

جواب پہلاد کا

مجھکو "خوف" نہیں" زنہار"، دیکھو "خوف" سنبھل کر مار، رام کے اوپر میں بلہار سبرے یراں یراں یراں

جواب گرو کا

تیری تُن تُن کے "گفتار"، رس آتی ہے "بیشمار" ٹھانے مت" ناداں "گنوار" ایسی ٹھاں ٹھاں ٹھان

جواب پہلاد کا

میرے" تن کے ٹکڑے چار" ہوں پر رام نام پہ پیار، کرونگا "صحیح" مری "گفتار" لیجئے جان جان جاں

اس سانگ کا ایک دوہا اور نقل کرنے کو دل چاہتا ہے۔ جسے پڑھ کر شاید ناظرین حیران ہو جائیں گے

کہ دیہاتی اپنی بولی میں " نطفۂ حرام " بھی بولتے ہیں

دوہا

" پیدا " ہوا کپوت ، یہ پاتی " نطفۂ حرام " سمجھا یا مانے نہیں لے " دشمن " " کا " نام "

قصۂ نل ودمن

اس قصے کو علی بخش نامی نے جو ریاست الور کا رہنے والا معلوم ہوتا ہے۔ سانگ کی شکل میں منتقل کیا ہے۔ نل ودمن کا قصہ بیان کرنا چونکہ بعض مضمون سے بالکل تعلق نہیں رکھتا۔ اس لئے تھوڑا سا کلام کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے ، جو درج ذیل کیا جاتا ہے :-

جواب رانی کا

دوہا

کنتہ کشٹھن بارہ برس ' اور بِکھا کے " دُور " ، - سمن جھڑی بارہ گھڑی ، تم کر لو " منظور "

چوبولہ

سمن جھڑی بارہ گھڑی تم کر لو " منظور " - کہیں رہے کہیں او گھڑے ، یہ رسا کا " معمول "
مری اتاری " چوکھشی " پانی جھٹنا بھول - برس برس میری مادرا ، تو ' بیتک " پیمتی بھول
سکھی ساون آئے پھیر " محل " میں " ریتم " ڈوری گیر

جواب رنگا چمار

دوہا

اوٹ گھمڑ کے جھڑے ، ہیں زور گڑھ کی " خیر " - پر لو میں مل جائیگا جو رہے " ڈیڑھ " " پہیر "

چوبولہ

ہو گیا اورے اور نظر پھیر دیکھ پیو کی پیاری - پیچھے سے پانی چڑھا " محل " کی ڈوبن لگی اٹاری

سلہ مرکب فارسی لفظ چہار وہندی لفظ گھٹ ہے

رانی یہ پراشوت کے لگے میری "علق" "ڈوب گاساری" ۔ کرر کھا کو نہد، میں نے آندرپت اوٹ لئی ساری

میٹر

رانی سن میری "اراوش"[1] راجہ نل ہے نوکر "خاص"

دوہا

بکھاستیس یہ لے لیا، سے بدل گئی اور نہ سمایا دھرتی میں ہوا "طورلے طور"

چوبولہ

ہوا "طورلے طور" رانی کی "فوج" "گرگئی ساری ۔ مچی "ملک" میں اٹ، علق سب ڈوبے ماری ماری
کمول "خزانہ" دیکھتے جی راجہ کا بھنڈار ۔ کنچن ہوگئے کوئلہ تو نیری "قدرت" یہ ملہاری

میٹر

کرتا "قلم" کبھی بے طور جگت میں کوئی نہ سا اور

جواب راجہ کا

دوہا

کنچن ہوگئے کوئلہ، میری ہوگیا "جہاں" ۔ وہی لوٹ کر لے گیا جس کا گھمنڈ "گماں"

چوبولہ

جاجس کا گھمنڈ "گماں" انھوں نے لیی دھوم مچائی ٹگی کرکے رانی لوٹی "ایک" دیا نہیں آئی
دوست رانی چھوٹی میری آج تک نا پائی ۔ ایک رالی دموونی میں لے "شکل" سے دبکائی

میٹر

"جان" "قربان" کر دنگا، نہیں میں تجھے تحونگا۔ بشتیں یہ بیتا سہونگا

---

[1] عرضداشت

چوبولہ

رنگا شیش یہ لے لئی میرے چھٹ گئے "عیش آرام" - ایسی لوٹ مچی "محلن" میں ہوئی "فجر" سے "شام"
سب نوکر "دشمن" ہو گئے "نمک حرام" - یہ "چارجامہ" سچا تو س گھوڑے کس "کام"

میتر

کرتا "ظلم" کبھی بے طور جگت میں کوئی نہ تما ہو

لاونی کا نمونہ یہ ہے -

لاونی

جواب رانی کا

سن سن ری گجری بہنا، ہم تو دو ہو کے "مہان" چھاچھ تھوڑی سی دینا

گجری کا جواب

چل چل ری ہٹ تو کون کدھر سے آئی - مرے بچھڑے بدکے جائیں پرے ہٹ جائی

جواب رانی کا

ترے بچھڑے، بچھیا "سلامت" سائیں - ہم ترے دوار پہ چھاچھ مانگنے آئیں

جواب گجری کا

نہ ملے "مفت" میں چھاچھ اری تجھکو - میں نے "مطلب" کی بات کہی تجھکو

جواب رانی کا

تو کیا "مطلب" لالچ کی ماری لولی - میں نے ایسا دریہ لٹا دیا بھر بھر جھولی

جواب گجری کا

تو ٹری درب کی دھائی کہاں سے آئی - تجھے چھاچھ مانگتے ذرا "شرم" نہ آئی

جواب رانی کا

کہاں رہے "شرم" جب باپ پیٹ پکارے - ہو گئے دن سات ہمکو بھوک کے مارے

جواب گجری کا

کیوں بھوکی مرے ساتھ "مرد" ہے تیرے ۔ نت اُٹھ دیوؤں گی ٹوکر بھرے میرے
تو چیری چنچل نار، جیبھ کی کھوٹی ۔ تو "کسب" کما کر کھلا خصم کو روٹی

اس کتاب نل وستی کے سانگ کے ختم ہونے کے بعد دو ہولیاں مہاراجہ جے سنگھ والئے آلور کی شان میں لکھی ہوئی ملتی ہیں۔ جس میں سے ایک رامچند نے لکھی ہے اور دوسری رامچند اور رنجیت دو شاعروں کی لکھی ہوئی ہے جس کے اقتباس درج ذیل کئے جاتے ہیں:-

پہلی ہولی کا نمونہ

ٹیپ:- مہاراجہ جے سنگھ، آئی ہولی کی اُمنگ

---

(۱) سبرے "تیار" کرائے، رنگ بھر بھر ہوری
سب ایسں سے چوّن، بیچے گاؤں گاؤں میں سّمن کھیلیں چھتری، بنے "مّن"، بل بل ہولی

کرتن ریت تسحیر باصیں، گھر گھر بھاگ، مہاتم باص ۔ سرے گلی گلی میں باصیں سارے نرناری

نیم محلوں آسہ جاگ، گیانی گاویں گسار رہ راگ، ہولی کھیلن سولے بھاگ، ساری سرداری

رنگ کی "شکیں" بھریں پکھال، چلتے "تم تمے" "فی الحال" ماریں ڈھولچی تک تک گال، اور پچکاری

پیاپی ال طنگ اور وارو، رسّیے راگ گاویں مارو، ہولی کھیلت جیت جارو، کھلی "گل" کیاری

"عام خاص" ہو رہا "آباد"، "خواص" "کھیلے" خانہ زاد" کبیر کنہ کشوم گادتا آباد" اڑتے ہے پرداد

ہولی کھیلیں آپ "حضور" ، بجتے" تاشے" ، ترئی ، "تنبور" ٹھاریں توپیں اور جنور[۵۱] ، دیکھیں گوری

سمت ایس سے چون بھیجے گاؤں گاؤں میں تس کھیلیں چھتری ، بنیئے ، بمن ، پل پل ہوری

دوسری ہولی کا نمونہ

سری سجے سنگھ جی مہاراج ، ہونگے مادن گڈھ "سرتاج" ، ساجے سب ہولی کے "ساج"[۵۲]
"متلیں"[۵۳] ری ری
ہاتھی گھوڑے سب "پچرنگ"[۵۴] ہو رہا "شہر" میں ماج اور رنگ ، ہولی کھیلی سب کے سنگ
—— کیسر گبولی۔
جوتھے "دور" یا مے نیڑے جنمیں "جوان" بانکے ڈٹے ، "حکم" بیج بلوائے بیڈے ،
آئے حمٹ ، پٹ ——
نیکن[۵۵] نان اور ملیش ، آئی "محل" چوک میں بن ٹھن جنمیں "جوان" سارے اکمن ،
ٹھاکر ، بامن ، گوجر ، جٹ ،

---

۵۱ رنبور ، چھوٹی قسم کی قدیم توپ ،
۵۲ ساز
۵۳ جمع مشعل کی
۵۴ پچ رنگ
۵۵ سبکادر نائس ۹/۵ فوج کا نمبر ہے

ماسجے بجے "بے شمار ے" ہیں ماسٹری "ستارے" زیب کی پری
آگے آگے کپتان کرنل، "افسر کمرشے" ہیں دریں "بیلے کیپی" "شملاؔ" جرل
سب سے کمپنی ہے "سلام"۔

عشق مجنوں

مذکورہ بالا سانگ نل دمیتی کا آستاسس، راجپوتانے کے مسلمان کا ابھی آپ نے ملاحظہ کیا تھا لیکن اب ذرا اسحارام ماتھرس نواسی، برج کے ایک ہندو شاعر کا بنایا ہوا سانگ بھی ملاحظہ فرمایئے، جو اس نے ایک خالص عربی قصے کو سن کر لکھا ہے، ابتدا اس طرح کی گئی ہے:۔

دوہا

"قلم" نہ "ہرگز" لکھ سکے، "صفت" "عالم الغیب"
اے "قادر" اے "کبریا" "ذات" تری "بے عیب"

چوبولہ

تیرے تمام آسرا ترا "لیل و نہار" رہتا ہے۔ "گنہ گار" "بندوں" کا "ہردم" "مددگار" رہتا ہے
رہے نہیں تیرے حد بس کچھ "حروار" رہتا ہے۔ "حال" "نہاں" "لستر" کا تجھے "آشکار" رہتا ہے

بحر طویل

"رب المالک" ہے "عزت" "دو عالم" کا تو "آسماں" ہے ترا اور "زمیں" ہے تیری
کوئی آئی نہ وہ ہے "نظر" کے تلے "یہاں جب" تسے "میں" "قدرت" نہیں ہے تیری
دی دکھائی نہ "لیکن" "لعجب" ہے یہ "حُسن" کی "روشنی" "چارسو" ہے تیری
"جابجا" تو ہی تو ہے "جلوہ نما"، جلوہ نما، چھوہ رائی مٹے "پردہ شب" ہے تیری

سلہ صلاح

دوڑ

میں ہوں "بندہ" "ناداں" "خدا" ہو مجھ پر "شاداں" "عقل" دے اسناتا ہوں
"داستاں" "دلچسپ" سناتا ہوں لیلیٰ مجنوں کی۔

لیلیٰ مجنوں کا سارا قصہ جو ۱۸ صفحوں پر سانگ کی صورت میں تمام تر اسی زبان میں لکھا گیا ہے جو مستولہ، وسے اور جو بولے میں اختیار کی گئی ہے، اس لئے صرف شاعر کے آخری اشعار جو اس نے بطور راگنی اختتام قصہ کرتے ہوئے لکھے ہیں اور درج کئے جاتے ہیں:-

جواب کبٹ[1] کا

ایسے کہ، سانس عمری میں نے، کر کے لیلیٰ ہی لیلیٰ گیا ہے وہ مر
دونوں بیٹھے میں جا کر کے "ملک عدم" "عشق بازی" کا کر کے دکھایا "حشر"
"واہ واہ" "انسان" ہر ایک کرنے لگا، ہوا "تعریف" کا "زبان" پہ "ذکر"
"واسطے" "لیلیٰ مجنوں کے کھدوائی ہے" "مشورہ" کر کے لوگوں نے جھٹ اک "قبر"
پاس ہی پاس دونوں کو "دبا دیا" آ گئے لوگ سب لوٹ کر اپنے گھر
واہ واہ واہ واہ کر گئے "نام" "دنیا" میں دونوں امر۔
کیا "قصہ" "ختم" "روح تمھارا" "معاف" "کرنا" پڑے گر جو "غلطی" "بطر"
بس یہیں پہ "قلم" "روپ کر رک گئی۔ جے اٹل چھڑکی لوٹے" "کل" "بستر"

ڈونگی

ڈونگی کے قصے کے سانگ دو ہریانے (اضلاع رہتک، حصار، کرنال وغیرہ) کے شاعروں

---

[1] کبت: اصلی شاعر

لکھمی چند اور ٹیک چند نے علیحدہ علیحدہ لکھے ہیں۔ پہلے لکھمی چند کے بنائے ہوئے سانگ کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے:-

نونگی لکھمی چند

دوہا

اے ایشور سب کے دھنی، جگت رچاون ہار
مجھ مورکھ "ناچیز" کو دیجئے پار اتار

اپدیش

ٹیک:- بھارت کو کھودیا "ورن سنکار" میں کوئی کوئی "مانس" باقی "رہ گئے"

(۱) پیارتے "دغا" کمالے، سر لیے پاپ کا بھار اٹھالے، بیٹی کے روپیہ کھالے،
ناریت برتی بیاہے سے، بھارت کھودیا الخ

(۲) اوں سے بیاہ ہرسے "عقلمند" چاتر، ارے جس گھر کو سمدر یاتر،
پھر یاری کرلیں کی "خاطر" کرے "طراں طراں"[1] کی چلائی سے۔ بھارت کھودیا الخ

(۳) ماباپ کرن تے ڈرتے، "جگہ جگہ" کام کرلے پھرتے۔ "شرم" ناہین کی کرنے،
چاہے کوئی دادی تائی، کاکی سے بھارت کھودیا۔۔ الخ

قصہ کا آغاز اس طرح کرتا ہے:-

دوہا

سیالکوٹ کے بیچ میں ہوئے گئے سکھ سردار
دو پتر جس کے لاڈلے، چندر ماں کے اونہار

چوبولہ

چند ماں کے اونہار کرے تھے "خوب" کمائی۔ بڑے بھائی سوپ کی تھی "حورم" لگائی

---

[1] طرح طرح

پھول سنگھ چھوٹے کے نا سیا ہ سگائی ۔ بھاوج کے کہنے سے جا ٹونگی بیا ہی

کمتال

" مال " میں سبی سساؤں جی ۔ نار ٹونگی بسیا ہوں جی

دیا بھاوج نے " طعنہ " مار ۔ " ستہر " ملتان کو جاوں جی

بارتھہ[۱]

" ۔ وار کسی " وقت " کا " داستان " ہے ، کہ بھوپ سنگھ کا چھوٹا بھائی پھول سنگھ اپنے ' یار ' کندن سیٹھ کے ساتھ بن سے " شکار " کھیل کر " واپس " آتا ہے ، اور اپنی بھاوج سے آکر کیا کہتا ہے ۔

اس سانگ نے حسن اتفاق سے ہریانے کی زبان کی بالکل صاف تصویر کھینچ دی ہے کہ " بارتھ " کے بہانے سے نظم کے علاوہ نثر بھی آگئی ہے ۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کیا زبان بولی جاتی ہے ۔

ٹونگی مصنفہ ٹیک چند

پر اُتھنا (دعا) کے بعد اس طرح شروع کرتا ہے ،

دوہا

جو " ، عدہ " تیسے کیا ، مرت ناکرے " حلاب " ۔ بہو سا کے لیے لال کی سُنے لے چلئے آپ

کافیہ[۲]

چولی " زیور " جلدی لیا رے ، اتنے " عطر " پھلیل ملوں میں

۱۔ ارتھاؤ ، یعنی وضاحت

۲۔ ، مزاد قافیے سے معلوم ہوتی ہے کہ اس طرز نظم میں قافیے کا التزام نظر آتا ہے ۔

ایک چکدار ساڑی لیا وے ، باندھ کے تیرے ساتھ چلوں میں
لے دھڑکے چلوں "محلن" میں مالن " ہرگز" نہیں ٹلوں میں

جواب کوئی کا

پھول سنگھ کے سن بچن مالن "حوش" ہو جائے
چولی ، "زیور" تو سب دی مالن نے لیا ئے

جواب پھول سنگھ کا

دوہا

دیس ، نگر ، گھر چھوٹ گیا ، لگے تن کے "عشق" "تیر"
تو ننگی کے کارن ہوں ایتے[1] مر تے بیر

ٹک :- یہ "مردانہ" بانہ تار[2] دھار لیا ، روپ لگائی کا ،
"زیور" لیا پھر بہتیرا ، کچھ نندی تے ، بچ گیا "چہرہ" گل میں گیر لیا چیندن ہار
بین میں ڈورا "سیاہی" کا

(۲) بنی مالن درسن کی لاہڑی ، پھول سنگھ کے کھڑی اگاڑی ، باندھ لی ساڑی " لوٹے دار"
کرے تھا " کام" "صفائی" کا .

(۳) ساڑی بنی " ریشمی" ہری ، " سرمائے[3] " جائے[4] دیکھ " پری" ، " قدم" دھری لگے " ، دچار "
کھڑکا حول " جہار ہوائی " کا

---

[1] اُب
[2] اُتار
[3] شرمائے
[4] جیسے

اس سانگ میں بھی صدہا الفاظ فارسی کے نظر آتے ہیں جس کا اندازہ اس نمونے سے ہی ہو جائے گا۔

اس مضمون کے ناظرین کو یہ اندازہ تو ہو گیا ہوگا۔ کہ ہمارے "ہندوستانی" دیہات میں کیسی زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ لیکن آئندہ اشاعت میں ہم یہ بتائیں گے کہ وہ کون سی زبان ہے جو ہندی پرست اپنی تحریروں میں استعمال کرتے ہیں، اور پھر یہ موازنہ بھی کریں گے، کہ دیہات کی روزمرہ نام نہاد ہندی بولیوں کی زبان سے قریب ہے یا اُردو ادیبوں کی زبان سے علاوہ ازیں اگر فرصت ملی، تو ایک فہرست اُن فارسی و عربی الفاظ، استعارات، محاوروں اور ضرب الامثال کی پیش کریں گے۔ جو دیہاتی زبان میں مدت سے رائج ہو کر جزو زبان بن چکے ہیں۔

قدیم ترین تراجم

مغربی تصانیف کے اردو تراجم کی ابتدا اس وقت سے ہوئی جب کہ مختلف مغربی اقوام نے ہندوستان میں تھوڑی بہت قوت حاصل کرلی۔ اس سلسلہ میں اولیں قابل ذکر پروٹسٹنٹ عیسائی پادریوں کی ہیں جنھوں نے وقتاً فوقتاً انجیل کے مختلف حصوں کے ترجمے کرائے۔ اب تک جو کچھ مواد دستیاب ہوسکا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ انجیل کا ترجمہ پہلی دفعہ ہندوستانی زبان میں بنجامن شلٹزہ نے ۱۱۴۳ء میں کیا۔

<u>فورٹ ولیم کالج</u> مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارت کے ساتھ حکومت بھی شروع کردی۔ اور اس کی قوت روز بروز زیادہ مستحکم ہوتی گئی۔ تجارتی اور حکومتی اغراض کے تحت کمپنی نے ابتدا ہی سے محسوس کرلیا کہ انگریزی ملازمین کو ہندوستان کے رسم و رواج اور معاشرت و زبان سے واقف کرانا ضروری ہے۔ چنانچہ اس بناء پر انگریزوں کے لئے دیسی تعلیم کا انتظام وقتاً فوقتاً کیا گیا۔ وارن ہیسٹنگز نے کلکتہ کے انگریزی حدود میں ایک مشرقی مدرسہ قایم کیا تھا جہاں انگریزوں کے ساتھ ہندوستانی طلبہ کے لئے بھی لکھنے پڑھنے کا انتظام تھا۔

چونکہ کمپنی کے ملازم عام طور پر نوعمر انگریز ہوتے تھے اور انگلستان میں بھی ان کی تعلیم اعلیٰ پیمانہ پر نہ ہوتی تھی اس لئے لارڈ ولزلی نے فورٹ ولیم کالج کی جو تجویز پیش کی تھی اس میں ایشیائی زبانوں مثلاً عربی فارسی سنسکرت اردو بنگالی تلنگی مرہٹی اور کنڑی کے علاوہ یورپین زبانوں میں لاطینی یونانی اور انگریزی اور علوم و فنون میں عام تاریخ شمالی ہندوستان اور دکن کا جغرافیہ دکن کی تاریخ اصول قانون اور تاریخ ہند (قدیم و جدید) کی تعلیم کا انتظام کرانا چاہا تھا۔ لیکن کمپنی نے اخراجات کے ڈر سے اس درسگاہ کو صرف مشرقی زبانوں کی تعلیم تک محدود کردیا۔

اس زمانہ میں اردو یا ہندوستانی کو عام زبان کی حیثیت حاصل ہوچکی تھی نصابی ضرورتوں کے

تحت اُردو ادبیات کی تلاش ہوئی ۔ اس کا سارا ذخیرہ شعر و شاعری پر مشتمل تھا اس لئے ادبی کتابوں کی تالیف و ترجمہ کے لئے ایک محکمہ قائم کیا گیا ۔ اس سررشتہ میں اخلاقی قصص اور بعض تاریخی کتابوں کے ترجمے قدیم مشرقی زبانوں یعنی عربی اور سنسکرت سے کئے گئے ۔ دوسرے علوم یا سائنس پر کوئی کتاب اس عہد میں تیار نہیں ہوئی ۔

شمالی ہند میں اُردو نثر کی باضابطہ ابتدا انگریزی اثر کی بنا پر ہوئی لیکن اول اول اس پر انگریزی یا مغربی اثر بہت کم پڑا اور جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے فورٹ ولیم میں کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہندوستانی میں نہیں ہوا وجہ یہ تھی کہ دیسی اہل قلم انگریزی سے ناواقف تھے ۔ فورٹ ولیم کالج کے کسی اہم کام کا ذکر مغربی زبانوں سے ترجموں کے سلسلہ میں کیا جا سکتا ہے تو صرف اس اُردو انگریزی لغت کا جس کا ایک حصہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے ۱۷۹۶ء میں چھپوایا ۔ فورٹ ولیم کالج اس لغت کی طباعت کے دو سال بعد ۱۸۰۰ء میں قائم ہوا لیکن چونکہ گلکرسٹ اس کالج کے روح رواں تھے اس لئے ہم نے ان کے کام کا ذکر اس کے سلسلہ میں کر دیا ۔

مرزا فطرت نے ول ہنٹر کی مدد سے ۱۸۰۵ء میں انجیل کے عہد جدید کا ترجمہ درست کر کے چھاپا ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ ترجمہ یونانی زبان سے کیا گیا ۔ ۱۸۰۸ء میں کپتان ٹیلر نے اپنی لغت شائع کی ۔ اس کے بعد ۱۸۱۰ء میں کپتان ٹامس روبک نے لغت جہازرانی طبع کرائی جس میں جہازرانی کی اصطلاحوں کے علاوہ ایسے الفاظ کا اردو ترجمہ بھی درج ہے جو کہ ملازموں کو میدان جنگ اور بارکس میں کارآمد ہو سکتے ہیں ۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کے ایک عرصہ بعد یعنی ۱۸۴۵ء کی لکھی ہوئی ایک کتاب دستیاب ہوئی ہے جس کا نام مجموعہ گنج ہے اور جو کلکتہ اسکول بک سوسائٹی پریس میں چھپی ہے یہ کتاب چونکہ ان تراجم میں سے سب سے اور کامیاب ہے اس لئے اس کے کچھ اقتباسات درج کر کے زبان اور طرز بیان کی خصوصیات پر ذیل میں روشنی ڈالی جاتی ہے

کتاب کے نام یعنی "مجمع گنج" کے نیچے حسب ذیل عبارت لکھی ہے ۔

"عقل سوش کرنے والی تعلیموں کا

اور

" ...... والی تبلیغوں کا

اس میں

اکثر ملکوں کی بستی اور شہر اور آدمیوں کے احوال کا بیان ہے۔

ہندستانی لڑکوں کے لئے

انگریزی زبان سے زبان اردو میں ترجمہ کیا گیا"

یہ کتاب چھوٹی تقطیع کے ۲۱۷ صفحوں پر مشتمل ہے اور اس میں ۴۸ مضامین اور عنوانات ہیں جن کے تحت تاریخ اور جغرافیہ کے ابتدائی مسائل بیان کئے گئے ہیں۔

کتاب کا سب سے زیادہ دلچسپ حصہ وہ ہے جس میں اس وقت کے ہندستان کی کیفیت لکھی ہے

اس رسالہ کی عبارت میں قدامت پائی جاتی ہے جملوں کی ترکیب پر انگریزی تراکیب کا اثر نمایاں ہے بعض ایسے الفاظ بھی استعمال کئے گئے ہیں جو عرصہ ہوا متروک ہو چکے ہیں۔ تجارت کی جگہ "سوداگری" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے مثلاً "انگریزوں کے وقت میں ہندوستان کی سوداگری خوب چمک گئی"۔ نے کے غلط استعمال اور جملہ کی ترکیب کی اجنبیت ملاحظہ ہو "کمپنی کے سوا کوئی آدمی پوست کا کھیت کرنے اور افیون مول لینے نہیں سکتا ہے مگر کمپنی کے حکم سے"۔ امریکہ ملک" "برٹین کی ولایت" اور انگریز کا ملک" جیسی ترکیبیں جا بجا نظر آتی ہیں۔ جملوں کی ساخت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی انگریزی کا ترجمہ ہے۔

"ہند کی سوداگری کے بیان میں"

"ہند میں جو چیزیں پیدا ہوتی ہیں دوسرے ملک میں لیجا کے بیچنے سے بہت فائدہ ہوتا ہے اور ہند میں دولت مند ہونے کا بڑا وسیلہ سوداگری ہے۔ جو چیزیں آدمی کو لئے ضروری ہیں ان کے بہتات سے پیدا

ہونے کے سبب ہند کے رہنے والوں کو غیر ممالک سے کوئی چیز لانے کی احتیاج کم ہوتی ہے بلکہ ملک سے بہت چیزیں جو اور ملکوں کے رہنے والوں کے لئے ضروری ہوتی ہیں خواہ کھانے کی چیز جیسا کہ دان چاول گیہوں خواہ کسی صنعت کے لئے ہو جیسا ریشم روئی دوسرے ملک میں لے جاتے ہیں اور اسی سوداگری کے وسیلہ سے بہت دولت دوسرے ملکوں سے اس ملک میں آتی ہے۔"

انگریزوں کی عدل گستری اور گذشتہ بادشاہوں کے مظالم کا ذکر حسب ذیل الفاظ میں کیا گیا ہے۔

"اگلے بادشاہوں کے وقت میں ان کے ظلم سے لوگوں کے مال اور ملک میں امن چین نہ تھا اور جب ملک میں امن چین نہو اور معاملہ مقدمہ میں حق انصاف نہو بلکہ اسامی فریادی میں سے ایک کی طرفداری ہو تو کون آدمی اپنا روپیہ اور اسباب لے کے اس ملک میں جائے گا۔ اس سبب سے اور ملک کے سوداگر اس ملک میں کمتر آتے تھے اور یہاں کے رہنے والے یورپ کی اچھی اچھی حکمت اور کاریگری سے بے نصیب تھے۔

انگریزوں کے وقت میں ہندوستان کی سوداگری خوب چمک گئی اور بہت فائدہ مند ہوئی اور اس سوداگری سے بہتیرے غریب دولت مند ہوئے اور اکثر دولت مند بہت روپے والے ہوئے۔ سچ ہے انصاف کے درخت میں بھی پھل ہوتا ہے اور امن و اماں عدل سے ہوتا ہے اور خلائق اور رعیت خواہ نزدیک کے ہوں خواہ دور کے سب خوشی سے گزران کرتے ہیں۔"

شمس الامرا

اس زمانہ میں اردو ترجموں کا دوسرا اہم مرکز حیدر آباد تھا۔ حیدر آباد کے امیر کبیر نواب فخر الدین خاں شمس الامرائے ثانی بڑے علم دوست آدمی تھے۔ نواب موصوف نے اپنے اطراف کے علما کا ایک گروہ جمع کر لیا تھا جن میں سے بعض درس و تدریس میں اور اکثر تصنیف و تالیف میں مصروف تھے۔ گلزار آصفیہ کے مؤلف نے نواب کے علم و فضل اور علمی دلچسپیوں کے متعلق لکھا ہے۔

"ایں سرخیل امرائے نامدار امیر ست صاحب شان و شوکت و شکوہ۔

-- -- -- -- -- -- -- - -- -- -- صاحب تصانیف علوم حکمت علی الخصوص در علوم ریاضی کہ عبارت از ہندسہ و ہیئت باشد و نیز در علم جر ثقیل رسالہ ہائے عمدہ تصنیف فرمودہ۔ ستہ شمسیہ کہ مشہور آفاق اند۔ در نفس الامر علوم ریاضی را آں قدر سہل و آسان تر نمود کہ خلقے در اندک توجہ و شوق بحصول مقاصد و مطالب بلند و آب دل پسند ار جمندی رسد اگر بو علی سینا زندہ می بود داد ایں تحریر دل غرائی می داد -- -- -- -- -- --

" معہذا مدرسہ ہائے متعدد در بلدہ حیدر آباد با ستادان کامل علوم مقرر فرمودہ کہ طفلاں غربائے بیشمار شبانہ روز بہ تحصیل علوم نقلی و عقلی مشغول و مصروف اند -- -- -- -- -- --

نواب فخر الدین خاں کو ریاضیات اور علم ہیئت سے خاص شغف تھا انہی علم دوستی اور علمی دلچسپی کی بنا پر انھوں نے اپنے زمانہ میں جو تراجم خاص اہتمام کے ساتھ اپنے سنگی چھاپہ خانہ میں چھپوائے وہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ ترجمے مستند اور اعلیٰ پایہ ہونے کے باوجود ان کی شہرت حیدر آباد سے باہر بہت کم ہوئی۔ اور خود حیدر آباد میں موجودہ زمانہ کے علما میں بہت کم ایسے ہوں گے جو نواب موصوف کی تمام علمی تحریروں اور تصانیف سے کما حقہ آگاہی رکھتے ہوں ۔ جدید علوم سے نواب کی دلچسپی نے انھیں نہ صرف بعض مستند انگریزی کتابوں کے ترجمے اُردو زبان میں کرنے پر مجبور کیا بلکہ کئی رسالے طبعزاد بھی لکھے ۔ اس کام کے سرانجام کے لئے کئی علما نواب نے ملازم رکھے تھے۔ ایک رصدگاہ "جہاں نما" تعمیر کرائی ۔ تعلیم کے لئے مدارس قائم کئے اور کتابیں چھاپنے کے لئے سنگی مطبعے خانگی طور پر جاری کئے ۔ اُردو میں علمی کتابوں کے تراجم کی ایسی منظم انفرادی کوشش نواب فخر الدین خاں کے سوا شاید ہی کسی نے کی ہو ۔

ممکنہ تلاش اور جستجو کے بعد ہمیں نواب فخر الدین خاں کی حسب ذیل کتابوں کا حال معلوم ہوا ہے ۔

- رسالہ مختصر جر ثقیل" اور "رسالہ اصول حساب ۱۲۵۲ھ"
- رسالہ کسوراتِ اعشاریہ ۔ ۱۲۵۳ھ

سرکار میں حکم کرنے میں آیا کہ ان علوم مذکور کو زبان انگریزی سے اُردو زبان میں ہمارے روبرو ترجمہ کریں چنانچہ بفضل حق سبحانہ تعالیٰ کے یہ چھ رسالے ترجمہ ہوئے مگر بعضے اسما انگریزی اصطلاح کے جو زبان عربی اور فارسی میں نہ میسر ہوئے ان کو اس زبان اصلی میں بحال رکھنے میں آیا اور یہ چھے رسالے جو ترجمہ کئے گئے چھے علم پر مشتمل ہیں اس واسطے نام ان کا ستہ شمسیہ رکھا گیا۔

-- -- ---- - مادہ تاریخ اس رسالے کا گزرانا ہوا عسلام محی الدین کا یہ ہے۔

ایں تالیف شمس الامرا

۱۲۵۵

ان علوم کے طالب علموں سے یہ امید ہے کہ وقت مطالعہ اس کتاب کے اگر کچھ سہو عبارت میں پاویں تو اس کے اصلاح دینے میں دریغ نہ کریں۔۔۔۔"

جو زبان ان رسائل میں استعمال کی گئی ہے اس میں بعض ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں اور ایسے الفاظ نظر آتے ہیں جو بعد میں متروک ہو گئے مثلاً وے آوے انھوں اور کبھو جملوں کی ترکیب اور ساخت کی قدامت کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

"چھپوایا تھا بیچ لندن میں
واسطے سیکھنے اور دل لگی نوشابوں کے۔
گولی جو مصنوع انسان کی ہے۔
گونج نہیں پیدا ہونے کی بغیر اس کے کہ۔۔۔۔ ---
فہرست رسالہ علم آب مشتمل ہے اوپر دیباچہ اور بائیس گفتگو کے۔
جو جسم کہ اس کا ثقل پانی سے کم ہے"

معلوم ہوتا ہے کہ لکھنو اور دلی کے ابتدائی زمانہ کے شاعروں کی طرح 'وے' کے استعمال میں انھوں نے بھی اپنے آپ کو پابند نہیں کیا۔

مثال ملاحظہ ہو۔

" استادوں نے دریافت کئے ہیں کہ"

بعض مقامات پر اسم کیفیت یا حاصل مصدر کے بجائے مصدر کا استعمال کیا گیا ہے مثلاً

" ہوا کے دو جسموں کے تصادم سے گرجنا پیدا ہوتا ہے "

بعض جگہ داخل کرنا' دل لگی' امتحان اور صرف کرنا جیسے الفاظ کو ان معنوں میں استعمال کیا گیا ہے جن میں وہ اب مستعمل نہیں ہیں۔

شکر کو ماس میں داخل کرنا	(معنی ڈالنا)
واسطے سیکھنے اور دل لگی نوشنا لوں کے	(دلچسپی)
امتحانات بیان کئے گئے ہیں	(تجربے)
یہ آلہ پانی کو چڑھانے کی غرض سے صرف کیا جاتا ہے	(استعمال)

بعض الفاظ کا املا بھی قدیم ہے مثلاً

کویں کو "کوے" اور وہ کو "وو" لکھا ہے۔

انگریزی الفاظ کے ہجا کا تعین نہیں کیا گیا تھا۔ ہیڈروجن کو کہیں "ہ" سے لکھا ہے اور کہیں "ح" سے۔

سائنس کی بعض اصطلاحات کے ترجمے کر لئے گئے ہیں اور بعض انگریزی تلفظ کے مطابق اُردو میں لکھے گئے ہیں ملاحظہ ہو۔

علم آب کی ترازو	Hydro statics Balance
غوطہ زنوں کا آلہ	
پانی چڑھانے کا پمپ	
چوسنے کا پمپ	Sucking Pump
زبردستی کا پمپ	Force Pump.

کلاں بین	Microscope
ہوائی بندوق	Air Gun
آلۂ تحلیل	
ہوائی پول	
موسمی پون	Monsoon
تبدیلی پون	
بخار کا آلہ	
نقشہ نویس کا صندوق	
قندیل حرمسا	
انحرافی دوربین	
منعکسی دوربین	Reflecting Telescope
آئینہ ہزار شیشی	
موازی شعاعیں	Parallel Rays
انقباضی شعاعیں	Convergent Rays
انبساطی شعاعیں	Divergent Rays
انحرافی روشنی	Defracted Light
منعکسی روشنی	Reflected Light.
دنبالہ دار ستارہ	Comet

بعض انگریزی الفاظ اور اصطلاحات کا ترجمہ نہیں کیا گیا ان میں سے بعض یہ ہیں :-

ہیڈرا میٹر

ہیرا میٹر۔

تھرمامیٹر

بیرامیٹر

ہیگرامیٹر

ان کتابوں میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ مندرجہ بالا خصوصیات کی حامل ہونے کے باوجود سادہ اور سلیس ہے۔ پیچیدہ سے پیچیدہ علمی مباحث کے سمجھنے میں بھی عام پڑھنے والے کو کوئی دقت پیش نہیں آتی اس سے ظاہر ہے کہ ترجمہ کرنے والوں نے اصل کتاب کے مطالب کو پوری طرح اور خوبی کے ساتھ سمجھ لیا تھا اس لئے کسی مقام پر بھی معنوی تعقید یا گنجلک پیدا نہیں ہونے پاتی۔ عبارت میں ترجمہ پن نہیں پایا جاتا۔ افسوس کہ باوجود تلاش کے ریورنڈ چارلس کی اصل کتابیں ہمیں نہیں مل سکیں اس لئے یہ نہیں بتلایا جا سکتا کہ ترجمہ اصل سے کہاں تک مطابق ہے۔ یہ کتابیں سوال و جواب کے طرز پر لکھی گئی ہیں اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

تعریفات اور کیفیات علم آب

علم آب جس کو یونانی زبان میں ہیڈرس ٹاٹکس کہتے ہیں علم فلسفۂ طبیعی کی ایک نوع ہے جو طبیعت اور ثقل اور دباؤ اور حرکت اکثر سیال کی ظاہر کرتا ہے۔

وہ اجزا کہ جن سے سیال بنات فرض کئے ہیں کہ نہایت خرد اور گرد اور مستقل ہیں اور یہ بھی فرض کیا گیا ہے کہ وے اجزا نہایت سخت اور بہت دبنے کے قابل نہیں ہیں۔ جو جسم کہ اس کا ثقل پانی سے کم ہے اس قدر پانی میں ڈوبے گا کہ ایک مقدار آب اس جسم کے ٹکڑے کے برابر جو پانی کی سطح کے نیچے ہے اس کے تمام جسم کے ہم وزن ہوگا۔ ہیڈرا میٹر کو شراب اتارنے کی بھٹیوں میں شراب کی قسمیں دریافت کرنے اور ان کا محصول مقرر کرنے کے کام میں لاتے ہیں۔

دوسری ایک مروڑ نلی ہے۔

کوئیں سے پانی کا چڑھنا جو سے کے پمپ میں ہوا کے دباؤ سے ہوتا ہے اور ۳۲ فیٹ

تک چڑھتا ہے ؛

" ہمیشہ پانی کی یکساں دھار دونوں نلوں میں کے ڈٹون کے متواتر حرکت کرنے سے حاصل ہوتی ہے "

پہلی گفتگو

" تلمیذ کلاں " تلمیذ خرد ۔ حیدرواسٹاٹکس کمال لفظ ثقیل اور اجنبی ہے ۔ اکثر نام جو ان علوم میں آئے ہیں یونانی ہیں اور ہر لفظ دوسری زبان کا جب تک محاورے میں نہ آوے ثقیل معلوم ہوتا ہے اور اصل وضع سے بعضے نام کے معنی مفرد ہوتے ہیں اور بعضوں کے مرکب۔ یہ نام دو لفظوں سے مرکب ہے ایک حیدرو جو اس زبان میں پانی کو کہتے ہیں دوسرا اسٹاٹکس مطلقاً اس علم کو کہتے ہیں جس سے ثقل وخفت اجسام کی معلوم ہوتی ہے ۔ چونکہ اس علم سے مقتضائے طبیعت تمام اجسام کا اور ثقل وخفت انھوں کی اور حرکت کرنا .... انھوں کا اور ترکیبیں اجسام غیر سیال کے وزن کرنے کی انھوں میں دریافت کرتے ہیں اس جہت سے اس علم کو حیدرو اسٹاٹکس یعنی علم آب کہتے ہیں "

نواب شمس الامرا نے علم کیمیا کی بعض انگریزی کتابوں کا ترجمہ کروایا تھا ۔ کتب خانہ آصفیہ میں بھی " کیمسٹری کا مختصر رسالہ " ملا ۔ مصنف کا نام ریورنڈ جان ٹائم ہے ۔ کتاب قلمی ہے ۔ دیباچہ میں لکھا ہے ۔ " یہ رسالہ مختصر علم کیمسٹری کا حسب الحکم حضرت نواب صاحب قبلہ نواب شمس الامرا بہادر امیر کبیر دام اقبالہ کے ترجمہ کیا گیا کہ جس میں تبدیل اور ترکیب عناصر اور چند اصول علم کیمسٹری کا بیان ہے اگرچہ اس علم میں بڑی بڑی کتابیں مع دلائل انگریزی زبان میں ہیں لیکن ساکنان فرخندہ بنیاد حیدرآباد کو بالکل آگاہی نہ تھی اس واسطے ریورنڈ جان ٹائم صاحب کا مختصر رسالہ انگریزی زبان سے اُردو عبارت میں لکھا گیا کہ ناواقف لوگوں کو کچھ کچھ اس علم کے اصطلاحات سے آگاہی ہووے اور یہ رسالہ مرتب ہوا نو باب اور سو امتحانات پر ۔ ۱۲۵۹ھ مطابق ۱۸۴۳ء "

کتاب کے شروع میں اصطلاحات کے ترجموں کی فہرست بھی دی گئی ہے ۔

"نام دوائیوں کے انگریزی معہ ترجمہ"

سلفرک اسڈ	-	گندک کا کشتہ
میوراٹیک اسڈ	-	کھانے نمک کا کشتہ
نیٹرک اسڈ	-	شورے کا کشتہ
آلو آئیل	-	زیتون کا تیل
ٹرمرک	-	ہلدی
مرکری		پارا
سلفٹ آف کوپر	-	نیلا تھوتھا
نیٹرٹ آف پٹاس	-	شورہ
سوب برٹ آف سوڈا	-	سہاگہ
نٹریٹ آف سلور	-	سفوف نقرہ
نٹریٹ آف کاپر	-	تانبے کا شورہ
گولڈ لیف		سونے کے ورق
ٹرمرک پیپر	-	ہلدی کے پتے کے رس میں بھگایا ہوا کاغذ

بعض انگریزی اصطلاحات مثلاً سنتھی سس، اینلیس، سوڈیم پٹاسیم، وغیرہ کا ترجمہ نہیں کیا گیا۔ ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

"کیمسٹری وہ علم ہے کہ جس سے اجسام کا باہم عمل دریافت کیا جاتا ہے اور اس سے اجسام قدرتی کے اجزا نمود ہوتے ہیں خواہ حالت بساطت میں ہوں یا حالت ترکیب میں اس علم کے مرکبات کی ذات کو پہچاننے کے واسطے دو ترکیبیں ہیں چنانچہ سنتھسس اور انلسس۔ سنتسس ایک لفظ ہے کہ اس کا معنی دو جسم یا زیادہ اجسام سے اتصال کیمیسٹری حاصل کرنا ہے۔ اور انلسس وہ لفظ ہے کہ اس کا معنی ہر ایک جسم کو جدا کرنا اور جدی جدی حالت میں دکھلانا ہے۔"

یہ رسالہ کل سو" امتحانات" یعنی تجربوں کے بیان پر مشتمل ہے۔ اس کا حجم ۹۹ صفحے ہے۔
ایک تجربہ کا بیان ملاحظہ ہو۔

" ایک گریں (سوڈیم) اور ایک گریں (پٹاسیم) لے کر ایک چھوری کی نوک سے دونوں کو خوب ملاؤ بعدہ ایک قطرہ پارے کا اس کے نزدیک لے جاؤ یہ دونوں مل جائیں گے اور ایک آنچ پیدا ہوگی"

اس کتاب کی زبان میں بھی وہی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں جو ستہ شمسیہ کی زبان کے متعلق بیان ہوئی ہیں یعنی جملوں کی ترکیب اور ساخت قدیم ہے۔ اور جو نحوی غلطیاں اس زمانہ کی عام اردو کتابوں میں پائی جاتی ہیں وہی یہیں یہاں بھی نظر آتی ہیں۔ انداز بیان ایسا ہے کہ تمام مسائل بآسانی سمجھ میں آتے ہیں۔

اس کے دو سال بعد یعنی سنہ ۱۲۶۳ھ میں "رسالہ کیمسٹری" شائع ہوا ابتدا میں حمد کے بعد لکھا ہے۔

" دانشوران ذی فہم پر پوشیدہ نہ رہے کہ یہ رسالہ ہے مختصر چند علوم کیمسٹری کے بیان میں کہ اس علم میں ترکیب عناصر کی حقیقت جو زبان فرنگ میں اس کو کہتے ہیں پائی جاتی ہے اور یہ علم بہت عجیب و غریب ہے کہ اس کی تحصیل اہل حکمت کو ضرور اور لازم ہے اور یہ علم اہل فرنگ کی زبان میں مندرج تھا لیکن حال میں ایک رسالہ اس علم کا ہندوستان سے شہر آگرے کا چھپا ہوا ایسا آیا تھا کہ اس میں ایک صفحہ انگریزی زبان کا اور دوسرا صفحہ اس کے ترجمہ کا اردو زبان میں لکھا ہوا تھا۔ اگرچہ وہ دوبارہ محتاج چھاپے کا نہ تھا مگر یہاں طالبوں کے فائدہ کے لئے اس کے اردو ترجمے کو علیحدہ لکھوا کر چھپا گیا"

اس کتاب کی زبان میں وہ سادگی اور روانی نہیں پائی جاتی جو "کیمسٹری کا مختصر رسالہ" میں پائی جاتی ہے بہتیری انگریزی اصطلاحات کا ترجمہ نہیں کیا گیا اس وجہ سے جگہ جگہ انگریزی الفاظ عبارت میں نظر آتے ہیں انہیں اسی طرح رکھ کر مفہوم سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے ان میں سے بعض یہ ہیں:

ڈکامپوزیشن

ایلیک ٹرسٹی

نیٹرک آسڈ

تھرمامیٹر

کنڈکٹر

نان کنڈکٹر (بعض مقامات پر نن کنڈکٹر بھی لکھا ہے)

پسٹن

سلنڈر

کاسٹک

میگنیشیا

جن اصطلاحات کا ترجمہ کیا گیا ہے ان میں سے بعض یہ ہیں:۔

قوت جاذبہ ۔ خواہش رغبت محبت	Attraction.
قلم	Crystal.
مہوس	Chemist
جامد	Solid
سیال	Liquid, Fluid.
ہوائی	Gas
سنگ چقماق	
گھلنے کی خاصیت	Solubility.
بچون	Iron filings.
شعلہ گیر۔	Inflamable.

سہاگہ — Borax.

نشاستہ — Starch

سرش

گلشی

حرارت — Heat

اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ کتاب "بطریق مکالمہ" لکھی گئی ہے۔ اصل انگریزی کتاب اور مصنف کا نام نہیں دیا گیا ہے۔ اس کا بھی کہیں ذکر نہیں کیا گیا کہ ترجمہ کس شخص یا جماعت نے کیا۔

سوال۔ کس طرح معلوم کیا جاتا ہے کہ فلانی چیز اسڈ ہے یا نہیں۔

جواب۔ پہلے مزے سے دوسرے یہ کہ جتنی نیلی چیز نباتاتی اس میں ڈالی جاوے ان کو سرخ کر دیتا ہے۔

سوال۔ سلفورک اسڈ کیا کام آتا ہے۔

جواب۔ رنگین کپڑے کو جو سفید کیا چاہیں تو یہی اس کی دوا ہے اور اس کی خاصیت یہ ہے کہ تین حصے پانی میں اس کا ایک حصہ ملا دیا جاوے تو اس کی گرمی تین سو درجے تک تھرمامیٹر کے ہوتی ہے۔ تو کھولتے پانی کی گرمی سے اس کی گرمی سوم حصہ زیادہ ہے اور اس کے سبب سے جو ہیڈروجن گاس نکلتا ہے اس کی ترکیب آگے ہی لکھی گئی ہے۔

ایک اور مقام سے تھوڑی سی عبارت نقل کی جاتی ہے۔

" سوال۔ ڈیکامپزیشن کے کیا معنی ہیں۔

جواب۔ کسی مرکب کے اجزائے بسیط کو جدا کرنا۔ مثلاً ایک روٹی لو اور اس میں جو میدا خمیر نمک پانی ہے ان کو ایک دوسرے سے جدا کرو۔ یہی ڈیکامپزیشن کہلاتا ہے اسی طرح آب و آتش خاک و باد ہر ایک ان میں سے ڈیکامپزیشن ہو سکتا ہے۔

سوال۔ اگر یہ سب مرکب ہیں تو کونسی چیز بسیط ہے۔

جواب ۔ یوں تو پچاس ساٹھ چیزیں بسیط ہیں پر یہاں چاروں مفرد نہیں چنانچہ ہوا دو چیزوں سے مرکب ہے یعنی آکسیجن اور نیٹروجن اس کا بیان مفصل آگے ہوگا ۔

نواب فخرالدین خاں کے فرزند عمدۃ الملک نواب رفیع الدین خاں نے مغربی اور جدید ترین علوم و فنون کو اُردو میں منتقل کرنے کی کامیاب کوشش کیں ۔ ان کے ایما سے رسالہ علم ہندسہ ۱۲۵۱ھ رفیع الحساب ۱۲۵۲ھ رفیع البصر رفیع الصنعت اور رفیع التراکیب ۱۲۶۰ھ جیسی متعدد کتابیں شائع ہوئیں لیکن ٹھیک طور پر معلوم نہیں کہ یہ تصانیف ہیں یا تراجم رفیع الدین خاں کی بعض کتابیں ان کے والد نواب فخرالدین کی زندگی میں شائع ہوئیں ۔

نواب ابوالخیر خاں بہادر ناموَر جنگ شمس الامرا کے حکم سے سنہ ۱۲۶۰ھ میں حال مارتس ساکن حیدرآباد نے الیمانی امین صاحب کی ایجاد " رسالہ ہومیو پاتک " کا ترجمہ کیا ۔ یہ کتاب مطبع رحمانی حیدرآباد میں چھپی ہے ۔ اور ۷۰ صفحات پر مشتمل ہے ۔

ترجمہ کی عبارت فارسی آمیز ہے ۔ نمونہ ملاحظہ ہو ۔

حق تعالیٰ عز شانہ نے انسان ضعیف البنیان کو عقل سے مکمل کیا اور ضرورت اور منفعت کے صدہا فوائد بخشے جس کے سبب بنی آدم کا رتبہ اشرف المخلوقات ہے ۔ انسان بیماری دور کرنے کے لیے قوت کیفیت اور تعیین اپنے اندر رکھتا پس اس عقل پر واجب ہے کہ جسم کے امراض دفع کرنے سریع التاثیر اور قوی العمل کے علاج کو معلوم کرے جو مشیت ایزدی سے اس کے وجود میں مطلقاً نہیں ہے ۔ لیکن جب یہ بات ہم کو قدرت سے مرحمت نہیں ہوئی تو اس طبیعت کو ہمارے حاجتوں کے لئے کافی نہ جاننا چاہئے ۔ بلکہ بہبودی اور خوبی کے واسطے عقل کے حوالے کو لاتعین طور سے صرف کرنا ضرور ہے

شاہان اودھ

اس عہد میں اُردو ترجموں کا تیسرا اور آخری مرکز لکھنؤ تھا ۔ شاہان اودھ نے لکھنؤ میں جدید مغربی علوم و فنون کی بعض کتابوں کے ترجمے کرائے جو مطبع سلطانی میں چھپ کر شائع ہوئے ۔

سید کمال الدین حیدر لکھنوی نے جدید علوم پر انیس رسالوں کا ترجمہ انگریزی سے اُردو میں کیا۔ ان میں سے بعض کتابوں کے نام حسب ذیل ہیں:-

(۱) رسالہ ہیئت مصنفہ ڈاکٹر ودسن
(۲) رسالہ دیگر ہیئت مصنفہ ڈاکٹر برنکلی
(۳) رسالہ علوم طبیعہ (فزکس)
(۴) رسالہ قوت مقناطیس
(۵) رسالہ علم الکیمیا
(۶) رسالہ علم المناظر
(۷) رسالہ علم المار
(۸) رسالہ علم الہوا
(۹) رسالہ علم الحرارۃ
(۱۰) رسالہ مقاصد العلوم مصنفہ لارڈ بروم

آخر الذکر کتاب یعنی رسالہ مقاصد العلوم لارڈ بروم کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے۔ یہ رسالہ ۱۸۴۵ء میں مطبع سلطانی میں طبع ہوا۔ اس میں مختلف علوم کے فوائد اور ان کے مقاصد اور موضوعوں کی تشریح کی گئی ہے کتاب کے شروع میں مترجم نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے ......

"حسب الحکم ابو الفتح معین الدین سلطان الزماں نوشیرواں عادل محمد علی شاہ بادشاہ غازی حسب فرمائش مجلس اجلاس جنرل کلسٹی (کمیٹی)، اسکول بک سوسائٹی کے عاصی سراپا معاصی سید کمال الدین حیدر عرف محمد میر الحسنی الحسینی نے زبان اُردو میں ترجمہ کیا" باوجود انتہائی کوشش کے مندرجہ بالا فہرست کی کوئی کتاب ہمیں نہیں مل سکی اس لئے ترجمہ کے صحت و سقم اور زبان کی خصوصیتوں سے متعلق کچھ بھی نہیں لکھا جا سکتا۔ البتہ کمال الدین حیدر کے ایک ترجمہ کا ذکر تفصیلی طور پر دہلی کالج کی مطبوعات کے سلسلہ میں کیا گیا ہے۔

انفرادی کوششیں

گذشتہ صفحات میں ہم نے صرف اجتماعی کوششوں کا ذکر کیا ہے مختلف افراد نے انفرادی طور پر جو ترجمے شائع کرائے ان میں اکثریت تاریخی کتابوں کی ہے۔ ایک ترجمہ ۱۸۲۹ء میں چھپا جس کا نام "قاصدین سو پولوس روین والیان کون لیکھو بیجین سو کا غذ ہے" نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب کس زبان میں ہے۔

۱۸۲۰ء سے ۱۸۴۲ء تک یعنی بائیس سال کے عرصہ میں جو ترجمے شائع ہوئے ان میں حسب ذیل مطبوعات شامل ہیں۔

ٹائٹلر کی ایلیمنٹر آف جنرل ہسٹری کا ترجمہ ایل ڈی کا سٹا نے ۱۸۲۹ء میں جو کلکتہ سے شائع ہوا۔ "تاریخ انگلینڈ کی" ۱۸۴۰ء میں مدراس میں چھپی ڈاکٹر گولڈ سمتھ کی کتاب کا اُردو ترجمہ "تاریخ روم" کے عنوان سے ۱۸۴۱ء میں دہلی سے شائع ہوا "تاریخ ملک چین" جیمس کورکورن کی تاریخ کا ترجمہ ۱۸۴۲ء میں بہ مقام کلکتہ شائع ہوا۔ مشہور انگریزی ناول نگار جان بنیان کے مشہور ناول پلگرمس پروگرس کا ملخص ترجمہ ۱۸۳۸ء میں شائع ہوا۔ اس کے دوسرے سال یعنی ۱۸۳۹ء میں سید محمد میر نے مشہور انگریزی ادیب ڈاکٹر جانسن کے ناول راسلس کا ترجمہ "قصہ راسلس ولایت حبش کے شہزادے کا" کے عنوان سے کیا ۱۸۳۵ء میں "داؤد کے زبور" سرام پور سے شائع ہوئی۔ راجہ کالی کرشنا بہادر نے سٹرگے کے ریفلیس کا ترجمہ ۱۸۳۶ء میں کلکتہ میں شائع کیا۔ ۱۸۴۲ء میں "خلاصہ علم الارض" کے عنوان سے ایک کتاب شائع ہوئی۔

ابابیل

اس کا نام تو رحیم خاں تھا مگر اس جیسا ظالم بھی شاید ہی کوئی ہو۔ گاؤں بھر اس کے نام سے کانپتا تھا۔ نہ آدمی پر ترس کھائے نہ جانور پر۔ ایک دن راموں لوہار کے بچے نے اس کے بیل کی دم میں کانٹے باندھ دیے تھے تو مارتے مارتے اس کو ادھ موا کر دیا۔ اگلے دن ذیلدار کی گھوڑی اس کے کھیت میں گھس آئی تو لاٹھی لے کر اتنا مارا کہ لہو لہان کر دیا۔ لوگ کہتے تھے کہ کمبخت کو خدا کا خوف بھی تو نہیں ہے۔ معصوم بچوں اور بے زبان جانوروں تک کو معاف نہیں کرتا۔ یہ ضرور جہنم میں جلے گا۔ مگر یہ سب اس کی پیٹھ کے پیچھے کہا جاتا تھا۔ سامنے کسی کی ہمت زبان ہلانے کی نہ ہوتی تھی۔ ایک دن بندو کی جو شامت آئی تو اس نے کہہ دیا "ارے بھئی رحیم خاں تو کیوں بچوں کو مارتا ہے"۔ بس اس غریب کی وہ درگت بنائی کہ اس دن سے لوگوں نے بات بھی کرنی چھوڑ دی کہ معلوم نہیں کس بات پر بگڑ پڑے۔ بعض کا خیال تھا کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اس کو پاگل خانے بھیجنا چاہیے۔ کوئی کہتا تھا اب کے کسی کو مارے تو تھانے میں رپٹ لکھوا دو۔ مگر کس کی مجال تھی کہ اس کے خلاف گواہی دے کر اس سے دشمنی مول لیتا۔

گاؤں بھر نے اس سے بات کرنی چھوڑ دی مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ صبح سویرے وہ ہل کاندھے پر دھرے اپنے کھیت کی طرف جاتا دکھائی دیتا تھا۔ راستے میں کسی سے نہ بولتا۔ کھیت میں جا کر بیلوں سے آدمیوں کی طرح باتیں کرتا۔ اس نے دونوں کے نام رکھے ہوئے تھے۔ ایک کو کہتا تھا 'نتھو' دوسرے کو 'چھدو'۔ ہل چلاتے ہوئے بولتا جاتا "کیوں بے 'نتھو' تو سیدھا نہیں چلتا۔ یہ کھیت آج تیرا باپ پورا کرے گا۔ اور اے چھدو تیری بھی شامت آئی ہے کیا" اور پھر ان غریبوں کی شامت آ ہی جاتی۔ سوت کی رسی کی مار۔ دونوں بیلوں کی کمر پر زخم پڑ گئے تھے۔

شام کو گھر آتا تو اں اپنے بیوی بچوں پر غصہ اتارتا۔ دال یا ساگ میں نمک کم ہے، بیوی کو

ادھیڑ ڈالا۔ کوئی بچہ شرارت کرتا تب، اس کو الٹا لٹکا کر بیلوں والی رسی سے مارتے مارتے بیہوش کر دیا۔ غرض ہر روز ایک آفت بپا رہتی تھی۔ آس پاس کے جھونپڑوں والے روز رات کو رحیم خاں کی گالیوں اور اس کی بیوی اور بچوں کے مار کھانے اور رونے کی آواز سنتے مگر بیچارے کیا کر سکتے تھے اگر کوئی منع کرنے جائے تو وہ بھی مار کھائے۔ مار کھاتے کھاتے بیوی غریب تو آدھی ہو گئی تھی چالیس برس کی عمر میں ساٹھ کی معلوم ہوتی تھی بچے سب چھوٹے چھوٹے تھے تو پٹتے رہے۔ بڑا جب بارہ برس کا ہوا تو ایک دن مار کھا کر جو بھاگا تو پھر واپس نہ لوٹا۔ قریب کے گاؤں میں ایک رشتہ کا چچا رہتا تھا اس نے اپنے پاس رکھ لیا۔ بیوی نے ایک دن ڈرتے ڈرتے کہا "ہلا اس لونڈے کی طرف جاؤ تو ذرا لونڈے کو لیتے آنا۔" بس پھر کیا تھا آگ بگولہ ہو گیا "میں اس بدمعاش کو لینے جاؤں۔ اب وہ خود بھی آیا تو ٹانگیں چیر کر پھینک دوں گا۔"

وہ بدمعاش کیوں موت کے منہ میں واپس آنے لگا تھا۔ دو سال کے بعد چھوٹا لڑکا بندو بھی بھاگ گیا۔ اور بھائی کے پاس رہنے لگا رحیم خاں کو غصہ اتارنے کے لئے فقط بیوی رہ گئی تھی سو وہ غریب اتنی پٹ چکی تھی کہ اب عادی ہو چلی تھی۔ مگر ایک دن اس کو اتنا مارا کہ اس سے بھی نہ رہا گیا اور موقع پا کر جب رحیم خاں کھیت پر گیا ہوا تھا وہ اپنے بھائی کو بلا کر اس کے ساتھ اپنی ماں کے ہاں چلی گئی۔ ہمسایک عورت سے کہہ گئی کہ آئیں تو کہہ دینا کہ میں چند روز کے لئے اپنی ماں کے پاس رام نگر جا رہی ہوں۔

شام کو رحیم خاں بیلوں کو لئے واپس آیا تو پڑوسن نے ڈرتے ڈرتے بتایا کہ اس کی بیوی اپنی ماں کے ہاں چند روز کے لئے گئی ہے۔ رحیم خاں نے خلاف معمول خاموشی سے بات سنی اور بیل باندھنے چلا گیا۔ اس کو یقین تھا کہ اس کی بیوی اب کبھی نہ آئے گی۔

احاطے میں بیل باندھ کر جھونپڑے کے اندر گیا تو ایک بلی میاؤں میاؤں کر رہی تھی۔ کوئی اور نظر نہ آیا تو اس کی ہی دم پکڑ کر دروازے سے باہر پھینک دیا چولھے کو جا کر دیکھا تو ٹھنڈا پڑا ہوا تھا۔ آگ جلا کر روٹی کون ڈالتا۔ بغیر کچھ کھائے پیئے ہی پڑ کر سو رہا۔

اگلے دن رحیم خاں جب سو کر اٹھا تو دن چڑھ چکا تھا۔ لیکن آج اسے کھیت پر جانے کی جلدی نہ تھی۔ بکریوں کا دودھ دھو کر پیا اور حقّہ بھر کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اب جھونپڑے میں دھوپ بھر آئی تھی۔ ایک کونے میں دیکھا تو جالے لگے ہوئے تھے۔ سوچا کہ لاؤ صفائی ہی کر ڈالوں۔ ایک بانس میں کپڑا باندھ کر جالے اتار رہا تھا کہ کھپریل میں ابابیلوں کا ایک گھونسلہ نظر آیا۔ دو ابابیلیں کبھی اندر جاتی تھیں کبھی باہر آتی تھیں۔ پہلے اس نے ارادہ کیا کہ بانس سے گھونسلہ توڑ ڈالے۔ پھر معلوم نہیں کیا سوچا۔ ایک گھڑونچی لا کر اس پر چڑھا اور گھونسلے میں جھانک کر دیکھا۔ اندر دو لال بوٹی سے بچے پڑے چوں چوں کر رہے تھے۔ اور ان کے ماں باپ اپنی اولاد کی حفاظت کے لئے اس کے سر پر منڈلا رہے تھے۔ گھونسلے کی طرف اس نے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ مادہ ابابیل اپنی چونچ سے اس پر حملہ آور ہوئی۔

"اری، آنکھ پھوڑے گی؟" اس نے اپنا خوفناک قہقہہ مار کر کہا اور گھڑونچی پر سے اتر آیا۔ ابابیلوں کا گھونسلہ سلامت رہا۔

اگلے دن سے اس نے پھر کھیت پر جانا شروع کر دیا۔ گاؤں والوں میں سے اب بھی کوئی اس سے بات نہ کرتا تھا۔ دن بھر ہل چلاتا، پانی دیتا یا کھیتی کاٹتا۔ لیکن شام کو سورج چھپنے سے کچھ پہلے ہی گھر آ جاتا۔ حقہ بھر کر پلنگ کے پاس لیٹ کر ابابیلوں کے گھونسلے کی سیر دیکھتا رہتا۔ اب دونوں بچے بھی اڑنے کے قابل ہو گئے تھے۔ اس نے ان دونوں کے نام اپنے بچوں کے نام پر نورو اور بندو رکھ دیے تھے۔ اب دنیا میں اس کے دوست یہ چار ابابیل ہی رہ گئے تھے۔ اس کے ہمسائے اس سے اب بھی خائف تھے۔ اس کی خاموشی کو وہ شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ لیکن ان کو یہ حیرت ضرور تھی کہ مدت سے کسی نے اس کو اپنے بیلوں کو مارتے نہ دیکھا تھا۔ نتھو اور چھدو خوش تھے۔ ان کی کمروں پر سے زخموں کے نشان بھی تقریباً غائب ہو گئے تھے۔

رحیم خاں ایک دن کھیت سے ذرا سویرے چلا آ رہا تھا کہ چند بچے سڑک پر گنڈی کھیلتے ہوئے ملے۔ اس کو دیکھنا تھا کہ سب اپنے جوتے چھوڑ کر بھاگ گئے۔ وہ کہتا ہی رہا "ارے میں کوئی مارتا

تھوڑا ہی ہوں۔" آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ جلدی جلدی بیلوں کو ہنکاتا ہوا گھر لایا۔ ان کو باندھا ہی تھا کہ بادل زور سے گرجا اور بارش شروع ہوگئی

اندر آکر کواڑ بند کئے اور چراغ جلا کر اجالا کیا۔ حسب معمول باسی روٹی کے ٹکڑے کرکے ابابیلوں کے گھونسلے کے قریب ایک طاق میں ڈال دئے۔ " ارے او بندو ارے او نورو " پکارا مگر وہ نہ نکلے گھونسلے میں جو جھانکا تو چاروں اپنے پروں میں سر دئے سہمے بیٹھے تھے عین جس جگہ چھت میں گھونسلہ تھا وہاں ایک سوراخ تھا اور بارش کا پانی ٹپک رہا تھا۔ اگر کچھ دیر یہ پانی اس طرح ہی آتا رہا تو گھونسلہ تباہ ہو جائے گا اور ابابیلیں بے چاری بے گھر ہو جائیں گی۔ سوچ کر اس نے کواڑ کھولے اور موسلا دھار بارش میں سیڑھی لگا کر چھت پر چڑھ گیا۔ جب تک مٹی ڈال کر سوراخ کو بند کرکے وہ اترا تو شرابور تھا۔ پلنگ پر جا کر بیٹھا تو کئی چھینکیں آئیں۔ مگر اس نے پرواہ نہ کی اور گیلے کپڑوں کو نچوڑ چادر اوڑھ کر سو گیا۔ اگلے دن صبح کو اٹھا تو تمام بدن میں درد اور سخت بخار تھا۔ کون حال پوچھتا اور کون دوا لاتا۔ دو دن اسی حالت میں پڑا رہا۔

جب دو دن اس کو کھیت پر جاتے ہوئے نہ دیکھا تو گاؤں والوں کو تشویش ہوئی۔ کالو زمیندار اور کئی کسان شام کو اس کے جھونپڑے میں دیکھنے آئے۔ جھانک کر دیکھا تو وہ پلنگ پر پڑا آپ ہی آپ باتیں کر رہا تھا۔ " ارے بندو۔ ارے نورو۔ کہاں مر گئے آج تمہیں کون کھانا دے گا؟" جبکہ ابابیلیں کمرے میں پھڑپھڑا رہی تھیں۔

" بیچارہ پاگل ہوگیا ہے " کالو زمیندار نے سر ہلا کر کہا " صبح کو شفاخانہ والوں کو پتہ دیں گے کہ پاگل خانہ بھجوا دیں۔"

اگلے دن صبح کو جب اس کے پڑوسی شفاخانہ والوں کو لے کر آئے اور اس کے جھونپڑے کا دروازہ کھولا تو وہ مر چکا تھا۔ اس کی پائنتی چار ابابیلیں سر جھکائے خاموش بیٹھی تھیں۔

دنیا میں ذخیرۂ غذا

(ذیل کا مضمون "الہلال" (مصر) کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے)

دنیا کی آبادی تقریباً ایک ہزار آٹھ سو ملین ہے۔ کرۂ ارض میں خشکی کا رقبہ، منطقۂ قطبی کے خشکی حصہ کو علیحدہ کر لینے کے بعد ۳۳ ہزار ملین ہے۔ اور اس کا نصف حصہ مشکل سے کاشت کی صلاحیت رکھتا ہے۔ معاشیین کا خیال ہے کہ فی شخص پانچ ایکڑ زمین زیست کے لئے کافی ہے۔ تو گویا اگر کرۂ ارض کے تمام خشک حصے، کاشت کے قابل بنا لئے جائیں تو چھ ہزار ملین آبادی کی گذراوقات کے لئے کافی ہوں گے۔ اور اگر صنعت و زراعت کی موجودہ ترقی قائم رہی تو چھ ہزار ملین نفوس کرۂ ارض پر نہایت سہولت کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں گے۔

انیسویں صدی کے دو بڑے ماہر اقتصادیات ـــــ ریکارڈو اور مالتھس کا خیال تھا کہ اس وقت انسان نے اگرچہ پیداوار کے بڑھانے کے لئے مختلف سینٹیفک وسائل ایجاد کر لئے ہیں لیکن اس کے باوجود پیداوار، آبادی کی بڑھتی ہوئی رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ صنعتی وسائل بہ نسبت زرعی وسائل کے زیادہ ترقی پذیر ہیں ـــــ انسان نے زراعت سے زیادہ صنعت کی طرف توجہ کی اور اسے ترقی کے آخری زینہ تک پہونچا یا لیکن ان کا یہ خیال تمام ممالک کے لئے صحیح نہیں ہو سکتا۔ ولایات متحدہ میں زراعت کو جس قدر فروغ حاصل ہے وہ صنعت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کو بہت حد تک ابھی ترقی دینے کی گنجائش ہے۔ وہاں کے ماہرین زراعت ہر طریقہ سے زرعی پیداوار کو ترقی دینے اور اس کو آفات ارضی و سماوی سے محفوظ رکھنے کی تدبیریں سوچنے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ زمین کے تمام خشک حصے کو قابل زراعت بنا لینا توسیع زراعت کے سلسلہ میں آخری اقدام ہے کیونکہ سائنس زراعت کی ترقی کے لئے روزانہ جدید وسائل دریافت کرتی رہتی ہے، جو زمین کی پیداوار اور غلہ

زیادتی میں بہت معین ثابت ہوئے ہیں اگر سائنس کے یہ اکتشافات ایڈانس کے ساتھ قائم رہے تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آبادی میں چاہے جس قدر بھی اضافہ ہو جائے مگر خوراک کبھی کم نہیں ہو سکتی

دنیا میں ذخیرۂ طعام کی مختلف قسمیں ہیں۔ جنہیں حسب ذیل طریقہ پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ غلّہ۔ مثلاً گیہوں، چاول

۲۔ ترکاری۔ مثلاً لوبیا، سیم

۳۔ نباتات۔ مثلاً گنا، آلو

۴۔ روغن دار تخم۔ مثلاً تخم روئی، تل

۵۔ بری حیوانات۔ مثلاً بکری، گائے، طیور

۶۔ آبی حیوانات۔ مثلاً مچھلی وغیرہ

یہی ذخیرۂ خوراک ہے جسے زیادہ تر لوگ استعمال کرتے ہیں اور جن پر ہم آگے چل کر اختصار کے ساتھ ہر ایک پر علیحدہ علیحدہ گفتگو کریں گے۔ لیکن اسے ملحوظ رکھنا چاہئے کہ بہت سے ایسے اسباب بھی ہیں جن کا ذخیرۂ خوراک اور پیداوار پر بہت کچھ اثر پڑتا ہے۔ مثلاً (۱) قابلیت زمین (۲) زراعتی معلومات (۳) اسباب رہدگی (۴) ایک جگہ سے دوسری جگہ خوراک کے نقل و حرکت کے وسائل (۵) آبادی سے مرکز غذا کا قرب و بعد۔

قارئین کے دل میں یہ اعتراض پیدا ہو سکتا ہے کہ اقسام خوراک میں ہم نے پھلوں کا کہیں تذکرہ نہیں کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر پھلوں کو غذا میں شمار نہیں کیا جاتا اور عموماً بطور غذا کے استعمال بھی نہیں ہوتے۔

۱۔ غذاؤں میں سب سے زیادہ اہمیت غلہ کو حاصل ہے درحقیقت یہ انسان کی توجہ کا بہت زیادہ مستحق بھی ہے کیونکہ اس میں کالوری (گرمی کی مقدار) بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ ولایات متحدہ کے باشندے غلہ ہی کو اپنی مستقل اور اصلی غذا خیال کرتے ہیں۔ اور مشرق کی تو ایک بڑی جماعت کی غذا کا انحصار محض غلہ پر ہے بخصوصیت کے ساتھ گیہوں، چاول، باجرہ، جو،

جئی اور جاویدار (Rye) کو تو ان کی غذا میں بہت دخل ہے ۔

دنیا میں غلہ کی پیداوار کا ہم ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں کر سکتے کیونکہ مشرقی ممالک کی پیداوار یکسر غیر معروف ہے مگر علماء اقتصادیات نے حسب ذیل مقدار میں اندازہ لگایا ہے ۔

گیہوں	ایک ہزار ملین اردب[1]
جاویدار (Rye)	چار سو " "
ماجرہ	ایک ہزار ملین اردب
جئی (oats)	" " "
جو	چار سو " "
چاول	ایک ہزار " "
دوسرے اقسام کے غلے	چھ سو " "

ان تمام کا مجموعہ تقریباً پانچ ہزار چار سو اردب ہوتا ہے ۔ اور یہ مقدار تقریباً ہر سال پیدا ہوتی ہے ہم ابتدا میں بتا چکے ہیں کہ کل آبادی اٹھارہ ہزار ملین ہے تو گویا فی کس سالانہ ۳ اردب کا اوسط ہوتا ہے اور یہ مقدار ایک شخص کے لئے نہ صرف کافی بلکہ زیادہ ہے ۔

غلوں کی پیداوار کا انحصار مختلف اسباب پر ہے جنہیں محنت اور مصارف کی کمی کو بہت دخل اور اہمیت حاصل ہے ۔ اسی بنا پر جہاں جس کی کاشت میں سہولتیں زیادہ حاصل ہیں اور مزدوری کم لگتی ہے وہاں اس کی کاشت بہت زیادہ ہے مثلاً مشرقی ممالک خصوصاً ہندوستان اور چین میں چاول کی پیداوار بہت کافی ہوتی ہے ۔ اگر وہ تمام وسائل جو غلہ کی پیداوار کے ضمن میں استعمال ہو سکتے ہیں، کام میں لائے جائیں تو موجودہ مقدار میں حیرت انگیز اضافہ ہو سکتا ہے ۔

۲۔ غذا کی دوسری قسم میں ترکاری داخل ہے ـــــ ترکاری قدیم زمانہ سے انسان کی

---

[1] ستر سیر ۱۲ تولہ کا ایک پیمانہ ہوتا ہے ۔

غذا ہے۔ افسوس کہ اس کی پیداوار کا ہمیں صحیح طور پر علم نہیں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک اکثر مشرقی ممالک نے اس کی زراعت کو کسی خاص طرح پر منظم نہیں کیا ہے اس کی علت غالباً یہ ہے کہ بہ نسبت غلہ وغیرہ کے اس کی تجارت میں بہت سی دشواریاں اور مشکلات ہیں اور اس میں نقصان کا بھی بہت زیادہ امکان ہے۔

یہ بالکل واضح ہے کہ ترکاریوں میں عموماً پروٹین (نشاستہ) اور روغنیت کی مقدار بہت کافی ہوتی ہے اس لئے اس میں اس بات کی پوری صلاحیت ہے کہ وہ گوشت کی قائم مقام بن سکے۔ عموماً دیکھا جاتا ہے کہ جن ممالک کی آبادی زیادہ ہے وہاں ترکاری کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے اگر آپ ہندوستان، چین، جاپان اور ان دیگر ممالک کو بغور دیکھیں جہاں آبادی بہت زیادہ ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں ترکاری کی کاشت کو نہایت سرعت کے ساتھ فروغ حاصل ہو رہا ہے اور وہاں ترکاری بتدریج گوشت کی جگہ حاصل کر رہی ہے۔ مشرق میں ترکاری کی کثرت کی ایک سب سے بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں کی بعض قومیں خصوصاً ہندوؤں کی بعض جماعتیں گوشت کا کھانا بالکل حرام سمجھتی ہیں اور وہ اس کمی کو غلہ اور ترکاریوں سے پوری کرتی ہیں۔ چین میں بھی ترکاری بہت کثرت سے استعمال کی جاتی ہے مگر اس کی وجہ گوشت کی گرانی اور ترکاری کی ارزانی ہے یعنی اقتصادی حالات نے ترکاری کے استعمال اور گوشت کے ترک پر مجبور کیا۔ آج کل بعض یورپی قومیں بھی چینی سیم (Soy Beans) کی کاشت پر بہت زیادہ توجہ مبذول کر رہی ہیں کیونکہ اس میں غذائیت اور پروٹین بہت کافی مقدار میں پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ نہایت آسانی سے گوشت کی قائم مقام ہو سکتی ہے اس کے علاوہ اس میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ بہت زیادہ ارزاں ہوتی ہے جسے غربا بھی بغیر کسی زحمت کے استعمال کر سکتے ہیں۔

علمی اور زرعی تحقیقات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ایک ایکڑ زمین کے غلہ میں پروٹین کی جو مقدار ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ اتنی ہی زمین کی پیدا کردہ ترکاری میں ہوتی ہے۔ اسی بنا پر یورپ میں غذا کی کمی اس قدر واقع نہیں ہوتی جتنی چین وغیرہ میں پائی جاتی ہے

اور نہ ایک طویل مدت کے لئے اس قسم کا خطرہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یورپ زرعی کے بجائے صنعتی ملک ہے۔ اس لئے اس کی غذا ترکاری کے بجائے زیادہ تر گوشت ہے لیکن وہ ممالک جو اپنی مصنوعات اور غلے کی نکاسی پر قدرت نہیں رکھتے ان کی کوشش عموماً یہ ہوتی ہے کہ اپنے یہاں کی مروجہ غذا کی کاشت کو بہتر سے بہتر طریقہ پر منظم کریں

۳۔ تیسری قسم میں ہم نے نشاستہ کو رکھا ہے۔ اس میں گنا، چقندر، آلو اور گاجر وغیرہ داخل ہیں۔ ان میں نشاستہ اور کاربوہائیڈریٹ (Carbohydrates) بہت زیادہ ہوتی ہے اور پروٹین اور دہنیت سے بالکل پاک ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود یہ غذائیت میں کسی طرح کم نہیں ہوتیں دوسرے یہ کہ یہ کبھی شاذ و نادر ہی خراب ہوتی ہیں۔

گنے کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ جنگ عظیم سے قبل شکر کی پیداوار دنیا بھر میں ۱۸ ملین ٹن تھی۔ مگر اب اس کی پیداوار ۲۵ ملین ٹن ہے جس میں سے ۱۶ ملین ٹن گنے سے تیار ہوتی ہے بقیہ ——— ۹ ملین ٹن ——— چقندر سے۔ لیکن جنگ عظیم نے بالکل کایا پلٹ دی۔ یہ گنے کے حق میں بہت زیادہ مفید اور چقندر کے حق میں سم قاتل ثابت ہوئی۔ مگر اب اس میں تغیر ہو چلا ہے۔ چقندر کی کاشت اپنی پہلی حالت کی طرف واپس آرہی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اقالیم معتدلہ میں۔

بہر حال ان دونوں کی کاشت کے لئے میدان بہت زیادہ وسیع ہے انہیں اس قدر ترقی دی جا سکتی ہے کہ موجودہ آبادی کے دس گنا اضافہ کے لئے کفایت کر سکتی ہیں۔ و نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پہلا سال ختم نہ ہوگا کہ دوسرے سال شکر کی مقدار ترقی کر کے ۳ ملین تک پہونچ جائے گی۔

آلو کو غذا میں بہت اہمیت حاصل ہے یہ ہر جگہ عموماً اور یورپ و شمالی امریکہ میں خصوصاً بہت استعمال کیا جاتا ہے حتیٰ کہ تقریباً دسترخوان کے لوازمات سے ہو گیا ہے گذشتہ سال اس کی پیداوار تقریباً ۱۲۰ ٹن تھی (واضح رہے کہ روسی پیداوار اس میں داخل نہیں ہے جس کی مقدار بہت کافی ہے) اور یہ عجیب بات ہے کہ یورپ اور امریکہ میں آلو کا جس قدر رواج ہے مشرقی

اقوام میں اسی قدر ناپید ہے۔ حالانکہ یہ بہت ہی زود ہضم ہوتا ہے۔ اس میں نشاستہ، شکر اور اسپرٹ (روح) کافی مقدار میں ہوتی ہے۔ اور انسان و حیوان دونوں کے لئے عمدہ اور طاقت ور غذا ہے۔ اس کی کاشت اوائل عہد سے قائم ہے اور اس میں ابھی اس قدر ترقی کی گنجائش ہے کہ ڈیڑھ سو برس یا موجودہ آبادی کی آٹھ گنی تعداد کی غذا کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔

۴۔ چوتھی قسم میں وہ تخم یا دانے (حبوب) داخل ہیں جن میں تیل ہوتا ہے مثلاً السی، تل وغیرہ ان میں روغن بہت ہوتی ہے مگر نشاستہ نام کو نہیں ہوتا اور اس کے باوجود غذائیت کے لحاظ سے عام غلہ سے بہتر ہوتے ہیں۔ ان کا استعمال غلہ اور ترکاری کے مقابلہ میں بہت کم ہے لیکن ظن غالب ہے کہ مستقبل قریب میں یہ کافی رائج ہوں گے کیونکہ یہ انسان و حیوان دونوں کی غذا بننے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان میں روغن کثرت سے ہوتا ہے جسے کھانا پکانے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے گو اطلاعات اس کی ترقی کی تائید میں نہیں ہیں لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ غذا کا عظیم الشان ذخیرہ ہے جسے فروغ دے کر موجودہ انسانی تعداد کی کئی گنی آبادی کی خوراک کا سامان کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ پانچویں قسم میں پالو بری حیوانات داخل ہیں گو عدم شماری کی بنا پر ان حیوانات کی تعداد کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے جن کا گوشت غذا کے طور پر استعمال ہو سکتا ہے۔ مگر پھر بھی ملاحوف کہا جا سکتا ہے کہ غذا کی یہ قسم بہت بڑی آبادی کے لئے کافی ہے۔ حیوانات کو غذا کے لحاظ سے بھی بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے لیکن افسوس کہ عام طور پر اس کی حفاظت کی طرف سے غفلت برتی جاتی ہے چنانچہ ایک سے زائد مرتبہ اس قسم کے واقعات پیش آئے ہیں کہ بعض حیوانات کے بالکل ختم ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔ جنگ عظیم میں بعض جانور خصوصاً گھوڑے، خچر (بعض ممالک میں ان کا گوشت کھایا جاتا ہے) بالکل ختم کے قریب ہو گئے تھے۔ مگر جنگ کے بعد پھر اپنی سابق حالت پر واپس آ گئے۔

علماء نے اہم حیوانات کی تعداد کا حسب ذیل، تخمینہ کیا ہے۔

گھوڑے، خچر اور گدھے	۱۴ راس

گائے	۵۸۰	راس
خنزیر	۲۰۰	"
بھیڑ بکری	۸۶۰	"
اونٹ اور بھینس	۶۰	"

اس میں شبہ نہیں کہ یہ تعداد محض تخمینہ اور اندازہ ہے اسے حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں کیونکہ اگر اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے تو موجودہ آبادی کی دو چند تعداد کے لئے محض یہی کافی ہیں۔

حیوانات کا خرچ، آسٹریلیا، ارجنٹائن، کناڈا اور ولایات متحدہ میں حسب ترتیب کم ہے۔ ایشیا میں اس کا سب سے کم خرچ ہے کیونکہ اس میں لاکھوں کھا تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو بعض حیوانات کے کھانے کو جائز ہی نہیں سمجھتے۔ مذہب کو درحقیقت گوشت کے بارے میں بہت دخل ہے مثلاً اسلام اور یہودیت میں خنزیر اور بعض دوسرے حیوانات کا کھانا مطلق حرام ہے۔ ہندو دھرم عام طور پر حیوانات کے خون کرنے کے خلاف ہے حتیٰ کہ بعض فرقے محض اس بنا پر اپنا منہ کھلا ہوا نہیں رکھ سکتے کہ سانس کے ساتھ بہت سے کیڑوں کی جان کا خطرہ ہے۔ جاپان میں عام طور پر مچھلی کو دیگر حیوانات پر ترجیح حاصل ہے۔ بہر حال غذا کی یہ قسم ایسی ہے جس کے ختم ہونے کا کسی صورت میں احتمال نہیں اور یہ غذا کا ایسا ذخیرہ ہے کہ اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتا جب تک نظام عالم قائم ہے۔ دوسرے یہ کہ مستقبل میں بہت ممکن ہے بلکہ یقین ہے کہ انسان ان حیوانات کے گوشت کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھے جن کے کھانے میں اسے آج تکلف ہو رہا ہے۔

۶۔ اب غذا کی چھٹی اور آخری قسم ملاحظہ ہو۔ اس قسم میں آبی حیوانات اور مچھلی وغیرہ داخل ہیں۔ یہی ایک ایسی غذا ہے جس کے ختم ہونے کا کبھی بھی امکان نہیں۔ دریا کی مساحت (بیاس) زمین سے چار گنا زیادہ ہے۔ اس کے خزانے بے شمار ہیں۔ انسانی غذا کی صلاحیت رکھنے والے جانوروں کا تخمینہ کرنا، محض ظنی اور اندازہ سے بھی ممکن نہیں ہے۔ بحری حیوانات کثیر التناسل ہوتے ہیں اور ان میں غذائیت بھی بہت کافی مقدار میں پائی جاتی ہے۔ امریکہ میں مچھلیوں کا

استعمال عام طور پر رائج ہے مگر یورپین سواحلی باشندے مچھلی کو غذا کے طور پر بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ غالباً جاپانی ہی ایسی قوم ہے جسے مچھلی بہت زیادہ مرغوب ہے۔ لیکن اب تو اکثر متمدن ممالک میں مختلف انواع، مچھلیوں کی خاص طور پر تربیت کی جاتی ہے۔

اُردو رسم خط میں ایک تبدیلی کا مشورہ

کسی زبان کی بقا و ترقی کے لئے دو باتوں کا ہونا نہایت ضروری ہے۔

۱۔ آسان و مفید ٹائپ

۲۔ پڑھنے میں سہولت

لیکن بدقسمتی سے اُردو ابھی تک ان دونوں باتوں سے محروم رہی ہے ٹائپ کی غیر موجودگی سے اُردو کو جو کچھ نقصان پہنچتا رہا ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔ کاتب سے لکھوانے۔ پتھر پر اتارنے اور پھر چھاپنے میں جو دقتیں پیش آتی ہیں ان سے بھی کوئی بے خبر نہیں کبھی حرف اڑ جاتے ہیں۔ کبھی پتھر ٹوٹ جاتا ہے اور کبھی کاتب بیمار پڑ جاتے ہیں۔

علاوہ ازیں اسی خامی کی وجہ سے اخراجات کی زیادتی کے باوجود اُردو اخبارات و رسائل کو وہ آسانیاں حاصل نہیں جو انگریزی اخبارات و رسائل کو حاصل ہیں۔ اس لئے ایک حد تک اُردو اخبارات کا حلقہ اشاعت انگریزی اخبارات کے مقابلہ میں محدود ہونے کا سبب بھی اسی کو قرار دیا جا سکتا ہے اور اسی سبب سے اُردو اخبارات کے مقابلہ میں ہندی و انگریزی اخبارات کو یہ فوقیت بھی حاصل ہو گئی ہے کہ اُردو اخبارات ہندی و انگریزی اخبارات کی طرح تصاویر نہیں چھاپ سکتے گو عرصہ سے چند اخبارات نے ابتدائی و آخری صفحوں میں تصاویر دینا شروع کر دی ہیں۔ لیکن اس میں ان کا کافی صرفہ ہو جاتا ہے۔

اس میں ان چند ہی نقصانات کے بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہوئے ان باتوں کی تشریح کرتا ہوں جنہوں نے ابھی تک اُردو کو مفید و آسان ٹائپ کے وجود سے محروم رکھا اور اس کے ساتھ ہی اپنی تجویز بھی پیش کرتا ہوں جس کو عملی جامہ پہنانے سے نہ صرف ان نقصانات کی تلافی ہو جائے گی اور انگریزی سے بہتر اُردو ٹائپ بن جائے گا بلکہ اُردو پڑھنا اس قدر آسان ہو جائے گا کہ اس کے سیکھنے میں چند دن سے زیادہ صرف نہ ہوں گے۔ یا بالفاظ دیگر جس قدر جلد کوئی شخص حروف تہجی اچھی طرح پہچاننے لگے گا۔ اسی قدر جلد وہ

اُردو پڑھنا بھی سیکھ جائے گا۔

ٹائپ کے لئے حرفوں کا علیحدہ علیحدہ ہونا نہایت ضروری ہے یا اگر ایک دوسرے سے ملے ہوئے بھی ہوں تو اس طرح کہ ان کی حقیقی شکل میں کسی قسم کا فرق واقع نہ ہو۔ لیکن اُردو کے موجودہ رسم الخط میں اس کے بالکل برخلاف ایک حرف دوسرے حرف سے اس طرح چھوٹے چھوٹے شوشوں اور قوسوں کے ذریعہ ملا ہوتا ہے کہ ایک خاص حصہ بانشانی کے علاوہ اس حرف کی حقیقی شکل قطعاً باقی نہیں رہتی۔ یہی نہیں بلکہ مقام استعمال و موقع کے اعتبار سے یہ حصہ بانشانی بھی بدلتی رہتی ہے۔ مثلاً "عرب" اور "ربع" میں ایک ہی حرف استعمال ہوتے ہیں لیکن دونوں جگہ حروف کی شکل ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ اس لئے اب اگر اُردو نستعلیق ٹائپ بنایا جائے تو ان دو لفظوں کے لئے تین کے بجائے چھ حرف رکھنا پڑیں گے لیکن اگر ان ہی لفظوں کو متصل حروف کے بجائے علیحدہ علیحدہ حروف کے ذریعہ لکھا جائے تو صرف تین ہی حروف درکار ہوں گے۔ مثلاً "عرب" کو "ع ر ب" اور "ربع" کو "ر ب ع" لکھا جائے تو جائے استعمال بدلنے کے باوجود حروف کی شکل میں اختلاف نہیں ہوتا۔

حروف کی اشکال کی تبدیلی سے زیادہ ان کے ملانے والے شوشوں و قوسوں کی کثرت اُردو ٹائپ کی راہ میں حائل ہے۔ ایک ہی حرف کو مختلف حروف سے ملانے کے لئے مختلف شوشے استعمال کرنا پڑتے ہیں۔ مثلاً جب "ب" یا اسی قسم کے دوسرے حروف "ن۔ت۔ر۔ وغیرہ" کو "ح د۔ر۔ط۔ی وغیرہ" سے ملاتے ہیں تو ہر حرف کے لئے ایک مخصوص شوشہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ الفاظ:-

بخت - بد - بر - بط - بی

کو غور سے دیکھئے۔ ہر شوشہ دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ اس اعتبار سے اُردو نستعلیق ٹائپ میں صرف ایک حرف کے لئے پانچ شوشے رکھنا پڑیں گے جو بجائے خود مکمل حروف کے برابر ہوں گے۔ لیکن اب ان ہی الفاظ کو علیحدہ علیحدہ حروف کے ذریعہ

ب خ ت ب د ب ر ب ط ب ی

کی طرح لکھا جائے تو صرف ایک ہی حرف سے کام نکل جاتا ہے۔ اس کے بعد الفاظ

شاہ ۔ نامہ ۔ شہر ۔ بارہ[1]

کو دیکھئے ہائے ہوز موقع و محل کے لحاظ سے چار مختلف طریقوں سے لکھی گئی ہے اور ہر جگہ اس کی شکل جدا جدا ہے ۔ لیکن اگر ان ہی الفاظ کو

ش ا ہ   ن ا م ہ   ش ہ ر   ب ا ر ہ

کی طرح لکھئے تو تین حروف کی بچت ہو جاتی ہے ۔ غرضکہ اس طرح اشکال حروف کی تبدیلی اور شوشوں کی کثرت نے اردو ٹائپ کی راہ میں سینکڑوں شکلیں حائل کر دی ہیں اور یہی وجہ تھی کہ برسوں کی کوششوں و دماغ سوزیوں کے باوجود بھی کوئی صاحب ایک عرصہ تک اردو نستعلیق ٹائپ بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے ۔ اگرچہ عبدالکریم صاحب حسینی کی کوششیں ایک حد تک بارآور ہوئیں اور اردو نستعلیق ٹائپ بن گیا جس کے لئے صاحب موصوف قابل تحسین و مبارکباد ہیں لیکن شوشوں اور اشکال حروف کی کثرت نے اس ٹائپ کی کامیابی میں بھی وہی موانع پیدا کرئے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے ۔

آج کل اردو اخبارات اور خاص کر روزناموں کو ٹائپ کی شدید ضرورت ہے کتابت و طباعت میں جو ایک ہی عمل کا اعادہ کرنا پڑتا ہے اس میں بہت سا وقت ضایع ہو جاتا ہے حسینی صاحب کے ٹائپ میں اعادۂ عمل کے بجائے مخصوص شوشوں اور مستعمل حروف کی مقامی شکلوں کی تلاش میں کم و بیش وہی وقت پیش آتی ہے اور کافی وقت صرف ہو جاتا ہے جس کے باعث عجلت کے مضامین اور روزانہ اخبارات کی طباعت و اشاعت میں وہ آسانی کسی طرح بھی پیدا نہیں کی جا سکتی جو انگریزی اخبارات کو حاصل ہے ۔ لیکن اگر ہر لفظ کے حروف کو علیحدہ علیحدہ بغیر ملائے ہوئے لکھا جائے تو پھر انگریزی ٹائپ سے بھی زیادہ آسانی پیدا ہو جائے گی ۔ کیونکہ انگریزی کے چھوٹے بڑے حروف (capital and small letters) کی کل تعداد اردو کے حروف تہجی سے تقریباً ڈیڑھ گنی زیادہ ہے ۔

---

[1] اگرچہ ہائے مخلوط (ھ) بھی ہائے ہوز ہے ۔ لیکن اس کے مخلوط التلفظ ہونے کی صفت کے باعث اس کو ایک علیحدہ حرف قرار دیتے ہوئے یہاں اس کا ذکر نہیں کیا گیا ۔

اب میں ٹائپ کو چھوڑ کر اپنے مضمون کے دوسرے حصہ پر بحث کرتا ہوں جو اس سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

اُردو نہ تو حکمراں قوم کی زبان ہے اور نہ اس کو اب سے پچاس سال قبل کی طرح پورے ملک کی حمایت و سرپرستی حاصل ہے۔ بلکہ اب اس کو انگریزی و ہندی کا مقابلہ کرنا ہے۔ جن میں سے ایک تو حکومت کی سرپرستی میں جڑیں پکڑ رہی ہے اور دوسری اکثریت کی حمایت سے پروان چڑھ رہی ہے ایسی صورت میں صرف ایک ہی شے ہے جو لوگوں کو اس کی طرف رغبت دلا سکتی یا اس کے حاصل کرنے کے لئے آمادہ کر سکتی ہے اور وہ "پڑھنے میں سہولت" ہے۔

اگر ایک شخص کو معلوم ہے کہ وہ دو دن میں اُردو پڑھنا سیکھ جائے گا تو یقین کیجئے ہندو ہونے کے باوجود اور "ہندی اُردو قضیہ" کی پیدا کردہ متعصبانہ فضا کے زیر اثر ہوتے ہوئے بھی وہ اُردو سیکھنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ لیکن اس کے برخلاف اگر اُردو پڑھنے میں وقت ہوتی ہے اور اس کے حصول کے لئے زیادہ وقت درکار ہوتا ہے تو ایک مسلمان بھی کچھ عرصہ تک کوشش کرنے کے بعد اکتا کر چھوڑ دے گا۔ یہ یاد رکھیے ایک شخص قومیت کے نام پر اپنے وقت کو قربان کرنے کے لئے تیار ہو سکتا ہے لیکن اپنی آسان طلب فطرت پر غالب نہیں آسکتا۔

اگرچہ اُردو میں ایسی خوبیاں موجود ہیں جو اس کو ہندی و انگریزی سے بالاتر ثابت کرتی ہیں اور جن کا اعتراف منشی پریم چند نے بھی کیا ہے تاہم ابھی اس میں وہ آسانیاں موجود نہیں جو انگریزی کی بڑھتی ہوئی ترقی کے مقابل اُردو کا پرچم لہرا سکیں یا ہندی سیلاب کو روک سکیں جو اکثریت و متمول طبقہ کی زیر حمایت برابر آگے بڑھ رہا ہے ایسی صورت میں یہ ہمارا فرض ہونا چاہئے کہ اُردو میں جو خامیاں ہیں ان کو دور کرکے اس کی اصلاح کریں اور اسے اس قدر آسان بنا دیں کہ حکومت و اکثریت دونوں کو ہمارے سامنے جھکنا پڑے۔ ورنہ بصورت موجودہ اس کی کامیابی کسی طرح بھی یقینی نہیں کہی جا سکتی۔

اُردو کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تو یہ ہے کہ اس کے پڑھنے میں بہت دقت ہوتی ہے اور یہ دقت تمامتر حروف کے اتصال کے باعث ہے۔ حرفوں کی حقیقی اشکال سے تو طالب علم ابتدا ہی میں واقف ہو جاتا ہے اور کسی قسم کی دقت کا سامنا کرنا نہیں پڑتا لیکن حرفوں کے اتصال

سے جو مقامی شکلیں پیدا ہوتی ہیں ان کا سمجھنا ایک مبتدی کے لئے نہایت دقت طلب امر ہے کیونکہ ان سے وہ اس وقت تک واقف نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہ بار بار اس کی نظر سے گذر کر ذہن میں نقش نہ ہو جائیں اور اس کے لئے کافی وقت درکار ہوتا ہے اور ایک شخص زیادہ عرصہ تک اپنے ارادہ پر اسی قوت قائم رہ سکتا ہے جبکہ جو کچھ وہ پڑھتا جائے وہ اس کے سمجھ میں آتا جائے ۔ کیونکہ اس طرح اسس کو اپنی کامیابی پر انتہائی مسرت ہوتی ہے جو اس کی دلچسپی کو بڑھادیتی اور آگے پڑھنے کے لئے آمادہ کرتی ہے لیکن اردو میں اس کے برعکس طالب علم اس دوران میں حرفوں کی تبدیلیوں اور حروف کی مقامی اشکال کی یکسانیت کی بھول بھلیوں میں پھنس کر گھبرا جاتا ہے ۔

ایک طالب علم کو حروف تہجی یاد کرنے کے دوران میں معلوم ہوتا ہے کہ ہائے ہوز کی شکل " ہ " کی طرح ہے لیکن جب وہ لفظ " ہار " پڑھتا ہے تو اس کو بتایا جاتا ہے کہ اس کا پہلا حرف ہائے ہوز ہے جو پہلی شکل سے بالکل مختلف ہے اس کے بعد جب وہ لفظ " شہر " پر پہنچتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس کا دوسرا حرف ہائے ہوز ہے ۔ جو پہلی و دوسری دونوں شکلوں سے مختلف ہے ۔ پھر لفظ " نامہ " آنے پر بتایا جاتا ہے کہ اس کا آخری حرف ہائے ہوز ہے جو پہلی دوسری اور تیسری تینوں شکلوں سے مختلف ہے ۔ اب سنائیے ایک مبتدی جو آسانی کا متلاشی ہوتا ہے کیا گھبرا نہ جائیگا کیا وہ ان سب کو یاد رکھ سکے گا کیا یہ خیال اس کو بددل نہ کر دے گا کہ شاید ہائے ہوز ابھی اور باقی ہوں یا جس طرح ہائے ہوز کئی ہیں اسی طرح دوسرے حروف بھی کئی کئی ہوں گے ۔

لفظ " معمر " کو لیجئے ۔ اس میں " ع " اور " ر " کی شکلیں ان شکلوں سے بالکل مختلف ہیں جن کو ایک طالب علم شروع شروع میں پڑھتا ہے اس طرح لفظ " مآب " میں اول تو " م " کی شکل اصل شکل سے مختلف اور پھر " م " کے الف ممدودہ سے مل جانے کے باعث ایک ایسی شکل بن جاتی ہے جو طالب علم کے لئے بالکل نئی ہوتی ہے اور جس کا سمجھنا اس کے لئے مشکل ہو جاتا ہے ۔

اشکال حروف کی کثرت سے زیادہ بعض حروف کی یکسانیت طالب علم کے انتشار کا باعث ہوتی ہے ۔ لفظ " بد " کو دیکھئے ۔ " د " کی شکل اس کی حقیقی شکل سے ذرا بھی متشابہ نہیں ۔ اس کے

برخلاف " ر " سے ملتی جلتی ہے اس لئے شروع شروع میں طالب علم " بد " " بر " پڑھتے ہیں لیکن جب ان کو بتایا جاتا ہے کہ یہ " ر " نہیں " بد " ہے تو پھر وہ " بر " کو " بد " پڑھنے لگتے ہیں۔ کیونکہ مبتدی کی نظر کسی چھوٹے چھوٹے اختلافات پر نہیں پڑتی۔ برخلاف اس کے آنے والے الفاظ میں چھپے ہوئے حروف کے ساتھ مشابہت کا متلاشی ہوتا ہے۔ مجھے خوب خیال ہے کہ جب میں ابتدائی درجہ میں پڑھتا تھا تو ایک ہندو لڑکے نے جو نیا نیا داخل ہوا تھا " کا " کو " کھا " پڑھا تھا۔ جس پر عرصہ تک بیچارہ کا مذاق اڑتا رہا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ہم سب سے زیادہ عقلمند تھا اس نے جو کچھ سمجھا اور پڑھا وہ قاعدہ اور عقل کے عین مطابق تھا۔ " کا " کا تجزیہ کیجئے آپ کو اس کا ثبوت مل جائے گا

لفظ " ہالہ " پر غور کیجئے۔ اس کے دوسرے حرف " ا " اور تیسرے حرف " ل " کی شکل میں ذرا سی فرق نہیں۔ اس لئے طالب علم اس وقت تک ان دونوں میں امتیاز نہیں کرسکتا جب تک کہ تشریح کرکے بتایا نہ جائے کہ ایسی یکساں اشکال میں " ا " کے بعد کوئی حرف ملا ہوا نہیں آتا اور " ل " میں اس کے برعکس ہوتا ہے لیکن اس قسم کی تشریحات کی جگہ جگہ ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے ان کو یاد رکھنا انتہائی مشکل ہو جاتا ہے اور یہ بجائے تسلی کے طالب علم کے ذہنی انتشار کا باعث بن جاتی ہیں،

ایک اور مشکل یہ ہے کہ شوشے اور نقطے چھوٹے چھوٹے اور قریب قریب ہوتے ہیں اس لئے مبتدیوں کو یہ تمیز کرنے میں انتہائی دقت ہوتی ہے کہ کون نقطہ کس شوشہ سے متعلق ہے اور بعض اوقات تو بڑی سخت غلطی کر جاتے ہیں مجھے یاد ہے کہ جب میں چوتھے درجہ میں پڑھتا تھا تو ایک جگہ لفظ " انجم " کتاب میں آیا۔ میں نے اس کو " اَ ب خ م " پڑھا تھا۔ جس پر ماسٹر صاحب بے انتہا ناراض ہوئے۔

شوشوں کے قرب کے علاوہ ایک خامی یہ ہے کہ اگر کسی لفظ میں (ی یا ے) دو حرفوں کے درمیان ملی ہوئی آتی ہے تو کوئی یہ تمیز نہیں کرسکتا کہ آیا وہ یائے مجہول ہے یا یائے معروف اس لئے جن طلباء کو ایسے الفاظ کا تلفظ معلوم نہیں ہوتا وہ یائے مجہول کی جگہ یائے معروف اور یائے معروف کی جگہ یائے مجہول پڑھ جاتے ہیں لفظ " بیری " کو دیکھئے۔ آپ کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ شوشوں اور یائے مجہول و معروف میں امتیاز نہ ہونے کے باعث کس قدر غلط فہمیاں ہوتی ہیں۔ بظاہر شکل کے

اعتبار سے تو یہ صرف ایک ہی لفظ معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقتاً تین لفظ ہیں جن کا تلفظ اور حروف دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان میں پہلے لفظ کے معنی تو اس تنے کے ہیں جسے عوام سگریٹ کی جگہ پر استعمال کرتے ہیں۔ دوسرے کے بجروں کی زنجیر اور تیسرے کے آلۂ برقی۔ اس لفظ کو مختلف اشخاص سے پڑھوا کر دیکھئے۔ کوئی پہلے معنی کے لحاظ سے پڑھے گا۔ کوئی دوسرے اور کوئی تیسرے لیکن اگر

ب ی ڑ ی　　ب ے ڑ ی　　ب ے ٹ ر ی

کی طرح علیحدہ علیحدہ حروف کے ذریعہ لکھئے تو کسی قسم کی غلطی کا احتمال باقی نہیں رہتا اور چند دن کا مبتدی بھی ہر لفظ کو تھوڑی سی کوشش کے بعد آسانی سے صحیح صحیح پڑھ سکتا ہے۔

اس پر بعض صاحبان یہ فرمائیں گے کہ ان ہر سہ الفاظ کو ان کے موقع و محل کے اعتبار سے صحیح پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کے جواب کے لئے صرف اسی قدر کہہ دینا کافی ہوگا کہ نقص ہر حالت میں باقی رہتا ہے اور کیا یہ ممکن نہیں کہ بعض جگہ تین یا دو مطالب پیدا ہوتے ہیں۔

آپ نے اکثر تجربہ کیا ہوگا کہ جب طلباء نے اردو شروع کی ہو اگر ان کو "دل آزاری" کی طرح ایسے الفاظ دیئے جائیں جن میں حروف علیحدہ علیحدہ ہوں تو وہ آناً فاناً پڑھ دیتے ہیں۔ مگر چونکہ الفاظ ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوتے ہیں اس لئے بعض اوقات ایک لفظ کے حرف کو دوسرے لفظ کے حرف سے ملا دیتے ہیں۔ لیکن اگر ایسی عبارت لکھی جائے جس میں حروف کے ساتھ الفاظ بھی ایک دوسرے سے علیحدہ ہوں تو یہ غلطی بھی باقی نہیں رہتی اور پڑھنے میں انتہائی سہولت پیدا ہو جاتی ہے ذیل میں اس عبارت کا ایک نمونہ دیا جاتا ہے

ت[1] م　ک و　ج س　ع ل م　ک ی　ض ر و ر ت　ہ ے　و ہ　و ہ
ع ل م　ہ ے　ج و　ت م ھ ا ر ی　س ا ک ن　و　پ ژ م ر د ہ
ق[2] و و ت و ں　ک و　م ت ح ر ک　ا و ر　ش گ ف ت ہ　ک ر د ے

---

[1] تم کو جس علم کی ضرورت ہے، وہ وہ علم ہے جو تمہاری ساکن و پژمردہ قوتوں کو متحرک اور شگفتہ کر دے۔

[2] یہاں تشدید کے بجائے ایک حرف کو دو کر لکھا گیا ہے اس طرح تشدید کی ضرورت نہیں رہتی

آپ کو اس عبارت کے پڑھنے میں الجھن ضرور محسوس ہوگی اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ اس قسم کی عبارت پڑھنے کے عادی نہیں اور برسوں سے متصل حروف سے لکھی ہوئی عبارت پڑھتے آرہے ہیں لیکن جب اس کے عادی ہو جائیں گے تو موجودہ رسم خط کی عبارت سے زیادہ جلد اور آسانی کے ساتھ پڑھ سکیں گے اس عبارت کو ایک چند دن کے طالب علم کو دیجئے جو صرف حروف کی شکلوں کو پہچانتا اور زیر و زبر و پیش کے استعمال سے واقف ہو۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ بغیر آپ کی رہنمائی کے تھوڑی سی کوشش کے بعد آسانی سے پڑھ لیتا ہے اس سے خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اگر یہ رسم خط جاری ہو جائے تو اردو پڑھنے والوں کی تعداد میں کم از کم ۵۰ فی صدی کا اضافہ ہو جائے گا اور جو اخبارات و رسائل اس رسم خط میں شائع ہوں گے نہ صرف ان کے اخراجات میں کمی اور طباعت و اشاعت میں آسانی پیدا ہو جائے گی بلکہ ان کا حلقہ اشاعت بھی موجودہ رسم خط کے اخبارات سے وسیع ہوگا۔

بعض اصحاب یہ اعتراض کریں گے کہ تجویز کردہ رسم خط موجودہ رسم خط کے مقابلہ میں زیادہ جگہ گھیرے گا۔ جواباً عرض ہے کہ موجودہ رسم خط میں حروف کی مقامی شکلیں اس قدر چھوٹی ہوتی ہیں کہ کاتب اس سے زیادہ باریک عبارت نہیں لکھ سکتے جتنی آج کل کے اخبارات میں لکھی جاتی ہے اور اگر لکھ بھی سکیں تو پڑھنے میں انتہائی دقت ہوگی۔ لیکن نئے رسم خط کی عبارت ٹائپ کی مدد سے کاتب سے کہیں زیادہ باریک لکھی جاسکے گی اور چونکہ حروف مکمل اور علیحدہ علیحدہ ہوں گے۔ اس لئے پڑھنے میں بھی کسی قسم کی دقت نہ ہوگی اور ایک حد تک اس نقصان کی تلافی ہو جائے گی لیکن اگر اس کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو اس رسم خط کے فوائد اس قدر زیادہ ہیں جن کے سامنے تھوڑے سے کاغذ کے نقصان کی کچھ حقیقت نہیں۔

ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ ان کلمات کے لکھنے کی کیا صورت ہوگی جن میں حروف شمسی اور قمری استعمال ہوئے ہوں۔ میری رائے میں اس کی بہتر اور آسان صورت یہ ہو سکتی ہے کہ حروف قمری میں سے "ا" اور حروف شمسی میں سے "ال" کو نکال دیا جائے۔ لیکن اگر آپ اس

اخراج کے لئے تیار نہیں تو حروف شمسی و قمری کے کلمات " نورالشمس " اور " نورالقمر " کو بالترتیب " ن ور الؒ ش ش م س " اور " ن ور اِل ق م ر " لکھا جاسکتا ہے لیکن اس صورت میں وہ آسانی ممکن نہیں جو اخراج کی صورت میں پیدا ہو جاتی۔

اب صرف ایک بات باقی رہ جاتی ہے۔ وہ یہ کہ اگر یہ رسم خط جاری ہو جائے تو عام خط و کتابت کے لئے کونسا رسم خط ہوگا۔ چونکہ اختصار نویسی میں اُردو کے موجودہ رسم خط کو باقی رکھنا ضروری ہے لیکن اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو وقّت پڑھنے میں ہوتی تھی وہ اب لکھنے میں ہوا کرے گی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ لوگ جو بصورت دیگر جاہل مطلق رہجاتے یا وہ جو اُردو کی طرف توجہ بھی نہ کرتے کم ازکم اُردو پڑھنا تو سیکھ جائیں گے جس سے اُردو کی ترقی اشاعت میں بہت مدد ملے گی۔ علاوہ ازیں کچھ نہ کچھ عرصہ تک اردو پڑھنے کے بعد ان لوگوں کو بھی یہ خیال ضرور ہوگا کہ لکھنا سیکھ کر اس کی تکمیل کرلی جائے جو اُردو زبان کا سب سے اہم حصہ ہے اور جس کے باعث اُردو کو دیگر زبانوں پر برتری و فوقیت حاصل ہے۔ اور اگر اس کثیر تعداد میں سے کچھ لوگ نہ بھی سیکھیں گے تو وہ اس نئے رسم خط کے ذریعہ اپنا کام نکال سکیں گے۔

لہ غیر ملفوظ یا خاموش (Silent) حروف کے نیچے نشان (ـ) لگا دیا ہے اس سے طالبعلم کو پڑھنے اور سمجھنے میں بہت آسانی ہو جائے گی۔

ادب اور سماج

(اپریل ۱۹۳۵ء میں اندور میں جو آل انڈیا ہندی ادبی کانفرنس ہوئی تھی اس میں بعض حوصلہ مند ادیبوں نے یہ طے کیا تھا کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں کا ایک ادبی وفاق قائم کیا جائے اس مقصد کے حصول کے لئے سب سے پہلی تجویز یہ تھی کہ ایک ہندی رسالہ نکالا جائے جس میں ہندوستان کی مختلف زبانوں میں جو ادب شائع ہو رہا ہے اسے پیش کیا جا سکے اس خیال کے حامیوں میں منشی پریم چند بھی تھے اس لئے ان کے رسالہ "ہنس" کو ہی اس کام کے لئے منتخب کیا گیا اکتوبر ۱۹۳۵ء سے "ہنس" برابر ہندوستان کی مختلف زبانوں کا ادب ہندی زبان میں پیش کر رہا ہے ذیل میں اسی رسالہ کے ایک مضمون کو ہم درج کر رہے ہیں۔ ہم اس مضمون کو جس طرح یہ "ہنس" میں شائع ہوا ہے ٹھیک ویسے ہی اردو رسم الخط میں نقل کر رہے ہیں اس سے اردو داں طبقہ کو اندازہ ہو سکے گا کہ "ہنس" میں کس قسم کی زبان کو استعمال کیا جاتا ہے اس مضمون کا ہندی کے سلیس اور فصیح مضمونوں میں شمار کیا جا سکتا ہے اس کی زبان غیر معمولی طور پر صاف اور سنسکرت کی گرانباری سے پاک ہے دوسرے مضمونوں کی زبان اس سے کہیں زیادہ کٹھن ہوتی ہے۔ اس کے شائع کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہمارے اہل ذوق قارئین اور خصوصاً ہمارے زبان کے ادیب اور مصنف ہندی ادب کی رفتار ترقی سے واقف ہو سکیں اور اپنی زبان کو وسیع اور ہمہ گیر بنانے کے لئے ضروری اصلاحی تدبیروں کو اختیار کر سکیں)۔

ایک سمے تھا جب ساہتیہ (ادب) کا سماج کے ساتھ کوئی وشیش سمبندھ نہیں تھا۔ پرنتو اس یگ میں ایسا نہیں ہے آج کل ساہتیہ سماج سے الگ نہیں کیا جا سکتا وہ زمانہ گیا جب "حیدر کانا" اور "حاتم طائی" کی دھوم تھی۔ دور کیوں جائیے۔ ایک ہمارے متر ہیں جو اب بھی کبھی کبھی "طوطا مینا"

کی کہانی پڑھا کرتے ہیں۔ یدی ان سے کوئی پوچھے کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں تو یہی کہیں گے "طبیعت نہیں مانتی"۔ "لیلیٰ مجنوں" "شیریں فرہاد" "گل بکاولی" کی کہانیاں کیا ہم اور آپ چاؤ سے فلم میں نہیں دیکھتے ہیں؟ والیس (Wallace) اور گاروِس (Garvis) کا یگ سماپت نہیں ہوا ہے۔ انگلینڈ کے Penny Dread- اور Shilling Shockers fuls اب تک مشہور ہیں۔ مگر جو کچھ ہو ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ سنسار کی رُچی ایسی ہے۔ جو ساہتیہ کے سچے اور گہرے پریمی ہیں وے ساہتیہ کو دوسری کسوٹی پر رکھتے ہیں۔ ان کا دھیئے دوسرا ہوتا ہے۔ وے تکیوں کے نیچے رکھی ہوئی کہانی کی پستکوں پر سنتُشٹ نہیں ہوتے۔ وے مینی تال کی جھیل کے کنارے بیٹھے ہوئے مچھلی ماروں میں سے نہیں ہیں جو مچھلی بھی مارتے ہیں اور کہانیاں بھی پڑھتے جاتے ہیں۔ وے دھیرج اور ایکاگرتا کے ساتھ ساہتیہ کا ادھین کرتے ہیں اور وے ہی ہم کو اور آپ کو بتائیں گے کہ سماج اور ساہتیہ کا کیا سمبندھ ہے۔

جوں جوں سماج نے اُنتی کی اس کا پربھاؤ ساہتیہ پر پڑتا گیا۔ ایک زمانہ وہ تھا جب ہندی ساہتیہ میں "چندرکانتا" ہی مشہور تھی۔ آج وہ سمے ہے جب لوگوں کو "سیوا سدن" پسند آتا ہے۔ کتنا پریورتن ہو گیا! اس کا کارن یہی ہے کہ رُچی کے انوسار ساہتیہ کا بھی رنگ بدل گیا۔ لوگوں نے اپنا نیا ساہتیہ بنایا۔ ساہتیہ میں مہتو آ ہی نہیں سکتا جب تک وہ سماج سے دور رہے گا۔ چودھویں شتابدی کے فرینچ لیکھک بکیچیو (Boccaccio) کو لیجئے۔ اس کی کہانیاں سنسار میں مشہور ہیں۔ کئی ایک بھاشاؤں میں وہ چھپیں۔ انگلینڈ کا سب سے پہلا کوی چوسر (Chaucer) بھی اسی سمے میں ہوا۔ اس کی کنٹربری ٹیلس (Canterbury Tales) کو لیجئے، زمین اور آسمان کا انتر ہے۔ بکیچیو نے من کو لبھانے والی کہانیاں لکھیں اور کداچت سنسار میں ایسے بہت کم ہیں جو اس کے سمان لکھ سکیں۔ پرنتو وہ پھر بھی سماج سے دور تھا۔ چوسر کی کہانیوں میں سماج کا پرتی بنب دکھائی دیتا ہے۔ اس نے اپنی کہانیوں میں سماج کے بھِنّ بھِنّ انگوں کی کڑی آلوچنا کی۔ اس نے مانو ہردیہ کے ساتھ ساتھ مانو سماج کا بھی ادھین کیا تھا۔ اس نے سماج کو اپنی آنکھوں سے

دیکھا تھا۔ یہی کارن ہے کہ اس کا جیہ ز چیترن بڑا ہی سچا ہے اور اسی کارن اس کی کتا میں بہتو ہے۔

جب جب ساہتیہ سماج سے الگ ہوا ہے اس میں وہ جان نہیں رہی ہے وہ سُندر ہو پرنتو اس میں جیون اتپادک شکتی نہیں رہتی ساہتیہ تو ایک پرکار کا درپن ہے جس میں سماج کی مورتی صاف صاف دکھائی دیتی ہے۔ یدی لیکھک یا کوی اسے سماج کا انگ سمجھتا ہے تو اس کی کرتیوں میں سماج اوشیہ جھلکے گا۔ اور یدی وہ اپنے کو اپنے یُگ سے الگ رکھے گا تو اس کی کتابوں میں ایک عجیب طرح کا سوار ہوگا وہ یہی سمجھے گا کہ وہ کلاکار ہے اور اس کے ہردیہ کو پرتی دن کے پرسوں سے کوئی سمبندھ نہیں۔ پرنتو اس کا ارتھ یہ نہیں ہے کہ وہ گرجے کے پادری کے سمان کھڑا ہو کر سنسار کو کھری کھری سنائے ساہتیہ یعنی سچا ساہتیہ وہی ہے جس میں زبردستی کی شکشا نہ دی جائے کسی کے گلے میں کڑوی دوا ٹھونسنے سے کیا لابھ؟ کیا اور کوئی طریقہ نہیں ہے کہ ساہتیہ مانو جیون پر پربھاؤ ڈالے؟ یہی ایک ایسی بات ہوتی ہے جس سے بہت لوگوں کو ٹھوکر کھانی پڑی ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لیکھک یا کوی ہماری طرف گھور گھور کر دیکھ رہا ہے اور کہتا ہے "یہ دیکھو یہ بُرا ہے وہ بُرا ہے سنسار میں یہ اوگن ہیں اور ان کو ٹھیک کرو۔ میں یہاں سے سب دیکھ رہا ہوں" تو ہم جھلا پڑتے ہیں ایسے لیکھک یا کوی اور ایک نٹ میں کیا انتر؟ نٹ بھی تو رسی اور بانس پر اٹکا ٹنگ کر ہماری اور پرسنتا سے تاکتا ہے۔

ساہتیہ میں شکشا ہونا تو اُچت ہے۔ پرنتو اسے 'پرتکش روپ سے' پرکشش روپ سے نہیں۔ یدی ساہتیہ جیون کا درپن ہے تو اسی درپن میں جیون کے لئے بل او شکتی ملنی چاہئے۔ سنسار کے جتنے بڑے کلاکار ہوئے ہیں' انھوں نے پہلے اپنا دھرم یہی سمجھا کہ وے جیون کے رہسیہ کو ڈھونڈھیں اور پرکھیں' اور سب لوگوں پر چھوڑ دیں کہ وے اس پرکھ میں اپنے لئے ادھار اور شکتی ڈھونڈھیں۔ ہماری اپنی ہندی میں ابھی اس بات کی کمی ہے۔ اُردو میں جیسے "لیلیٰ مجنوں" اور "گل و بلبل" کے بھوت اب تک شاعروں کو تنگ کرتے ہیں اسی پرکار ہندی کے کویوں پر بھی کئی بھوت سوار ہیں۔ "لکیر کے فقیر" ہی ان کے لئے ٹھیک ہے۔ یدی ان سے کوئی پوچھے کہ کیوں صاحب کیا

آپ دوسرے ڈھنگ پر نہیں آ سکتے ؟ تو ناک سکوڑ کر یہی کہیں گے " دوسرا تو کوئی ڈھنگ ہی نہیں ہے "
بیچارے اندھے سورداس اور گوسوامی تلسی داس کی تو مٹی ہے ۔ جس نے چاہا اس نے روئی کے سمان
انہیں دھن ڈالا اور کہیں اتفاق سے ایسے مہاتمے آدھونک ٹیگ کی طرف جھک جاتے ہیں تو دیکھیئے
کیا کرتے ہیں ؟ بس پھر شکتا ہی دیے لگتے ہیں ۔ کہانی لیکھکوں میں ہمارے یہاں بہت کم ایسے ہیں
جنہیں ہم اونچا استھان دے سکتے ہیں ۔ پریم چند جی کا نام کوئی نہیں بھول سکتا ۔ وے بھی شکشا دیتے
ہیں ۔ پر تو کم سے کم اوروں کے سمان یہ تو نہیں کہتے کہ دنیا میں دودھ ہی کی دوکانیں ہیں شراب کہیں
بکتی ہی نہیں ' ایسے ہی مہا لو مہاؤ ہمارے ساہتیہ کو اونچے استھان پر بٹھا سکتے ہیں ۔

ساہتیہ کو جیون سے الگ کرنا ایسا ہی ہے جیسے بیوی کو میاں سے ۔ یہ سچ ہے کہ آج کل
طلاق کا زمانہ ہے ۔ پر تو خیر ہمارے یہاں اتنا زور نہیں ہے ۔ ساہتیہ پر جیون کی چھاپ سدا رہتی ہے
آج کل کے روسی ناٹکوں کو دیکھیئے ۔ ان میں روس کی ورتمان سمیتی کا کتنا سچا درشن ہے ایسے بہت
سے ناٹک ہیں جن میں ہمیں آج کل کی روسی تعمیر اور وچار دھارا کا پربھاؤ دکھائی دیتا ہے ۔

"Inga" by (انگا) Anatole Clebou "Tempo" by (ٹیمپو) Nikolai Pogodin
"Bread" by (بریڈ) Kirshon Viladimar
"Fear" by Alexandar Afinogenyev. (ڈیئر)

وغیرہ ناٹک آدھونک روس کی ٹھیک ٹھیک تصویریں ہیں ان ناٹکوں کا پہلا دھیئے یہی ہے کہ
وے لوگوں کو کمیونزم (Communism) کا پاٹھ پڑھائیں ۔ وے اپنی جنتا اور ان کی
کٹھنائیوں کا سچا چتر کھینچتے ہیں ۔ انہیں چتروں میں ہمیں سچی شکتا دکھائی دیتی ہے ۔ آدھونک انگریزی
ساہتیہ کو دیکھیئے ۔ وہ بھی آدھونک انگلینڈ سے الگ نہیں ہے ۔ اس میں بھی انگلینڈ کی ورتمان دشا
کا چتر ہے ۔ پرنتو ہمارے یہاں دوسری حالت ہے ۔ ہم اور ہمارے وچار اتنے دقیانوسی ہیں کہ ہم
دھرم پران بھی کریں گے تو اپنے لکڑ دادا ہی کے حقے کو پئیں گے ۔ دوسرا خریدیں گے ہی نہیں یہی کارن
ہے ہمارے ساہتیہ میں اب تک سچی سمالوچنا کے لئے کوئی استھان نہیں ہے ۔ ہم اب بھی باتوں کو دوہراتے

ہیں اور ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ کسی کی کیا مجال ہے کہ تلسی داس پر انگلی اٹھائے ۔ چاہیے کہ گلے پر چھری چل جائے۔ پر تو کسی پراچین کوی یا ساہتیکس پر وچار پرکٹ کرنا انوچت ہے۔ اس پرکار کی بھگتی سے کیا لابھ ؟ اور اس پرکار کے بگلہ بھگتوں سے ساہتیہ کو کوئی فائدہ نہیں۔ یہی تو کارن ہے کہ آج کل جس نے فدا کہا "مجھے کوئی سشدا است سے ملا رہا ہے" بس ہم نے ہاتھ تالا کے لڑکوں کے سمان ٹوپیاں پھینکنا شروع کیں اور کہا "واللہ کیا بات کہی ہے ؟" اُس دن سے وہ رہسیاوادی کوی کہلانا جانے لگا۔ اس سے کوئی مطلب نہیں کہ اس نے کبیر کی سوکھی روٹیوں کو کتنا چبایا ہے۔ مگر وہ ایک نیا یگ ستھاپت کرنے والا رہسیاوادی کوی کہلاتا ہے۔ یدی ہمارے یہاں سمالوچنا کا پرچار ہو تو ساہتیہ میں اچھے اور رنگے سیار کبھی نہ پیدا ہوں۔ سمالوچنا کا ہونا ہی ایک پرمان ہے کہ ساہتیہ اور جیون میں گھنشٹ سمبندھ ہے۔

جب تک ہمارے ساہتیہ میں ہمارے جیون کی چھاپ نہیں ہوگی ہمارا ساہتیہ کبھی وستریت روپ سے پھیل نہیں سکتا۔ اور جب تک ساہتیہ پرتیک یگ کا پرتی ندھ نہیں ہوگا۔ جنتا اس کو اپنائے گی نہیں اور سادھارن منشیوں کو اس سے کوئی لابھ نہیں ہوگا۔ سماج کا درشن ساہتیہ اور کلا ہے۔ انگلینڈ کا مہا کوی شیکسپیئر بھی اپنے یگ کا تھا۔ پرتیک یگ اپنے کوی اور اپنے کلاکار پیدا کرتا ہے اور اسی پرکار کوی اور کلاکار بھی اپنے اپنے یگوں کا سنکار کرتے ہیں سماج اور ساہتیہ دو ہردے ہیں۔ ایک کے ہردے کی دھڑکن دوسرے کو سنائی دیتی ہے۔

تنقید و تبصرہ

کتب :-

تاریخ الحدیث | مولفہ قاضی عبدالصمد صاحب سیوہاروی لکھائی، چھپائی اور کاغذ عمدہ تقطیع ۲۰×۲۶/۸ حجم ۴۰۰ صفحے قیمت ۶؍ - ملنے کا پتہ مولوی محمد ادریس صاحب مکتبہ شرقیہ دہلی

یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے علم حدیث کی تاریخ میں لکھی گئی ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی اس عنوان پر اردو زبان میں کتابیں لکھی جا چکی ہیں مگر قاضی عبدالصمد صاحب نے اس کتاب میں حدیث کی تاریخ کو زیادہ وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔ عہد بعہد کے رواۃ اور ان کی کتب، علوم حدیث اور ان کے عاملین کے طبقات اور ائمہ جرح و تعدیل کے حالات تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ اور کوئی گوشہ حدیث کی تاریخ کا تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ منکرین حدیث کے جوابات دینے میں حدیث کی حمایت اور عقیدت کا جذبہ ان کے اوپر غالب آگیا ہے۔ لیکن یہ مذہبی بحث ضمنی طور پر آگئی ہے۔ بحیثیت تاریخی معلومات کے یہ کتاب اردو زبان میں قابل قدر اضافہ ہے۔

علوم الحدیث | مولفہ مولانا شاہ محمد جعفر الدین سیال صاحب پھلواروی خطیب شاہی مسجد لاہور۔ لکھائی، چھپائی اور کاغذ معمولی۔ تقطیع ۲×۲۶/۸ ضخامت ۱۶۸ صفحے قیمت عہ۔ مصنف سے مل سکتی ہے۔

یہ کتاب بھی حدیث کی تاریخ میں ہے۔ اس میں بھی عہد بعہد کی حدیث کی کتابوں، علوم حدیث اور محدثین کے طبقات کے حالات لکھے گئے ہیں۔ لیکن اختصار کے ساتھ حجیت حدیث کی بحث بھی چھیڑی گئی ہے جو خالص مذہبی ہے اور جس کا تاریخ سے کوئی تعلق نہیں۔ لہذا غالباً یہی جذبہ اس کی تصنیف کا بھی محرک ہوا ہے۔ بہرصورت کتاب ابتدائی معلومات کے لئے مفید ہے۔ قیمت کسی قدر زیادہ ہے۔

ا - ح

مادرِ ہند | از حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم۔ تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۱۰ صفحات کتابت طباعت اور کاغذ اوسط۔ قیمت ۱۲ر ملنے کا پتہ۔ شاد بک ڈپو چوگھڑہ پٹنہ سٹی۔

یہ عجیب و غریب مثنوی حضرت شاد نے ہندوستان کے ناخوشگوار سیاسی حالات سے متاثر ہو کر لکھی ہے قصے کا خلاصہ یہ ہے۔ "کہ ایک زمانہ میں مادرِ ہند (ہندوستان) بڑے عروج پر تھی اس کے دو سپوت رام اور رحیم بڑے میل ملاپ اور پیار اور محبت سے رہتے تھے مگر بعد میں کچھ ایسی ہوا چلی کہ دلوں میں گرہ پڑ گئی 'مادرِ ہند' نے بہت کچھ اونچ نیچ سمجھائی مگر ان کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ آخر ہندوستان کی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ اور غیروں کی نظریں اس پر پڑنے لگیں تاآنکہ کچھ نووارد تجارت کے بہانے سے آئے اور مادرِ ہند پر قابض ہو گئے۔ مادرِ ہند نے پھر ان ناسمجھ بچوں کو سمجھایا اور تاجروں کو ان ناسمجھ فرزندوں کے ساتھ اچھے برتاؤ کی سفارش کی آخر ۱۸۵۸ء کے شاہی فرمان اور ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی پر یہ کہانی ختم ہو گئی۔"

یہ مثنوی آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے حضرت شاد نے ملکہ معظمہ کی جوبلی کے موقع پر لکھی ہے اگرچہ ضروریات و مقتضیات ہر زمانے میں بدلتی رہتی ہیں تاہم آخری حصے کو چھوڑ کر جس میں وفاداری کا جذبہ زیادہ نمایاں ہو گیا ہے یہ مثنوی آج بھی ہمارے لئے درسِ عبرت ہے اگرچہ یہ بڑی حد تک افسوسناک بات ہے کہ اربابِ زمانہ کی ناقدردانی کی وجہ سے اتنے طویل عرصے تک یہ کتاب منظرِ عام پر نہ آسکی لیکن اس سے ایک فائدہ ضرور ہوا کہ حضرت شاد کو کئی بار اس پر نظرِ ثانی کا موقع مل گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں حسن و عشق کی چاشنی نہیں ہے پھر بھی کہیں بے لطفی خشکی یا تلخی نہیں پیدا ہوئی ہے۔

الزہرا | از جناب عبدالرحمن صاحب کاشغری استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰۸ صفحے کتابت و طباعت اور کاغذ اچھا۔ قیمت ۸ر مصنف سے شبلی ہوسٹل لکھنؤ یا مکتبۃ الضیاء لکھنؤ کے پتے پر مل سکتی ہے۔

یہ مولوی عبدالرحمن صاحب کاشغری کے ان عربی قصیدوں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ندوے میں

مختلف موضوعوں پر پڑھے ہیں کاشغری صاحب ترکی النسل ہیں عربی کی تعلیم شروع سے آخر تک ندوے میں پائی ہے جو شخص ان کی طالب علمی کی زندگی سے واقف ہے اُسے معلوم ہے کہ انھوں نے عربی زبان وادب کے حصول میں کس قدر محنت شاقہ برداشت کی ہے ۔ شاعری کا انھیں ابتدا سے ذوق تھا اب اس ذوق میں پختگی آچلی ہے اور یہ بات ان کے زیر نظر دیوان سے ظاہر ہے ۔ کلام بے عیب ہے اور جملہ لوازم شاعری سے مرصع ہے ۔ البتہ بقول مقدمہ نگار صاحب ایک عجمی کے کلام کو عربی شعرا شوقی یک، رافعی ۔ احمد محرم وغیرہ کی شاعری کے معیار پر رکھنا انصاف سے بعید ہوگا ۔ بایں ہمہ بعض بعض شعروں پر طبیعت وجد کرنے لگتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی عربی شاعر بھی یہ شعر اسی طرح کہتا ۔ شروع میں مولوی مسعود عالم صاحب ندوی ایڈیٹر الضیا (عربی) کا طویل مقدمہ بھی ہے جو بہت محنت اور خلوص سے لکھا گیا ہے ۔ امید ہے کہ عربی داں طبقے میں اس دیوان کی کافی قدر ومنزلت کی جائے گی ۔

یاد حالی | مرتبہ غلام طیب صاحب لکچرر اُردو اورنگ آباد کالج سائز چھوٹا صفحات ۱۴۲ صفحے کتابت وطباعت اور کاغذ اچھا قیمت درج نہیں غالباً پرنسپل عثمانیہ کالج اورنگ آباد کے پتے سے مل سکتی ہے۔

عثمانیہ کالج اورنگ آباد میں بزم حالی کے ماتحت ۵ نومبر ۱۹۳۷ء کو مولانا حالی کی صدسالہ برسی کا جشن بہت اہتمام سے منایا گیا تھا ۔ اس موقع پر مولانا پر بہت اچھے اچھے مضمون پڑھے گئے تھے اور اُن کی مختلف حیثیتوں کو نمایاں کیا گیا تھا ۔ یہی مضمون اب یاد حالی کے نام سے کتابی صورت میں مرتب کردئے گئے ہیں ۔ مضمون لکھنے والوں میں مولانا عبدالحق معتمد انجمن ترقی اردو ۔ سر شیخ عبدالقادر ۔ مولوی سید محی الدین صاحب پرنسپل کالج ۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف ۔ ڈاکٹر محی الدین صاحب اور شیخ چاند خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ مضامین کے علاوہ خاص خاص پیام بھی ہیں جو اس موقع پر ملک کے نامور لوگوں کی طرف سے بھیجے گئے ہیں چند اچھی اچھی نظمیں بھی ہیں جو مولانا حالی پر لکھی گئی ہیں ۔ غرض یہ مجموعہ ہر حیثیت سے کامیاب ہے اور خاصے کی چیز ہے لکھائی چھپائی

میں بھی نہایت نفاست اور سلیقے سے کام لیا گیا ہے شروع میں مولانا حالی کی تصویر ہے ہم اس کامیابی پر بزم حالی کے کارکنوں کو دلی مبارکباد دیتے ہیں۔

<u>یادگارِ حالی</u> | مرتبہ منشی دیا نرائن نگم بی اے۔ سائز بڑا ضخامت ۱۰۴ صفحے۔ کتابت وطباعت اچھی کاغذ اوسط درجے کا۔ قیمت ۱۲ر ملنے کا پتہ دفتر زمانہ پریس کان پور۔

مولنا حالی کی صد سالہ برسی کی تقریب میں اردو کے مشہور رسالہ زمانہ کان پور نے بھی نہایت اہتمام سے خاص نمبر (حالی نمبر) شائع کیا تھا۔ اسی خاص نمبر کو یادگارِ حالی کے نام سے اب کتابی شکل دے دی گئی ہے نگم صاحب نے اس پرچے یا کتاب کو بہت محنت سے مرتب کیا ہے۔ اور اس بات کی خاص طور پر کوشش کی ہے کہ حالی مرحوم کی علمی و عملی زندگی کے تمام پہلو سامنے آجائیں۔ مضامین میں "حالی ایک انسان کی حیثیت سے"۔ "مسدس حالی"، "مولانا حالی کا فارسی کلام" "حالی اور غزل"، خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں۔ ان کے علاوہ نظمیں بھی اچھی ہیں مولنا حالی کے کلام کا انتخاب بھی دیا گیا ہے۔ ان کی تصانیف کی فہرست بھی ہے۔ آخر میں ایڈیٹر صاحب نے بتایا ہے کہ رسالہ زمانہ سے مولنا کو کس قدر تعلق اور دلچسپی تھی۔ مولانا حالی اور اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال کی تصویریں بھی ہیں۔

<u>اولیاء اللہ و اولیاء الشیطان</u> | از مولانا ابو الکلام آزاد تقطیع بڑی۔ ضخامت ۷۵ صفحات کتابت وطباعت اوسط کاغذ اچھا قیمت ۸ر ملنے کا پتہ۔ الہلال بک ایجنسی فاروق گنج بیرون شیرانوالہ دروازہ لاہور۔

یہ عالمانہ مضمون الہلال مرحوم کے صفحات پر شائع ہوا تھا اب الہلال بک ایجنسی نے اسے کتابی صورت میں شائع کیا ہے اس میں مولانا نے اولیاء اللہ و اولیاء شیطان وحزب اللہ وحزب الشیطان۔ اصحاب النار و اصحاب الجنۃ اصحاب المیمنہ و اصحاب المشئمہ۔ اصحاب الیمین و اصحاب الشمال

کے زیرعنوان دنیا کے دو متضاد گروہوں کی تفصیل بتائی ہے، جن حضرات کو مولانا کے اس قسم مضامین کے مطالعے کی سعادت نصیب ہوئی ہے انھیں اندازہ ہوگا کہ انھوں نے اس میں کیا کیا نکات بیان فرمائے ہوں گے۔ الہلال بک ایجنسی مستحق ستائش ہے کہ وہ ایسی نایاب چیزیں جو مرحوم الہلال کے فائلوں میں مدفون تھیں تفحص و تلاش کے بعد اس اہتمام سے شائع کر رہی ہے۔

افسانہ ہجر و وصال | از مولانا ابوالکلام آزاد تقطیع بڑی۔ ضخامت ۴۴ صفحے کتابت وطباعت اور کاغذ اچھا۔ قیمت ۴ر ملنے کا پتہ الہلال بک ایجنسی فاروق گنج بیرون شیرانوالہ دروازہ لاہور۔

یہ مضمون بھی الہلال میں شائع ہوا تھا اور اب الہلال بک ایجنسی نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے۔ درحقیقت یہ ایک دردمند دل کی آہ ہے جو مسلمانوں کی موجودہ پستی غفلت اور بے حسی سے متاثر ہو کر نکلی ہے۔ زبان نہایت صاف، سادہ اور سلیس۔ اور طرز بیان پرجوش اور دلوں کو ہلا دینے والا۔

فن انشاپردازی | از جناب ڈاکٹر محی الدین صاحب زور قادری پروفیسر ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ۔ سائز بڑا ضخامت ۱۱۵ صفحات کتابت وطباعت اور کاغذ اچھا۔ قیمت اور ملنے کا پتہ کتاب پر درج نہیں۔

یہ کتاب بقول جناب مصنف اس غرض سے لکھی گئی ہے کہ نوجوانوں میں صحیح ادبی ذوق نشوونما پائے۔ کتاب علاوہ مقدمے اور اشاریہ کے ۲۱ ابواب پر مشتمل ہے چند ابواب کے عنوان یہ ہیں۔ کیوں لکھیں کیا لکھیں۔ کس طرح لکھیں۔ اسلوب بیان۔ اپج پیدا کرنا بچوں کے لئے لکھنا۔ عورتیں اور انشاپردازی۔ وغیرہ زور صاحب نے کوشش کی ہے کہ تمام کام کی باتیں کتاب میں آجائیں بعض باتیں ایسی بھی کتاب میں درج ہو گئی ہیں، جو کچھ غیر ضروری سی معلوم ہوتی ہیں مثلاً اشاعت کے راز، مسودہ کی تشکیل وغیرہ تاہم نومشق نوجوانوں کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔

خواب پریشان | از مولنا عنایت اللہ بی اے دہلوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۰ صفحے لکھائی چھپائی اور کاغذ اچھا ٹائٹل خوشنما قیمت ۸ ملنے کا پتہ شاہجہاں بک ایجنسی دہلی۔
یہ دلچسپ قصہ بھی رسالہ ساقی میں شائع ہو چکا ہے اس میں ایک فلسفی حکیم صاحب کا خاکہ اڑایا گیا ہے۔ اور پھر ایک خواب میں فلاسفہ یونان قدیم کے سامنے انھیں پھانسی دلوائی گئی ہے قصہ شروع سے آخر تک بہت دلچسپ ہے۔ حکیم ہدی صاحب کا کیرکٹر بڑی خوبی سے کھینچا گیا ہے۔ خواب کی عبارت بھی پڑھنے کے لائق ہے

انکشاف حقیقت | از جناب صادق الخیری بی اے دہلوی۔ تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۰ صفحات کتابت وطباعت اور کاغذ اچھا قیمت ۸ ملنے کا پتہ شاہجہاں بک ایجنسی دہلی۔
یہ دلچسپ افسانہ ساقی کے کسی پچھلے افسانہ نمبر میں شائع ہو چکا ہے۔ قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک نوجوان اور ایک خاتون میں جو فرضی ناموں سے رسائل میں مضمون لکھتے ہیں خط وکتابت کا سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔ پھر ان دونوں میں یکایک دو ایک ملاقاتیں ہوتی ہیں تعلقات بڑھتے ہیں اور شادی ہو جاتی ہے اور پھر شکر رنجی۔ اس شکر رنجی کا اثر خاتون پر خاص طور پر پڑتا ہے وہ قریب مرگ ہو جاتی ہے۔ اسی اثنا میں یک بیک یہ انکشاف ہوتا ہے کہ یہ دونوں تو وہی ہیں جو پہلے فرضی ناموں خط وکتابت کرتے رہے ہیں۔ افسانہ بحیثیت مجموعی کامیاب ہے صادق الخیری صاحب کو افسانے لکھنے کا اچھا سلیقہ ہے ان کے قلم میں بھی شگفتگی اور اثر ہے۔

عروس ادب | از جناب قاضی عباس حسین صاحب ظریف دہلوی۔ تقطیع چھوٹی۔ ضخامت ۱۸۰ صفحے کتابت وطباعت وکاغذ اوسط۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ ساقی بک ڈپو دہلی۔
یہ جناب ظریف صاحب کے اُن چودہ افسانوں کا مجموعہ ہے جو شاہجہاں، شباب اُردو اور ساقی میں شائع ہو کر سند قبول حاصل کر چکے ہیں افسانے خاصے دلچسپ ہیں دلّی کی آسان اور

نکھری ستھری زبان میں لکھے گئے ہیں۔ موقع بموقع ظرافت کی چاشنی نے مزید لطف پیدا کر دیا ہے، فنی حیثیت سے بھی کامیاب ہیں۔ کرداروں میں بھی ایک خاص زندگی اور جان ہے۔ علاوہ اس کے ہر افسانہ کسی خاص مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے۔ آخر میں چند ظریفانہ غزلیں بھی ہیں۔ بہت دلچسپ۔

تاریخی ناول (افغانی و انگریزی) | از جناب حافظ محمد حسین خاں صاحب بی اے سابق رئیس تدریسات افغانستان۔ تقطیع بڑی۔ ضخامت ۲۰۴ صفحات کتابت و طباعت اور کاغذ اوسط قیمت۔ ملنے کا پتہ حمید خاں بستی نو۔ جالندھر۔

اس ناول میں جناب حافظ محمد حسین خاں صاحب نے ناول کے پیرائے میں افغان اور انگریز مردوں اور عورتوں کے عادات و خصائل بڑی خوبی سے بیان کئے ہیں۔ قصہ ۱۸۳۸ء سے کچھ پہلے کا ہے جبکہ افغانستان میں شورشوں کا مرکز تھا۔ انگریزی فوج کابل پر حملہ کر رہی تھی اور افغانی جواں مردی دلیری سے ان حملوں کی مدافعت کر رہے تھے اسی اثنا میں ایک نوجوان افغانی اکرم پر ایک انگریز دوشیزہ کی نظر پڑ گئی اور وہ اس پر سو جان سے فدا ہو گئی یہی حالت اکرم کی ہوئی تاآنکہ انگریز لڑکی مسلمان ہو گئی اور ان دونوں میں نکاح ہو گیا۔ اس سلسلے میں بہت سے دلچسپ، ہیبتناک واقعات پیش آئے ہیں جن کی تفصیل طوالت کا موجب ہوگی کتاب میں جگہ جگہ عیسائیت کے متعلق مناظرے بھی ہیں ان میں دلائل و براہین سے تمام مذاہب پر اسلام کی برتری اور فوقیت دکھائی ہے۔ افغانستان کے پرانے ملاؤں اور قاضیوں وغیرہ کی بھی خوب قلعی کھولی گئی ہے۔ حافظ صاحب نے یہ کتاب فنی اصول کو مدنظر رکھ کر نہیں لکھی اس لئے اگر اس قسم کے نقائص ہوں تو انھیں نظر انداز کر دینا چاہیے۔

اقتباس ثمری | از جناب حافظ محمد حسین خاں صاحب سابق رئیس تدریسات افغانستان تقطیع چھوٹی

ضخامت ۲۰۴ صفحات۔ کتابت وطباعت اور کاغذ اوسط قیمت درج نہیں غالباً بستی نو جالندھر کے پتے پر جناب مصنف سے مل سکے۔

حافظ صاحب مثنوی مولانا روم کی ضخیم جلدوں میں سے یہ اقتباس کیا ہے شروع میں سبب اقتباس کے عنوان سے ایک نظم بھی ہے اُس میں فرماتے ہیں :۔

گل بچیدم خار را بگذاشتم ⸎ برگ وغنچہ نرم نرم اماستم
از عبارات عبرتے برداشتم ⸎ گرچہ لازم جملہ را پنداشتم
ہر کہ دارد وقت فوائد داستاں ⸎ ورنہ بردارد نتیجہ ہائے آں

گلبو | از جناب حافظ محمد حسین خاں صاحب بی اے سابق رئیس تدریسات افغانستان سائز چھوٹا ضخامت ۱۰۴ صفحے کتابت وطباعت معمولی کاغذ اوسط درجے کا قیمت درج نہیں غالباً بستی نو جالندھر کے پتے پر مصنف سے مل سکتی ہے۔

جناب حافظ صاحب نے گلستان اور بوستان کا انتخاب فرمایا ہے اور اُس کا نام گلبو رکھا ہے۔ طالب علموں اور کم فرصت لوگوں کے لئے اچھی چیز ہے

مکتوبات امجد | مرتبہ جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی۔ سائز چھوٹا۔ ضخامت ۹۰ صفحات لکھائی چھپائی اور کاغذ اچھا۔ قیمت ۸ مطبع کا پتہ شمس المطابع عثمان گنج حیدرآباد دکن۔

یہ حیدرآباد کے مشہور شاعر حضرت امجد کے خطوط کا مجموعہ ہے جو اُنھوں نے اپنے دوست احباب اور معتقدین کے نام لکھے تھے۔ شروع میں نواب جیون یار جنگ بہادر کا پیش لفظ اور ہاشمی صاحب کا ۲۲ صفحے کا مقدمہ ہے اس کے بعد اصل خطوط شروع ہوتے ہیں۔ ان خطوط میں تصوف کا رنگ غالب ہے۔ اور صاحب ذوق حضرات کے کام کی چیز ہے۔

حضرت محمد صلعم اور اسلام | از بابو کنج لال دلوالی ام اے۔ تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۵ صفحات۔ کتابت و طباعت اچھی قیمت ۴ر ملنے کا پتہ بابو کنج لال دلوالی ام اے ملول (نزد دہلی)

۱۰ اگست ۲۹ء میں محمڈن ایجوکیشنل سوسائٹی کی طرف سے آنحضرت صلعم کے روز ولادت کی تقریب پر گولھاپور میں ایک جلسہ ہوا تھا بابو کنج لال اس کے صدر تھے انھوں نے اس روز ایک تقریر بھی کی تھی اور یہی صدارتی تقریر افادۂ عام کی غرض سے انھوں نے ترمیم و اضافے کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کر دی ہے۔ اس میں آنحضرت کے مختصر حالات ہیں اور ہندوؤں اور دوسرے فرقوں کی طرف سے اسلام پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں اُن کے معقول۔ مدلل اور مسکت جوابات ہیں بابو صاحب نے اسلام اور اس کی تاریخ کا غور و توجہ اور چشم بصیرت سے مطالعہ کیا ہے اگر ہندوستان کے مختلف مذہبوں اور فرقوں کے لوگ اسی فراخ دلی سے دوسروں کے مذاہب کا مطالعہ کریں تو ان آئے دن کے جھگڑوں اور فسادوں کا نام و نشان ہی مٹ جائے جنھوں نے ہندوستانی قومیت کی تعمیر میں بے شمار رخنے پیدا کر دئے ہیں۔ (م۔ ح ح)

رسائل:۔

کامران (ماہوار) | ایڈیٹر حاجی نبی احمد صاحب و سید ولایت حسین صاحب تقطیع بڑی حجم ۴۰ صفحے کتابت و طباعت اچھی کاغذ اوسط درجے کا قیمت سالانہ ۳ر فی پرچہ ۴ر مقام اشاعت دہلی۔

یہ پرچہ "مسلمانوں کی اصلاح اور ان کی ہر جہتی ترقی" کے لئے نکالا گیا ہے۔ لیکن زیادہ تر توجہ "علمائے کرام" کی اصلاح کی جانب ہے۔ شروع میں مولانا راشد الخیری مرحوم کا مضمون ہے جس میں انسداد ارتداد کے بارے میں نہایت سنجیدہ مشورے دئے گئے ہیں اس کے بعد مولانا عنایت اللہ بی اے دہلوی نے ڈانٹے کے جہنم کے ایک حصے کا ترجمہ کیا ہے اور جیسی یہ کتاب کلاسکل ہے اسی طرح ترجمہ بھی ادب عالیہ میں شمار ہونے کے قابل ہے اس کے بعد تفاسیر القرآن کے عنوان سے مولانا اسلم کا مضمون ہے۔ اس میں انھوں نے مختصر طور پر تفسیر کے مدون ہونے کی تاریخ بیان کی ہے۔ پھر

ان تفسیروں کے نقائص بتائے ہیں ۔ پھر جناب ص ۔ ق دہلوی نے دنیائے سعادت کے نام سے ایک نئی دنیا بسائی ہے ۔ اس کے بعد حضرت جوش ملیح آبادی نے اپنے مخصوص انداز میں مولویوں کو جی بھر کے ملاحیاں سنائی ہیں اور سب وشتم میں " علمائے کرام " سے زیادہ جرات دکھائی ہے ۔ پھر مولانا نیاز فتح پوری کے ارشادات میں ان کا انداز بھی یہ ہی ہے ۔ پھر حاجی نبی احمد صاحب نے ایک نظم میں مولویوں کے اخلاق کو کوسا ہے کچھ عرصہ ہوا دیو بند نے آں حضرت کی شہوانی طاقت پر کچھ ریسرچ کیا تھا (نعوذ باللہ) اس کی تفصیل اور اس پر نقد بھی اس پرچے میں موجود ہے پھر راجپوتانہ کے مسلمانوں کی زبوں حالی اور علماء ومشائخ کی خودغرضیوں کا تذکرہ ہے ۔ پھر مکافات کے عنوان سے امرسن کا ایک مضمون ہے ۔ مولوی عنایت اللہ صاحب بی اے دہلوی نے ترجمہ کیا ہے آخر میں ہم کیا چاہتے ہیں اور مولویوں کے نام ہمارا پیام کے زیر عنوان علماء کرام کو مشورہ دیا گیا ہے کہ موجودہ حالات میں انھیں کیا کرنا چاہئے اور انھوں نے ہماری بات نہیں مانی تو ہم آن کے ساتھ کیا سلوک کریں گے ۔

اس میں شک نہیں کہ رسالہ بہت محنت اور سلیقہ سے نکالا گیا ہے ۔ اور یہ ہی توجہ رہی تو آئندہ اور ترقی کرے گا ۔ لیکن جس مقصد کے لئے یہ نکالا گیا ہے اس کے حصول کے لئے یہ روش ہمارے خیال میں مناسب نہیں ۔ آج کل قوم کی اصلاح کا احساس بہت شدت سے عام ہے ہمارے چند نوجوان مسلمانوں کی توجہ علمائے کرام کی اصلاح کی جانب مبذول ہوئی ہے اور یہ بہت اچھا مشغلہ ہے لیکن ہمارا خیال ہے اور شاید بہت سے پچھلے مصلحین کا بھی یہ ہی تجربہ ہو کہ اصلاحی کام میں اکثر و بیشتر نرم گفتاری و خوش اخلاقی ودرشت کلامی وغضبناکی کے مقابلے میں زیادہ کامیاب ہوتی ہے ۔ ہمیں امید ہے کہ رسالے کے کارکن مضمون نگار اور شعرائے کرام ہماری گذارش کو ناقابل التفات نہ سمجھیں گے ۔

<u>ادب (محمود آباد نمبر)</u> مرتبہ جناب ناصر لکھنوی ۔ تقطیع " جامعہ " کی ضخامت ۲۰۰ صفحات ۔ کتابت وطباعت اور کاغذ اچھا ۔ سرورق دیدہ زیب مقام اشاعت نظامی پریس ۔ لکھنؤ ۔

ادب کا ذکر ان ہی صفحات میں پہلے آچکا ہے ۔ اب جناب ناصر لکھنوی نے مہاراجہ محمود بالقابہ

کے جشن تاج پوشی کی تقریب میں محمود آباد نمبر کے نام سے اس کا ایک خاص نمبر نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اداریہ پیغامات اور رائوں کے علاوہ اڑتیس مضامین نظم و نثر ہیں۔ فرمانروائے محمود آباد دام اقبالہ مہاراج کمار بہادر محمود آباد دام اجلالہ کے ارشادات عالیہ بھی شریک اشاعت ہیں ان کے علاوہ جناب مرتب نے ملک کے تمام مشہور ادیبوں اور شاعروں کے کلام نظم و نثر سے اس پرچے کو زینت دی ہے۔ اور بڑے سلیقے سے اس گلدستے کو سجایا ہے رسالے کی ظاہری تزئین بھی اس کی شان کے مطابق ہے اور نظامی پریس اور اس کے کارکن اس معاملے میں بجا طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں رسالے میں گزشتہ و موجودہ فرمانروایان محمود آباد اور جشن تاج پوشی کے موقع کی تصویریں بھی ہیں۔

الموسی (سہ ماہی) ایڈیٹر محمد افضل الدین و سید مہدی حسین۔ تقطیع بڑی، ضخامت ۱۲۰ صفحات سرورق خوب صورت مقام اشاعت دفتر الموسی سی کالج حیدر آباد دکن۔

یہ رسالہ سٹی کالج کے طالب علم کئی سال سے بہت محنت اور توجہ سے نکالتے ہیں اس کا معیار بھی برابر بلند ہوتا جا رہا ہے۔ زیر نظر نمبر اس کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ اس میں علاوہ طالب علموں کے بہت اچھے اچھے لکھنے والوں کے نام نظر آتے ہیں مثلاً جناب آغا حیدر حسن صاحب حضرت فانی بدایونی ہز اکسلنسی مہاراجہ سر کشن بہادر یمین السلطنت و صدر اعظم۔ آخر میں مدیر کے قلم سے کالج سنسار کے زیر عنوان کالج کی مختلف دلچسپیوں کی بہت دلچسپ انداز میں روداد بیان کی گئی ہے۔ ہم اس کامیابی پر طلبائے سٹی کالج خصوصاً اس کے مرتبین کو مبارکباد دیتے ہیں۔

دلچسپ (ماہوار) ایڈیٹر کرم چند و عبدالحمید۔ سائز بڑا۔ کتابت و طباعت اوسط درجے کی ضخامت ۴۶ صفحے قیمت سالانہ ایک روپیہ۔ مقام اشاعت بمبئی۔

یہ باتصویر رسالہ بمبئی سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ مضامین عام مذاق کے ہوتے ہیں۔ تصویروں کا بھی انتظام ہے۔

تاج (ہفت روزہ) مرتب حضرت نشتر جالندھری و قربان علی کاظم طباعت وکتابت اور کاغذ اچھا ٹائٹل دیدہ زیب۔ قیمت سالانہ تین روپے مقام اشاعت لاہور۔

یہ اخبار تاج کمپنی لاہور کی طرف سے نکلنا شروع ہوا ہے زیر نظر پرچہ جلد کا پہلا نمبر ہے۔ شروع میں "تاج کے خیر مقدم" کے عنوان سے جناب خاں صاحب ابو الاثر حفیظ جالندھری صاحب کی ایک نظم ہے۔ دوسرے صفحے پر "جنگ بدر" کی تفصیل ہے پھر آغاز سفر کے عنوان سے افتتاحیہ ہے جو جناب نشتر نے بڑے جوش اور ولولے سے لکھا ہے پھر شذرات ہیں۔ اس کے بعد خبروں کا انتخاب ہے۔ پھر خاموش جلیل کے عنوان سے ایک دلچسپ افسانہ ہے۔ تنتر و دیا پر حضرت سالک کا ایک دلچسپ مضمون ہے۔ اس کے بعد مسلمان بچیوں کی تعلیم کی ابتدا پر ممتاز رفیع بیگم صاحبہ نے ایک مضمون لکھا ہے۔ پرچہ بہت محنت اور سلیقے سے مرتب کیا گیا ہے اور نشتر صاحب کی یہی توجہ رہی تو آئندہ اس سے بہت کچھ امیدیں قائم کی جاسکتی ہیں۔

رہبر (ہفت روزہ) رئیس التحریر ابو سعید صاحب بزمی ایم اے کتابت وطباعت معمولی۔ قیمت سالانہ ۵ مقام اشاعت بھوپال۔

یہ اخبار بھوپال کے عوام کا ترجمان ہے افسران حکومت پر آزادی سے نکتہ چینی کرتا ہے۔ لب ولہجہ متین وسنجیدہ ہے۔ (م۔ ح۔ ح)

دکن کے زمانہ ماقبل تاریخ کی یادگاریں از غلام یزدانی صاحب، ایم اے، ایف اے ایس بی، ناظم محکمہ آثار قدیمہ سرکار عالی و ماہر کتبات اسلامیہ سرکار عظمت مدار سلسلہ مطبوعات سرکار عالی۔ حجم ۱۰۰ صفحے، قیمت ۱ر۰ باتصویر۔

یہ نہایت ہی دیدہ زیب رسالہ غلام یزدانی صاحب کی ایک تقریر ہے جو انھوں نے ۱۷ ستمبر ۱۹۳۵ء کو حیدرآباد کے ریڈیو اسٹیشن سے کی تھی۔ دہلی کی طرح حیدرآباد میں بھی ریڈیو کی تقریروں کا مختصر ہونا شرط

ہے اور سب کچھ دیکھتے ہوئے بہتر بھی یہی ہے، پھر بھی جب غلام یزدانی صاحب کی سی قابلیت اور وسیع معلومات رکھنے والے ریڈیو کو اپنی تقریر کا شرف بخشیں تو جی چاہتا ہے کہ ایسا کوئی قاعدہ نہ ہوتا۔ رسالہ کے اختصار کا سبب یہی ہے، لیکن ان دس صفحوں میں دکن کے زمانہ ماقبل تاریخ کی نسبت جو کچھ معلوم ہو جاتا ہے اس کے آگے ہے بھی بہت کم۔ یزدانی صاحب مختصر تقریر کریں یا کوئی اور موٹی کتاب لکھیں، پڑھنے والے کو حاصل قریب قریب اتنا ہی ہوگا۔

زندوں کا حال مردوں سے معلوم کرنا، زندگی کا آثار قدیمہ سے، مکانوں کا قبروں سے اور مقبروں سے، بڑا مشکل اگرچہ بہت ہی دلچسپ کام ہے۔ جب حقیقت تک پہنچنے کی کوئی صورت نہ ہو تو اسی مشکل دلچسپی کو اختیار کرنا پڑتا ہے، اور اب تک ہندوستان اور دکن کے آثار قدیمہ کے محکموں سے علم تاریخ کو جو فیض پہنچا ہے وہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ غلام یزدانی صاحب کے شوق اور محنت کی بدولت ریاست حیدرآباد کے محکمہ آثار قدیمہ نے جو علمی خدمات انجام دی ہیں ان کا اندازہ اس محکمے کی سالانہ رپورٹوں پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہو سکتا ہے، مگر شمالی ہندوستان میں ان خدمات کا اعتراف بھی کیا جائے تو ذکر نہیں کیا جاتا۔ سبب نہ پوچھئے، بیان کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ بہر حال، یہ تو ثابت ہے کہ ریاست حیدرآباد اور برطانوی ہند کے محکمہ آثار قدیمہ نے جو انکشافات کئے ہیں انھوں نے قدیم تاریخ ہند کا نقشہ ہی بدل دیا ہے۔ اب نہ آریوں کی قدامت کوئی ایسی قدامت رہی ہے، نہ ان کا مذہب خالص، نہ تہذیب دوسروں سے بہتر۔ ایک محقق کی رائے میں تو نہ ان کا رنگ صاف تھا نہ ناک اونچی نہ ڈیل لامبا، یعنی وہ باہر سے نہیں آئے تھے، یہیں کے لوگ تھے، دوسروں کو، جنھیں وہ اپنے مخالف جانتے تھے، انھوں نے جی میں آیا تو غلام اور جی میں آیا تو صورت پریت کہہ دیا۔ ان کی زبان ایک خاص مت کی زبان تھی، اسے سمجھنے والے وہی تھے جن کا خود ستائی میں فائدہ تھا، لہٰذا انھوں نے جیسا چاہا قانون بنایا اور جس کو چاہا دیوتا بنایا۔ یہ بہت بعد کی بات ہے کہ انھیں اپنے دیوتاؤں کو چھوڑ کر دوسروں کی پرستش کرنے میں اپنا فائدہ نظر آیا، یعنی انھوں اندر اور ورن سے منہ پھیر کر شو اور وشنو (کرشن) کو سجدہ کیا اور اپنی لاج رکھنے کے لئے دیوتاؤں کے نسب نامے اور شخصی علامات کو

نئے تاریخی نقطہ نظر کو سمجھنے کے لئے یزدانی صاحب کا یہ مختصر رسالہ بہت مفید ہو گا۔ اس میں وہ خیال آرائیاں نہیں ہیں جن کی طرف آثار قدیمہ کے اکثر ماہر مائل ہوتے ہیں، اس لئے کہ یزدانی صاحب بہت محتاط عالم ہیں، اور شہرت حاصل کرنے کی اس وبا سے محفوظ ہیں جو شمالی ہندوستان کیا ساری دنیا میں علم کاذب کی علامت ہے۔

"نظام الملک آصف جاہ"

(مصنفہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب ڈی لٹ (پیرس) پروفیسر جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد۔ حجم ۲۱۶ صفحے قیمت چھ روپیہ ملنے کا پتہ درج نہیں ہے۔)

یہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کی پہلی انگریزی تصنیف ہے، مگر اسی پہلی کوشش سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ تحقیق کے فن میں ماہر ہیں، اپنی معلومات اور مطالعہ سے خود پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اسے دوسروں تک بہ پہنچا بھی سکتے ہیں۔ اب تک سلطنت مغلیہ کے زوال کے ابتدائی دور پر انگریزی میں صرف ارون کی کتاب تھی، جو مفصل تو ہے مگر اس کی تفصیل سے الجھن ہوتی ہے، اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں سفر میں کہاں کہاں پر منزل کی گئی، کون خیمے کی رسی لایا اور کس نے میخ ٹھوکی، دو چار درباریوں کی سیرت کا بھی اس میں خاکہ کھینچا گیا ہے، لیکن وہ ہے خبروں کا ایک بے جان اور اس لئے مہمل مجموعہ اور نظام الملک کی سیرت اس میں کسی وجہ سے نظر انداز بھی کی گئی ہے، یا اگر مصنف کی نیت یہ نہ تھی کہ اجڑی محفل کے آخری چراغ کی روشنی بھی دھیمی کر دے، تو اس کا معیار ایسا تھا جس نے جلتے اور بجھے ہوئے چراغوں میں فرق کرنے کی اجازت نہیں دی۔ بہرحال یوسف صاحب کی کتاب ایک بہت بڑی کمی پوری کرتی ہے، اور تصنیف کی حیثیت سے تاریخ نویسی کا بہت اچھا نمونہ ہے۔

نظام الملک آصف جاہ کے دادا، خواجہ عابد شاہجہاں کے آخری سالوں میں ہندوستان آئے، اور اسی زمانے سے ایک طرف وفا شعاری اور قابلیت اور دوسری طرف قدردانی اور مردم شناسی کی وہ داستان شروع ہوتی ہے جو سلطنت مغلیہ کے عہد زوال کی سب سے ہمت افزا کہانی ہے۔ اس کا انجام اس اعتبار سے تو دردناک تھا کہ نظام الملک کی تحصیب اور حکمت عملی کام نہ آئی، اور مغلیہ سلطنت روز بروز کمزور ہوتی گئی، لیکن یہ کیا کم تھا کہ ایسے وقت میں جب قوت اور عزت ہاتھ سے جا رہی تھی، ایک ایسا شخص پیدا ہوا جسے نہ غدار دوست نقصان پہنچا سکے نہ کھلے دشمن، جس نے ایک

نااہل بادشاہ کی آبرو قائم رکھی، کمینوں کا مقابلہ کرنے کے لئے کبھی کوئی نازیبا حرکت نہیں کی، اور خود غرضیوں اور حماقتوں میں گھر کر بھی کبھی سیدھے ایمانداری کے رستے سے ایک قدم نہ ہٹایا۔ ریاست کے وفادار اور جاں باز خادم اور بھی تھے، جو محمد خاں بنگش کی طرح تباہ ہوئے۔ اس لئے کہ وہ ہر داؤ پر سب کچھ لگا دیتے تھے اور عمل میں ماہر نہ تھے، ان کی شکست میں بے شک مردانگی کی شان نظر آتی ہے مگر دنیا میں مردانگی کے علاوہ اور اوصاف بھی درکار ہوتے ہیں۔ نظام الملک شمالی ہندوستان کو مرہٹوں کی لوٹ مار سے نہیں بچا سکا، نادر شاہ کو نہ روک سکا نہ لوٹا سکا، پر یہ کیا کم ہے کہ اس نے دکن کے صوبے کو مرہٹوں سے پاک کر دیا، اور اس وقت جب کہ اس کا سر جھکانے والا کوئی نہ تھا اس نے بزرگوں کی یاد تازہ رکھنے کے لئے اپنا سر جھکائے رکھا، اور شاہان مغلیہ کی آبرو رکھلی۔ ہوشیار سپہسالار بھی یہی کرتے ہیں کہ جب پوری فوج کو بچانے کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی تو ایک حصے کو بچا لیتے ہیں اور اسے کسی محفوظ جگہ پر پہنچا دیتے ہیں۔

یوسف صاحب کی تصنیف تحقیق کے موجودہ معیار پر پوری اُترتی ہے، ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے، اور کتب خانہ آصفیہ اور دفتر دیوانی میں انھیں قلمی کتابوں اور کاغذات اور اسناد کا ایک بہت بڑا ذخیرہ مل گیا ہے جو دوسرے مورخوں کو میسر نہ تھا۔ اس ذخیرے سے انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا ہے، اور ان کی کتاب نہایت مستند ہے۔ ان کے طرز تحریر میں بھی ایک محتاط عالم کا انداز نظر آتا ہے اور اگرچہ وہ اپنے ہیرو کے بہت معتقد معلوم ہوتے ہیں، انھوں نے ہمیشہ اس عقیدت کو ثبوت اور سند کا پابند رکھا ہے۔ ان کے اس احتیاط سے نظام الملک کی شخصیت گھاٹے میں نہیں رہتی، کیونکہ پس منظر صاف ہو تو اصل تصویر خود بخود اُبھر آتی ہے، اور یوسف صاحب پس منظر کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ نظام الملک کی عاقبت بینی اور مصلحت اندیشی کو بھی نمایاں کرتے رہے ہیں۔ ان کی تصنیف میں کوئی کمی محسوس ہوگی تو انھیں لوگوں کو جو "شاعری" کو تاریخ کا رس سمجھتے ہیں اور اس کی خاطر متین اور سنجیدہ عالموں کی گھڑکیاں بھی سہنے کو تیار ہوتے ہیں۔

نذرِ حسینؑ

رُباعی

آنکھیں غمِ شبیر میں تڑپیں دونوں / ہم پہلوئے درد، دل جگر ہیں دونوں
عاشورہ و چہلم کی عزاداری سے / یک رنگ، محرّم و صفر ہیں دونوں
لیتا ہے شقی کا نام کب کوئی کہیں / لیکن، لقبِ سعد ہے ہر دل میں مکیں
ہے نامِ بد و نیک کی نسبت کا یہ فرق / لاکھوں ہیں حُسینؑ، اور یزید ایک نہیں

سلام

کیا پوچھتا ہے کوئی محرّم میں کیا ہُوا / گھر کربلا میں، ذبح شہِ کربلا ہوا
یہ حشر کربلا کی زمیں میں بپا ہوا / بھائی سے بھائی، باپ سے بیٹا جدا ہوا
کیوں فرشِ کربلا کو نہ عرشِ عُلا کہوں / ہے سلسلہ نبی سے خدا تک ملا ہوا

قطعہ

احوالِ کربلا سبق آموزِ عام ہے / دنیا پر اُس کے فیض کا در ہے کُھلا ہوا
لیکن طلسم ساز، فریبِ نگاہ ہے / آنکھوں پہ غفلتوں کا ہے پردہ پڑا ہوا
اُٹھ جائے یہ حجاب تو ہو جائے یہ عیاں / ہر ذرّہ ہے چراغِ ہدایت بنا ہوا

جنگِ حسینؑ تھی نہ زر و مال کے لیے
تھا اُن کے سامنے یہ تخیل گرا ہوا

وہ صبر، وہ ثبات، وہ تسلیم، وہ رضا
جس کا نشان بعدِ نبیؐ تھا مٹا ہوا

وہ جوشِ دیں، وہ جذبۂ ملّی، وہ عزم و حزم
اسلام جس کے بل پہ قوی القوا ہوا

ابلاغِ دینِ مطلق و اعلائے امرِ حق
باطل کا جس کے سامنے سر تھا جھکا ہوا

اِن حسیات کی حرکت ہو رہی تھی بند
اور انحاد کا تھا اثر بھی بڑھا ہوا

وہ کوششیں، جان دے کے اُبھارا حسینؑ نے
جو سنگِ بے حسی میں پڑا تھا دبا ہوا

پروا نہ اُن کو زر کی، نہ خواہش تھی مال کی
تھا مال و زر تو قدموں سے اُن کے لگا ہوا

تھے وہ تو شاہزادۂ شاہنشہِ دو کون
سب کچھ تھا اُن کے پاس خدا کا دیا ہوا

کرتے وہ کیا طلب کسی حق ناشناس سے
اُن کے لئے خزانۂ حق تھا کھلا ہوا

احسن یہ بوترابؑ کی ہیں فیض بخشیاں
جو اُن کے در کی خاک ہوا کیمیا ہوا

ارشاداتِ ثاقب

اس کے نیرنگ کا تماشا ہوں — جز فریبِ نگاہ، میں کیا ہوں
عشق میں دل گنوا کے حال یہ ہے — کچھ میں کھویا ہوا سا رہتا ہوں
پرسشِ حال اس نے کی تو مجھے — یہی کہتے بنا کہ اچھا ہوں

دل تھا غم کا فسانہ خواں نہ رہا — اب کوئی لطفِ داستاں نہ رہا
ہم کہیں کس سے اور سمجھے کون — جب کوئی اپنا ہمزباں نہ رہا

کس منہ سے زباں کرتی اظہارِ پریشانی — جب تم سے مری حالت صورت سے نہ پہچانی
رازِ غمِ الفت ہم سمجھے تو مگر چپ ہیں — کہنے میں نہیں آتی جو تا ہو جدائی

ظلم اپنوں پہ جفا جو کس لئے — اے فلک! شبنم کے آنسو کس لئے
ڈھونڈتے ہیں سب تجلی گاہِ دوست — قمریوں کی ورنہ کو کو کس لئے
خواہشِ دنیائے عشق و حسن ہے — ورنہ پھر میں کس لئے، تو کس لئے

دل کے قصے کہاں نہیں ہوتے — ہاں وہ سب سے بیاں نہیں ہوتے
ایک ہی طرح کے ہیں دیر و حرم — غم کے مارے کہاں نہیں ہوتے

سلیم الزماں نے دوا دی ہے ثاقب — جو مخصوص ہے بہرِ عودِ جوانی
یہاں گوشۂ قبرِ دل ڈھونڈتا ہے — کہ ہے تلخ تر موت سے زندگانی

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کا ترجمان القرآن

دوسری جلد

سورۂ اعراف سے سورۂ مومنون تک

یہ جلد اپنی نوعیت میں پہلی جلد سے بھی زیادہ مہتم بالشان ہے۔ یعنی حواشی، زیادہ مفصل اور دلکش اور اہم مسائل پر مشتمل ہیں۔ طباعت و کتابت بھی بہتر ہے۔ چونکہ سورہ یوسف، انفال، توبہ، کہف، مریم، انبیاء وغیرہ اس حصے میں آگئی ہیں اور مولانا کو کتابت کے جدید انتظام کے باعث جی کھول کر بحث کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ اس لئے کتاب اپنے رنگ میں بے نظیر ہوگئی ہے۔

ہدیہ بلا جلد [illegible] مجلد [illegible]

جلد اول صرف مجلد مل سکتی ہے ہدیہ [illegible]

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔